حکیم الاُمّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

اِدارۃُ المعارف کراچی ۱۴

مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی کوتاہیوں کی نشان دہی نیز
عبادات، نکاح وطلاق، حقوق العباد اور دیگر معاشرتی معاملات سے متعلق
معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں حکیمانہ علاج

حکیم الامّت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ط

الحمد للہ وکفیٰ وسلام علیٰ عبادہ الذین اصطفیٰ

"اصلاحِ انقلاب امت" حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس اللہ سرہ کی وہ مجددانہ تصنیف ہے جس میں انہوں نے اپنے زمانہ کے مطابق زندگی کے ہر شعبے میں اسلام کی تعلیماؐ کی توضیح فرمائی ہے۔ مسلمانوں کی عملی زندگی کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں وہ اپنے دین کی اصل تعلیمات سے دور نہ ہٹتے چلے گئے ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کتاب میں عمل کی ان ہی کوتاہیوں کی انتہائی جزرسی کے ساتھ نشان دہی فرمائی ہے اور پھر انہیں دور کرنے کی موثر تدبیریں بتائی ہیں۔

یہ کتاب درحقیقت ایک سلسلۂ مضامین ہے جو دارالعلوم دیوبند کے معروف ماہنامہ "القاسم" میں قسط وار شائع ہوتا رہا، بعد میں اسے کتابی شکل میں شائع کردیا گیا۔

احقر نے اپنے ماہنامہ البلاغ میں اس سلسلۂ مضامین کی کچھ قسطیں القاسم سے نقل کرکے شائع کی تھیں، اور اس بات کی آرزو تھی کہ یہ مضامین یکجا طور سے کتابی صورت میں شائع ہوں۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی سینکڑوں تالیفات بار بار شائع ہوتی رہی ہیں، لیکن حیرت ہے کہ ایسی جامع مفصل اور مفید کتاب غالباً صرف ایک بار شائع ہوکر رہ گئی، اور اب حضرت رحمۃ اللہ علیہ کے بہت سے متوسلین بھی اس کے نام تک سے واقف ہیں۔

اسی دوران احقر کے شیخ ومربی سیدی وسندی حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب دامت برکاتہم نے "اصلاح انقلاب امت" کا ایک نسخہ جناب محمد حنیف اللہ لاری صاحب سے حاصل کر کے احقر کو عطا فرمایا اور حکم دیا کہ اس کی طباعت واشاعت کا انتظام کیا جائے۔

احقر نے کتاب کا مطالعہ کیا تو اندازہ ہوا کہ موجودہ دور میں اس کو شائع کرنے کے لئے اس پر کچھ کام کرنے کی ضرورت ہے، یہ کتاب ایسے دور میں لکھی گئی تھی جب عام مسلمان بھی دینی اصطلاحات اور علمی اسلوب بیان سے پوری طرح مانوس تھے اور اس سے پورا استفادہ کر سکتے تھے، لیکن اب ہماری شامت اعمال سے عوام اس انداز بیان سے بہت نامانوس ہو گئے ہیں، اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ تشریحی حواشی وغیرہ کے ذریعہ اسے بالکل عام فہم بنانے کی کوشش کی جائے۔ دوسرے عہد حاضر کے مذاق کے مطابق کتاب میں پیراگراف قائم کرنے اور ذیلی عنوانات لگانے کی بھی ضرورت تھی۔

جہاں تک پہلے کام کا تعلق ہے، میں اس کے لئے فرصت کا متلاشی رہا، لیکن جب یہ دیکھا کہ فرصت کی تلاش میں یہ کام ٹلتا جائے گا اور اس طرح ہو سکتا ہے کہ اصل کتاب کی طباعت ہی میں غیر معمولی تاخیر ہو جائے، تو والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہم العالی نے حکم دیا کہ اب تسہیل وتشریح کے انتظار میں کتاب کی طباعت کو مؤخر نہ کیا جائے، کتاب ایک مرتبہ وجود میں آ گئی تو انشاء اللہ اس پر اس نوعیت کے کام ہوتے رہیں گے۔ چنانچہ اس کام سے صرف نظر کر کے احقر نے صرف دوسرے کام پر اکتفا کرنے کو مناسب سمجھا، اور اس کے لئے برادر عزیز مولوی محمد علی صاحب کو (جو آج کل جامعہ تعلیمات اسلامیہ لائلپور میں نظامت کے فرائض انجام دے رہے ہیں) کتاب حوالہ کر دی۔ انہوں نے پوری کتاب کو نقل کر کے اس کے بڑے حصے پر پیراگراف قائم کئے۔ عنوانات لگائے اور بعض مقامات پر مختصر تشریحی حواشی کا اضافہ کیا، پھر وہ اپنی بعض مصروفیات کی بناء پر کام کی تکمیل نہ کر سکے تو میں نے برادر عزیز مولوی عبدالغفار ارکانی صاحب (فاضل دارالعلوم کراچی) سے اس کام کی تکمیل کرائی، چنانچہ کتاب کا نصف سے زائد حصہ انہوں نے ہی نبٹایا۔ اللہ تعالیٰ ان دونوں صاحبان کو جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین۔

بہرکیف ! اب اس کتاب کا پہلا حصّہ آپ کے سامنے ہے، انشاء اللہ دوسرا حصّہ بھی جلد از جلد پیش کرنے کی کوشش کی جائے گی، اگرچہ تسہیل و تشریح کا کام اس مرتبہ نہیں ہو سکا، لیکن امید ہے کہ انشاء اللہ کتاب کے بیشتر مباحث عام اردو خواں حضرات پوری طرح سمجھ سکیں گے۔ جہاں دشواری محسوس ہو وہاں کسی اہل علم سے سمجھ لیا جائے۔ وما توفیقی الا باللہ۔

احقر
محمد تقی عثمانی
مدیر: ماہنامہ البلاغ
دار العلوم کراچی ۱۴

فہرست مضامین

مسلمان کیوں بدل گئے

بسم اللہ الرحمن الرحیم

اُمتی من حیث ھو امتی کے اعتبار سے دینوی انقلاب تو مطمع نظر ہو نہیں سکتا، گو اس سے بحث کرنے کو بھی میں بیکار نہیں سمجھتا، مگر حیثیت مذکورہ سے یہ بحث مقصود نہیں، بلکہ انقلاب دینی سے بحث مقصود ہے۔ اسی کے نسبت اس وقت عرض کرنا چاہتا ہوں۔

افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے! کہ جس مرتبہ کا انقلاب عظیم اکثر آحاد امت میں واقع ہوا ہے اس کو دیکھتے ہوئے بے اختیار یہ زبان پہ آتا ہے ؎

اے بسرا پردۂ یثرب بخواب

ترجمہ:۔ اے وہ ذات! جو مدینہ میں محو خواب ہے۔

خیز کہ شد مشرق و مغرب خراب

ترجمہ:۔ اٹھیئے!! کہ مشرق و مغرب برباد ہوگئے۔

س انقلاب کا اس سے اندازہ ہو سکتا ہے۔ کہ ہاتھ میں ایک کتاب تفاصیل احکام شرعیہ کی لے لیجئے اور ایک نظر سے ایک ایک حکم جزئی کو دیکھتے جائیے، اور ایک نظر سے کسی غیر مطیع اُمتی

کی ایک ایک حالت کو جو اس جزئی کا محل اور متعلق ہے۔ دیکھتے جائیے، اور دونوں کو ملاتے جائیے، تو ایک حیرت عظیم ہوگی، کہ ــــ یا اللہ! ان حالتوں کے مرتکب کو کیا اِن احکام سے کچھ مس معلوم ہوتا ہے ــــ ؟

دین کے یہ اجزاء ہیں:۔

(۱) عقائد ـــ (۲) دیانات (مثل نماز، روزہ، طلاق، نکاح وغیرہ) ـــ (۳) معاملات (مثل۔ بیع و شراء وغیرہ) ـــ (۴) معاشرات (مثل طعام، لباس، کلام و سلام وغیرہ) (۵) اخلاق باطنہ (مثل ریاء اخلاص وکبر و تواضع وغیرہ)

عقائد میں مسلمانوں نے غنیمت ہے "انکار کا انقلاب" نہیں پیدا کیا، گو اُن میں تدیُّن کے رنگ میں کچھ تغیر و تبدل ہوا۔ جس سے وہ حد بدعت میں داخل ہو گئے، اور جس نے اہل باطل کو اسی تغیر کی اصلاح کے سبب سے اہل حق کا مخالف بنا دیا۔ غرضکہ نصوص کا انکار نہیں کیا گیا۔ البتہ تاویل باطل کی گئی ــــ یہ حالت عام مسلمانوں کی ہے۔!!

متجددین میں انکار کا انقلاب

مگر خاص خاص جدید تعلیم یافتوں نے "انکار کا انقلاب" بھی اختیار کیا، بلکہ انکار سے متجاوز ہو کر جمہور کے عقائد کے ساتھ استہزاء اور تمسخر سے پیش آنے لگے، جس پر حافظانِ حدود دین نے کفر کا فتویٰ لگایا۔ اور اس فتویٰ کی بدولت دوسری طرف سے ان کو "متعصب" کا لقب عطا ہوا۔ گو جو شخص کفر کی حقیقت سمجھے گا، وہ ان علماء کو اس فتویٰ میں نہ صرف معذور بلکہ خود بھی اس میں ان کے ساتھ بالاضطرار اتفاق کرے گا ــــ یہ تو پہلے جزو کے انقلاب کی کیفیت تھی۔

رہا دوسرا جزو ــــ دیانات ــــ اس میں عام مسلمانوں نے درجۂ بدعت کا بھی تغیر و تبدل نہیں کیا، مگر "ترک و اہمال کا انقلاب" البتہ اختیار کیا، کہ کسی نے نماز و روزہ کو اس طرح خیرباد کہا، گویا اس کے ذمہ فرض ہی نہیں، کسی نے نکاح و طلاق کے ساتھ یہ ہی معاملہ کیا کہ عقیدے میں تو یہ ہی سمجھا کہ مسائل نکاح و طلاق دین میں داخل ہیں۔ ہماری رائے و اختیار پر نہیں ہیں اسی طرح جس طرح علمائے دین بتلاتے ہیں۔

اسی لئے احکام دین کے مقابلہ میں ــــ اور احکام مخترع نہیں کئے گئے ــــ مگر عمل

اس کے ساتھ یہ رکھا کہ جہاں نفس کا غلبہ ہوا، وہاں تمتع کے لئے نکاح کا بھی انتظام نہیں کیا، جہاں کوئی دنیوی ننگ و ناموس کے باقی رکھنے میں مصلحت دنیوی دیکھی، وہاں باوجود طلاق کے بدستور بیوی کو گھر میں رکھا، اور اس سے متمتع ہوتے اور بچے جنواتے رہے۔ اور خاص خاص جدید تعلیم یافتوں کو تو یہاں بھی انکار میں تردد نہیں ہوا۔

بہرحال عام مسلمانوں میں، جزو اوّل میں انقلاب تغیر ہوا تھا، اور یہاں جزو ثانی میں انقلاب ترک و اہمال ہوا ہے۔

معاملات، معاشرات اور اخلاق اجزائے دین ہیں۔

اب رہ گئے بقیہ اجزائے ثلثہ ــــ معاملات ــــ معاشرات ــــ اخلاق ــــ ان تینوں میں مذکورہ "انقلابوں" سے بڑھکر انقلاب ہوا ہے۔ یعنی عام مسلمانوں نے بھی اپنی بے خبری سے اُن کو جزو دین نہیں سمجھا، بلکہ دنیوی کارروائی سمجھ کر اس کے دستور العمل کو اپنی رائے و اختیار پر مُفَوَّض سمجھا، اور چونکہ اغراض فاسدہ تھیں اور رائے میں زیغ تھا اس لئے اس کا ثمرہ یہ ہوا کہ ہر ہر حکم شرعی کے مقابلے ایک ایک کارروائی اور ایک ایک رسم اور ایک ایک عادت اختراع کی اور اس مجموعہ کو اپنا دستور العمل قرار دیا اور اس قرار داد میں ذرا بھی اپنے کو قصوروار یا خطاکار نہیں سمجھا، بلکہ بعض امور کو الٹا ہنر اور فخر سمجھا۔ اس طرح سے کہ مجموعی حالت کے دیکھنے والے کو یہ گمان ہوتا ہے کہ جیسے کسی نے قصداً ہر ہر حکم رحمانی کے مقابلے میں ایک ایک حکم نفسانی مستحسن سمجھکر ایجاد کیا ہو۔

اور استحسان کی یہ علامت ہے کہ ان امور میں احکام حَقّہ کے داعی سے سخت مزاحمت کی جاتی ہے ــــ سو درحقیقت یہ انقلاب بہت ہی بڑا انقلاب ہوا ــــ کیونکہ اوّل کے دو انقلابوں میں اجزائے دین کو، دین سے خارج نہیں کیا گیا تھا اور ان اجزاء کے مقابلہ میں دوسرے امور کو من حیث الاستحسان تجویز کیا گیا تھا گو ایک جگہ تغیر وہ بھی من حیث التدین، اور دوسری جگہ ترک، وہ باعتقاد تقصیر واقع ہوا تھا، اور ان تینوں میں اجزائے دین کو، دین سے خارج کر دیا گیا اور بجائے ان اجزاء کے دوسرے احکام اختراع کئے گئے، اور اُن مخترعات کو اصل پر ترجیح دی گئی تو ظاہر ہے کہ یہ انقلاب اجزائے ثلثہ اخیرہ کا ان انقلابین اولین سے بدرجہا بڑھا ہوا ہے اور وقوع میں اظہر اور اکثر یہی اجزائے ثلثہ اخیرہ ہیں۔

کیوں کہ "عقائد" کا حصّہ گو الزام ہے مگر اظہر نہیں۔ اور "دیانات" کا حصّہ خاص خاص اوقات میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس وقوع میں اکثر نہ ہوا۔ اور یہ ثلٰثۃ اخیرہ اظہر بھی ہیں، اکثر بھی ہیں اور ان ہی میں یہ انقلاب عظیم واقع ہے۔

مسلمانوں سے اپیل

پس اس بناء پر دیکھنے والوں کو اکثر احاد امت میں بر وقت یہ انقلاب عظیم ہی نظر آوے گا، تو جو شخص بروقت انقلاب عظیم دیکھے اور پھر یہ دعویٰ بھی سنے کہ "انا امتی لمحمد"، تو وہ سخت تحیر میں واقع ہو جاوے گا، کہ یا اللہ! یہ شخص کس امر میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے موافق ہے، جو ایسا دعویٰ کرتا ہے؟

مسلمانو! اب بھی اپنی حالت پر آپ کو تنبیہ ہوا؟ اگر نہیں ہوا تو انا للہ!! اگر ہوا ہے، تو کیا اس کی اصلاح ضروری نہیں ہے؟ اگر ہے، تو کب اصلاح شروع ہوگی؟ کیا ان میں سے کسی چیز کا انتظار ہے؟ ـــــ شغل مانع ـــــ مرض معطل ـــ موت ـــــ یا وحی جدید، سو اس کی تو امید نہیں، فبای حدیث بعدہٗ یومنون (اس کے بعد کون سی بات پر ایمان لاؤ گے) اور امور بالا کا واقع ہونا مستبعد نہیں، بلکہ موت تو متیقن ہے مگر کیا اس وقت کچھ کر سکو گے؟؟

مسلمانو! جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، اسی انقلاب کی، جس کا اس زمانہ میں وقوع ہو رہا ہے بطور پیشن گوئی کے خبر دی تھی، الناس کابل مائۃ لاتجد فیھا راحلۃ (عوام سواونٹوں جیسے ہیں تم ان میں ایک بھی سواری کے لائق نہیں پاؤ گے) ورنہ وہ زمانہ تو خیریت کا تھا واللہ اعلم وھو الموافق۔

طریق اِصلاح اِنقلاب

جاننا چاہیئے کہ یہ "انقلاب" ایک روحانی مرض ہے اور جس طرح جسمانی امراض کے خاص اسباب ہوتے ہیں اور ان کی اصلاح و معالجہ ان اسباب کے ازالہ سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اس مرض روحانی (انقلاب) کے بھی خاص اسباب ہیں اور ان کا ازالہ ہی اس کے معالجہ و اصلاح کا طریق ہے۔ اب اسباب کی تشخیص اور ان کے ازالہ کی تدبیر، بس یہ ہی دو امر مرجع اہتمام قرار پائے۔

امر اول:۔ یعنی "تشخیص اسباب انقلاب" اس میں تامل و تدبر و تتبع کرنے سے معظم اسباب دو امر ثابت ہوئے۔

(۱) ایک قلّت علم یعنی ناواقفی و بے خبری۔

(۲) دوسرا ضعف ہمت، یعنی قصد و ارادہ کی کمی یا فقدان

سبب اوّل سے خود احکام ضروریہ و واقعیہ ہی مخفی رہے ہیں۔ اور سبب ثانی سے باوجود خبر اور آگاہی کے نوبت، عمل کی نہیں آتی۔

امر ثالث :۔ یعنی "ان اسباب کے ازالہ کی تدبیر" اور یہ ہی بڑا امر ہے۔ جس کے لئے توجہ تام و قوت متفقہ کی سخت احتیاج ہے۔

سو دونوں سببوں میں سے ہر ایک کے ازالہ کی تدبیر جدا ہے۔ پس بے خبری کے ازالہ میں تو معلم اور متعلم یعنی خواص، علماء احکام اور عوام و طالبان احکام دونوں کو دخل ہے۔ اور ہر ایک کے لئے جداگانہ ضروری دستور العمل ہے۔

مردوں کا دستور العمل

طالبان احکام کا دستور العمل یہ ہے کہ ان میں جو زیادہ فارغ ہیں۔ جیسے اہل تنعم و اہل ثروت، وہ اپنی اولاد کو علوم دینیہ کے لئے فارغ کردیں۔ گو ضروریات دنیاوی کے لئے لسان ملک و فنون رائجہ کی بھی تحصیل کا مضائقہ نہیں، مگر یہ درجہ تبعیت سے متجاوز نہ ہونے پاویں۔ پس اولاد تو یوں درست ہوئی۔ اور خود کوئی وقت معین کرکے کسی عالم یا کامل الاستعداد طالب علم کے پاس جاکر یا اس کو بلاکر، اگر علوم عربیہ سے مناسبت ہو تو وہ زیادہ بصیرت کا آلہ ہے۔ ورنہ اردو ہی کے مفید اور ضروری رسائل کو کسی محقق کے مشورہ سے تجویز کرکے سبقاً سبقاً، بہتر تو یہ ہی ہے کہ دو تین بار، ورنہ اقل درجہ تحصیلاً ایک ہی بار پھر مطالعتہً چند بار ان پر عبور کرلیں۔ مگر یہ رسائل ایسے ہوں۔ جن میں سب اجزاء دین کافی بیان ہوں۔ عقائد ـــــ دیانات ـــــ معاملات ـــــ معاشرات ـــــ اخلاق باطنہ (جن کا ذکر اس سے پہلے مضمون میں بھی ہو چکا ہے)

اور جن کو معاش کی ضرورت سے زیادہ فراغ نہیں ہے اور ۳، ۴ حرف شناس ہیں یا با آسانی ہوسکتے ہیں وہ اپنے لئے بھی اور اپنی اولاد کے لئے بھی بجائے علوم عربیہ کے وہی رسائل دینیہ اردو کے بطور درس طالب علمانہ کے تجویز کرلیں اور پھر بطور ورد کے، ان کا بار بار مطالعہ کیا کریں۔ اور جب تک درس کا انتظام نہ ہوسکے، بطور خود ہی دو چار ورق روزانہ بالالتزام مطالعہ کرلیا کریں اور موقع خلجان

میں خود رائی سے کام نہ لیں۔ بلکہ نشان بنا کر چھوڑ دیں۔ اور ماہر کے میسر ہونے کے وقت اس کی تحقیق کر لیں۔

اور جو لوگ حرف شناس نہیں ہیں۔ اور نہ با آسانی ہو سکتے ہیں۔ اور نہ ہی اپنے بچوں کو کسی وجہ سے اس کام کے لئے فارغ کر سکتے ہیں۔ وہ ایسا انتظام کریں کہ ہفتہ میں، بہتر تو یہ ہے کہ روزانہ ایک ہی روز خاص مجلس علمی کے لئے بالالتزام مقرر کریں۔ اور کوئی عالم یا صحبت یافتہ اہل علم جو ان رسائل کو اچھی طرح سمجھا ہو، تجویز کریں۔ اور اگر کسی عالم سے تجویز کرالیں، زیادہ احتیاط ہے۔ اور اس روز سب لوگ کسی خاص مقام، مسجد وغیرہ میں جمع ہو کر اس خواندہ وفہمیدہ شخص کو لاکر ایک معین وقت تک (مثلاً ایک گھنٹہ یا آدھا گھنٹہ) ان رسائل کو سنا کریں، اور سمجھا کریں۔ اور اگر ایسا شخص مفت نہ ملے۔ تو اس کی کچھ مالی خدمت کریں۔ اور اس سنانے والے شخص کو جہاں شبہ رہے پنسل وغیرہ سے نشان بنا کر اس وقت اس کو رہنے دیں۔ پھر جب کوئی عالم میسر ہو۔ اس سے حل کریں۔ اور سب مجمع کو پہنچا دیں۔

اور جہاں دیہات وغیرہ میں ایسا شخص نہ ہو۔ تو آپس میں مشروع طریقہ سے چندہ کر کے، اس چندہ سے کوئی ایسا آدمی باہر سے بلا کر رکھ لیں۔ اور یہ طریقہ جاری کریں۔

اور یہ تمام طبقات مذکورین، علاوہ اس تحصیل یا مطالعہ یا سماع رسائل کے، دو امر کا اور بھی التزام رکھیں۔

(۱) ایک یہ کہ اپنے اعمال واحوال میں جب کوئی امر جس کا حکم معلوم نہ ہو۔ پیش آوے فوراً علماء حقانی سے اس کو دریافت کریں۔ اور اگر بوجہ بُعد کے زبانی نہ پوچھ سکیں۔ تو بذریعہ خط کے تحقیق کریں۔ اگر اوسط ایک مسئلہ روزانہ کے حساب سے تقریراً یا تحریراً پوچھ پاچھ رکھے تو سال بھر میں ساڑھے تین سو سے زائد، اور دس سال میں ساڑھے تین ہزار سے زیادہ مسئلے معلوم ہو سکتے ہیں۔ کہ بعض نام کے یا جدید عالموں کو بھی اتنے مسائل معلوم نہیں! اور کوئی بڑا مشکل کام نہیں ہے۔

(۲) دوسرے اس امر کا التزام رکھیں کہ علماء کی مجلس میں جایا کریں۔ خواہ خاص مجلس ہو جیسے جلسہ ملاقات وزیارت، خواہ عام مجلس ہو۔ جیسے جلسہ وعظ ونصیحت، اور جو سنیں دل سے

یاد رکھیں۔ یہ تو مردوں کا انتظام ہوا۔

عورتوں کا دستور العمل

اب عورتیں رہ گئیں، سو یہ مجموعی انتظام مذکورہ ان کے لئے اشکال سے خالی نہیں، اس لئے سہل تر ان کے لئے یہ طریق ہے کہ اگر معلمہ عفیفہ، دین دار مل جاوے، تو کمسن لڑکیوں کو اس کے ذریعہ سے قرآن مجید اور ایسے رسائل کی تعلیم دلاویں اور ان کے لئے "بہشتی زیور" کے دس حصہ بالکل انشاء اللہ تعالیٰ کافی ہیں بلکہ بانضمام گیارھویں حصہ مسمیٰ "بہشتی گوہر" کے مردوں کے لئے بھی کافی ہیں۔ اور اگر کوئی معلمہ ایسی نہ ملے یا کسی لڑکی کو فراغ یا مناسبت نہ ہو تو ان کو بھی بڑی عورتوں کے انتظام میں شامل سمجھا جائے اور وہ انتظام دو ہیں۔

ایک یہ کہ گھر کے مردوں میں سے اگر کوئی خواندہ ہو تو وہ روزانہ کچھ وقت معین کر کے سب گھر والیوں کو اس وقت جمع کر کے رسائل بالا سنایا کریں، سمجھایا کریں بلکہ کئی دورے کر دیں۔

دوسرا انتظام یہ ہے کہ گاہ گاہ کسی مُتَوَرِّع مُتَبِّع سنت عالم کا گھر میں وعظ کہلا دیا کریں، کہ یہ عجیب موثر عمل ہے۔ یہ سب دستور العمل، طالبان احکام کے متعلق ہے۔

علماء کا دستور العمل

اب علماء احکام کا دستور العمل باقی رہا۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ وہ وقتاً فوقتاً اس میں ساعی رہیں کہ ناواقفوں تک احکام پہنچائیں اور اس کی یہ صورتیں ہیں۔

(۱) درس (گو بعوض ہو) اس میں علوم ضروریہ کو مقدم اور مُہتم بالشان رکھیں۔ دینیات سے حتی الامکان طالب علم کو پہلے فارغ کر دیں۔ اگر طالب علم دینی مختصرات یا اردو کے رسائل بھی پڑھے۔ اور اپنے پاس وقت ہو۔ تو ہرگز اس کے درس کو خلاف شان نہ سمجھے۔ طالب علم کے فضول سوال پر اس کو متنبہ کرے، جواب نہ دے۔

(۲) دوسری صورت وعظ ہے۔ جس میں خطاب عام ہے۔ اس میں ضرورت وقت کا لحاظ رکھیں۔ جن امور میں لوگ اس زمانہ میں مبتلا ہوں، یا جن ضروریات میں فرو گذاشت کرتے ہوں۔ مدار بیان، اس پر رکھے۔ دوسرے مضامین اگر ہوں، تو بالتبع اور بقِلّت ہوں۔ اور یہ ضروری مضامین جمیع ابواب کے ہوں۔ صرف عقائد و دیانات پر اقتصار نہ کرے بلکہ معاملات و

معاشرات واخلاق سے بھی مشبع بحث کرے بلکہ بوجہ متروک ہونے کے یہ ثلثۂ اخیرہ زیادہ اہم ہو گئے ہیں۔ اور وعظ میں بات صاف کہے کہ سننے والوں کی سمجھ میں خوب آجاوے۔ مگر خشونت اور اشتعال انگیز طرز سے بچے۔ اور وعظ پر عوض نہ لے۔ البتہ اگر وعظ کا نوکر ہو، وہ اور بات ہے۔

(۳) تیسری صورت جواب ہے، استفتار کا خواہ زبانی سوال ہو، یا تحریری ہو۔ اس میں ان امور کا لحاظ رکھے۔

(۱) حتی الامکان جواب میں توقف نہ کرے۔

(۲) لایعنی سوال کا جواب نہ دے، بلکہ سائل کو متنبہ کردے۔

(۳) اگر سوال محتمل دوصورتوں کو ہو تو تشقیق سے جواب نہ دے۔ کیونکہ بعض اوقات سائل دونوں شقوں کا حکم سن کر ایک شق کو اپنے مفید مطلب سمجھ کر سوال میں اسی کا دعویٰ کرنے لگتا ہے جس کی وجہ سے سائل کا یا اس کے مقابل کا ضرر دینی یا دنیوی ہو جاتا ہے۔

(۴) عامی کو دلیل تبلانے کا التزام نہ کرے کہ اکثر اس کے فہم سے خارج ہوگی۔

(۵) ہاں! دوسرے علمار مصححین کی سہولت کے لئے اگر دلیل کی طرف اشارہ کردے یا کوئی عبارت بلاترجمہ نقل کردے، مستحسن ہے۔

(۶) اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سائل غائب، اس تحریری جواب کو اچھی طرح نہ سمجھے گا۔ یا سمجھنے میں غلطی کرے گا جواب لکھکر لکھدے کہ کسی عالم سے اس جواب کو زبانی حل کرے۔

(۷) اگر قرائن سے معلوم ہو کہ سوال برائے تعنّت ہے، جواب نہ دے۔ غرض اہل سے دریغ نہ کرے، نااہل کو منہ نہ لگاوے۔

(۴) چوتھی صورت تالیف وتصنیف ہے۔ خواہ اشتہار ہو، یا اخبار ہو یا رسالہ وکتاب ہو۔ اس میں بھی ضرورت وقت کا لحاظ اور عبارت میں سلامت اور کفایت کی رعایت ہو۔ اور اگر اللہ تعالیٰ معاش کی کوئی صورت اور سبیل عطا فرما دے تو اپنی تصانیف کی خود تجارت نہ کرے۔

یہاں تک بیان تھا، بے خبری کے ازالہ کی تدبیروں کا، آگے بیان ہے، ضعف ہمت کی ازالہ کی تدبیر کا۔

ضعف ہمت کی ازالہ کی تدبیر؟ صحبت شیوخ کاملین۔

تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ امور ذیل کو تقویت ہمت میں خاص اثر اور دخل ہے۔

ایک ان میں سے صحبت شیوخ کاملین کی ہے۔ جن کی یہ علامتیں ہیں۔

(۱) بقدر ضرورت علم دین رکھتا ہو۔

(۲) عقائد و اعمال و اخلاق میں شرع کا پابند ہو۔

(۳) دنیا کی حرص نہ رکھتا ہو۔

(۴) کمال کا دعویٰ نہ کرتا ہو، یہ بھی شعبہ دنیا ہے۔

(۵) کسی شیخ کامل کی صحبت میں چندے رہا ہو۔

(۶) اس زمانے کے منصف علماء و مشائخ اس کو اچھا سمجھتے ہوں۔

(۷) بہ نسبت عوام کے خواص یعنی فہیم، دین دار لوگ اس کی طرف زیادہ مائل ہوں۔

(۸) اس سے جو لوگ بیعت ہیں، ان میں اکثر کی حالت باعتبار اتباع شرع و قلت حرص دنیا کے اچھی ہو۔ وہ شیخ تعلیم و تلقین میں اپنے مریدوں کے حال پر شفقت رکھتا ہو۔ اور ان کی کوئی بری بات دیکھے یا سنے تو ان کو روک ٹوک کرتا ہو۔ یہ نہ ہو، کہ ہر ایک کو اس کی مرضی پر چھوڑ دے اس کی صحبت میں چند بار بیٹھنے سے دنیا کی محبت میں کمی اور حق تعالیٰ کی محبت میں ترقی محسوس ہوتی ہو۔

(۹) خود بھی وہ ذاکر شاغل ہو۔ اس لئے کہ بدون عمل یا عزم عمل، تعلیم میں برکت نہیں ہوتی۔ اور صدور کشف و کرامت استجابت دعا و تصرفات لوازم شیخت سے نہیں۔

غرض ایسے حضرات کی صحبت، خاص طور پر مؤثر ہے۔ مگر اس صحبت کی تاثیر میں شرط یہ ہے کہ اس میں نیت بھی یہ ہی ہو کہ میرے قلب میں رغبت طاعت اور نفرت معاصی پیدا ہو۔ اور اس کے ساتھ اس کا بھی التزام رہے کہ اپنی کیفیات قلبیہ کی شیخ کو اطلاع دیکر جو معالجہ تجویز فرمایا جائے اس پر کاربند ہو۔

دوسرا امر، ان میں سے بوقت میسر نہ آنے صحبت کاملین کے اہل اللہ کے، حالات کا مطالعہ یا استماع ہے مگر ان سے مقالات متعلقہ اسرار مسائل غامضہ تصوف ہیں۔

ان میں ہرگز مشغول نہ ہو۔ البتہ علوم معاملہ یعنی تربیت باطن وتہذیب نفس کے بارہ میں جو کچھ ان کے اقوال ہیں۔ وہ سرتاپا عمل درآمد بنانے کے قابل ہیں۔

تیسرا امر، ان میں سے مراقبہ موت ومابعد الموت ہے۔ مراد اس سے ابتدار نزع روح سے دخول جنت یا نار تک جو احوال پیش آنے والے ہیں۔ مثلاً سوال نکرین وعذاب ونعیم قبر وحشر ووزن اعمال وحساب وجزاء وعبور صراط وغیرہ۔ سب کو کسی وقت فراغ میں بالالتزام روزانہ کم ازکم بیس منٹ سوچا کرے تقویت ہمت میں جن ملکات کو دخل ہے۔ اس مراقبہ سے ان کا کمال پیدا ہو جاوے گا۔ جیسے زہد وخشیت وامثالہا۔

پس یہاں پر بیان ختم ہو گیا۔ یعنی اسباب انقلاب کے ازالہ کی تدبیر کا، پس طریقہ اصلاح مکمل طور پر مشخص ہو گیا۔ وللہ الحمد۔

اور لطف یہ ہے کہ نہایت سہل اور ایسا عام اور تام کہ ادنیٰ توجہ سے تمام امت باسرع اوقات اپنی اصلاح کر سکتی ہے آگے نفع حاصل کرنے والوں کی توفیق ہے ؎

ما نصیحت بجائے خود کردیم — روزگارے درین بسر بردیم

ترجمہ: ہم نے اپنی جگہ یہ نصیحت کردی — ترجمہ: کتنا عرصہ اس میں صرف کیا

گر نیاید بگوش رغبت کس — بر رسولاں بلاغ باشد وبس

ترجمہ: اگر ہماری یہ نصیحت کسی کو پسند نہ آئے — ترجمہ: تو سمجھ جان لو کہ ایلچی پر صرف پہنچانا ہے اور بس

(تذییل)

علماء احکام کے دستور العمل کا متمم ایک اور امر بھی ہے۔ یعنی امر بالمعروف ونہی عن المنکر اور اس میں بعض مواقع پر غیر علماء بھی شریک ہیں۔ یعنی خاص لپنے ان متعلقین پر احتساب کرنا جن پر قدرت ہے۔ علماء کے ساتھ مخصوص نہیں۔ البتہ عام احتساب، یہ خاص ہے علماء کے ساتھ اور عوام کی تصدی اس کے لئے اکثر موجب فتنہ وعداوت ہو جاتی ہے نیز عوام اکثر احتساب کی حدود بھی نہیں جانتے۔ اس سے غلو فی الدین کی نوبت آجاتی ہے۔ نیز اکثر عوام نفس کو مہذب کئے ہوئے نہیں ہوتے۔ اور ان کے احتساب میں بکثرت

نفسانیت ہوتی ہے۔

اس معنی کے افادہ کے لیے بعض مفسرین نے وَلْتَكُن مِّنكُمْ میں مِن کو تبعضیہ کہا ہے۔ اور یہ امر بالمعروف ونہی عن المنکر کہیں واجب ہوتا ہے، جہاں فاعل بے خبر ہو یا فاعل پر پوری قدرت ہو۔ یا قبول کی پوری توقع ہو، ورنہ مستحب ہے۔

منجملہ اس کے آداب کے یہ ہے کہ اول خلوت میں کہے اور نرمی سے کہے اس کے بعد اگر مصلحت ہو، علانیہ کہے اور سختی سے کہے ورنہ اعراض کرے اور دعا کرے۔

منجملہ اس امر بالمعروف ونہی عن المنکر کے کفار کی تبلیغ بھی ہے۔ خواہ بذریعہ تقریر خواہ بذریعہ تحریر اپنے ملک کے کفار کو بھی اور دوسرے ملک کے کفار کو بھی اور یہ بوجہ عموم شیوع احکام دینیہ کے گو اس وقت واجب نہیں رہا لیکن اگر کوئی ہمت کرے عین عزیمت ہے اور اس غرض کی تحصیل وتکمیل کے لیے اگر ان اقوام کی زبان بھی سیکھ لے تو بشرط خلوص نیت عین طاعت ہے جیسا اس وقت کوئی شخص انگریزی وغیرہ اسی غرض سے حاصل کرنا چاہیئے۔

تکمیل

تبلیغ احکام کے متعلقات ہی میں سے ان احکام کی ایک خاص حفاظت بھی ہے۔ یعنی اصول و فروع اسلام پر جو حملے یا آمیزشیں ہیں خواہ وہ اہل کفر ہوں یا اہل بدعت، ان کو دفع کرنا...... تاکہ طالبان حق شبہات سے محفوظ رہیں۔ اور اس مقصود کے لیے اگر اہل باطل پر ردّ وقدح کرنے کی حاجت ہو، یا ان سے مناظرہ کرنا مصلحت ہو، اس سے بھی پہلوتہی نہ کرے۔ اور اس زمانہ پر آشوب میں مناظرہ اگر مشروع ہے تو اسی غرض سے ورنہ تعصب اس درجہ ترقی پر ہے کہ مناظرہ سے احقاق حق، مقصود ہی نہیں رہا۔ اور اس ردّ وقدح یا مناظرہ کے لئے اگر اہل باطل کے علوم وفنون حاصل کرنا ضروری ہو۔ وہ بھی طاعت ہے۔ جیسے اس وقت سائنس وغیرہ سیکھنا۔

یہاں تک تدبیریں ہیں اصلاح کی اور اس کے بعد بھی بڑی ضرورت دعا والتجا بجناب حق ہے ؎

این ہمہ گفتیم ولیک اندر پسیچ
بے عنایات خدا ہیچم وہیچ

ترجمہ: ہم نے سب کہدیا، لیکن حقیقت میں بات یہ ہے
ترجمہ: کہ حق تعالیٰ کی عنایتوں اور بندگان حق

بے عنایات حق و خاصان حق　　گر ملک باشد سیہ ہستش ورق

ترجمہ: حق کی مہربانیوں کے بغیر اگر کوئی　　ترجمہ: فرشتہ بھی ہو تو اس کا اعمال نامہ بھی سیاہ ہوگا

سدِّ موانعِ اصلاحِ انقلاب

اس سے سابق انقلاب امت کی اصلاح کی تدبیر کی تعیین و تفصیل مذکور تھی چونکہ ہر تدبیر پر عمل کرنے کے لئے، ساتھ اس کے موانع تاثیر سے تحرز بھی واجب ہوتا ہے۔ جس طرح امراض جسمانی میں پرہیز کی ضرورت سمجھی جاتی ہے۔ اس لئے ان تدابیر اصلاح کے ساتھ ان امور سے بچنا بھی ضروری ہوگا جو ان کے اثر میں خلل انداز ہیں۔

بیان اس کا یہ ہے کہ ان تدابیر میں سے بعض علماء کے متعلق تھیں۔ یہاں ان کے باب میں کلام مقصود نہیں۔ کیونکہ وہ خود جانتے ہیں۔ صرف ان میں جو عوام کے متعلق ہیں۔ ان پر بقدر ضرورت لکھا جاتا ہے۔ سو اس باب میں یہ امور بتلائے گئے تھے۔

(۱) کتب دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا،

(۲) علماء دین سے مسئلہ پوچھنا،

(۳) وعظ سننا۔

(۴) صحبت اہل کمال

(۵) گھر والوں کو خود پڑھانا یا سنانا یا کسی کے ذریعہ سے پڑھوانا، سنوانا،

ان امور پنجگانہ میں سے ہر ایک میں بعض لوگ بے احتیاطیاں کرتے ہیں۔ جو معالجہ مطلوب میں بد پرہیزی کا حکم رکھتی ہیں۔ بالترتیب ہر ایک کے متعلق مختصراً تنبیہ ضروری ہے۔

امرِ اوّل یعنی کتبِ دینیہ کا پڑھنا یا دیکھنا یا سننا

اس کے متعلق آج کل بعض بکثرت یہ غلطی کرتے ہیں کہ جو کتاب دین کے نام سے دیکھی یا سنی خواہ اس کا مضمون حق ہو یا باطل خواہ اس کا مصنف ہندو ہو یا عیسائی یا دہری ہو یا مسلمان پھر مسلمان بھی گو صاحب بدعت ہی ہو ـــــ غرض کچھ تفتیش نہیں کرتے اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔

اور اسی میں وہ مضامین آگئے جو کسی مسئلہ کے متعلق اخبارات میں چھپتے رہتے ہیں۔ سو اس میں چند مضرتیں ہیں۔

بعض اوقات بوجہ کم علمی کے یہ ہی امتیاز نہیں ہوتا کہ ان میں کون مضمون صحیح ہے؟ کون غلط؟ کسی غلط کو صحیح سمجھ کر، عقیدہ یا، عمل میں خرابی کر بیٹھتے ہیں۔ بعض اوقات پہلے سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ امر غلط ہے مگر بعض مصنفین کا طرز بیان ایسا تلبیس آمیز یا دل آویز ہوتا ہے کہ دیکھنے والا فی الفور اس سے متاثر ہو جاتا ہے اور اس کے مقابلہ میں اپنے پہلے اعتقاد کو ضعیف اور بے وقعت خیال کر کے بعض دفعہ تو اس پہلے کو غلط اور اس پچھلے کو صحیح سمجھ لیتا ہے۔ اور بعض دفعہ اس کو گو قبول نہیں مگر متزلزل و مذبذب ہو کر کبھی دل میں دکھتا ہے۔ اور پریشان ہوتا ہے اور کبھی دوسروں سے تحقیق کرنا چاہتا ہے مگر چونکہ اس میں کچھ غموض ہوتا ہے جس کے ادراک کے لئے اس کا علم و ذہن کافی نہیں ہوتا، اس لئے سمجھ میں نہیں آتا اور بے سمجھے لایعنی سوال کر کے دوسروں کو پریشان کرتا ہے۔ اور اپنے فہم کا قصور فہم میں نہیں آتا۔ اور جواب دینے والوں کو جواب سے عاجز سمجھ کر ان کے علم یا اخلاق میں تنگی کا حکم لگا کر ان سے بدگمان ہو جاتا ہے اور بھی انواع مفاسد پیدا ہو جاتے ہیں۔

عالم دین کی ضرورت

ان سب کا انسداد یہ ہے کہ کوئی کتاب کوئی رسالہ کوئی تقریر تاوقتیکہ کسی محقق عالم کو نہ دکھلائیں۔ اور اس سے رائے نہ لیں، ہرگز نہ دیکھیں۔

اخبارات کے بعض مفاسد اس قسم کے احقر نے ایک مستقل تحریر مسمٰی بہ "اخبار بینی" میں ایک زمانہ میں لکھے تھے۔ جس پر بلا تدبر بعض معترضین نے غل مچایا مگر وہ تحریر بغور پڑھنے کے قابل ہے اُس سے یا اِس سے یہ ہرگز مقصود نہیں کہ کسی اخبار یا کسی کتاب کا مطالعہ ہر حالت میں حرام ہے!

مقصود صرف یہ ہے کہ چونکہ ان چیزوں میں بعض اوقات ایسے مفاسد ہوتے ہیں اور ان مفاسد سے بچنا ملت اسلامیہ میں واجب ہے اور بچنا بدون معرفت یعنی عالم محقق سے مشورہ لے کر اس کا اتباع ضروری ہوگا۔ افسوس ہے! کہ باوجود وضوح اس امر کے پھر اس ممانعت کو تنگ خیالی و تعصب پر محمول فرمایا جاتا ہے۔ کیا کوئی خیرخواہ باپ اپنے بچے کو زہر ملی ہوئی مٹھائی کے کھانے سے روکے کوئی عاقل، اس باپ کو متعصب یا تنگ خیال کا لقب دے گا؟ یا غایت رافت کے ساتھ اس کو متصف

کہے گا ؟ —— اور اگر کوئی کہے کہ ہم خذ ما صفا ودع ماکدر - ترجمہ (اچھی چیز کو لے لو اور بری چیز کو چھوڑ دو) کے طور پر اس کو دیکھتے ہیں۔

سو اس کا جواب، اوپر کی تقریر سے واضح ہوگیا ہے کہ اس امتیاز کے لئے علم کامل وفہم وافی کی حاجت ہے اور کلام اس کے فاقد[ف] میں ہے۔ رہا کسی کا اپنے کو فاقد نہ سمجھنا، یہ معتبر نہیں۔ بلکہ کسی عالم ماہر کا کسی کو فاقد کہنا۔ اس کے اثبات کے لئے کافی ہے۔

توارت کے مطالعہ سے ممانعت۔

اور یہ ہی وجہ ہے کہ جناب رسول کریم ونبی حکیم علیہ صلوۃ اللہ تعالیٰ والتسلیم نے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ جیسے راسخ العلم والعمل شخص کو —— تورات کے مطالعہ سے منع فرمایا۔ باوجودیکہ وہ فی نفسہٖ آسمانی کتاب تھی۔ گو اس میں تحریف بھی ہو گئی تھی اور پھر مطالعہ بھی تنہا نہ تھا بلکہ خود ...... حضور پُر نور صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا رہے تھے۔ اور اس میں جز محرف کا معین ومبین ہو جانا ظاہر تھا۔ اس کے بعد کسی فساد کے ترتب کا احتمال ہی نہ تھا مع ہذا پھر اس مصلحت سے کہ آئندہ کو یہ عمل ان مفاسد کے باب، مفتوح ہونے کا سبب نہ بن جائے کس سختی سے منع فرمایا ؟ اور کیسی ناخوشی ظاہر فرمائی ! جیسا کہ حدیث دارمی میں مذکور ہے۔

ان دلائل حسیہ وحدیثیہ کے بعد امید ہے، کہ اہل انصاف، مصلحت اندیش کو، کوئی خدشہ نہ رہا ہوگا اور جبکہ اس تقریر سے وہ کتابیں وغیرہ بھی تحرز قرار پائیں۔ جن میں مصالح کے ساتھ بعض مفاسد بھی ہوں۔ سو جن میں سرتاسر مفاسد ہی ہوں، جیسے ناول وغیرہ، جن سے اعمال واخلاق کا بڑا حصہ نہایت گندہ ہو جاتا ہے۔ ان کا مطالعہ کس طرح جائز سمجھا جائے گا ؟ بالخصوص نوجوانوں اور عورتوں کو بلکہ اگر ایسی کتابیں گھر میں دیکھی جائیں، آگ میں جلا دینا چاہیئے۔ یہ ہی ان کا حق ادا کرنا ہے۔

مختصر نصاب

آب ذیل میں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ عام لوگوں کے لئے ایک مختصر نصاب، قابل مطالعہ کتب کا معین کر دیا جائے تاکہ ان میں مشغول رہ کر مخدوش کتب سے محفوظ رہیں۔

[ف] - اس جگہ فاقد سے مراد وہ شخص ہے جو کامل دینی سمجھ نہ رکھتا ہو ۱۲ - محمد علی عفرلہٗ

(۱) بہشتی زیور گیارہ حصے (۲) تعلیم الدین (۳) فروع الایمان (۴) جزاء الاعمال (۵) تبلیغ دین (۶) قصد السبیل (۷) شوق وطن ـــــ اگر اس سے زیادہ مطول و مفصل کی ضرورت ہو۔ کسی عالم محقق سے دریافت کر لیا جائے۔ تمام ہوا بیان امر اول کا۔

امر دوم یعنی علماء دین سے مسئلہ پوچھنا

اس میں چند غلطیاں کی جاتی ہیں۔

(۱) ایک یہ کہ کیف ما اتفق کسی سے مسئلہ پوچھ لیتے ہیں۔ بعض اوقات تو یہ بھی نہیں تحقیق کرتے کہ یہ شخص واقعی میں عالم بھی ہے یا نہیں؟ کسی کا نام ـــــ "مولوی" سن لیا اور اسی سے دین کی باتیں پوچھنے لگے اور بعض اوقات عالم ہونا معلوم ہوتا ہے مگر یہ نہیں دیکھتے کہ یہ کس مشرب کا؟ کس عقیدہ کا ہے۔ ایسے شخص کے جواب سے بعض اوقات تو عقیدہ یا عمل میں خرابی ہو جاتی ہے اور بعض اوقات تردد و شبہ میں پڑ کر پریشان ہوتا ہے یا پریشان کرتا ہے۔ جیسا کہ امر اول کے بیان میں گذر چکا ہے۔

(۲) دوسری غلطی یہ کی جاتی ہے کہ ایک مسئلہ کو کئی کئی جگہ پوچھتے ہیں اور بعض اوقات جواب مختلف ملتا ہے تو اس وقت یا تو تعین راجح میں پریشان ہوتے ہیں یا جس میں نفس کی مصلحت ہوتی ہے۔ اس پر عمل کرتے ہیں اور کبھی اس کی عادت ہو جاتی ہے تو استفتار سے یہی مقصود ہوتا ہے ـــــ کہ نفس موافق جواب ملے اور جب تک ایسا جواب نہیں ملتا، برابر اس کد و کاوش میں رہتا ہے اور ظاہر ہے کہ یہ وضع تدین سے بمراحل بعید ہے سراسر اتباع ہویٰ و تلعب فی الدین ہے

(۳) ایک تیسری غلطی، اس دوسری غلطی سے یہ پیدا ہوتی ہے کہ بعض اوقات ایک مجیب کا جواب دوسرے مجیب کے سامنے نقل کر دیا جاتا ہے۔ چونکہ بعض اوقات طبیعت کا رنگ خاص ہوتا ہے۔ بعض اوقات نقل کا لب و لہجہ کچھ معارضانہ ہوتا ہے اس لئے کبھی اس مجیب کی زبان سے دوسرے مجیب کی نسبت یا اس کے جواب کی نسبت کوئی نا ملائم لفظ نکل جاتا ہے پھر یہی ناقل یا دوسرا اس مجیب تک اس کو پہنچا دیتا ہے پھر وہ کچھ کہہ دیتا ہے اس کی خبر اس پہلے تک پہنچتی ہے۔ اور بعض دفعہ بلکہ اکثر ان منقولات میں بھی بہت کچھ لفظی یا معنوی تغیر و تبدل کر دیا جاتا ہے۔ اور اس طور

پر باہم ایک فسادِ عظیم ان میں برپا ہو جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ ہے کہ غیر ضروری مسئلے پوچھے جاتے ہیں۔

ایک غلطی یہ ہے کہ مسائل کے دلائل دریافت کئے جاتے ہیں جن کے سمجھنے کے لئے علوم درسیہ کی حاجت ہے اور چونکہ مسائل کو وہ حاصل نہیں اس لئے دلیل کو سمجھتا نہیں اور اگر اسی خیال سے کوئی مجیب دلیل بتلانے سے انکار کرتا ہے تو اس مجیب غریب کو بد خلقی پر محمول کیا جاتا ہے۔

ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ کسی سے کسی مسئلہ میں مباحثہ شروع کرتے ہیں۔ پھر اپنی تائید کے لئے فتویٰ حاصل کرتے ہیں اور وہ فتویٰ اپنے مخالف کو دکھلا کر اس پر احتجاج کرتے ہیں پھر وہ اپنے موافق فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کرتا ہے اس طرح خواہ مخواہ باہم جنگ وجدل کیا کرتے ہیں۔ حالانکہ عوام کو اس میں پڑنا موجب خطر ہے۔ اگر ان سے کوئی اہل باطل اُلجھے تو علماء کا حوالہ دیکر اس کو قطع کر دیا جائے۔ اگر غرض ہوگی آپ پوچھے گا۔

غلطیوں کی اِصلاح کا طریق

ان سب غلطیوں کی اصلاح اس سے ہو سکتی ہے کہ اپنا دستور العمل اس باب میں یہ رکھیں کہ جب کوئی ضروری بات پیش آوے، اپنے عمل کرنے کے لئے نہ کہ مباحثہ کے لئے، ایسے شخص سے مسئلہ پوچھیں جس کا معتبر و محقق ہونا صحیح ذریعہ سے پہلے معلوم ہو۔ اور اس پر اعتماد و اعتقاد بھی ہو۔ اور دلیل دریافت نہ کریں۔ اور کسی دوسرے عالم سے بلا ضرورت نہ پوچھیں۔ اور اگر باوجود ان سب رعایتوں کے اس کے جواب میں شبہ رہے۔ اور شِفانہ ہو تو ایسے ہی صفت کے دوسرے عالم سے پوچھ لیں اور اگر جواب پہلے کے خلاف ہو تو پہلے کا جواب اس کے سامنے اور اس کا جواب پہلے کے سامنے نقل نہ کریں۔ اور جس قول پر قلب مطمئن ہو۔ اس پر عمل کرلیں اور یہ ہی عمل اس حالت میں کریں، جبکہ بلا مراجعت دوسرے عالم کے خود بخود جواب، اول کے خلاف کوئی جواب اس باب میں گوش زد ہو جائے۔

استفتاء کے آداب

اور اگر استفتاء تحریراً ہو۔ تو ان رعایات کے علاوہ اور بھی بعض رعایتوں کا لحاظ رکھیں یعنی

* سوال کی عبارت اور خط بہت صاف ہو۔

* حتی الامکان فضول، غیر متعلق باتیں اس میں نہ لکھیں۔
* اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔ اگر کئی بار ایک ہی جگہ استفتے آجاویں تب بھی ہر خط میں......
* اپنا پتہ اور نام صاف لکھیں۔ اور جواب کے لئے ٹکٹ ضرور رکھدیا کریں۔ بلکہ اگر سوال دستی بھی بھیجیں تب بھی جواب کے لئے ٹکٹ رکھدیں اور پتہ اپنا پورا لکھدیں۔ شاید اس وقت جواب مسئلہ کا نہ دے سکیں تو بعد میں ڈاک میں بھیج دیں گے۔ ورنہ ٹکٹ واپس آجائے گا۔
* اگر کئی سوال ہوں تو کارڈ پر نہ بھیجا کریں۔ اور کبھی ایسا اتفاق ہوجائے تو ان سوالوں پر نمبر ڈال کر ان کی ایک نقل اپنے پاس بھی رکھ لیں اور مکتوب الیہ کو اطلاع دیدیں کہ ہمارے پاس سوالات کی نقل نمبروار ہے۔ آپ اعادہ سوال کی تکلیف نہ کریں۔ نمبروں کی ترتیب سے صرف جواب لکھدیں۔

امر سوم یعنی وعظ سننا

جس قسم کی غلطیاں امر اوّل میں کی جاتی ہیں۔ اسی قسم کی غلطیاں لوگ یہاں کرتے ہیں کیونکہ تحریر و تقریر دلالت و احکام و آثار میں متقارب ہیں۔ یعنی لوگ ہر قسم کے واعظوں کا وعظ سن لیتے ہیں۔ اس کے وہ ہی مفاسد ہیں۔ جو امر اوّل میں تھے اور ان کا وہ ہی انسداد ہے جو مفاسد متعلقہ امر اول کا تھا۔

وعظ سننے کے آداب

جب کوئی واعظ جدید آوے، اپنے شہر یا قریب کے کسی عالم معتبر سے اس واعظ کی حالت پوچھ لے۔ اگر وہ اطمینان دلاوے تو وعظ سنے، ورنہ، نہ سنے کیونکہ بعض واعظ جاہل ہوتے ہیں اور بعض بدمذہب اور ان میں بعض اپنے مدعا کو ذہن میں جمادینے میں مَلکہ رکھتے ہیں۔ اور بعض ایسے چالاک ہوتے ہیں کہ اوّل اوّل مخاطبین کے موافق کہتے ہیں پھر بعد مناسبت و موانست اپنے مسلک کی دعوت شروع کرتے ہیں بقول مولانا رحمۃ اللہ علیہ ؎

زانکہ صیاد آورد بانگ صفیر

شکاری سیٹی کی آواز نکالتا ہے

تا کہ گیرد مرغ را آن مرغ گیر

اس لئے کہ وہ پرندہ کو پکڑ لے

پس محتاط کو یہ طریقہ رکھنا چاہیئے ؎

دشمن ارچہ دوستانہ گویدت

دشمن اگرچہ آپ کو دوست خطاب کرکے پکارے

دام دان گرچہ ز دانہ گویدت

تو اس کو فریب سمجھو، اگرچہ وہ کہے کہ یہ موتی ہے

اور یہ شیوہ اختیار نہ کریں ؎

لختے بر دازدل گذرد ہر کہ بہ پیشم

جو میرے سامنے سے گذرتا ہے وہ میرے جگر کا ایک ٹکڑا لیجاتا ہے

من تاشس فروش دل دیوانہ خویشم

میں اپنے دل دیوانہ کی پھانک بیچنے والا ہوں۔

اور اگر باوجود احتیاط کے کوئی بات مشتبہ کان میں پڑجائے، علماء محققین سے اس کی تحقیق کرلیں۔

امر چہارم یعنی اہل کمال کی صحبت

اس میں جو دھوکہ ہوتا ہے وہ بہت عام ہے یعنی جو علامتیں اہل کمال کی شناخت کی ہیں ان کی رعایت نہیں کی جاتی جن کو احقر نے مضمون سابق میں "قصد السبیل" سے نقل کیا ہے اس کا انسداد ان علامات کی رعایت ہے۔ بقول مولانا رومی رحمۃ اللہ علیہ ؎

اے بسا ابلیس آدم روئے ہست

خبردار! بہت شیطان انسان کی شکل میں ہیں

پس بہر دستے بناید داد دست

پس ہر ہاتھ کو ہاتھ سے نہ ملانا چاہیئے

بری صحبت کے نقصانات

اسی کے ذیل میں اس صحبت کی مضرت بھی سمجھ لینا چاہیئے جو مقتدا بنا کر نہ ہو۔ محض دوستی کے طور پر ہو مگر وہ دوست بدین ہو ـــــ یہ بھی غلطی عظیم ہے۔ تجربہ سے ایک دوست کا اثر طبعًا دوسرے دوست پر ضرور آتا ہے اور مضر اثر، جلد آتا ہے۔ اس لئے ارشاد نبوی ہے المرءُ علی دین خلیلہٖ فلینظر من یخالل ـــ (انسان اپنے دوست کے طریقے پر ہوتا ہے۔ چاہیئے کہ وہ دیکھ لے کہ کون اس سے دوستی گانٹھتا ہے؟) ـــــ البتہ جو ملاقات بضرورت ہو، وہ مستثنٰی ہے۔

امر پنجم یعنی گھر والوں کو خود پڑھانا

اس میں جو غلطیاں ہوتی ہیں، ان کا مجموعہ امور اربعہ مذکورہ کے بیان میں، منتشر طور پر علاج آگیا ہے۔

خلاصہ یہ ہے، کہ گھر والوں کے لئے جو کتابیں تجویز کی جاویں۔ یا جو واعظ بلایا جائے ان میں رعایت امور سابقہ ملحوظ ہوں۔ اور یہ امر تصریح و تخصیص کے ساتھ اس میں قابل ذکر ہے کہ سیانی لڑکی کا معلّم نامحرم جوان یا میانی عمر کا جائز نہ رکھا جائے۔ وَاٰخِرُ دَعْوَانَا ان الحمد للہ رب العالمین ۰

قرآن مجید کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ قرآن مجید)

اس سے سابق کے مضامین میں انقلاب و اصلاح کے باب میں جو کلام ہوا تھا۔ وہ مجملی اور کُلی طریق پر تھا چونکہ جزئیات خاصہ کو ان پر منطبق کرنا، طلب صادق و فہم صائب کو مقتضی ہے اور اُن دونوں کی کمی اکثر طبائع میں مشاہد ہے اس لئے مضمون مذکور کے نفع میں تام ہونے کے لئے اس کی حاجت محسوس ہوئی کہ بعض ایسی جزئیات کو جو کہ مہم اور کثیر الوقوع ہیں، بطور انموذج مگر بقدر کافی، اسی سلسلہ میں مفصلاً و مصرحاً بھی بیان کردیا جاوے۔ چنانچہ اس مضمون سے اس کا آغاز ہے اور یہ امر بھی ضروری الذکر ہے کہ زیادہ حصہ اس سلسلہ کا اعمال ــــ اخلاق ــــ معاملات ــــ معاشرات کے متعلق ہوگا۔ اور یوں اتفاقاً کسی عقیدہ سے سادہ طرز پر کوئی بحث آجائے، ممکن ہے، اب اس کا سلسلہ شروع کرتا ہوں۔

قرآن مجید کے معاملہ میں کوتاہیاں

قرآن مجید کے معاملہ میں چند کوتاہیاں کی جارہی ہیں۔

ایک یہ کہ بعض لوگ تو اس کے پڑھنے کو قابل اہتمام نہیں سمجھتے۔ پھر ان میں بھی دو گروہ ہیں۔

ایک یہ کہ ان کا عدم اہتمام محض عملاً ہے۔ یعنی اس کا استحسان یا نافع ہونا تو ان کے اعتقاد میں ہے مگر بوجہ غفلت کے اشتغال یا دوسری حاجات معاشیہ کے اس کو حاصل نہیں کرتے، نہ اپنی اولاد کے لئے اس کی سعی کرتے ہیں اس گروہ کی حالت ایک درجہ میں اخف ہے کیونکہ یہ لوگ ایک امر نافع کے تارک ہیں۔ کسی امر مضر کے مباشر و مرتکب نہیں، کیونکہ پورے قرآن کا پڑھنا مجموع امت کے اعتبار سے بغرض اس کی حفاظت کے فرض الکفایۃ ہے، البتہ قدر ما یجوز بہ الصلوٰۃ فرضٌ علی العین ہے۔ اور قدر ما یتادیٰ بہ واجب القرأۃ واجبٌ علی العین ہے۔ تو یہ لوگ کسی فرض یا واجب علی العین کے تارک نہیں ہوئے۔ گو ایک برکت سے محروم ہیں اسی وجہ سے ہم نے اس کو، کوتاہی کی فہرست میں شمار کیا ہے۔

مکاتب قرآن کی ضرورت اور چندے کے آداب

علاج اس کا یہ ہی ہے کہ ان لوگوں کو اِدھر متوجہ کیا جائے۔ اور جتنا ان کا خرچ دُنیوی سمجھا جائے کسی قدر امداد مالی سے اس کا تدارک کیا جائے۔ کم از کم اُن بچوں ہی کو خوراک و پوشاک کے لئے وظیفہ دیا جائے۔ اور ہر بڑے گاؤں میں ایک ایک مکتب قرآن مجید کا قائم کیا جائے اور وہاں کے گرد و نواح کے دیہات کے بچوں کو اس میں تعلیم دی جائے۔

بڑوں کو بھی جب فرصت میسّر ہو، تھوڑا وقت اس میں دیا جائے۔ یہ ممکن ہے کہ جنہوں نے شروع کیا ہے بوجہ قلت مناسبت کے یا بسبب عروض عوارض کے سب ختم نہ کر سکیں۔ لیکن تاہم ایک عدد عظیم ختم کرنے والوں کا اس سے بھی حاصل ہو جائے گا اور ایسے مکتبوں کا چونکہ خرچ زیادہ نہ ہوگا۔ اس لئے بیرونی امداد کی طرف مضطر نہ ہوں گے، ہر جگہ کے مکتب کے لئے خود وہاں کے چند صاحبوں کی امداد کافی ہو سکتی ہے مگر اس امداد سے اس کا لحاظ رہے کہ ــــ "کسی شخص پر دباؤ ڈال کر یا شرما کر اس سے وصول نہ کیا جائے کہ علاوہ خلاف دین ہونے کے اور بے برکتی کے ایسے چندوں کو ثبات بھی نہیں ہوتا۔"

۲ دوسرا گروہ وہ ہے کہ ان کے اس عدم اہتمام کا منشا رسوء اعتقاد ہے یعنی تحصیل الفاظ کو ایک فضول ولایعنی حرکت بلکہ معاش مُخل سمجھ کر مضر جانتے ہیں اور پڑھنے والوں کو "احمق"

اور تاریک دماغ خیال کرتے ہیں۔ اور دوسروں کو بھی تلبیس میں ڈالتے ہیں۔

کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب معنے نہ سمجھے تو طوطے کی طرح پڑھنے سے کیا فائدہ ؟ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ جب دو سال اس میں صرف ہو گئے یا حفظ کرنے میں دماغ صرف ہو گیا، پھر علوم معاش کے وقت میں گنجائش نہیں ہو گی یا اس میں دماغ کام نہ دے گا۔ کوئی صاحب کہتے ہیں کہ بچوں کو قرآن مجید پڑھانے میں اس کی بے حرمتی ہوتی ہے۔ لڑکے بے وضو ہاتھ لگاتے ہیں۔ سیپارے پھاڑتے ہیں کہیں بے تعظیمی سے رکھ دیتے ہیں۔ اس لئے ادب کا مقتضا یہ ہے کہ ان کو پڑھایا نہ جائے .... اس قسم کی باتیں ابلہ فریب تراشتے ہیں۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ فضول اس کو کہتے ہیں، جس میں کوئی فائدہ نہ ہو۔ اور جو شخص خدا کو خدا، رسول کو رسول اور دونوں کے کلام کو صادق مانتا ہے وہ اس کا انکار نہیں کر سکتا ہے۔ کہ فائدہ منحصر نہیں ہے فائدہ دنیویہ میں، پھر محض اس کے انتفاء سے مطلق کا انتفاء کیسے لازم آیا ؟ ... یہ مسئلہ عقلیہ ہے۔ کہ خاص کا انتفاء مستلزم نہیں ہوتا عام کے انتفاء کو۔

ہر حرف کے بدلہ دس نیکیاں

جب مخبر صادق علیہ الصلوٰۃ والتسلیم کے کلام ہدایت فرجام سے ثابت ہے کہ خالی الفاظ پڑھنے سے بھی ایک ایک حرف پر دس دس نیکیاں ملتی ہیں اور ثابت ہے کہ خالی الفاظ کا پڑھنا بھی اعظم سبب ہے، حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب کا،

ہاں ! کوئی ان نیکیوں کو اور حق تعالیٰ کی توجہ اور قرب ہی کو مد فضول میں شمار کرے تو اس مقام پر اس سے گفتگو نہیں ہے۔ مخاطب خاص وہ ہی شخص ہے جو خدا اور رسول کی عظمت اور صدق کا قائل ہو۔ اور جو اسی کا منکر ہو۔ اس کو بجائے اس وقت مخاطب بنانے کے قیامت کے روز انشاء اللہ تعالیٰ دکھا کر کہا جائے گا۔ ھٰذا الذی کنتم بہٖ تکذبون (مطففین) یہ ہی ہے جس کو تم جھٹلایا کرتے تھے۔

احمق کون ؟

یہ حضرات غور فرمائیں کہ اب پڑھنے والے احمق ہوئے یا ان کو احمق کہنے والے ؟ اور اگر اب بھی سمجھ نہ آیا ہو تو بس یہ کہہ کر بات کو ختم کیا جائے ، ان تسخروا منا فانا نسخر منکم کما تسخرون فسوف تعلمون من یاتیہ عذاب یخزیہ ویحل علیہ عذاب مقیم ہود ۳۹۔ یعنی اگر تم ہنستے ہو ہم سے، تو ہم ہنستے ہیں تم سے جیسے تم ہنستے ہو - اب جلد جان لوگے کہ کس پر آتا ہے عذاب کہ رسوا کرے اس کو اور اترتا ہے اس پر عذاب دائمی ۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ جب الفاظ کا فائدہ علاوہ معانی کے فائدہ کے مستقل بھی ہے تو پھر اس کو طوطے کی سی پڑھائی کہنا کیسے صحیح ہے ؟ ہم نے بہت سے انگریزی طالب علم دیکھے ہیں کہ وہ اقلیدس کی کسی شکل کا ثبوت نہیں سمجھتے مگر پھر بھی اس امید پر عبارت یاد کر لیتے ہیں ، کہ امتحان میں عبارت لکھ دیں گے چنانچہ وہ ایسا ہی کرتے ہیں ، اور پاس ہو جاتے ہیں - چونکہ سمجھنے کے علاوہ اس پر بھی یہ فائدہ خاص ، پاس ہو جانے کا مرتب ہوتا ہے ۔ ہم نے کسی کو اس پر بیکار ہونے کا حکم لگاتے نہیں دیکھا - پھر ان سارے فضایا کی مشق کے واسطے بس دین ہی رہ گیا ہے - افسوس ! افسوس !

یہ حضرات غور فرمائیں کہ کیا کبھی جاہ و عزت کی طلب کے لئے کوئی بڑا سفر انگلستان وغیرہ کی طرف کرنے میں یا کسی دربار میں رسائی کی کوشش کرنے میں یا کسی حاکم اعلیٰ کی خوشنودی و تقرب کی امید میں مالی خرچ یا بار گوارا نہیں کیا جاتا ؟ تو کیا یہ افسوس کی بات نہیں ہے ؟ کہ خدا کی رضا و قرب و عنایت کی اتنی بھی وقعت نہیں ہے ؟ وَمَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ - اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی قدر نہیں کی جتنا اس کی قدر کا حق تھا۔

حفظِ قرآن سے قوتِ حافظہ بڑھتی ہے اور علومِ معاشیہ میں کام دیتی ہے۔

یہ حضرات غور فرمائیں کہ حفظ کرنے میں اگر اعتدال کے ساتھ مشقت ہو تو اس میں دماغ کا زیادہ کام نہیں ، زیادہ کام ذہانت کا ہے ، جیسا کہ ایک ڈاکٹر نے بھی بیان کیا ، البتہ کسی قدر

اشتراک قوت حافظہ کا ہے۔ جوکہ قویٰ دماغیہ سے ہے، سو حکمار نے اس کی تصریح کی ہے، کہ جس قوۃ سے اعتدال کے ساتھ کام لیا جائے، تو وہ اس کی ریاضت ہے، اور اس ریاضت سے اس قوت میں ترقی ہوتی ہے۔ سو اس بنا پر تو "حفظ قرآن سے قوت حافظہ بڑھے گی جو آگے علوم معاشیہ میں کام دے گی،، اور اس حافظہ کے بڑھ جانے سے دوسرے علوم میں دوسرا شخص جو کام چھ ماہ میں کر سکتا ہے۔ یہ شخص اتنا کام چار ماہ میں کر سکے گا۔ سو حفظ قرآن میں اتنی مدت بھی صرف نہ ہوگی۔ جتنی کفایت آگے نکل آئے گی .... !!

البتہ جس کو حفظ سے مناسبت ہی نہ ہو۔ اس کا ذکر نہیں ہے۔ ایسے شخص کے لئے حفظ کرانے کا ہم بھی مشورہ نہیں دیتے۔

یہ عذر تو سب سے زیادہ عجیب ہے! کہ قرآن کی بے حرمتی ہوتی ہے کیا یہ حضرات، خدا کو عالم الضمیر پر حاضر و ناظر اعتقاد اور خیال کر کے اس پر قسم کھا سکتے ہیں؟ کہ بچوں کو قرآن نہ پڑھانے کی رائے اس نیت پر مبنی ہے کہ قرآن کی بے حرمتی نہ ہو کیا خدا سے بھی اپنے اس مخفی حیلے کو چھپا سکتے ہیں؟ اگر یہ ہی نیت تھی تو اچھا ہوش و عقل آنے کے بعد کتنے صاحبوں نے تحصیل قرآن کی طرف توجہ کی، بہرحال اس گروہ کی حالت پہلے گروہ سے زیادہ خطرناک ہے۔ اور پڑھنے کا اہتمام نہ کرنا دونوں میں مشترک ہے پس ایک کوتاہی تو یہ کی جاتی ہے۔

دوسری کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بہت لوگ پڑھتے پڑھاتے ہیں۔ مگر پڑھ کر پھر اس کا نام تک نہیں لیتے بلکہ ان میں جو ـــــ حافظ ہیں وہ فخر کرتے ہیں کہ ہم نے سال بھر تک کھول کر بھی نہیں دیکھا باوجود اس کے ہم نے رمضان میں سنا دیا۔ اس ناواقفی کی بھی کوئی حد ہے؟ کہ جو بات عیب کی تھی اسکو ہنر سمجھکر اس پر فخر کیا جاتا ہے .... !!

جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے۔

ان صاحبوں کو سمجھنا چاہیئے کہ مقصود پڑھنے سے تو یہ تھا کہ ہمیشہ اس کی تلاوت سے برکات حاصل کی جائیں، جب یہ نہ ہوا تو پڑھا نہ پڑھا برابر ہو گیا۔ پھر تجربہ سے معلوم ہوا ہے۔ اور ایک حدیث میں بھی یہ ہی مضمون آیا ہے کہ قرآن مجید نہ پڑھنے سے اس سے ایسی بے مناسبتی ہو جاتی

ہے کہ پھر دیکھ کر بھی نہیں چلتا۔ یہ تو ناظرہ خواں کے بھولنے کی حد ہے اور حافظ کے بھولنے کی حد یہ ہے کہ حفظ نہ پڑھ سکے، صحیح یہ ہی ہے اور نسیان قرآن پر حدیثوں میں وعید شدید آئی ہے، پھر یہ کہ اتنے دنوں کی، کی کرائی محنت جو کہ پڑھنے میں برداشت کی تھی۔ اس کے ضائع کر دینے کیلئے دل کیسے گوارا کرتا ہے؟ دوام تلاوت میں بعض لوگ کم فرصتی کا عذر کرتے ہیں لیکن سچ یہ ہے کہ جس چیز کا انسان ارادہ کر لیتا ہے کسی نہ کسی صورت میں اس کو کر ہی لیتا ہے " خاص کر جبکہ کام بھی آسان ہو۔ کیا یہ بھی کوئی مشکل کام ہے؟ کہ ۲۴ گھنٹے میں سے آدھا گھنٹہ کہ مجموعہ روز و شب کے ساتھ ۱/۴۸ کی نسبت رکھتا ہے، نکال کر اس میں اگر ناظرہ خواں ہے تو ایک پارہ اور اگر حافظ ہے تو ایک یا ڈیڑھ پارہ بے تکلف پڑھ لیا کرے اور اتفاقاً ناغہ ہو جانا دوسری بات ہے اس سے زیادہ وقت تو فضولیات وخرافات میں صرف ہو جاتا ہے جس میں نہ نفع دین نہ نفع دنیا۔

کیا تو بہ توبہ قرآن مجید کی ان فضولیات کی برابر بھی وقعت نہیں ہے! کہ فضولیات کے لئے تو فرصت ہو جایا کرے اور قرآن مجید کے لئے نہیں ہوتی؟

تیسری کوتاہی یہ ہے کہ بعض دواماً بھی پڑھتے ہیں مگر اس کی تصحیح کی طرف اصلاً توجہ نہیں فرماتے نہ مخارج کی خبر نہ صفات کا اہتمام نہ نقص و زیادت سے تحاشی،

کوئی صاحب "ض" کو صاف مخرج "ظ" سے ادا کرتے ہیں اور کوئی صاحب مخرج "د" سے ث ــ س ــ ص میں ان کے نزدیک کوئی فرق ہی نہیں، الف کے موقع پر نرا فتح پڑھنا اور فتح کی جگہ الف ملا دینا، بعض کی عادت ہو گئی ہے۔ نہ بے موقع وقف کر دینے سے اجتناب کیا جاتا ہے۔ حالانکہ اس سے بعض مواقع پر معنی میں فساد ہو جاتا ہے۔ اگر سانس ٹوٹنے سے اس کی طرف مضطر ہو۔ تو ایسا کرے کہ جس لفظ پر وقف کیا ہے۔ اس کا پھر آگے بڑھنے میں اعادہ کرے۔ البتہ وصل سے ایسا فساد لازم نہیں آتا۔

اہل علم کی کوتاہیاں

نہایت افسوس سے کہا جاتا ہے! کہ اس کوتاہی میں اہل علم کا نمبر غیر اہل علم سے کچھ بڑھا ہوا ہے۔ حتیٰ کہ ایک صاحب سورہ ناس میں "من الجنّۃ والناس" کو اس طرح پڑھتے ہیں۔

من الجنات والنس " پھر بعضے ان میں مساجد کے امام ہوتے ہیں۔ اس وقت اس غلطی کا اثر دوسروں تک بھی دو طور سے پہنچتا ہے۔

ایک یہ کہ اگر کوئی مقتدی صحیح خوان ہوا۔ تو ان کی نماز ان امام صاحب کے پیچھے نہیں ہوتی اور چونکہ غلط خواں کا حکم صحیح خواں کی نسبت سے اُمّی کا سا ہے بہ نسبت قاری کے، اس لئے اس خاص صورت میں یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ نہ امام کی نماز ہوتی ہے نہ دوسرے مقتدیوں کی، پس کتنی بڑی تباہی کی بات ہے؟

دوسرے اس طور سے کہ یہ امام صاحب اگر زمرہ اہل علم ہوئے، تو علماء کی عوام میں سخت بے وقعتی ہوتی ہے جس کا اثر ایک گونہ علماء کے اتباع واقتدار تک بھی سرایت کر سکتا ہے ہر چند کہ تجوید کے وجوب کے متعلق کلام طویل و مقتضی تفصیل ہے مگر اتنی قدر میں کسی کو کلام نہیں کہ جس قسم کی غلطیوں کا ذکر اوپر ہوا ہے ان کی تصحیح واجب علی العین ہے جب تک کہ عدم قدرت وعدم مساعدت لسان متیقن نہ ہو جائے۔ جس کی موٹی دلیل یہ ہے کہ بدون اس قدر تصحیح کے قرآن کی عربیت باقی نہیں رہتی اور عربیت بدلالت خصوص لوازم قرآن سے ہے۔ پس اس کے نہ رہنے سے قرآن نہ رہے گا۔ پس اس کی ضرورت میں کیسے اشتباہ ہو سکتا ہے؟

اس میں قرآن کی یا عربی کی کیا تخصیص ہے؟ ہر زبان کی صحت اس کے خاص طرز ادا پر موقوف ہے مثلاً لفظ "پنکھا" اور "رنگ" میں اخفا ہے۔ اگر نون، میں اظہار کیا جاوے یقیناً لفظ غلط ہو جاوے گا ــ اور لفظ "کھنبا" اور "دنبہ" میں اقلاب ہے، اگر یہ نہ ہو تو یقیناً لفظ غلط ہو جائے گا۔ مگر بات یہ ہے کہ قلوب میں ادراک نہیں رہا۔ نعماء آخرت کی رغبت، نعماء دنیا کے برابر نہیں رہی انا للہ وانا الیہ راجعون (بقرہ [۱۵۶]) (ہم اللہ تعالیٰ ہی کا مال ہیں، اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں)

تصحیح قرآن صرف دو ہفتہ میں

کل حروف اٹھائیس ہیں۔ ان میں بعض تو قریب قریب صحیح نکلتے ہیں۔ ان کو مستثنیٰ کر کے جن میں اہتمام کی حاجت ہے، تقریباً ایک ربع یعنی سات ہیں، جیسے ث ــ ح ــ

د ۔ ص ۔ ض ۔ ط ۔ ظ اور جو بالکل دیہاتی ہیں۔ ان کے لئے اتنے ہی اور ہیں جیسے خ۔ ز ۔ ش ۔ ع ۔ غ ۔ ف ۔ ق ۔ اگر کسی ماہر کو تلاش کر کے ایک گھنٹہ روزانہ مشق کے لئے نکالا جائے تو روزانہ ایک حرف کی ضروری مشق ہو سکتی ہے جس میں ایک ہفتہ اور دیہاتی کے لئے دو ہفتہ کافی ہیں۔ اگر احتیاطاً اس سے دونی مدت لی جائے۔ تو آدھا مہینہ اور ایک مہینہ غایت غایت صرف ہوتا ہے تو کیا دین کی اتنی بڑی ضرورت کے لئے اپنی اتنی بڑی عمر میں سے اتنا حصہ بھی نہیں دے سکتے ہو؟ کتنا بڑا غضب اور ستم ہے؟

اسی طرح فتح اور الف کی مقدار کا فرق، اگر ایک پارہ میں اس کی درستی ہو جائے تو تمام قرآن یکساں ہی تمام کے لئے کافی ہے۔ اگر ایک رکوع روزانہ درست کر لیا جائے، تو یہ کام بھی پندرہ بیس روز سے زیادہ کا نہیں ہے۔ پھر بقیہ قرآن بھی ہے۔ تھوڑا تھوڑا کر کے کسی ماہر کو سنادینا۔ جو متفرق اوقات میں نہایت سہل ہے زیادہ اطمینان اور احتیاط کی بات ہے۔

بعض لوگوں کو ماہر قرآۃ میسر نہ آنے کا بہانہ ہوتا ہے لیکن اول تو اتنی تھوڑی مہارت رکھنے والے اکثر جگہ ایک دو پائے جاتے ہیں اور اگر بالفرض کوئی میسر نہیں تو چند آدمی مل کر کسی ماہر کو بلا کر رکھ سکتے ہیں۔ ہم نے دیکھا ہے کہ جہاں کوئی طبیب نہیں رہا۔ بستی والوں نے چندہ کر کے تنخواہ دار طبیب کو رکھا ہے۔ پس فرق وہی ضرورت اور عدم ضرورت کے اعتقاد یا استحضار لعقاد کا ہے۔ یا بستی میں سے دو چار ہونہار شخصوں کو سفر میں بھیج کر ماہر بنوا سکتے ہیں۔ حق تعالیٰ کے عموم کلام میں یہ صورت بھی داخل ہے۔ فلولا نفر من کل فرقۃ منہم طائفۃ لیتفقہوا فی الدین التوبہ [۱۲۱] سو کیوں نہ نکلا؟ ہر فرقہ میں سے ان کا ایک حصہ تاکہ سمجھ پیدا کریں دین میں) بلکہ اگر باہر سے کسی ماہر کو بلا کر رکھا جائے یا بستی میں سے کسی کو باہر بھیج کر ماہر بنوایا جائے تو اس میں ایک بڑا فائدہ یہ ہوگا۔ اور ایسا ہونا بھی چاہئے کہ بچے جس وقت قرآن پڑھیں، پڑھنے کے ساتھ ہی اس تصحیح کا اہتمام رہے یعنی اس میں گونہ تکلیف ہے کہ غلط یاد کر کے پھر تصحیح کی جائے اگر ابتدا ہی سے صحیح پڑھایا جائے، پھر بالخصوص زمانہ صبا میں تو یہ صحت ان کے لئے مثل امر طبعی کے ہو جائے اور مشقت کا ایک بڑا حصہ مختصر ہو جائے۔

امام مقرر کرنے کے آداب

اس کا بھی التزام رکھیں کہ جب کسی کو مسجد میں امام مقرر کریں۔ کسی ماہر کو اس کی متعدد مختلف سورتیں سنوادی جاویں۔ اگر وہ صحت کی تصدیق نہ کرے تو کسی ماہر کو تلاش کریں۔ اگر ارزاں نہ ملے گراں لاویں۔

کیسی ظلم کی بات ہے ؟ کہ ہر دنیوی کام کے لئے ذی ہنر اور ذی لیاقت آدمی ڈھونڈا جاتا ہے حتی کہ لوہار۔ معمار۔ نجار۔ بلکہ گانے بجانے والا تک بھی، اور خدا کے روبرو جو سب کیطرف سے وکیل بن کر کھڑا ہوتا ہے وہ چھانٹ کر ایسا رکھا جاتا ہے جس میں نہ کمال نہ جمال، تمام محلہ میں جو ناکارہ ۔ اندھا ۔ چندھا ۔ فاتر الحواس ۔ گنوار ۔ بدتمیز ۔ جاہل ۔ ہو غرض جو کسی مصرف کا نہ رہے، اس کو امامت کے لئے انتخاب کیا جاتا ہے۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن البقرہ [۱۵۶] ہم تو اللہ ہی کا مال ہیں اور ہم اسی کی طرف لوٹ کر جانے والے ہیں۔

مشائخ اور اہل مدارس کیلئے دستور العمل

اہل مدارس اس کا التزام رکھیں کہ جو طالب علم ان کے مدرسہ میں داخل ہونا چاہیں امتحان داخلہ کا ایک جزء اور اجزاء سے زیادہ نہیں، تو برابر درجہ میں سہی صحت قرآن کو بھی قرار دیں ۔ اور بدون تجربہ صحت یا بعض حالات میں کم از کم وعدہ تصحیح تو ضرور لے لیا جاوے بدون اس کے داخل نہ کریں اور وعدہ کی صورت میں جتنے سبقوں کا وہ مستحق ہے ان میں سے ایک سبق کی جگہ اس تصحیح کو رکھیں اور اس مرحلے کو طے کرنے کے بعد پورے سبقوں کی اجازت دیں۔ اور نیز جن مدارس میں گنجائش ہے ان کو ایک مدرس تجوید کا مدرسہ میں بڑھانا ضرور ہے۔ اس طریق سے یہ فن عام ہو سکتا ہے۔

اسی طرح مشائخ کو چاہیئے کہ اپنے مریدوں کو خصوصی خلفاء کو صحت قرآن پر مجبور کریں۔ کیا ظاہر یا باطن کا مقتدا بنایا جائے ؟ اور بچوں سے بھی کم ہو، کیا یہ معیوب نہیں ؟

تجوید میں افراط و تفریط

چوتھی کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تصحیح و تجوید کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر کاوش اور بحث ہی تک پہنچ کر رہ جاتے ہیں۔ جیسا اس وقت لوگ ض ـ ظ میں الجھنے والے دیکھے جاتے ہیں۔ مگر انشاء اللہ تعالیٰ ادا کے نام خاک بھی نہیں، بعضے عمل تک پہنچنے کا ارادہ کرتے ہیں مگر اس کی حقیقت سمجھنے میں غلطی کرتے ہیں۔ یعنی صرف لہجہ کا نام قرارت سمجھ کر اسی کا اہتمام کرتے ہیں۔ اور یا تو خود کوئی طبعی لہجہ اختراع کرتے ہیں اور یا کسی مشاق کی نقل اتار لیتے ہیں اور اتار چڑھاؤ صحت وزن میں اس قدر غلو کرتے ہیں کہ بعضے ضروریات یا مستحسنات قرأۃ بھی فوت ہو جاتے ہیں، یعنی حرف گھٹا بڑھا دیتے ہیں۔ یا غنہ یا مد حذف کر دیتے ہیں تاکہ وزن ٹھیک رہے!!

سو اس کی نسبت سرکار نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے۔ اقرءوا القرآن بلحون العرب واصواتها وایاکم ولحون اهل العشق واهل الکتابین[1]۔ (تم قرآن شریف کو عربوں کے طریقے اور ان کے لہجے میں پڑھو عاشقوں اور اہل کتاب کے طریقوں سے بچو)

یعنی ایسے لحن سے منع فرمایا ہے اور اسکو لحون عرب سمجھنا خطاء عظیم ہے۔ جیسا شراح حدیث نے تصریح کی ہے بلکہ یہ لحن اہل عشق و اہل کتاب میں داخل ہے جس کو منع فرمایا ہے اور اگر یہ لحن عرب ہوگا تو لحن اہل عشق کون ہوگا؟ پس خود حدیث کے الفاظ تو اس زعم کا تخطیہ کر رہے ہیں۔ اور لہجہ کا اہتمام تجوید میں تفریط ہے اور بعضے حقیقت صحیح سمجھتے ہیں۔ مگر خوش لہجگی کے ایسے مخالف ہیں کہ اس کا اہتمام بلیغ کرتے ہیں کہ تحسین فوت نہ ہونے پائے اور کسی کو ذرا تحسین صوت کرتا دیکھتے ہیں تو اس پر گانے کا طعن کرتے ہیں اور یہ تجوید میں افراط ہے۔ مثل تفریط مذکور کے یہ بھی نصوص کے خلاف ہے۔

حسنِ صوت اور گانے کا فرق

زینوا القرآن باصواتکم اور نحوہ حدیث قولی (قرآن شریف کو اپنی آوازوں کے ساتھ مزین

---

[1] مشکوۃ شریف ص ۱۹۱ عن حذیفۃ رضی اللہ تعالیٰ، بحوالہ بیہقی ۱۲ محمد علی عفی عنہ۔

کرو) اور حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے اس عرض پر کہ لو علمت انک تستمع لقرانی لحبّرتہٗ تحبیراً ؎ ادنحوہ (اگر میں جانتا کہ آپ میری قرأۃ سن رہے ہیں تو میں اس کو اور سنوارتا) آپ کا انکار نہ فرمانا حدیث تقریری اس تحسین صوت بالقصد کی مشروعیت و مطلوبیت میں نص صریح ہیں - اور یہ ہی ہے وہ تغنی جس کا امر چند حدیثوں میں مروی ہے اور اس میں اور گانے میں فرق ظاہر ہے یعنی گانے میں تو لہجہ مقصود اور دوسرے قواعد تابع ہیں۔ اگر لہجہ کے بنانے میں قواعد رہ جاویں تو پروا نہیں کی جاتی اور تحسین صورت میں قواعد مقصود اور حسن صوت تابع ہے یعنی اگر قواعد کو محفوظ رکھکر خوش آوازی ہو سکے تو اس کی رعایت کی جاتی ہے ورنہ اس کی پروا نہیں کی جاتی ہے ———— اور بلا مقصد اگر کسی شخص کی قرأۃ کا کوئی جز کسی قاعدہ موسیقی پر بھی طبیعت کے تناسب یا موزونیت کی وجہ سے منطبق ہو جاوے تب بھی وہ گانے میں داخل نہیں، جیساکہ خود قرآن مجید میں شعریت کی جابجا نفی کی گئی ہے، مگر بعض عبارت یقیناً اوزان شعر پر منطبق ہیں۔

جیسے ثم اقررتم وانتم تشھدون ثم انتم ھؤلاء تقتلون البقرہ [۸۴] پھر تم نے اقرار کرلیا اور تم جانتے ہو پھر تم وہ لوگ ہو کہ ویسے ہی خون کرتے ہو آپس میں) فاعلاتن فاعلاتن فاعلات پر منطبق ہے مگر باوجود انطباق، ہرگز اس کے پڑھنے والے کو شعر کا پڑھنے والا نہ کیا جائے گا۔

البتہ اگر لقصد تطبیق پڑھے گا شعر پڑھنے والا، اور قرآن میں ایسا کرنے سے ناجائز فعل کا ارتکاب کرنے والے کہا جائے گا۔ بس یہی حالت لہجہ کی بالقصد تطبیق کے ہے غرض اس چوتھی کوتاہی کی دو جانبین ہیں۔ تفریط، افراط، دونوں سے بچنا یہ وہ ہے جس کو لحون عرب واصواتہا (عربوں کا طریقہ اور ان کی آوازیں) فرمایا گیا ہے۔

تجوید لاِرضاءِ خلق؟

پانچویں کوتاہی یہ کہ بعضے تجوید پر قدرت حاصل کرلیتے ہیں۔ مجالس یا حالت امامت میں جب پڑھنے کا اتفاق ہوتا ہے اس پر عمل بھی کرتے ہیں مگر جب خلوت میں تلاوت یا حالت

انفرادیں نماز ادا کرتے ہیں۔ اس وقت اس کی طرف التفات بھی نہیں کرتے جس سے معلوم ہو کہ قرآن کی تصحیح سے غرض، ارضاء خلق تھی نہ کہ ارضاء خالق! کیا کسی فعل کے کسی ثمرہ کے ترتب کے لئے قوت واستعداد کا مرتبہ کافی ہے؟ یا صدور وفعلیت کی ضرورت ہی کیا تجوید پر صرف قدرت ہونے سے تجوید کے ثمرات مثل ادائے واجب وتضاعف اجر ورضائے حق واداے حق حاصل ہوسکتے ہیں؟ یا اس کے عمل واجراء کی بھی ضرورت ہے؟

کیا کسی خارشی کو محض نسخہ کے یاد کرلینے سے اچھا ہوتا ہوا بھی دیکھا ہے؟ یا اس کے استعمال کی بھی ضرورت ہوتی ہے؟ بالخصوص سری نمازوں میں تو غنّہ اور مدو اظہار واخفاء کا تو کیا ذکر ہے؛ غالباً بلکہ یقیناً مخارج وصفات حروف پر بھی نظر نہیں ہوتی جو کہ لوازم حروف سے ہیں اور وہ نہیں تو حروف نہیں، اور جب حروف نہیں، جو کہ بسائط ہیں تو قرآن کی عبارت نہیں جو کہ مرکب تھی، اور جب عبارت نہیں تو قرات نہیں، تو نماز کہاں؟ فلیتدبّروا الّذکوا (بار بار غور وفکر کریں) اور یوں ابتلاء عام کو پیش نظر رکھ کر اس پر فتویٰ نہ دینا یہ دوسری بات ہے مگر ترک واجب کے گناہ سے بچنے کے لئے بھی عموم بلویٰ کافی ہوسکتا ہے۔ ومن لنا بذلک (اس کی گارنٹی دیتا ہے؟) اور اگر مستحسنات سے قطع نظر کی جائے مگر ضروریات کی حفاظت سے تو چارہ نہیں!

معانی قرآن سے غفلت

چھٹی کوتاہی یہ ہے کہ قرآن کے معنی جاننے کی رغبت جس قدر کہ کم پائی جاتی ہے، قریب قریب نہ ہونے کے ہے، سخت افسوس کی بات ہے! کہ جو اصل مدار ہے اسلام کا، جو منبع ہے تمام دینی علوم کا، جو اساس ہے دارین کے فلاح کا، جو خاص علاقہ ہے معاملہ وخطاب کا، اللہ تعالیٰ ورسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کی امت کو نہ خبر، نہ خبر کا شوق، ہماری اس جمود وخمود کی کوئی انتہا بھی ہے!! ...... شاید بعض طالب علم ناز کرتے ہوں کہ ہم کو تو شوق تھا جب ہم نے تفسیر پڑھی سو کہنا تو اور بات ہے۔ اور انصاف سے کہنا اور بات ہے۔

اگر انصاف سے غور کریں تو اس کا نام رغبت رکھنے سے خود ان کو ضرور شرم آوے گی۔ غور

کرکے بتلادیں کہ اگر تفسیر، درس میں داخل نہ ہوتی، کیا اُس وقت بھی پڑھتے ؟ چنانچہ جو کتاب تفسیر کے درس میں داخل ہے۔ اس سے زیادہ بھی کوئی پڑھتا ہے؟ بلکہ اس سے بھی مختصر کر دینے پر نظر ہوتی ہے۔ اگر آخر سال میں پانچ پارے جلالین کے رہ جاویں تو کیا آئندہ سال یا پھر کسی موقع پر اس کو پڑھتے ہیں؟ یا مار مار کر جلالین ہی ختم کرلی، تو کیا تمام ضروری مضامین پر اس سے عبور ہو گیا ؟

کیا مدارک یا ابوالسعود یا پوری بیضاوی[۲] میں کوئی مضمون جلالین سے زائد نہیں ہے، پھر اس کو کوئی پڑھتا ہے ؟ میں سچ کہتا ہوں، اگر جلالین بھی درس میں نہ ہوتی تو اس کو کوئی بھی نہیں پڑھتا، اور جلالین بھی پڑھی تو کیا پڑھی ؟ اس کو ختم کرکے اتنی استعداد بھی تو نہ ہوئی، کہ اگر بدون جلالین کے خالی غیر مترجم قرآن ان کے ہاتھ میں دیدیا جائے، کہ ایک رکوع کا ترجمہ اور ضروری حل کردو، تو اسی کو حل کرسکیں ؟ ہرگز نہ کرسکیں گے۔ ہاں جلالین منگا کردے دو، تو کچھ دال دلیا کرلیں گے، اس سے ثابت ہوا کہ قرآن کے معنی مقصود حاصل کرنے نہ تھے، بلکہ جلالین مقصود تھی۔ پھر کیا اس کو شوق و رغبت قرآن کہا جاسکتا ہے ؟ میری رائے میں خاص اس جزو کا کہ بدون جلالین کے مطلبِ قرآن نہ بیان کرسکیں گے۔

اہلِ مدارس کو مشورہ

تدارک یہ ہے کہ اہل مدارس طرزِ تعلیم میں کچھ ترمیم کریں، جیسے بعضی متون بدون شرح کے پڑھائی جاتی ہیں۔ اسی طرح جلالین سے پہلے قرآن مجید بھی بدون کسی خاص تفسیر کے زبانی حل کے ساتھ پڑھایا جایا کرے[۱]۔

یا تو پورا قرآن پہلے پڑھا دیا جائے یا ایسا کریں کہ مثلاً ربع پارہ اوّل خالی قرآن میں پڑھا دیا پھر اسی قدر جلالین پڑھادی اور مدرس اپنی سہولت کے لئے خواہ جلالین پاس رکھیں یا اور کوئی مبسوط تفسیر، تو طلبا کو اسی طرح پڑھنے میں اسی طرح یاد کرنے کی اور مطالعہ کرکے حل کرنے کی عادت

---

[۱] الحمدللہ دارالعلوم کراچی میں شروع ہی سے اس مبارک طریق پر کام جاری ہے ۱۲ محمد علی عفرلہٗ

[۲] جلالین، مدارک، ابوالسعود، بیضاوی الفان قرآن شریف کی مشہور تفاسیر ہیں ۱۲ محمد علی

پڑ جاوے گی۔

پس اس جزو کا بہت آسانی سے تدارک ہو جاوے گا۔ چونکہ جلالین میں جمیع فنون تفسیر مذکور نہیں، اس لئے کم از کم اتقان کو ضرور داخل درس کیا جاوے، یہ بیان تھا بد رغبتی کی کوتاہی کا۔

معانی قرآن میں رغبت کرنے والوں کی بے پرواہی۔

ساتویں کوتاہی ان کی ہے، جن کو معانی قرآن کی کسی درجہ میں رغبت ہے ..... مگر کوتاہی یہ ہے کہ وہ بدون اس کے، کہ کسی استاد سے یہ فن حاصل کیا ہو یا دوسرے علوم عالیہ و درسیہ پڑھے ہوں اردو کا کوئی ترجمہ یا تفسیر خرید کر (گو مصنف کا معتبر ہونا بھی محقق نہ ہو یا اس میں احتیاط ہی کی نہ ہو) بطور خود اس کا مطالعہ شروع کر دیتے ہیں۔ پھر ان میں بھی دو قسم کی جماعت ہیں ـــ ایک معتقد علماء کی ـــ دوسرے کچھ انگریزی پڑھ کر یا انگریزی خوانوں کے پاس رہ کر خود اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے ـــ مشترک خرابی تو یہ ہے کہ اس حالت میں فہم معانی میں بکثرت غلطیاں رہ جاتی ہیں چنانچہ اس پر واقعات کثیرہ شاہد ہیں اور راز اس میں یہ ہے کہ

(۱) اول تو ایک زبان جب دوسری زبان میں ترجمہ ہو کر آتی ہے۔ ضرور بعض مفہومات اصلی رنگ پر نہیں رہتے۔

(۲) دوسرے بہت سے مقامات میں خود اجمال ہے، جو بدون تفصیل کے وجوہ متعدد کو محتمل ہوتا ہے، بعض وجوہ کی تعیین بلا دلیل کر لی جاتی ہیں، جس طرح قانون کی کوئی کتاب اردو کے بڑے فاضل کو دی جائے اور وہ اس کو بیان کرے مگر قانون دان اس کو سن کر بہت جگہ غلط بتلا دے گا۔

(۳) تیسرے یقیناً فہم قرآن میں بعض دوسرے فنون نقلیہ و عقلیہ کی حاجت ہے، جو شخص اُن سے بے خبر ہے وہ قطعاً غلطی میں پڑے گا۔

دوسری جماعت میں بالخصوص یہ خرابی ہے کہ ان کی غلطی پر بھی اگر کوئی مطلع کرے تو وہ اپنے کو اس بتلانے والے سے افضل اور عاقل سمجھ کر اس کی نہیں سنتے اور عقیدے میں یا عمل میں اس غلطی پر جم جاتے ہیں، پھر بعض اوقات بنا فاسد علی الفاسد کے طریق پر دوسرا اور فاسد کو اس پر

متفرع کر لیتے ہیں۔

طریق اصلاح

ان دونوں یعنی چھٹی اور ساتویں کوتاہی کے مجموعہ کی اصلاح یہ ہے کہ اگر کسی قدر علم یا صحبت علماء کی برکت سے فہم مع حرف شناسی حاصل ہو۔ تب تو کسی محقق عالم سے کوئی ترجمہ یا مختصر یا متوسط تفسیر دریافت کرکے ان ہی عالم سے سبقاً سبقاً تمام قرآن کا ترجمہ بالتفسیر خوب سمجھ کر ختم کرلیں اور بعض مقامات جو باوجود سمجھانے کے سمجھ میں نہ آویں، یا کچھ شبہ رہے، اس کے درپے نہ ہوں، بس زبانی مقصد شرع، اس عالم سے دریافت کرکے اس پر اعتقاد رکھ کر تفتیش چھوڑ دیں۔ اور ایسے مقامات پر نشان بنادیں۔ پھر جب تلاوت کریں تو تھوڑا سا مطالعہ اس ترجمہ یا تفسیر کا بھی کریں۔ انشاء اللہ تعالیٰ اس طرح معانی قرآن سے مناسبت بڑھ جائے گی کہ یاد اور فہم دونوں میں سہولت اور ترقی ہوگی اور اس میں سہولت اور ترقی ہونے سے طبعاً رغبت بڑھے گی، پھر دوام آسان ہو جائیگا اور تدبر و عمل میں بھی جن کا ذکر آگے آتا ہے اس سے اعانت ہوگی۔ اور اگر اس قدر استعداد نہیں ہے تو پھر اس کے معانی پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ یہ ہے کہ

معانی قرآن پر مطلع ہونے کا سہل طریقہ

چند اشخاص مل کر، اگر کوئی عالم بلا تنخواہ میسر ہو جاویں تو فبہا، ورنہ تنخواہ پر رکھ کر ان سے استدعا کریں کہ روزانہ یا چوتھے پانچویں روز معین وقت پر ایک یا نصف رکوع کا خلاصہ، مطلب، عام فہم زبان میں بطور وعظ فرمادیا کریں۔ اسی طرح قرآن کو ختم کردیں۔ اگر ہمت ہو تو پھر دورہ شروع کردیں اور جو شبہ پیدا ہو، اس کو زبانی پوچھیں جو سمجھ میں نہ آوے اس کو چھوڑ دیں اور حکم شرعی پوچھ کر اس پر کاربند رہیں۔

قرآن کے الفاظ و معنی میں کوتاہیاں۔

آٹھویں کوتاہی، جو الفاظ و معنی دونوں کے متعلق ہے وہ یہ ہے ـــــ کہ بعضے لوگ الفاظ

یامعانی کو کسب دنیا کا ذریعہ بناتے ہیں مثلاً

* بعض تراویح میں اجرت پر سناتے ہیں۔
* بعضے مردوں پر پڑھکر اُجرت لیتے ہیں ــــ یہ طلب مال تھا۔
* بعضے تعریف کرانے کی غرض سے مجالس میں یا محاریب میں امام بن کر پڑھتے ہیں ــــ یہ طلب جاہ ہے، اور یہ سب الفاظ کے ذریعہ سے ہے۔
* بعضے واعظ کہہ کر نذرانہ لیتے ہیں۔ بلکہ پہلے ہی نرخ طے کر لیتے ہیں۔
* بعضے شہرت کے لئے وعظ کہتے ہیں ــــ یہ معانی کے ذریعہ مال یا جاہ کی تحصیل ہے

مسئلہ منصوصہ و اجماعیہ ہے کہ طاعت پر اُجرت لینا اور اسی طرح کا ریاءً کرنا معصیت ہے البتہ الفاظ میں تعلیم پر اُجرت لینا بقول مفتیٰ بہ اور رُقیہ پر اجرت لینا بناءً علیٰ انہٗ من اعمال الدنیویۃ .... اسی طرح معانی میں اگر وعظ کا نوکر ہی ہو اس وقت تنخواہ لینا یہ مستثنیٰ ہے۔ یہ مستثنیٰ اور بعض کتب فقہیہ میں جو مذکر (واعظ) کو کچھ مال لینے کی اجازت لکھی ہے۔ اس کا محمل یہ ہی ہے ورنہ مجتہدین کے کلیہ سے غیر مجتہدین کا کسی جزئیہ کو استثنار کرنا غیر معتبر ہے۔

اصلاح کی ضرورت

اس کی اصلاح میری رائے میں دو ہیں۔

ایک یہ کہ ایسے لوگوں کو کوئی دنیا کا کام بھی سکھلایا جائے تاکہ وہ مضطر ہو کر دین کو حرفہ نہ بنائیں۔ اور اس کے لئے سہل صورت یہ ہے کہ امراء چندہ کر کے جا بجا صنعت و حرفت کے مدرسے کھلوادیں اور بچپن ہی سے سب کو کوئی نہ کوئی دستکاری ضرور سکھلائی جاوے۔

دوسری یہ کہ جو کسی وجہ سے نہ سیکھیں یا سیکھنے سے معذور ہوں اور اس لئے وہ خدمت دین ہی کے لئے فارغ ہوں تو بلاتعین لوگوں کو اتنی خدمت کرنی چاہیئے کہ ان کی ضروری حاجات تو پوری ہوتی رہیں تاکہ ان کی نیت بگڑنے نہ پائے۔

یہ کوتاہی الفاظ و معانی کے متعلق تو وہ تھی جس میں الفاظ و معانی کو بحال خود باقی رکھکر اس سے دنیوی غرض حاصل کی گئی۔ اس سے اقبح اور اشنع وہ ہے کہ ایسی اغراض مال وجاہ کے لئے

الفاظ یا معانی میں تحریف کا ارتکاب کیا جائے، جیسے بعض جاہل حفاظ کو دیکھا جاتا ہے کہ امتحان کے طور پر پوچھا کرتے ہیں . . . . . کہ بتلاؤ کہ الحمد میں شیطان کا نام کے جگہ آیا ہے ؟ پھر خود افادہ فرماتے ہیں کہ سات جگہ،

- ذُلِل
- ہَرَب
- کَنس ؎۱
- کَنع

اسی طرح سات گنوا دیتے ہیں ـــــ پہلے انہوں نے دلل کو ترکیب دی ہے۔ الحمدُ کے آخر اور للہ کے اول سے اور ہرب کو للہ کے آخر اور ربّ العالمین کے اول سے اور کنع کو ایاک کے آخر اور نعبدُ کے اول سے اور کنس کو ایاک کے آخر اور نستعینُ کے اول سے، . . . .

اس کے لغو ہونے میں کیا شبہ ہوسکتا ہے ؟ یہ امر قیاسی تو ہے نہیں، نقل کی ضرورت ہے۔ پس ان سے تصحیح نقل کا مطالبہ کافی ہے۔

بچپن میں ایک حافظ صاحب سے سُنا تھا کہ بتلاؤ " بکوبل " کہاں آیا ہے ؟ پھر فرمایا مِن قبلک وبالاٰخرۃ الخ

ایک صاحب نے فرمایا تھا، کہ قرآن میں ایک جگہ ہے اِدھر اللہ اُدھر اللہ، بیچ میں اونٹنی کا بچہ، یعنی اس آیت میں فقال لہم رسولِ اللہ ناقۃ اللہ، الشمس [۱۲] (پھر کہاں ان کو اللہ کے رسول نے، خبردار رہو! اللہ کی اونٹنی سے) اور بہت سی ایسی خرافات گڑھ رکھی ہیں۔ یہ تصرف فی الالفاظ ہے۔

معانی میں تصرف فاسد

بعضے معانی میں تصرف فاسد کرتے ہیں بعضے محض بعض لوگ شہرت یا تجارت کے لئے قرآن مجید کا ترجمہ یا تفسیر محض اپنی رائے سے یا اہل زمانہ کے مذاق کے اتباع سے لکھ لکھ کر شائع کرتے

؎۱ پانچواں نام کیو، چھٹا تعل اور ساتواں لعل ہے ۱۲ مولانا محمد عاشق الٰہی صاحب مدظلہ

ہیں اور اس زمانہ میں اس کا فسادِ عظیم برپا ہے، ائمہ فن نے تصریح کردی ہے کہ جبتک فنون عربیہ وعلوم شرعیہ میں کہ تعداد ان کی چودہ، پندرہ تک پہنچی ہے طاقت ومہارت نہ ہو تو تفسیر میں کلام کرنا حرام ہے۔ کیا اہل تحقیق کے تراجم وتفاسیر کافی نہیں ہیں؟ جو ان آراء کاسدہ داہواء فاسدہ کی حاجت ہوئی ؎

فی طلعۃ الشمس مایغنیک عن زحل

سورج کے ہوتے ہوئے زحل کی کیا ضرورت ہے؟

اس لئے ساتویں کوتاہی کے آخر پر جو مضمون عرض کیا ہے اس کو پھر یاد دلاتا ہوں کہ ——— ایسے تراجم وتفاسیر کی خرابیوں میں مبتلا نہ ہوجائیں۔

آدابِ تلاوت میں کوتاہیاں

نویں کوتاہی یہ ہے کہ اس کی تلاوت کے وقت اس کے آداب کا لحاظ نہیں کیا جاتا نہایت بے دلی سے، بے رغبتی سے، بے عظمتی سے، جتنا پڑھنا ہوا جھٹ پٹ بوجھ سا اتار کر نام کرکے اٹھ کر چلتے ہوئے، بالخصوص رمضان میں تو بعض حفاظ ایسا پڑھتے ہیں کہ قرآن کے حقوق بھی فوت ہوتے ہیں اور مقتدیوں کے حقوق بھی!

بعض نے تلاوت میں ایک اور طریق اختراع کیا ہے کہ ——— ایک قاری نے ایک آیت پڑھی دوسرے نے دوسری بلکہ کبھی ایک نے آیت کا ایک ٹکڑا پڑھا اور دوسرے نے پورا کیا، بعض دفعہ سب مل کر گلا ملاکر پڑھتے ہیں اور اگر ایک کی سانس لینے سے دوسرا آگے بڑھ گیا تو وہ پھر درمیان کے اجزاء چھوڑ کر آگے سے شریک ہو جاتا ہے۔

یہ سب ظاہر ہے کہ ادبِ قرآن کا ضائع کرنا ہے اور اس میں تغنّی مذموم وقطعِ کلمات اور اختلالِ نظم یہ مفاسد علیحدہ رہے۔

تلاوت کے آداب

تلاوت کے آداب بہت ہیں مگر طریق ذیل انشاء اللہ تعالیٰ سب کا جامع ہے۔

*۔ جب قرآن پڑھنے کا ارادہ کرے، وضو کرکے روبقبلہ، اگر سہل ہو، ورنہ جیسے موقع ہو خشوع کے ساتھ بیٹھے۔

*۔ یہ تصور کرے کہ حق تعالیٰ مجھکو فرمائش کرتے ہیں کہ ہم کو پڑھ کر سناؤ۔

*۔ یہ تصور کرے کہ اگر کوئی مخلوق مجھ سے ایسی فرمائشیں کرتی تو میں کیسا پڑھتا؟ تو خدا تعالیٰ کی فرمائشیں کی تو زیادہ رعایت چاہیئے اور اس کے بعد تلاوت شروع کرے۔

اور جب یہ تصور ضعیف ہو جائے تلاوت بند کرکے اسی مراقبہ کو پھر تازہ کرے، البتہ اگر تکثیرِ تلاوت مقصود ہو اور اتنی مہلت نہ ہو کہ مقید ہو کر بیٹھ سکے تو ان آداب میں تخفیف ہو سکتی ہے۔ مگر تجوید بقدر واجب میں تخفیف ممکن نہیں۔

عمل سے غفلت

دسویں کوتاہی یہ ہے کہ بعضے سب طرح کے لیپ پوت کرلیتے ہیں مگر جو نزول سے مقصود اعظم ہے، اور قرآن کا سب سے بڑا حق ہے یعنی ــــ عمل، اس کا کچھ بھی اہتمام نہیں کرتے، چونکہ اس کے اعتقاد کی ضرورت میں کسی کو کلام نہیں اس لئے ہم اس میں تطویل نہیں کرتے۔ البتہ یہ امر قابل تنبیہ ہے کہ "عمل کا طریقہ وہی معتبر ہے جو سلف نے بتایا" اور عمل کرنے میں ان سب علوم کو دخل ہے جن کا صحیح و حجت ہونا خود قرآن نے بتلایا ہے یعنی حدیث و فقہ و کلام و فنِ فرائض و تصوف، جو سلف کے خلاف نہ ہو۔

افسوس! بعضے لوگ اس وقت قرآن کا اتنا ہی حق سمجھتے ہیں کہ اس کی قسم کھالی، بیمار کو اس کی ہوا دے دی، اس سے فال نکال لی، بچہ کا نام نکال لیا، چوری کے شبہ میں لوٹے پر "یٰسین" پڑھ کر اس کو گھما دیا، کوئی مرگیا دو چار ختم پڑھوا دیئے، یا کہیں کہیں دستور ہے کہ ایک قرآن کے عوض میت کے سارے گناہ فروخت کر ڈالے یا تعویذ بنا کر بازو پر باندھ لیا۔

افسوس! کیا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تئیس سال تک اس کا نزول اور مخالفین کی اذیت پر تحمل بس ان ہی مقاصد کے لئے تھا؟؟

یہ دس کوتاہیاں ہیں جو بطورِ نمونہ کے بیان کی گئیں کسی میں ایک ہے، کسی میں متعدد، کسی

میں مجموع اور یہ سب متعلق تحصیل کے تھیں، اب اس کے ملحقات میں سے ایک کوتاہی۔ استماع کے متعلق ذکر کر کے اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

الفاظ و معنی کے آداب میں کوتاہیاں

وہ گیارہویں کوتاہی یہ ہے کہ اس کے الفاظ یا معنیٰ کا ادب بھی ملحوظ نہیں رکھا جاتا۔ چناں چہ جہری نماز میں "قراءۃ امام" کی طرف توجہ نہیں کی جاتی حالانکہ امر فاستمعوا لہ سورہ الاعراف [۲۰۳] (تو اس کی طرف کان لگائے رہو) کو داخل نماز کے وجوب کے لئے کہا گیا ہے، خارج نماز کے تلاوت کرنے والے کی آواز پر اپنے دنیوی مخاطبات میں آواز کو بلند کیا جاتا ہے حالانکہ لا ترفعوا اصواتکم فوق صوت النبی (سورہ الحجرات) [۱] یعنی بلند نہ کرو اپنی آوازیں نبی کی آواز سے) علماء نے درس حدیث کے وقت رفع صوت کو منع کیا ہے۔ فضلاً عن القرآن (چہ جائیکہ قرآن مجید)۔

اگر کوئی پڑھنے والا غلط پڑھتا ہے اس کو بتلایا نہیں جاتا، حتیٰ کہ اساتذہ اپنے شاگردوں سے سنتے ہیں اور نہیں ٹوکتے اور وہ غلطیاں عمر بھر کے لئے ان کی گلوگیر ہو جاتی ہیں ...!!

بعض حفاظ تراویح میں دوسری جگہ جا کر پڑھنے والوں کو کبھی کھٹکھٹا کر، کبھی کھنکھار کر، کبھی غلط بتلا کر پریشان کرتے ہیں، کیا قرآن مجید سننے کا یہی ادب ہے؟

اور اسی طرح استماع معانی یعنی وعظ کے وقت بعضے آدمی آپس میں باتیں کیا کرتے ہیں۔

حالاں کہ آیۃ واذا قرئ القرآن الخ (اور جب قرآن پڑھا جائے)۔ سے اور آیہ فما لھم عن التذکرۃ معرضین (پھر کیا ہوا ہے ان کو کہ نصیحت سے منہ موڑتے ہیں) سے یہ حرام ہے ہاں کسی عذر سے وہاں نہ بیٹھ سکنا یا اٹھ کر چلے جانا، مضائقہ نہیں وہاں حاضر رہ کر دوسری طرف مشغول ہونا یہ مذموم ہے۔

غرض یہ سب مذکورہ کوتاہیاں اور جو ان کے اشباہ و نظائر ہوں ان سب کا تدارک کرنا ضروری ہے۔ جیسا ہم مضمون کے درمیان میں ہر ایک کے تدارک کا نہایت آسان، آسان طریقہ بھی بتلاتے آئے ہیں، ورنہ اندیشہ ہے کہ قیامت میں کہیں ہماری وہی حکایت نہ ہو۔ وقال الرسول یارب ان قومی اتخذوا ھذا القرآن مھجوراً۔ الفرقان [۳۰] (اور کہا رسول نے اے میرے رب میری قوم نے ٹھہرایا ہے اس قرآن کو جھک جھک) پھر اس وقت کی حالت دیکھ کر یہ کہنا پڑے۔

نعوذ باللہ من غضب اللہ وغضب رسول اللہ (یعنی ہم اللہ سے اللہ کے غضب سے اور اللہ کے رسول کے غضب سے پناہ پکڑتے ہیں) مگر وقت ہوگا کہ لاینفع النادم ندمہ حیث ان الندم عمل وھو دار الجزاء لا دار العمل۔ اللّٰھم وفقنا لما تحب وترضیٰ واجعل آخرتنا خیرًا من الاولیٰ (یعنی شرمسار کو شرمندگی نفع نہ دے گی اس وجہ سے کہ ندامت ایک عمل ہے اور وہ دار الجزاء ہے نہ کہ دار العمل۔

قرآن سے نام نکلوانا ادب کے خلاف ہے

نیز بعض متفرق کوتاہیاں قرآن مجید کے معاملہ میں کہ اس کے الفاظ یا معانی یا نقوش یا اس کے مقاصد واغراض ادب کے خلاف ہیں۔ اور بھی خیال میں آئیں وہ بلالحاظ کسی خاص ترتیب کے معروض ہیں۔

(۱) بعض کی عادت ہے کہ بچہ کا نام رکھنے کے لئے قرآن مجید میں کسی خاص طریقہ سے جو خود ان کا مقرر کیا ہوا یا ان کے کسی معتقد فیہ سے (عام اس سے کہ اس اعتقاد کا مبنیٰ صحیح ہو یا غلط) منقول ہوتا ہے غور کرتے ہیں تو اتفاق سے اس موقع پر کوئی نام لکھا ہوا مل گیا تو وہ، ورنہ کوئی حرف جو شروع سطر وغیرہ میں مل گیا لے کر اس حرف سے جو نام شروع ہو وہ نام متعین کر دیتے ہیں۔ اور اگر جاہل ہوئے تو خود سمجھتے ہیں ورنہ دوسرے جاہل کو یوں سمجھاتے ہیں کہ قرآن مجید سے اس نام کا رکھنا نکلا ہے بعضے اس نام نکلوائی پر کچھ نذرانہ بھی وصول کرتے ہیں اور جہلا یہ سمجھ کر دیتے ہیں کہ حضرت نے بڑی توجہ سے عالم غیب کا راز منگا دیا ہے ان کی خدمت ضروری ہوگئی ہے۔ —— قرآن مجید میں جس غرض کے لئے موضوع نازل ہوا ہے جس کی تصریح خود کلام مقدس میں ہے۔ کتابٌ انزلناہ الیک مبارکٌ لیدّبّروا آیاتہ ولیتذکر اولوا الالباب (ص: ۲۸) (یعنی) برکت والی کتاب ہے جو ہم نے آپ کی طرف اتاری ہے تاکہ دھیان کریں لوگ اس کی باتوں پر اور تاکہ سمجھیں عقل والے)۔ جس کا حاصل دین کا علم وعمل ہے، اور اگر اس پر کوئی شخص کاربند ہو اور برکت کے لئے اپنی کسی مباح غرض میں بھی اس سے کچھ اقتباس کرلے تو مضائقہ نہیں۔ بشرطیکہ اس میں کسی حد شرعی سے تجاوز نہ ہو لیکن قرآن مجید سے ان اغراض میں ایسے طور پر کام لینا کہ گویا قرآن

اسی کام کا رہ گیا ہے۔ جس کا قرینہ اور علامت یہ ہے کہ اس کے علم اور اس پر عمل کی طرف کبھی توجہ نہ کی جائے مگر ایسے موقعوں پر قرآن یاد آئے کیا یہ ظلم وضع الشئی فی غیر محلہ (بیجا استعمال) نہیں ہے؟ پھر اس پر اور مزید اگر یہ سمجھا جائے کہ اس بچہ کا یہ نام ہونا یہ مفہوم قرآنی ہے، کیا یہ افترا علی اللہ نہیں ہے؟ خاص کر وہ دوسری صورت کہ اگر حرف "خ" نکل آیا تو خدا بخش نام کو قرآن مجید کی طرف منسوب کرنا افترار در افترار ہے... !!

پھر اس پر کچھ وصول کر لینا کریلا اور نیم چڑھا کی مثال کا مصداق ہے۔ کیا یہ اشترار دنیا بالقرآن کی اقبح الافراد نہیں ہے؟

اگر نام برکت کا مقصود ہے اول تو وہ قرآن کے ایسے مطالعہ پر موقوف نہیں، حضرات انبیاء علیہم السلام کے نام پر، نام رکھدو، اور "اسماء حسنی الہیٰہ" میں سے کسی نام کے ساتھ عبد لگا کر رکھدو، بالخصوص عبداللہ وعبدالرحمان کی بالتعیین تو ترجیح وارد ہے، اور اگر قرآن سے ہی اس نام کا تلبس مقصود ہے تو کسی عالم محقق سے رجوع کیجئے، وہ قرآن کے کسی مضمون یا کسی لفظ کی مناسبت کے لحاظ سے خواہ، قرآن دیکھ کر ایسے طریقہ سے کہ اس میں غلو نہ ہو جیسا عنقریب نمبر ۲ میں آتا ہے۔

یا قرآن کی بے دیکھے کسی اپنی محفوظ آیت سے کوئی نام بتلادیں گے، نہ بس کی ضرورت، اور نہ اس اعتقاد کی اجازت کہ قرآن میں اس نام رکھنے کا حکم نکلا ہے،

اس قسم کی خرابیاں ان بندگان زر نے پھیلائی ہیں جو عوام کی نظر میں کوئی دینی امتیاز رکھتے ہیں۔ مثلاً خود مکر و فریب سے پیر بن گئے ہیں، یا کسی بزرگ کی اولاد میں ہوئے فی الواقع یا بالادعا ایسے امور کی نسبت حضرت عارف شیرازی[1] کا ارشاد ہے۔ د

دام تزویر مکن چوں دیگران قرآن را (قرآن کو دوسروں کی طرح جھوٹ کا پھندہ نہ بناؤ۔

---

[1] خواجہ حافظ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ (۷۱۵ھ/ ۱۳۱۵ء) ان کی زندگی میں سات بادشاہ یکے بعد دیگرے حکمراں ہوئے۔ حافظ قرآن، عارف باللہ تھے، تفسیر، کشاف کا حاشیہ لکھا، معقول و منقول کی تطبیق کی۔ شیراز کے سبزہ زار "خاک مصلّے" میں (۷۹۱ھ/ ۱۳۸۵ء) میں دفن کئے گئے۔ تاریخ وفات بھی "خاک مصلّے" سے برآمد ہوئی ہے۔ بجو تاریخش از خاک مصلے ع ۷۹۱ یعنی اس کی تاریخ کو خاک مصلے سے تلاش کرو۔ ۱۲ محمد علی

قرآن سے فال نکالنا

(۲) بعضے کسی مقصدِ مباح یا غیر مباح میں اوفق بالمصلحۃ پہلو کی تعیین کے لیے اور بعضے اس سے بڑھ کر کسی گذشتہ واقعہ کے معلوم کرنے کے لیے قرآن مجید میں فال دیکھتے ہیں اس کے کسی مضمون سے اپنے مطلب کے مناسب کوئی بات نکال لیتے ہیں، اور اس کی صحت کے معتقد ہوتے ہیں۔

افسوس! یہ آفت نیم علم لوگوں میں ہے، کیونکہ بے علم آدمی مضمون ہی کو نہیں سمجھے گا جو ماخذ ہے "فال" کا بخلاف امراول کے نام لکھا ہوا دیکھ لینا، یا کسی حرف کا کوئی نام سوچ لینا یہ تو عامی بھی کر سکتا ہے۔

ہاں زبردستی کوئی بے علم یہاں بھی بین السطور ترجمہ دیکھ کر یا کسی ذی علم سے اس آیت کا ترجمہ پوچھکر نیم عالموں میں داخل ہو جائیں تو اور بات ہے،

بہرحال یہ کام وہ کریگا جو اول قرآن کو الٹا سیدھا کچھ سمجھے اس لیے ان لوگوں پر زیادہ افسوس ہے، اور اس ناتمام علم سے اس کو "استخارہ" پر قیاس کیا جاتا ہے جب مقیس علیہ ثابت ہو مقیس بھی جائز!

بعض فال دیکھنے والوں کا یا اکثر ان عام لوگوں کا جو جلسۂ فال میں موجود ہوں، یہ اعتقاد ہوتا ہے، کہ گویا خدائے تعالیٰ نے قرآن سے یہ خبر دیدی ہے، تو اب اس میں احتمال نقیض کا احتمال محال ہے، اور نہایت جرأت سے کہتے ہیں کہ واہ صاحب! کیا قرآن میں غلط لکھا ہے؟ افسوس! ان حرکات پر ہنسی شروع ہو کر اخیر میں رونا آتا ہے!

خوب سمجھ لینا چاہئیے کہ نمبر ایک میں جو بعضی شکایتیں مذکور ہوئی ہیں کہ —— قرآن مجید کے علم و عمل کو چھوڑ کر، اس سے یہ کام لینا، یا اس کو مدلول قرآن اور فرمودۂ حق سمجھنا جو کہ افرادِ ظلم و افترا سے ہیں، یہاں بھی یاد دلائی جاتی ہیں کہ دونوں جگہ مشترک ہیں، اور ان کے علاوہ اور بھی بعض خاص تنبیہات قابل عرض ہیں۔

قرآن مجید میں تمام علوم ہونے کے معنی

مثلاً اس میں اس اعتقاد کے ساتھ کہ قرآن مجید میں اس واقعہ کے متعلق یہ خبر نکلی ہے ۔
" قرآن مجید میں تحریفِ معنوی لازم آتی ہے "، کیونکہ ظاہر بات ہے، کہ قرآن کی تفسیر دوسری ہے جس میں یہ واقعہ ہرگز داخل نہیں اور اگر کسی پڑھے لکھے ...... کو یہ شبہ ہو کہ قرآن مجید میں تمام علوم ہیں جیسا کسی بزرگ کا قول ہے ؎

جمیع العلم فی القرآن لکن ۔ تقاصر عنہ افہام الرجال ط
تمام علم قرآن میں ہے لیکن لوگوں کی ، عقلیں اس کے سمجھنے سے عاجز ہیں

سو یہ واقعہ بھی اسمیں ضرور ہے ، چنانچہ بعض اہلِ کشف نے قرآن مجید سے قیامت تک کی پیشن گوئیاں کی ہیں، اور وہ صحیح بھی ہوئی ہیں، سو جواب یہ ہے کہ قرآن مجید میں تمام علوم کے ہونے کے یہ معنی ہی مسلّم نہیں کہ علم "کونیات" کو بھی عام ہے بلکہ وہ ...... علم شرعیات ہے کہ قرآن اس کے تمام اصول پر حاوی ہے مگر وجہ دلالت و طریق استنباط، بعض علوم میں غامض ہے ، کہ بعضے علماء بھی نہیں سمجھ سکتے، اس لیئے دوسرے مرجح کی حاجت واقع ہوئی ۔
رہا بعض عرفاء کا کچھ "کونیات" کو مستنبط کرنا تو وہ ازقبیل تفسیر نہیں ہے ، جیسا اہلِ فال کا اعتقاد ہے، بلکہ ازقبیل تعبیر ہے کہ ———— اصول اس کے خود دقیق ہیں، جو اہلِ فال کے خواب میں بھی نہیں آئے ، اور باوجود اس تمام دقت کے پھر وہ ظنّی ہیں، کیونکہ وہ خود اصول ہی کشفی ہیں، جن کی ظنی ہونے پر اہلِ حق کا اتفاق اور ان کے کلام میں اس کی تصریح ہے ، پھر اس فال دیکھنے والے کو بزرگوں کے اس قول و عمل سے انتفاع کا کیا حق رہا ؟

فال اور استخارہ کا فرق ؟

مثلاً اس کا استخارہ پر قیاس کرنا ، کہ محض قیاس باطل ہے کئی وجہ سے ایک تو یہ کہ استخارہ دلیل شرعی سے ثابت ہے ، اور یہ بقیود مذکورہ کسی دلیل صحیح سے ثابت نہیں۔

ؔ۱ استخارہ کا مفہوم خیر طلب کرنا ہے نہ کہ خبر ! عبدالرؤف

دوسرے یہ کہ خود مقیس علیہ بھی واقعاتِ گذشتہ کی تحقیق کے لئے نہیں،
مثلاً کسی کے یہاں چوری ہو جائے، تو استخارہ اس غرض کے لئے نہ جائز، اور نہ مفید کہ چور معلوم ہو جائے، جیسا فال والے، اس قسم کی حکایتوں کو نہ بطور ظرافت کے بلکہ بطور اعتقاد کے بیان کیا کرتے ہیں۔

استخارے کے ساتھ اعتقادِ باطل کا ہونا

کسی بادشاہ کا موتیوں کا ہار گم ہو گیا تھا، اس نے دیوانِ حافظ میں فال دیکھی، رات کا وقت تھا، چراغ ایک کنیز کے ہاتھ میں تھا، یہ مصرع نکلا ؎

چہ دلاور ست دُزدی کہ بکف چراغ دارد

یعنی چور کتنا بہادر ہے، جس کے ہاتھ میں چراغ ہے

بس بادشاہ نے فوراً اسی کنیز کو پکڑ لیا، اور تلاشی لینے سے اس کے پاس برآمد ہوا۔ اوّل تو ان قصوں کی کوئی سند صحیح نہیں، ثانیاً اگر ایسا واقعہ ہوا ہو تو اتفاق پر محمول ہوگا، کیونکہ ملازمت کی کوئی دلیل نہیں، اور اگر تجربہ سے ملازمت پر استدلال کیا جائے، تو ہم بطور معارضہ کہتے ہیں، کہ اگر ایسا ہوا ہے، تو "بیس بار اس کے خلاف ہوا کہ فال میں کچھ نکلا اور واقعہ کچھ اور تھا" تو تجربہ یعنی تکرارِ مشاہدہ سے ملازمت ثابت ہوئی یا عدمِ ملازمت؟
غرض فال کا مقیس علیہ یعنی استخارہ، واقعۂ گذشتہ کے "علم" کیلئے نہ مفید اور نہ جائز،

تا بغال چہ رسد

اور اگر کوئی استخارہ کو اس غرض کے لئے سمجھے ہوئے ہے تو وہ اپنے غلط خیال کی اصلاح کرے کہ "بالکل اعتقادِ باطل ہے"
اور یاد رکھنا چاہیئے کہ جس طرح اس سے واقعۂ گذشتہ نہیں معلوم ہوتا، اسی طرح واقعۂ آئندہ بھی کہ فلاں بات یوں ہو گی، معلوم نہیں کیا جا سکتا،

بس استخارہؒ کا صرف ...... اتنا اثر ہے، کہ جس کام میں تردد ہو، کہ یوں کرنا بہتر ہے ؟ یا یوں ؟ یا یہ کہ، کرنا بہتر ہے ؟ یا نہ کرنا ؟ تو اس عملِ مسنون سے (کہ حاصل اس کا دعا ہے اس امر کی کہ جو میرے لئے مصلحت ہو میرا قلب اس پر مطمئن ہو جائے اور ویسا ہی سامان غیب سے ہو جائے) دو اثر ہوتے ہیں۔

* قلب کا اس شق پر مجتمع ہو جانا،
* اور اس مصلحت کے اسباب میسّر ہو جانا، بلکہ خواب نظر آنا بھی ضروری نہیں ـــ

من قال سوی ذاک فقد قال محالا۔ یعنی (جس نے اس کے علاوہ کہا بیجا کہا)

اور بعض بزرگان دین سے جو بعضے "استخارے" اس قسم کے منقول ہیں جس سے واقعہ صراحۃً یا اشارۃً خواب میں نظر آجائے، سو وہ استخارہ نہیں ہے، بلکہ خواب نظر آنے کا عمل ہے۔

. پھر یہ اثر بھی اس کا لازمی نہیں، خواب کبھی نظر آتا ہے، کبھی نہیں۔ ـــــــــ

ـــــــ اور خواب بھی اگر نظر آیا تو وہ محتاج تعبیر ہے، اگرچہ صراحت سے نظر آئے، پھر تعبیر بھی جو کچھ ہوگی وہ ظنی ہے یقینی نہیں، اس میں اتنے شبہات تو بتو ہیں پس اس کو استخارہ کہنا یا مجاز ہے اگر ان بزرگوں سے یہ تسمیہ منقول ہو، ورنہ اغلاط عامہ سے ہے۔

اسی لئے محققین ایسے امور، اپنے خاص ہی لوگوں کو بتلاتے ہیں کہ ان کے قلوب بھی منور ہوتے ہیں اور عقائد بھی مطہر ہوتے ہیں، طہارتِ عقیدہ کی بدولت غلو فی الدّین (دین میں حد سے زیادہ بڑھنا) سے محفوظ ہوتے ہیں، اور نورانیت کے قلب کے سبب ان کا انکشاف و منام راجح الصدق ہوتا ہے جو حقیقت ہے ظن کی، ورنہ عوام پر تو اضغاثُ احلام (پراگندہ خواب) ہی غالب ہوتے ہیں مثلاً ایسی فال وغیرہ کی بنا اور اعتماد پر کسی مسلمان سے بدگمان ہو جانا اور کسی قول یا فعل یا خیال غیر مشروع کا مرتکب ہو جانا یہ خاص خرابیاں اس عمل فال میں ہیں اور یہی حکم سب ہے عارفین کے کلام سے فال لینے کا غرض یہ عمل مروج طریق پر بالیقین مذموم ہے۔

---

[1] اگر کوئی مندرجہ ذیل دعا ۴۰ مرتبہ بعد نماز فجر ہر روز پڑھا کرے اور اپنے جائز مقصد کے لئے دعا کرے تو ان شاء اللہ حاجت پوری ہوگی۔

یَا حَیُّ یَا قَیُّومُ لَا اِلٰهَ اِلَّا اَنْتَ بِرَحْمَتِكَ اَسْتَغِیْثُ اَصْلِحْ لِیْ شَأْنِیْ کُلَّهٗ وَلَا تَکِلْنِیْ طَرْفَةَ عَیْنٍ " محمد علی

اگر کسی طالب کو یہ وسوسہ ہو کہ اس تقریر سے تو فال کا محض بے اصل ہونا ثابت ہوتا ہے۔ حالانکہ احادیث میں صاف موجود ہے یعجبہُ الفال الصالح اونحوہٗ ۔ اسی طرح اکثر بعضے معتبر بزرگوں سے قرآن یا کلام عرفار سے تفاؤل لینا منقول ہے۔

تو جواب اس کا یہ ہے کہ منشا راس شبہ کا اشتراک لفظی ہے، ایک شریعت کی اصطلاح ہے وہ ثابت اور ایک غلاط کی اصطلاح ہے وہ غیر ثابت۔

اس ثابت بالسنہ وعن الاکابر کی اصل آتنی ہے کہ کسی شخص کو کچھ تشویش یا فکر ہے اس وقت اتفاق سے یا کسی قدر قصد سے کوئی لفظ خوشی و کامیابی کا اس کے کان میں پڑا یا نظر سے گذرا تو رحمتِ الٰہیہ " سے جو امید ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس کو پہلے سے تھی، وہ اس لفظ سے اور قوی ہو گئی پس حاصل اس کا — تقویتِ رجاء رحمت ہے اس سے آگے اختراع اور ابتداع ہے۔

قرآن مجید عملیات اور ناجائز اغراض

(۳) بعضے قرآن مجید کو ناجائز اغراض میں، بطورِ عملیات برتتے ہیں، یہ تو عملی تقصیر ہے اور پھر غضب یہ کہ اس کو برا نہیں سمجھتے اور یوں کہتے ہیں کہ صاحب ہم کوئی "سفلی عمل" تو نہیں کرتے قرآن کی آیتیں پڑھتے ہیں — یہ علمی یعنی اعتقادی تقصیر ہے۔

اول تو اگر جائز ہی اغراض میں عملیات کے طور پر مگر غلو کے ساتھ برتتے، یعنی نہ علم سے غرض رکھے نہ عمل سے، جب قرآن کی یہ آیتیں ڈھونڈھی جائیں تو اسی غرض سے کہ اس سے دنیا کا فلاں کام ہو جاتا ہے اور اس سے فلاں مطلب نکلتا ہے۔ جیسے بعض امرار کے گھر میں اسی غرض سے رکھا رہتا ہے کہ

* جب کوئی بیمار ہو گیا، اس کو قرآن کی ہوا دیدی۔
* ایک مصحف نہایت خفی قلمی یا مطبوع تعویذ بنا ہوا رکھا رہتا ہے، جب کوئی بیمار ہوا گلے میں ڈال دیا۔ وَمِثْلُ ذَالِكَ

سلہ

اس کا بھی اس تقریر سے جو نمبر اول میں مذکور ہے غیر مرضی ہونا ثابت ہے اور اگر وہ اغراض بھی ناجائز ہوں جیسے :-

(۱) یٰسین پڑھ کر چور کا نام نکالنا۔

(۲) ناجائز موقع پر محبت کی تدبیر یا زوجین میں یا باہم اقارب میں تفریق کی یا بلا اذنِ شرعی مطلق دو شخصوں میں تفریق کی تدبیر کرنا۔

(۳) کسی کو ہلاک کر دینا۔

(۴) دستِ غیب کے ایسے عمل کرنا کہ روپے رکھے ہوئے مل جایا کریں۔

(۵) جنات کو تابع کر کے ان سے کام لینا گو جائز ہی کام ہو اور ناجائز کا تو کیا پوچھنا ... ؟

پس اگر ایسے ناجائز اغراض ہوں تو ناجائز کام کے قصد و اہتمام کا معمولی گناہ تو ہے ہی جو سب جانتے ہیں، یہاں وہ گناہ اس لئے اور بھی شدید ہو جائے گا کہ اس شخص نے "کلام پاک کو ناپاک غرض کا آلہ بنایا"

پس اس کی ایسی مثال ہو گئی جیسے نعوذ باللہ کوئی قرآن کو بازاری عورت کی خرچی میں دیکر منہ کالا کیا کرے کوئی مسلمان جس میں ذرا بھی دین کی عظمت ہو اس کو جائز سمجھ سکتا ہے ؟

اور اگر ان اغراض کے ناجائز ہونے میں خفا رہ ہو، تو مفصلاً اہل فتویٰ سے تسلی کر لیجئے۔

مختصراً اتنا یہاں بھی لکھے دیتا ہوں کہ اوّل تو چور کا نام نکلنا اس عمل سے کچھ تعلق نہیں رکھتا، یہ عامل کے یا کسی صاحبِ مجلس کے خیال کا تصرف ہے، اس کا سمجھنا مسمریزم جاننے پر موقوف ہے اور حاضرات وغیرہ جو عامل لوگ کرتے ہیں وہ اگر سب نہیں تو اکثر تو اسی قبیل سے ہیں تو اس صورت میں قرآن پڑھنا یہ نرا دھوکہ دینا ہے!

پھر یہ کہ جو نام نکلتا ہے اس کے صحیح ہونے کی کوئی دلیل نہیں، اکثر ایسا ہوتا ہے جب چاہے آزما لیا جائے کہ ایک عامل کے عمل سے ایک شخص کا نام نکل آیا، دوسرے کے عمل سے دوسرے شخص کا، مگر جو شخص پہلے کو چور سمجھتا ہو وہ اس دوسرے عامل کے پاس سے اس وقت بالکل علیحدہ ہو جانا چاہئیے، جب یہ ایسی بودی ـــــ بنیاد ہے تو کسی شخص کو محض اس بنیاد پر چور سمجھ لینا یقیناً یا ظناً کہاں جائز ہو گا؟ پھر اگر اس پر تشدد کیا یا زبان سے اوروں کے

روبرو اس کا نام لیا تو یہ گناہ اور بڑھنے شروع ہوئے۔

دست غیب سے آمدنی اور تسخیر جنات ناجائز ہے

اور حُبّ و بغض مذکورین اور اہلاک کا ناجائز ہونا تو محتاجِ بیان نہیں۔ شاید دستِ غیب بالمعنی المذکور یا تسخیرِ جنات بغرضِ مباح میں شبہ ہو، تو سمجھ لیجئے کہ اس دستِ غیب میں یہ ہوتا ہے کہ جنات اس کام پر مسلّط ہو جاتے ہیں کہ بعضے عمل میں تو وہی روپیہ جس کو یہ خرچ کر چکا ہے وہ جہاں بھی ہو وہاں سے اٹھا لاتے ہیں اور بعض عمل میں دوسرا روپیہ جس جگہ سے ان کے ہاتھ آئے نکال لاتے ہیں۔

سو اس کی تو ایسی مثال ہے جیسے کوئی شخص خاص اس کام کے لئے آدمیوں کو نوکر رکھے کہ چوری کر کر کے مجھکو دیا کرو، اس نے یہی کام جنات سے لیا۔ اور چوری کے ناجائز ہونے کا کس کو انکار ہو سکتا ہے؟ اور اگر شبہ ہو کہ ممکن ہے کہ وہ جن اپنے پاس سے لے آتے ہوں تو چوری کہاں ہوئی؟ سو اوّل تو امکان سے دوسرے احتمالات کی نفی نہیں ہو سکتی، دوسرے اگر اپنے ہی پاس سے لاویں تب بھی ظاہر ہے کہ خوشی سے نہیں لاتے۔ ورنہ اوروں کو لاکر کیوں نہیں دیتے؟ محض جبر عمل سے لاتے ہیں تو کسی کو مجبور کرنا کہ اپنا مال مجھ کو دیدے خود حرام ہے اور اس تقریر سے تسخیر جنات کا ناجائز ہونا سمجھ میں آجائے گا۔

یعنی کسی آدمی سے جو نہ اس کا غلام شرعی ہو، نہ نوکر ہو، نہ اس کے زیر تربیت ہو، کوئی کام جبراً لیا جائے گو وہ کام گناہ کا نہ ہو تو یہ ظلم اور تعدّی ہے اس عامل نے اسی طرح اس جن سے کام لیا ہے جو عمل سے مقہور ہو چکا ہے اور یہ وسوسہ تو نرا جاہلانہ ہے کہ اسماء وکلمات الٰہیہ سے عمل چلانا کیسے گناہ ہو گیا؟

دیکھئے اگر کوئی شخص بڑا مجلّد قرآن زور سے کسی کے سر میں اس طرح مار دے کہ وہ مر جائے تو کیا یہ قتل اس وجہ سے کہ بواسطہ قرآن مقدس کے ہوا ہے، جائز ہو جائے گا؟ اور کیا عدالت اس پر داروگیر نہ کرے گی؟ کہ اس نے تو قرآن سے مارا ہے، اس لئے مجرم نہیں، بس اسی سے اس کو بھی سمجھ لیجئے البتہ اگر قرآن مجید کے علم و اتباع کو اصلی کام سمجھکر اس پر کاربند ہو اور کسی موقع

پر کسی جائز کام کے لئے کوئی آیت پڑھ لکھ لے تو ناجائز نہیں۔

قرآن مجید کو آلۂ کسب بنانا

(۴) بعض لوگوں نے قرآن مجید کو آلۂ کسب دنیا و جلب مال کا بنا رکھا ہے، مختلف طور سے۔

بعض تو تراویح میں اُجرت پر سُناتے پھرتے ہیں، بعضے مردوں پر تیجے میں یا چالیسویں تک یا اس کے بعد بھی پڑھنے کا پیشہ کر لیتے ہیں، ان کا ناجائز ہونا مُکرّرات و مُکرّرات علماء کے فتاویٰ میں طے ہو چکا ہے۔

بعض تو اور بھی غضب کرتے ہیں یعنی یہ بھی نہیں کہ صرف عقدِ اجارہ کے بعد ہی پڑھا کریں بلکہ پہلا جو پڑھا ہوا ہے، اس کو کچھ لے کر بخشتے ہیں یہ تو اچھا خاصہ مبادلہ اور بیع ہے، جو اس اجارہ سے بھی بڑھکر ہے کہ اجارہ میں بعض اہل تحمل تاویل تو چلاتے ہیں گو چلتی نہیں، یہاں تو اس کی بھی گنجائش نہیں۔

بعض اس کے مطالب کے بیان، یعنی وعظ پر نذرانہ لیتے ہیں اور فی نفسہ اس کے جائز و ناجائز ہونے میں تو سرِدست اس لئے کلام نہیں کرتا کہ اس میں طول ہے، لیکن جو ہیئت اس کی شائع ہے کہ اس کو پیشہ مستقل بنا لیا ہے، اسی لئے سفر کرتے ہیں، زبان سے مانگتے ہیں، جس امر حق سے نذرانہ میں کمی آنے کا اندیشہ ہو اس کو بیان نہیں کرتے اور اس " حرفہ " میں سہولت دیکھ کر سینکڑوں جاہل ..... واعظ بن کر خلقِ خدا کو گمراہ کر رہے ہیں کیا ان مفاسد پر نظر کر کے بھی اس کو جائز کہا جا سکتا ہے؟

البتہ تعلیم قرآن کی نوکری اور اسی طرح واعظ کی نوکری، اس میں اگر اور کوئی خرابی نہ ملالے تو مضائقہ نہیں۔

قرآن میں تحریف

(۵) قرآن مجید کی آیات کو بعض اوقات غیر معنی مقصودہ میں نطقًا یا کتابتہً برتا جاتا ہے۔

مثلاً جنتری پر یہ آیت لکھدی لقد خلقنا الانسان فی احسن تقویم (التین) [-۴] یعنی (ہم نے بنایا آدمی خوب سے انداز سے پر) جس کا حاصل یہ دعویٰ ہے کہ ہماری جنتری " احسن تقویم " یعنی عمدہ جنتری ہے، یا کسی کتاب کی لوح پر کوئی آیت لکھدی جس میں مطبع یا صاحب مطبع کے نام کے نام کے مناسب کوئی لفظ یا معنی ہوں یا کوئی شخص گذرا ہے " باؤ " یہ کہہ دیا کہ اس کی مذمت قرآن میں ہے باؤ بغضب من اللّٰہ (البقرۃ) [۹۰] (پھر اللّٰہ کا غصہ لے کر) یہ سب تحریف ہے جس سے توبہ واجب ہے، اور بعض اوقات اس میں بعضے اہل علم جن کو کسی دوسرے فن میں زیادہ شغف و انہماک ہوتا ہے مبتلا ہو جاتے ہیں۔

چنانچہ احقر نے ایک معقولی کے کلام میں اس جملۂ قرآنیہ الا لنعلم من یتبع (البقرۃ) [-۱۴۳] (مگر اس واسطے کہ معلوم کریں کون تابع رہے گا) کے مشہور اشکال کے جواب میں یہ توجیہہ دیکھی ہے کہ مراد یہاں "علم تفصیلی" ہے۔ جو حادث ہے، پس اب وہ اشکال نہ رہا، حالانکہ یہ کھلی تحریف ہے کیوں کہ اصطلاحِ معقول پر علم تفصیلی عینِ معلومات ہے، تو اس کو علم کہنا محض اصطلاح ہے بطور اس کے علم کے ہو گیا ہے، سو وہ معنی مصدری نہیں ہے کہ اس سے نعلم کا اشتقاق ماننا صحیح ہو اور علم تفصیلی جس سے نعلم مشتق ہو سکتا ہے، وہ معنی مصدری لغوی ہے اور اس کے معنی ہیں انکشاف ایک جزئی کا، سو وہ جب حق تعالیٰ کی طرف منسوب ہوگا اس کا مصداق و منشاء انتزاعِ قدیم ہوگا اور اس کے مقابل جو اجمالی ہے اللّٰہ تعالیٰ اس سے منزّہ ہے۔ اور جو علم اجمالی اہلِ معقول کی اصطلاح ہے وہ عین ذات ہے۔ سو ان اصطلاحوں کے خلط سے کس قدر خبط ہو گیا۔

اسی طرح "صوفیہ کی تفسیر کو تفسیر سمجھنا جائز ہے" تحقیق اس کی احقر نے "کلید مثنوی" میں لکھی ہے اور اقتباس ہماری اس مبحث سے خارج ہے کہ حقیقت میں اس کا ایراد من حیث القرآن نہیں ہے بلکہ تشبیہ بالوارد فی القرآن وشتان بین التمثیل والتبدیل۔

سلہ مہاراجہ رنجیت سنگھ والی پنجاب نے ایک صاحب سے کہا کہ ہمارا نام قرآن شریف میں نہیں ہے؟ انہوں نے کہا حضور! موجود ہے۔ دیکھیے قرآن میں کان من الکٰفرین۔ "کان" کو کانا پڑھا، رنجیت سنگھ کانے تھے ۱۲

(۶) بعض لوگ قرآن کو بے وضو چھوتے ہیں یا لکھتے ہیں، اس میں کاپی نویس اور تعویذ لکھنے والے بہت مبتلا ہیں، اسی طرح ورق بردار اور پتھر جمانے والے یا پریس مین، ان سب کو باوضو رہنا چاہیئے۔ ورنہ پاک کپڑے سے چھوئیں۔

(۷) بعضے لوگ قرآن مجید کو پشت کی طرف یا اپنی نشست کی جگہ سے نیچے یا متبذل جگہ پر رکھدیتے ہیں۔ یا قرآن کے اوپر کوئی کتاب یا قلم دوات وغیرہ رکھدیتے ہیں یا قرآن میں دوسرے کاغذات یا غلاف میں قرآن کے اوپر عینک وغیرہ رکھدیتے ہیں، یہ سب خلاف ادب ہے۔ البتہ سفر میں اگر اسباب وصندوق وغیرہ میں مسطور ہو تو بمجبوری بعض آداب میں تخفیف ہوجاتی ہے۔ اسی طرح اس پر بہت متبذل میلے کپڑے کا غلاف باوجود وسعت بدلنے کے ایک گونہ قلتِ ادب ہے، گو درجہ حرمت تک نہ ہی،

(۸) قرآن مجید جب ایسا کہنہ ہوجائے کہ اس سے انتفاع ممکن نہ ہو، تو اس کو پاک جگہ دفن کردینا چاہیئے۔ مگر اس پر مٹی نہ ڈالے بلکہ جس طرح مسلمان میت کی قبر میں تختے وغیرہ رکھ کر مٹی دیتے ہیں اسی طرح کرنا چاہیئے۔

ایسے ہی اگر کوئی قرآن ایسا غلط لکھا ہو کہ اصلاح دشوار ہو تو اس کو بھی دفن کردینا چاہیئے اس میں اکثر لوگ جو سستی کرتے ہیں وہ "دریدہ" ہو کر منتشر ہوجاتا ہے اور افسوس ہے! کہ وہ ردی میں جاکر دواؤں کی پڑیوں میں یا بچوں کے بعض کھلونوں میں استعمال کیا جاتا ہے ایسا کرنا ہم لوگوں کی کتنی بے غیرتی ہے ۔۔۔۔!!

(۹) جس روشنائی میں کسی نجس چیز کا میل ہو اس سے قرآن لکھنا یا جس کپڑے میں ایسا قوی شبہ ہو اس کا غلاف بنانا یا جس وارنش میں ایسی چیز ہو اس کو جلد پر ملنا یہ سب گناہ ہے، چنانچہ ظاہر ہے۔

(۱۰) قرآن کی کتابت یا طباعت میں تصحیح کا اہتمام نہ کرنا یہ ایسی بلا کی بات ہے جس کا ضرر دور تک اور دیر تک وبال جان رہے گا، جتنے لوگ پڑھیں گے اور جب تک (خواہ دو سو برس کیوں نہ ہوں) یہ مصاحف رہیں گے، اس بانی مسبب کو اس گناہ کا حصہ ملتا رہے گا۔

اس وقت ذہن میں یہی "امور عشرۃ" حاضر ہوئے لیکن اگر کوئی امر رہ بھی گیا ہوگا تو انشاء اللہ تعالیٰ ان میں جو اصول کی جا بجا تقریر ہوئی ہے وہ امر بھی ان میں داخل ہوگا۔

وَاللّٰہُ الْمُوَفِّقُ لِکُلِّ مَا یَرْضٰی اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی۔

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے حقوق میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ متعلق بحضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم)

آپ کے جو احسانات وعنایات امت کے حال پر متوجہ و مبذول ہیں، ان کی کمیت وکیفیت پر نظر کرکے یہ حکم یقینی ہے، آپ کے حقوق امت کی گردن پر اس قدر کثیر ہیں کہ قیامت تک ان سے سبکدوشی قریب بہ محال ہے، لیکن باوجود کثرت کے وہ سب حقوق تین کلی کے احاطہ میں آئے ہوئے ہیں۔

(۱) محبت!

(۲) متابعت،

(۳) عظمت،

اور ہر چند کہ ان تینوں میں اپنی اصل حقیقت کے اعتبار سے باہم ایسا تعلق اور تلازم ہے کہ ایک کا وجود بغیر دوسرے کے ممکن ہی نہیں، لیکن بلا خیالِ معنی اگر صرف صورت کے درجہ کا لحاظ کیا جائے تو یہ تینوں کہیں کہیں علیحدہ علیحدہ بھی خیال میں آسکتے ہیں۔

اس وقت چونکہ اکثر طبیعتیں محض صورت پر قناعت کئے ہوئے ہیں، اس لئے ان امور کا جدا جدا موجود ہونا بکثرت واقع ہو رہا ہے اور اس معاملہ میں یہی بڑا جدید انقلاب ہے جس سے سلف صالح مبرا تھے، چنانچہ ان حضرات کے تاریخی واقعات کو جو کہ مشہور اور کتب

احادیث سیر میں مذکور ہیں۔

اس وقت کے اکثر مسلمانوں کے معاملات کے ساتھ (جن میں کچھ بطورِ نمونہ کے ذیل میں بعنوان کوتاہی مرقوم ہوتا ہے) موازنہ کرنے سے اس حکم کی صحت بداہۃً معلوم ہو سکتی ہے اور اس مضمون سے اسی انقلاب پر تنبیہ اور اس کی اصلاح کی طرف ترغیب توجہ مقصود ہے۔

جنابِ رسولِ مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ متجددین کا معاملہ

حاصل اس کا اختصار کے ساتھ یہ ہے کہ جو طبائع زمانہ کے "جدید رنگ" میں رنگے گئے ہیں ان میں تو یہ کوتاہی مشاہد ہے کہ وہ جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ صرف اس قدر دلچسپی رکھتے ہیں کہ دوسری اقوام یا مذاہب سے مقابلہ کی گفتگو کے موقع پر آپ کی سوانح عمری میں سے یا آپ کے بعض اقوال وافعال کی حکمتوں میں سے (خواہ ان کی حقیقت تک ان کے ذہن کو رسائی ہوئی یا نہ ہوئی ہو) صرف وہ حصہ جس کو تمدن سے تعلق ہے محض اس غرض سے بیان کر دیتے ہیں کہ آپ کی عظمت اور آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہو جاوے، اور اسی کو — اسلام کی خدمت اور آپ کے "ادائے حقوق" کے لئے کافی سمجھتے ہیں۔ باقی نہ اتباع کو ضروری سمجھتے ہیں، نہ محبت کا کوئی اثر پایا جاتا ہے۔

بلکہ اتباع کو تعصب اور محبت کو وحشت سمجھتے ہیں اور سببِ خفی اس کا یہ ہے کہ اس زمانہ میں سب سے بڑا مقصد — جاہ وعزت کو دیا گیا ہے، جس کے مطلوب ہونے کا ہم کو بھی انکار نہیں، مگر کلام اس میں ہے کہ آیا وہ مطلوب بالعرض ہے یا خود مطلوب بالذات ہے؟

بہرحال چونکہ اس کو کمال بالذات سمجھا جاتا ہے، اس لئے حضورِ اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے لاتعدُّ ولاتحصیٰ کمالاتِ حقیقیہ عظیمۃُ الشان میں سے ان کی نظر اسی کا انتخاب کرتی ہے اور دوسرے کمالات کا مثل محبتِ الٰہی وخشیت وزہد، صبر وتربیتِ روحانی، ومجاہدہ، وشغل بحق و دیگر فضائل علمیہ وعملیہ کا کبھی ان کی زبان پر نام بھی نہیں آتا۔

جس کا خلاصہ یہ نکلتا ہے کہ گویا آپ خاص اسی غرض کے لئے مبعوث فرمائے گئے تھے کہ ایک

جماعت کو قوم بنا کر، اس کو دنیاوی ترقی کے وسائل کی تعلیم فرماویں، تاکہ وہ دوسری قوموں پر سابق وفائق رہ کر، دنیا میں شوکت کے ساتھ زندگی بسر کر سکیں۔

کیا قرآن مجید وحدیث میں گہری نظر کرنے والا آپ کی تعلیم کا یہ خلاصہ نکال سکتا ہے ؟

اہل اللہ کی صحبت و ملازمت کا التزام ضروری ہے

ان صاحبوں کو اپنی اصلاح کے لئے اس کی سخت ضرورت ہے کہ علماءِ محققین وعرفاء متحققین اہل دل کی صحبت وملازمت کا التزام کریں اور ان کی خدمت میں کچھ عرصہ تک بالکل سکوت اختیار کرکے رہیں، خود ان کے اقوال متفرقہ وارشاداتِ مختلفہ سے انشاء اللہ تعالیٰ ایک بڑی فہرست خیالات کی درست ہو جاوے گی، اس کے بعد جو شبہات رہ جاویں ان کو ادب کے ساتھ ان کے حضور میں پیش کریں اور توجہ وانصاف کے ساتھ جواب سنیں۔

ان کو اس زمانۂ سکوت میں جو اصول وقواعد سننے اور ذہن نشین کرنے کا اتفاق ہوا ہے، وہ اصول ان جوابوں کے سمجھنے میں نہایت معین ہوں گے اور اطمینان وشفائے کلی میسر ہوگی۔

اس طریقِ اصلاح کو جو حکمی مجرب ہے، سرسری خیال نہ فرماویں اور نیز حدیث میں "کتابُ الرّقائق وابوابُ الزّھد" کا بار بار مطالعہ فرماویں یہ کلام تو ان لوگوں کے مذاق پر تھا جو نئی روشنی کے تابع ہو رہے ہیں۔

اہلِ محبت کی کوتاہیاں

اب دوسرے باقی حضرات کی کیفیت معروض ہے کہ ان میں سے بعض میں محبت کے ظاہری آثار بھی پائے جاتے ہیں، مثلاً حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اشعار مدحیہ پڑھنا یا شوق سے سننا ان سے متاثر ہونا، کیفیت طاری ہو جانا، کبھی نعرہ لگانا، کثرت سے آپ کے ذکر مبارک کی مجالس منعقد کرنا، وَمِثلِ ذَالِکَ

لیکن ان میں یہ کوتاہی دیکھی جاتی ہے کہ اس کو کافی سمجھ کر حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادِ فرمودہ احکام کی بجا آوری اور متابعت کے اہتمام کو ضروری نہیں جانتے، اول تو

خود ان اعمال مذکورہ میں بھی، جن کو وہ محبت کے عنوان سے اختیار کرتے ہیں بسا اوقات حدود شرعیہ کو محفوظ نہیں رکھتے، پھر دیگر اعمال و معاملات میں تو نہ عنوان محبت رہتا ہے، نہ اعمالِ محبت!

- کسی کو نماز کا یا جماعت کا اہتمام نہیں
- کسی کو رشوت و ظلم سے باک نہیں
- کوئی مسکرات اور حرام لذات میں مبتلا ہے۔
- کوئی شرکیات و بدعیات کو دین سمجھکر کر رہا ہے، سبب اس کا بے علمی یا کم علمی ہے یا غلط علمی !!

اس کی اصلاح یہ ہے کہ کتب حدیث میں سے ٭ ابوابُ الایمان ٭ وابوابُ العلم ٭ وباب الاعتصام؟ بالکتاب والسنۃ ٭ ابوابُ الفتن ٭ ابواب الصفۃ جہنم واحوالُ القیامۃ کو مدت تک مطالعہ میں رکھیں اور ان ابواب کے مطالعہ سے علماء متبعین سنت سے محبت اور ان کی شناخت ہو جاوے گی اس وقت ایسے حضرات کی صحبت اختیار کرنا، اس اصلاح اور علاج کی تکمیل اور پختگی ہوگی۔

اپنے کو مقدس اور دوسروں کو جہنمی سمجھنے والوں کی کوتاہیاں

اب صرف ایک جماعت اور رہ گئی کہ جن کو "احکام" کی متابعت کا ضروری ہونا پیشِ نظر ہے اور کم و بیش اس کا اہتمام بھی ہے، مگر کوتاہی اتنی ہے کہ ان میں کیفیتِ خشوع اور لین کی نہیں آئی، جو غلبۂ محبت کو لازم ہے، جس سے پتہ چلتا ہے کہ ابھی ان میں اتباع کی حلاوت جو کہ محبتِ خاصہ کا اثر ہے پیدا نہیں ہوئی۔

پس ان کا طرزِ عمل بالکل ایسا ہے، جیسے کسی نوکر کو اپنے آقا سے صرف "ضابطہ کا تعلق ہو کہ خدماتِ مفوضہ میں تو فروگذاشت نہیں کرتا ــــــ ــــــ مگر وقت پورا کر دینے کے بعد) نہ ایک منٹ ٹھیرتا ہے، نہ کبھی کوئی زائد خدمت کرتا ہے، نہ آقا کا کبھی ذکرِ خیر کرتے ہوئے دیکھا گیا، نہ آقا کے اہل و عیال کا ادب و احترام کرتا ہے نہ اپنے خواجہ تاش لوگوں سے (یعنی ایک آقا کے نوکروں سے) کوئی واسطہ سلام و کلام کا رکھتا ہے یہ تو خشکی ہی تھی اس سے بڑھکر

یہ کرتا ہے کہ بجز اپنے سب خواجہ تاشوں کو نافرمان اور حقیر سمجھکر ان سے لڑتا بھڑتا ہے اور اپنی بجاآوریٔ خدمت پر ہمیشہ ناز اور فخر کرتا ہے اور اس وجہ سے سب سے الجھتا ہے اور جنگی فہمائش کرنے کا آقا نے نرمی کے ساتھ حکم دیا ہے، ان سے یہ سختی کرتا ہے اور جن "کوتاہیوں" سے آقا درگذر کر دیتا ہے، یہ ان میں بھی مدعی بن کر کسی کو مارتا ہے اور کسی کو گالی دیتا ہے ظاہر ہے اس صورت میں یہ "نوکر" آقا کی نظر سے گر جائے گا۔ اور ان بداخلاقیوں کی بدولت، جو کہ آقا کی مرضی کے بھی خلاف ہیں، اس کی خدمت کا اثر اور ثمرہ بھی ضعیف ہو جائے گا۔

بعینہٖ یہی حالت ان لوگوں کی ہے جو کسی قدر نماز، روزہ اور بعض معاملات بھی درست کر کے، اپنے کو مقدس اور متبع اور تمام دنیا کو فاسق، بدعتی، کافر، جہنمی سمجھ بیٹھتے ہیں اور خفیف خفیف امور میں بھی ان سے الجھتے ہیں اور ہر شخص سے فساد و فتنہ کرتے ہیں۔

بعضے ان عوام سے گذر کر علماء اور بعض ائمہ یا حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کی شان میں بدگمانی کر کے بدزبانی کرنے لگتے ہیں، اسی کو دین کی بڑی حمایت اور خدمت سمجھتے ہیں ......!!

جس ذات مقدسہ کے اتباع کا دعویٰ ہے، خود آپ کے ساتھ یہ برتاؤ ہے کہ آپ کا نام مبارک ادب سے لیتے ہیں، نہ کبھی آپ کا ذکرِ مبارک شوق سے کرتے ہیں، نہ کبھی ذکرِ مبارک سن کر گداختہ ہوتے ہیں، نہ درود کا کوئی معمول انہوں نے ٹھہرایا ہے نہ آپ کے محبوبوں (یعنی علماء و صحابہ و اہل بیت) سے ان کو کوئی تعلق، محبت و احترام کا معلوم ہوتا ہے!

ان امور میں بعض تو موجب خسران و عصیان ہیں اور بعض سببِ حرمان ہیں کیونکہ اخلاق ظاہرہ و باطنہ کی اصلاح فرائض میں سے ہے، جس میں خلل اندازی عصیان ہے، اسی طرح آپ کے وارثان علوم سے عظمت و احترام کا تعلق اور آپ کی امت سے شفقت و رحمت کا تعلق رکھنا بھی واجب ہے، جس کا ترک یقینی خسران ہے۔

باقی جو آداب خاصہ و حقوق محض عباداتِ نافلہ کے درجہ میں ہیں، ان کی کمی بھی "خاص برکات" سے محرومی تو ضروری ہے۔

اس کوتاہی کی اصلاح کاملین اہل اللہ کی صحبت اور کتب سیر نبویہؐ و حقوق مصطفویہ مثل "شفاء" قاضی عیاض رحمۃ اللہ وغیرہ اور کتب اخلاق و سلوک کا مطالعہ اور ان پر عمل کرنے کا اہتمام ہے۔

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ چند تعلقات؟

ہر امتی کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ہمارے چند تعلقات ہیں۔

- ایک تعلق یہ کہ آپ نبی اور ہم .... اُمتی!
- آپؐ حاکم اور ہم محکوم،
- آپؐ دارین میں محسن، ہم زیر بارِ احسان
- آپؐ محبوب، ہم..... مُحب

اور ان میں سے ہر تعلق جب کسی کے ساتھ ہوتا ہے تو اس پر خاص خاص حقوق و آداب کا مرتب ہونا معلوم اور مسلّم، اور معمول ہے پس جب آپ کی ..... ذاتِ با برکات میں سب تعلقات مجتمع ہوں اور پھر سب اعلیٰ اور اکمل درجے کے تو آپ کے حقوق بھی ظاہر ہیں کہ کس قدر اور کس درجے کے ہوں گے، ان سب کے ادا کرنے کا دل سے اور التزام سے ایسا اہتمام کرنا چاہیئے کہ وہ کثرت عادت اور استحضارِ الفت سے شدہ شدہ طبعی ہوجاویں اور پھر بھی آپ کے حقوق کے مقابلہ میں اپنی اس خدمت کو درحقیقت اس کا نفع اپنی ہی طرف عائد ہے، ناتمام سمجھے۔

یہ مختصر مضمون ختم ہوا اور اس کے ختم ہونے کے وقت یاد آیا کہ احقر نے ایک رسالہ "نشر الطیب" متوسط حجم کا سیرِ نبویہ میں لکھا ہے، میں امید کرتا ہوں کہ وہ اس مختصر کی شرح کے لئے کافی اور بقصدِ اعتقاد و عمل اس کا مطالعہ میں رکھنا، ان سب اصلاحات کے لئے ان شاء اللہ کامل ہوسکتا ہے، دعائے[1] اشاعت فرمایئے والسلام۔

---

[1] یہ کتاب شائع ہوگئی ہے اور کتب مکتبہ دار العلوم سے طلب فرمایئے ۱۲

تتمۂ سابقہ

یہ تتمہ پہلے مضمون سے الگ کوئی مضمون نہیں ہے بلکہ ایک درجہ میں گویا اُسی کی تفصیل اور شرح ہے، مضمونِ سابق میں زمانہ کا رنگ قبول کرنے والی طبائع کی نسبت جس کوتاہی کا بیان ہوا ہے اس کا تتمہ یہ ہے کہ ایسے لوگ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے تینوں حقوق میں تقصیر کئے ہوئے ہیں، متابعت ومحبت کا وجود نہ ہونا تو ظاہر ہے اور پہلے مضمون میں اس کو صراحت سے بیان کر دیا گیا ہے البتہ ان کے اس عمل سے کہ ان کی زبان یا قلم سے بعض ایسے مضامین صادر ہوتے ہیں کہ ان سے آپ کی عظمت یا آپ کے قانون کی عزت ظاہر ہوتی ہے، یہ شبہ ہو سکتا ہے کہ شاید وہ آپ کا حقِ عظمت ادا کرتے ہیں، لیکن اگر ذرا نظر کو عمیق کیا جائے تو ثابت ہو جائے گا کہ یہ احتمال بھی واقعیت نہیں رکھتا۔

جناب محمد مصطفٰے رسُول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت بحیثیت حامل وحی ہونے کے

حقیقت یہ ہے کہ آپ کی جس عظمت میں گفتگو ہو رہی ہے وہ عظمت ہے جس کے ساتھ آپ حامل وحی ہونے کی حیثیت سے متصف ہیں اور ان لوگوں کی تحریر و تقریر میں نظر کرنے سے اتنا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے قلوب میں آپ کی جو عظمت ہے، وہ اس حیثیت سے نہیں بلکہ ایک حکیم تمدن ہونے کی حیثیت سے ہے۔

کیوں کہ ان دو عظمتوں کے آثار کا موجود نہ ہونا ہمارے دعوے کی دلیل ہے۔ چنانچہ اعتقادِ عظمت نبوی کے آثار یہ ہیں کہ آپ کے احکام سنتے ہی یہ معلوم ہو کہ گویا حق تعالیٰ نے ہم سے خود فرما دیا ہے اور یہ کہ اس حکم کے قبول کرنے میں حکمت و مصلحت سمجھنے کا ہرگز انتظار نہ ہو۔

بلکہ اگر بادی النظر میں کسی حکمت کے خلاف بھی معلوم ہو، تب بھی اسی خوشی سے قبول کرے جیسے حکمت معلوم ہونے کے وقت کرتا اور نہ بدون حکمت سمجھے ہی اس حکم کی وقعت میں کچھ کمی

ہو بلکہ جس طرح ادنیٰ خدمت گار شاہی حکم سن کر مغلوب وَالِہٗ[1] ہو کر دیوانہ وار، اس کی بجا آوری کے لئے دوڑتا ہے اسی طرح اس کی کیفیت ہو جائے اور یہ کہ اس حکم کے خلاف کا مستحسن ہونا خیال میں بھی نہ آئے۔

بلکہ اجمالاً یوں سمجھیئے کہ بس تمام خیر و برکت اور حکمت و مصلحت اور فلاح و صلاح اسی میں منحصر ہے، خواہ ہمارا ذہنِ کوتاہ اس کی تفصیل تک پہنچے یا نہ پہنچے، بقول حضرت عارف گنجوی رحمۃ اللہ ؎

زُبان تازہ کردن باَقرارِ تو | نینگیختن علّت از کارِ تو

(آپ کے اقرار کے ساتھ زبان کو تازہ کرنا ہے نہ کہ آپ کے کام میں کوئی علت نکالنا)

سب سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال

صرف حکیم ممدّن ہونے کے لحاظ سے، جو اعتقادِ عظمت ہوتا ہے اس کے آثار یہ ہیں کہ حکم سن کر اتنا ہی اثر ہو، جو ایک مخلوق ذی رائے کی رائے کو سُنکر ہوتا ہے اور یہ کہ اس کے قبول کرنے میں یا اس کو بنظرِ وقعت دیکھنے میں اس کا بھی انتظار ہو کہ اس میں عقلی (اور عقلی میں بھی دنیوی) مصلحت کیا ہے؟ جب تک مصلحت نہ معلوم ہو اس میں سخت تردد و خلجان رہے اور ہرگز اس پر عمل کرنے میں شرحِ صدر نہ ہو۔

خود بھی ایک قسم کی تنگی اور جبرِ و تحکّم کا سا اثر رہے اور دوسروں کے سامنے بھی اس کا دعویٰ کرتے ہوئے، ایک گونہ خجلت اور بیوقعتی کی سی کیفیت رہے۔ اور بار بار اس حکم کی جانب مخالف کی ترجیح کا حکم اور اس کی تمنا کا قلب پر غلبہ رہے اور ہرگز اس کے صحیح ہونے کا دل، کھول کر حکم نہ کر سکے۔

بلکہ اس میں فکر رہے کہ کسی طرح اس کا شرعی ہونا ثابت نہ ہو اور جب اور کچھ نہ ہو سکے تو بعض تاویلات سے اس حکم کے شرعی ہونے کا انکار کر دے، کبھی اس کے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے میں شبہات پیدا کرے، بلکہ اس کو راویوں کی نقل کی غلطی

---

[1] وَلہ باب سمع سے آتا ہے وَالِہٗ اسم فاعل کا صیغہ ہے حیران ہونا ۱۲

یا ان کی رائے کی آمیزش کا اثر بتلاوے۔

کبھی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہونے کو تسلیم کرکے خود آپ کی نسبت کسی ضرورت و مصلحت وقت کے اتباع کا دعویٰ کرے اور چونکہ وہ مصلحت باقی نہ رہی لہٰذا اس حکم کو بھی موجود نہ سمجھے، غرض ہزاروں حیلے نکالے، مگر اس حکم کو نہ مانے یا اگر مانے تو اعتقاد سے نہ مانے "بلکہ بدنامی سے بچنے کو یا قومی شیرازہ کے منتشر نہ ہونے کی ضرورت سے ملنے یا اعتقاد ہی سے مانے، مگر نشاطِ خاطر کے ساتھ نہ مانے، بلکہ مذہبی مجبوری سمجھکر مانے اور یہ ان سب میں سے زیادہ سلیم و صالح طبائع کا حال ہے)

یہ وہ مراتب ہیں جو کم و بیش سب کفر سے ملے ہوئے ہیں، کوئی صریح کفر ہے کوئی خفی کفر ہے، کوئی کفر بننے کو ہے، کمالا یخفی علی المتفطن السلیم۔

جب دونوں اعتقادوں کے آثار جُدا جُدا معلوم ہوگئے، آگے ہر شخص کو مشاہدہ سے اپنے اندر بھی، ان آثار کا وجود و عدم معلوم ہو سکتا ہے اور اس سے ہمارے دعویٰ سابقہ کا صدق بخوبی واضح ہو جائے گا (اس مضمون کی شرح زیادہ تحقیق کے ساتھ مطلوب ہو، تو مضمون "عظمتِ وحی" رقمزدہ حضرت شیخ الہند) مولانا محمود حسن صاحب دامت فیوضہم جزو القاسم" کے نمونہ میں شائع ہوا ہے ملاحظہ فرمالیا جائے) ہماری اس تقریر کے یہ معنی نہ سمجھیں جائیں کہ احکام شرعیہ حکمت سے خالی اور عاری ہیں معاذ اللہ ــــــ بلکہ مقصود یہ ہے کہ ان کا اتباع اور ان کی خاص عظمت کا اعتقاد فہم حکمت پر موقوف نہ ہونا چاہیئے۔ ہاں وہ خود ایک مستقل علم ہے کہ اس کو اسرار شریعت کا لقب دیا جاتا ہے مگر اس کے اہل خواص علماء راسخین ہیں عوام الناس کو اس سے بجائے نفع کے ضرر کا احتمال غالب ہے کئی وجہ سے۔

ایک اس لئے کہ ان میں سب تو منصوص ہیں نہیں اجتہادی بکثرت ہیں جن میں احتمال خطا کا بھی ہے سو اگر کبھی اس کا غیر صحیح ہونا ظاہر ہو گیا اور عامی کے خیال میں اس حکم کی وہی حکمت یقینی تھی تو اس کے صحیح نہ ہونے سے اس حکم کو غیر صحیح سمجھ بیٹھے گا۔ بخلاف خواص کے کہ وہ اس یقینی علت اور مبنی حکم کا نہ سمجھیں گے۔ اس لئے حکم میں ان کو کبھی کوئی خدشہ نہ ہوگا۔

دوم اس لئے کہ کبھی کوئی مبنی اور حکمت صحیح معلوم ہوگی لیکن بعض اوقات وہ وجہ اور حکمت اس عامی کی نظر میں باوقعت نہیں ہوگی تو اس حکم کو بھی بے وقعت سمجھنے لگے گا۔

ہر حکمت نہ علّت ہے اور نہ مقصود بالذات

سوم اس لئے کہ ہر حکمت علت نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو علّت اور اصلی سبب سمجھکر کسی موقع میں اس کے موجود ہونے سے حکم ہی کے غیر موجود ہونے کا حکم لگا دے گا۔
چہارم یہ کہ ہر حکمت مقصود بالذات نہیں ہوتی بعض اوقات عامی اس کو مقصود بالذات سمجھکر کسی محل و موقع میں حکمت کے حاصل ہوجانے کو کافی سمجھکر تحصیل حکم کی ضرورت نہ سمجھے گا اور ان دونوں صورتوں میں (سوم و چہارم) میں اجتہادِ باطل کا باب وسیع ہوجائے گا۔ مثلاً سفر میں مشقت پر نظر کر کے قصر کا حکم دیا گیا ہے لیکن یہ علت نہیں حتیٰ کہ اگر سفر میں مشقت بھی نہ ہو تب بھی قصر ہے اور اس طرح وضو شروع ہوا ہے۔ حکمتِ نظافت و طہارت سے، لیکن اگر طہارت و نظافت حاصل ہو تب بھی وضو سے استغنا نہ ہوگا۔

کُتّا پالنے کی ممانعت کی حکمت؟

پنجم یہ کہ عامی مخالفِ دین کے مناظرہ میں اس کو بیان کرے گا اور اور اگر وہ یقینی نہیں تو اس میں مخالف نے اگر خدشہ نکال دیا تو یہ مغلوب ہوجائے گا۔ اور اس میں اسلام کو اور اہل حق کو صدمہ پہنچے گا، مثلاً کسی نے کتا پالنے کی ممانعت کی یہ حکمت بیان کی کہ اس میں صفت سبعیت (درندگی) کی ہوتی ہے تو اگر کسی نے اس میں یہ خدشہ پیدا کیا کہ تعلیم کے بعد سبعیت نہیں رہتی، پھر کیوں ممنوع ہے؟ تو یہ شخص بہ زبان حال اس حکم کو بے بنیاد کہیگا۔ بخلاف راسخ فی العلم کے کہ وہ بجائے اس حکمت کے یہ کہے گا کہ ہمارے آقائے عظیم الشان کا یہ حکم ہے ہم نہیں جانتے کیا مصلحت ہے؟ تو اس شخص پر کوئی خدشہ ہی نہیں ہوسکتا۔ یہ شرح تھی مضمون متعلق حضرات محکوم الجدّت[1] کی، اس کے بعد اس مضمون سابق میں ان لوگوں

---

[1] جدت پسندی کے خوگر حضرات مراد ہیں ۱۲

کی کوتاہی کا بیان ہے، جن میں ظاہراً بعض آثارِ محبت کے بھی پائے جاتے ہیں۔
اس میں یہ بھی مذکور ہے کہ خود ان اعمالِ مذکورہ میں بھی جن کو عنوانِ محبت سے وہ اختیار کرتے ہیں، بسا اوقات حدودِ شرعیہ کو محفوظ نہیں رکھتے، اس کا تتمہ یہ ہے کہ یہ لوگ بھی درحقیقت تینوں حقوق کو ضائع کرتے ہیں، متابعت کی نفی تو ظاہر ہے۔

متابعت کی حقیقت

لیکن اگر غور کیا جائے تو ان کے قلب میں حقیقی عظمت و محبت بھی نہیں، گو زبان سے تعظیم و محبت کا دعویٰ کرتے ہیں، کیونکہ ہم مشاہدہ کرتے ہیں کہ اعتقادِ عظمت کے لئے یہ لازم ہے کہ اپنے ارادے اس معظم و مکرم کے ارادوں کے سامنے فنا ہو جائیں۔
چنانچہ کسی رئیس کے پاس کسی عظیم الشان باختیار افسر کا حکم ضابطہ کا یا نج (ذاتی) کا فوری حاضری کے لئے آئے۔ اور فوری بھی ایسا کہ وہ حاکم دروازہ پر ٹھیر کر جلدی طلب کرے تو اس وقت ہم اس کی حالت کا اندازہ، اس کی حرکات سے کرتے ہیں کہ ان میں اختیاریت کی شان پر اضطراریت کی حالت کو غلبہ ہوتا ہے، حتیٰ کہ اکثر امور اس وقت معمول کے خلاف اس سے سرزد ہونے لگتے ہیں اور وقار و متانت سب مرتفع ہو جاتا ہے اور یہ سب علامت ہے فنارِ ارادہ کی اور منشار اس کا وہی اعتقادِ عظمت ہے۔
اور فنارِ ارادہ کے لئے یہ لازم ہے کہ متابعت تعمیلِ ارشاد میں مبادرت و سبقت ہو، جب متابعت نہ ہوئی تو ظاہر ہے کہ حقیقی عظمت بھی دل میں نہ ہوئی اور جس طرح غلبۂ عظمت سے ارادہ فنار ہوتا ہے اسی طرح غلبۂ محبت سے بھی فنارِ ارادہ پیدا ہوتا ہے، گو دونوں کیفیتیں جُدا جُدا قسم کی ہیں مگر فنارِ ارادہ دونوں کے لئے لازم اعم ہے۔
جیسے حرارت کہ نار کو بھی لازم ہے اور دھوپ کو بھی پس جس طرح حرارت کے نہ ہونے سے دھوپ اور آگ کا معدوم ہونا لازم آتا ہے، اسی طرح جب متابعت نہ ہوگی محبت و عظمت دونوں کے معدوم ہونے کا حکم کیا جائے گا۔
اسی معنی میں حضرت عبداللہ بن المبارک کا ارشاد ہے ؎

لو کان حُبُّكَ صَادِقًا لا طعتہٗ　　إنَّ المُحِبَّ لِمَن یُحِبُّ مطیع ،

اگر تیری محبت سچی ہوتی تو، تو اس کی اطاعت کرتا، بیشک عاشق، محبوب کا فرمانبردار ہوتا ہے۔

البتہ ادنی درجہ کی محبت و اعتقادِ عظمت کا انکار نہیں کیا جاتا، لیکن شرعًا مطلوب ہے، ان دونوں کا غلبہ اور قوت جیسا کہ اس ارشادِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے لا یومن احدکم حتّٰی اکون احب الیہ من ولدہٖ ووالدہٖ والناس اجمعین تم میں سے کوئی مومن نہیں ہو سکتا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے بیٹے، باپ اور تمام لوگوں سے زیادہ عزیز نہ ہو جاؤں) اور ان لوگوں کا دیگر امورِ شرعیہ میں متابعت نہ کرنا تو ظاہر ہے۔

حضرات انبیاء وملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی

چنانچہ مضمونِ مذکور میں کچھ اس کی تفصیل بھی ہے لیکن خاص ان امور میں جن کو وہ عنوانِ محبت سے اختیار کرتے ہیں، اس متابعت کا معدوم ہونا اس مضمون میں مجملًا بیان کیا گیا ہے کہ ان میں بھی لبًا اوقات " حدودِ شرعیہ " کو محفوظ نہیں رکھتے۔ اس کی تفصیل ان لوگوں کے ان طریقوں کے دیکھنے سے ہو سکتی ہے مثلًا

● — یہ کہ آپ کی مدائح میں اس قدر غلوّ اور مبالغہ کرتے ہیں کہ اس میں دوسرے حضراتِ انبیاء اور ملائکہ علیہم السلام کی شان میں گستاخی ہو جاتی، مثلًا ؎

برآسماں چہارم مسیح بیمار است　　تبسم تو برائے علاج درکار است

(حضرت مسیح علیہ السلام چوتھے آسمان پر بیمار ہیں اور آپ کی مسکراہٹ علاج کے لئے درکار ہے)

اور مثلًا ؎

" شب و روز ان کے صاحبزادوں کا گہوارہ جنبان[1] تھا "

---

[1] ہلنے والا

"عجب ڈھب یاد تھا روح الامین کو بھی خوشامد کا"

نصوص قرآنیہ و حدیثیہ میں ان حضرات مقدسین کی تعظیم و ادب کا حکم وارد ہے پس ایسے طریقہ میں ترک متابعت نبویہ ہے۔

(۲) ●۔ یہ کہ بعض اوقات خود حق جل وعلیٰ شانہٗ کے حضور میں گستاخی ہوتی ہے مثلاً ؎

پئے تسکینِ خاطر صورتِ پیراہنِ یوسف محمدؐ کو جو بھیجا حق نے سایہ رکھ لیا قد کا

اور مثلاً ؎

طوافِ کعبہ مشتاقِ زیارت کو بہانہ ہے کوئی ڈھب چاہئے آخر رقیبوں کی خوشامد کا

نعوذ باللہ منہ اس کو ترکِ متابعت کی سب سے بڑی مثال سمجھنے میں کس کو کلام ہو سکتا ہے۔

(۳) ●۔ بعض اوقات خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی شان مبارک میں گستاخی ہو جاتی ہے۔ مثلاً اس مصرع سے حضور پُرنور کو مخاطب بنانا ؎

"اے نرگس شہلائے تو اور وہ رسم کافری ؎

الٰہی توبہ اس کو ترکِ متابعت کہہ کر ترکِ تعظیم کی دلیل بنانے کی کچھ ضرورت نہیں اس کا ترک تعظیم ہونا خود ظاہر ہے۔

(۴) ●۔ یہ کہ روایات موضوعہ "فضائل" میں بیان کرتے ہیں جس پر حدیث نبویؐ میں سخت وعید وارد ہے، ظاہر ہے کہ حدیث کے خلاف کرنا ترک متابعت ہے،

(۵) ●۔ ان قدائح وفضائل کے بیان میں بہت سے منکراتِ اعتقادیہ وعملیہ کو منضم کر لیا ہے۔ (۱) ایک ممنوعِ شرعی تو خود ان چیزوں کو ضم کر لینا اور ملا لینا ہے (۲) پھر ان ناپسند چیزوں کو مستحسن اور پسندیدہ سمجھنا اور ان پر اصرار کرنا دوسری خرابی ہے (۳) پھر جو ان منکرات کی اصلاح کرے ان سے عناد و بغض رکھنا یہ تیسری خرابی ہے۔

غرض ان کا یہ طریقہ ہمارے اس دعوے کی پوری دلیل ہے کہ ان میں متابعت نہیں ہے

ف۱

ف۲

یہ شرح تھی مضمون متعلق حضرات مدّعیانِ محبت کی۔

اس کے بعد اس مضمونِ سابق کے اخیر میں ان لوگوں کی کوتاہی کا بیان ہے جو متابعت ظاہری کا اوروں سے زیادہ اہتمام کرتے ہیں، مگر ان میں تعظیم و ادب اور شوق و محبت کی شان کم ہے۔

اس بیان کی شرح یہ ہے کہ ان میں غلبۂ ادب اور غلبۂ محبت کی کمی تو ظاہر ہے ہی، لیکن نظرِ غائر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ ان میں متابعت ہی کامل نہیں، کیوں کہ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشاداتِ قولیہ وعاداتِ فعلیہ کو دیکھنے سے بداہتہً بلکہ حسًّا ثابت ہوتا ہے کہ یہ طرزِ خاص:-

(۱) خشونت ـــــ (۲) تقشّف ـــــ (۳) تعسیر ـــــ (۴) تنفیر[1]

کا، آپ کو سخت ناپسند ہے اور جب یہ امور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو پسند نہیں اور برخلاف اس کے قرآن حدیث میں، خود حضور کی توقیر و ادب اور محبت میں اپنی جان پر بھی آپ کی ترجیح اور امت کے ساتھ تبشیر و تیسیر کے احکام وارد ہیں۔ تو ان میں خلل اندازی کرنا متابعت کے ساتھ کیسے جمع ہو سکتا ہے؟

اور اس میں مراتب مختلف ہیں۔

بعض تو حدِ خسران تک پہونچ گئے ہیں، ادب یا محبت کے حقوقِ واجبہ، اعتقادیہ یا عملیہ کو کھو بیٹھے ہیں، معتزلہ جناب رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم سے جبرئیل علیہ السلام کو اور اسی طرح جمیع انبیاء علیہم السلام سے تمام ملائکہ علیہم السلام کو افضل بتلاتے ہیں، جس کا جواب کتب کلامیہ میں مفصّل و مدلل مذکور ہے، یہاں صرف جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت، جبرئیل علیہ السلام پر مختصر طور پر سمجھ لینا چاہئے۔

———★———

[1] خشونت = درشتی، کھردراپن / تقشّف: موٹے جھوٹے کپڑے پہننا اور تھوڑی روزی پر بسر کرنا۔/ تعسیر: تنگی میں ڈالنا، / تنفیر۔ نفرت دلانا۔

رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کی افضلیت جبرئیل علیہ السلام پر

ان لوگوں کو شبہ ہو گیا ہے کہ قرآن مجید سے جبرئیل علیہ السلام کا آپ کے لئے معلم ہونا منصوص ہے اور ظاہر ہے کہ استاد بحیثیت استادی، شاگرد سے افضل ہوتا ہے اور اگر معلم کے افضل ہونے کو تسلیم نہ کیجئے، تو جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا امت سے باعتبار علم کے افضل ہونا ثابت نہ ہوگا، حالانکہ آپ اس حیثیت سے بھی بالاتفاق افضل ہیں۔

جواب اس شبہ کا یہ ہے کہ معلّم کی دو حیثیتیں ہوتی ہیں۔

ایک محض مبلّغ وسفیر ہوتا ہے جس کے متعلق محض بات کا پہنچا دینا ہے، اس میں معلم کا افضل ہونا ضروری نہیں، اگر بادشاہ اپنے وزیر کے پاس کسی خاص قاصد کے ہاتھ کوئی پیام بھیجے تو یہ قاصد وزیر سے افضل نہ ہوجائے گا؟

دوسری حیثیت استاد واتالیق ہونا جس کے متعلق متعلّم وشاگرد کی تربیت بھی ہے اس میں معلّم کا افضل ہونا ضروری ہے۔ سو جبرئیل علیہ السلام آپ کے معلّم بالمعنیٰ الاوّل ہیں نہ کہ بالمعنیٰ الثانی۔

کیونکہ مُربّی بمعنیٰ ثانی اتالیق وتربیت دہندہ حسب تصریح حدیث۔ علّمنی ربی فاحسن تعلیمی وادّبنی ربی فاحسن تادیبی۔ میرے رب نے مجھے تعلیم دی کیا اچھی تعلیم دی۔ میرے رب نے مجھے ادب سکھایا کیا اچھا ادب سکھایا" خود حضرت جلّ وعلا شانہٗ بلاواسطہ ہیں اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ امت کے لئے معلّم بمعنی ثانی ہیں، بس آپ کی اور جبرئیل علیہ السلام کی معلّمیت میں بڑا فرق ہے پس معتزلہ کی یہ بہت بڑی گمراہی ہے، عقیدہ واجبہ ہیں۔

---

[1] ۔ امام مالک رحمۃ اللہ سنہ ۹۳ھ ۱۲، ش سنہ ۱۷۹ھ ۹۵، ش حضرت ابوعامر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے پوتے ہیں۔ آپ اسوقت تک منصب قضا پر نہ بیٹھے جب تک کہ ستر اہل علم شیوخ نے شہادت نہ دیدی کہ آپ اس کے اہل ہیں۔ آپ کی مجلس وقار کی مجلس تھی صاحب ہیبت، رعب داب والے تھے آپ کی مشہور حدیث کی کتاب موطا ہے جس میں تمام صحیح روایات ہیں۔ آپ بڑے محدث مفتی اور مجتہد تھے۔ امام مالکؒ تمام عمر مدینہ شریف ہی میں قیام پذیر رہے۔ مذاہب مالکیہ بلاد مغرب اندلس وغیرہ میں زیادہ پھیلا۔ امام شافعی حضرت عبداللہ بن مبارک وغیرہم نے آپ سے روایت کی ہے ۱۲ محمد علی

اور مثلاً میں نے ایک مقام پر بچشم خود دیکھا ہے کہ ایک صاحب نے ایک حدیث ڈھونڈنے کے لئے مؤطا امام مالک کا نسخہ الماری میں سے نکالا اور اس کو کھڑے کھڑے فرش پر زور سے پٹک کر مارا۔ اہل مجلس میں سے ایک شخص نے کہا کہ :-

"میاں حدیث کی یہ بے ادبی"؟

تو وہ جواب میں فرماتے ہیں "میں نے بے ادبی کیا کی ہے، اس کی گرد جھاڑی ہے" جب قیامت میں ان کی گرد جھڑیگی تب حقیقت معلوم ہوگی، سو یہ اس خشک دماغی کا اضلال ہے عل واجب ہیں، اللّٰھمّ احفظنا ولنعم ما قیل ؎

از خدا جوئیم توفیق ادب
بے ادب محروم ماند از فضل رب

(ہم اللہ تعالیٰ سے ادب کی توفیق طلب کرتے ہیں اس لئے کہ بے ادب اللہ تعالیٰ کے فضل سے محروم ہوتا ہے)

بے ادب تنہا نہ خود را داشت بد
بلکہ آتش در ہمہ آفاق زد

(بے ادب نے تنہا اپنے آپ کو ذلیل نہیں کیا ہے : بلکہ ساری دنیا میں آگ لگادی)

از ادب پر نور گشت ست ایں فلک
از ادب معصوم و پاک آمد ملک

ادب کی وجہ سے آسمان پر نور ہو گیا ہے اور فرشتے ادب کی وجہ معصوم اور پاک ہو گئے ھیں)

بد ز گستاخی کسوف آفتاب
خوشہ عزازیلے ز جرأت ردّ باب

آفتاب کا کسوف گستاخی کی وجہ سے ہو گیا۔ عزازیل (شیطان) بے ادبی کی وجہ سے راندہ درگاہ ہو گیا)

حدیث میں ایک گستاخ کا قصہ آیا ہے کہ وہ بائیں ہاتھ سے کھاتا تھا، حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دائیں ہاتھ سے کھانے کو فرمایا۔ اسے براہِ بے ادبی کہا کہ "میں دائیں ہاتھ سے کھا نہیں سکتا"! آپ نے فرمایا کہ (خدا کرے) تو اس سے کھا ہی نہ سکے بس وہ فوراً شل گیا۔

صحابہ کرام رضی اللہ تعالیٰ عنہم کا ادب

حضرات صحابہ رضی اللہ عنہم کا آپ کی طرف بیدھڑک نہ دیکھنا اور ایک بزرگ کا اس سوال کے جواب میں کہ تم بڑے ہو؟ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم؟ یہ کہنا کہ بڑے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ہی ہیں، مگر عمر میری زیادہ ہے۔ کیا قولی ادب کا کافی نمونہ نہیں؟ ایک بزرگ کا اس سننے کے بعد کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کمان ہاتھ میں لی تھی، تمام عمر بلاوضو کمان کو مس نہ کرنا، کیا قابلِ التفات و تقلید نہیں ہے؟

اسی طرح حضرات صحابہؓ کی عادت تھی کہ جب بیٹھتے ایک دوسرے سے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا حلیہ مبارک و شمائل و طرزِ عمل پوچھتے۔ چنانچہ شمائل ترمذی کی روائتیں اس میں صریح ہیں۔

حضرت عمر بن عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ خاص آستانۂ مبارکہ پر سلام پہنچانے کے لیئے قاصدوں کی ڈاک کا انتظام کرتے تھے، جمہورِ امت مدینہ طیبہ کی حاضری کا اہتمام کرتے رہے۔ اکثر سلف درود شریف کی کثرت رکھا کرتے تھے، خود حدیث میں ہے کہ جس مجلس میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور درود شریف نہ ہو وہ مجلس اہل مجلس کے حق میں موجب حسرت ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ گو یا امور مؤکدہ نہ ہوں مگر ان کی کمی موجب حسرت حرمان ہے اور جیسے کمی سے حرمان ہوتا ہے اسی طرح ان کے اہتمام و التزام سے گوناگوں برکت و فیضان ہوتا ہے، دنیا میں بھی اور آخرت میں پھر دنیا میں دینوی بھی اور اخروی بھی، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ایک صحابیؓ کو جب کہ انہوں نے کئی بار سوال و جواب کے بعد یہ عرض کیا کہ بس اب میں تمام وظائف کی جگہ درود ہی ٹھہرا لونگا یہ ارشاد فرمانا کہ " تو پھر تمہارے سب گناہ معاف ہوتے رہیں گے۔ اور سب فکروں کی کفایت

---

[1] ابو عیسیٰ محمد بن عیسیٰ بن سورہ ترمذی ۲۰۹ھ ۸۲۴ ش ۲۷۹ھ ۸۹۲ ش آخر عمر میں کثرت بکا کی وجہ سے نابینا ہوگئے تھے۔ بہت بڑے محدث تھے۔ آپ کی جلالت قدر، فراست، ذکاوت، قوت استدلال، حفظ اور شان اجتہاد کا اعتراف آپ کے اساتذہ نے بھی کیا ہے۔ ترمذی حدیث کی ایک مشہور کتاب اور ترمذ ایران میں ایک جگہ کا نام ہے ۱۲ محمد علی

ہوتی رہے گی" اس کی کافی دلیل ہے۔

عجیب وغریب واقعہ

اس وقت ایک عجیب الشان عظیم المکان فیضان حکایت یاد آتی ہے اسی پر اپنے اس مضمون کو ختم کرنا چاہتا ہوں، جس سے ثابت ہوگا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ تعلق بڑھانے سے خود آپ کی "عنائتیں" کیسی مبذول ہوتی ہیں، اس حکایت کو امام جلال الدین سیوطی[۱] رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے رسالہ "شرف محتم" میں سلسلہ وار سند سے لکھا ہے کہ وہ روایت کرتے ہیں شیخ کمال الدین رح سے اور وہ شیخ شمس الدین جزیری رح سے اور وہ شیخ زین الدین ۳ھ سے اور وہ شیخ عزالدین احمد فاروقی رح کے واسطے اور وہ اپنے والد شیخ ابواسحٰق ابراہیم رح سے اور وہ اپنے باپ شیخ عزالدین عمر سے رحمہم اللہ تعالیٰ کہ میں ۵۵۵ھ ۱۱۶۰ء ہجری میں حضرت سید احمد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ[۲] کے ساتھ سفر حج میں تھا، جب وہ مدینہ طیبہ پہنچے اور روضہ شریف پر حاضر ہوئے تو انہوں نے ان الفاظ سے سلام عرض کیا۔ السلام علیکم یا جدّی! وہاں سے جواب عطا ہوا وعلیکم السلام یا ولدی! کہ اس کو تمام اہلِ مسجد نے سنا، حضرت سیّد احمد رفاعی رحمۃ اللہ پر وجدِ شدید نے غلبہ کیا اور بڑی دیر تک رویا کئے اور شدّتِ شوق میں عرض کیا یا جدّاہ!

۱۔ حضرت علامہ جلال الدین سیوطی بن عبدالرحمٰن مصری رحمۃ اللہ علیہ چار سو کتابوں کے مصنّف ہیں۔ تمام علوم میں ماہر اور طاق تھے۔ آپ نے ۹۱۱ھ / ۱۵۰۵ء ش میں وفات پائی ۱۲ عبدالرؤف

۲۔ حضرت سیّد احمد کبیر رفاعی رحمۃ اللہ علیہ ۱۵ رجب ۵۱۲ھ / اکتوبر ۱۱۱۸ء ش کو مقام حسن (عراق) میں پیدا ہوئے اولیاء کرام کے سردار ہیں۔ بہت بڑے عالم باعمل متورع بزرگ تھے۔ حالت شیر خوارگی میں رمضان میں صرف بعد مغرب دودھ پیتے تھے، ۲۰ سال کی عمر میں تمام فنون مروجہ کی تکمیل کرلی ان کی خانقاہ میں بسا اوقات ایک لاکھ آدمیوں کا مجمع ہوتا تھا۔ ان ایک لاکھ کے طعام قیام کا انتظام حضرت سیّد احمد کبیر صاحب رح کی جانب سے تھا آپ کے خلفاء کی تعداد اسی ہزار ایک سو تھی آپ کی نماز جنازہ کے وقت نو لاکھ مرد وعورت کا مجمع تھا ایک شعر میں آپ کی ولادت، وفات کی تاریخ اور عمر کی مقدار کہی گئی ہے۔ ——————— (شعر صلا پر ملاحظہ فرمائیں حاشیہ میں)

ے فی حَالۃِ البعدِ روحی کنت اُرسلُھا
تقبل الارضَ عنی وھِیَ نا ئبتی

وَھٰذِہٖ دولۃ الاشباحِ قد حضرت
فامدد یمینک کی تحظیٰ بھا شفتی

(یعنی اے نانا جان! حالتِ بُعد میں، اپنی روح کو حضور میں بھیجا کرتا تھا، وہ نائب بن کر زمین بوس ہوجاتی تھی، اب جسم کی حاضری کی نوبت آئی ہے، سو ذرا اپنا دایاں دستِ مبارک بڑھا دیجئے؟ تاکہ میرے لب اس کے بوسے سے مشرف ہوجائیں) پس فوراً آپ کا ـــــ دستِ مبارک چمک اور دمک کے ساتھ قبر شریف سے ظاہر ہوا، اور ہزاروں آدمیوں نے زیارت کی اور سیّد رفاعی رحمۃ اللہ علیہ نے اس کا بوسہ لیا۔

اس کے بعد بلا سند دوسرا قصہ ان ہی کا لکھا ہے کہ جب سالِ آئندہ پھر حاضر ہوئے تو نہایت انکسار و مسکنت کے ساتھ عرض کیا ے

اِنْ قیل زرتم بِمَا رجعتم — یَا اکرمَ الرّسلِ مَا نقولُ

(یعنی اگر لوگ ہم سے پوچھیں کہ تم زیارت کر کے آئے تو کیا لے کر آئے؟ تو ہم جواب میں کیا کہیں؟) قبر شریف سے آواز آئی جس کو تمام حاضرینِ مسجد نے سُنا" ے

اِرجعنا بکلِ خیرِ — وَاجتمعَ الفروعُ وَالاصولُ

(یعنی تم یوں کہنا کہ ہم ہر طرح کی خیر لے کر آئے اور فروع و اصول جمع ہوگئے)۔

کیا یہ فضائل قابلِ رشک نہیں؟ سو یہ بھی تو سوچنا چاہیئے کہ بجز کمالِ اتباع وکمالِ محبت و کمالِ اعظام و اجلال کے اس دولت کا سبب اور بھی کوئی امر ہے؟ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون (المطففین، [۲۵] اور اس پر چاہیئے کہ ڈھکیں ڈھکنے والے) و المثل ھٰذا فلیعمل العاملون (والصّٰفٰت [۶۰] (ایسی چیزوں کے واسطے چاہیئے محنت کریں محنت کرنے والے)

یہ معاملات تو براہِ راست آپ کے ساتھ عمل میں لانے کے ہیں، باقی آپ کے اہلِ تعلق، اہل

صحبت، اہل قرابت، اہل ملت (یعنی خواص وعوام امت) کے ساتھ ادب ومحبت شفقت و رحمت وخدمت کرنا علیٰ حسبِ تفاوتِ مراتبہم، یہ سب بھی متمم ہیں، آپ کے ساتھ معاملہ رکھنے کے جن میں سے بعض واجب ہیں کہ ان میں خلل اندازی سے خسران ومعصیت ہوتی ہے اور بعض مستحب ہیں جن سے اعراض کرنا مفلسی اور محرومی کا باعث ہے۔

یہ بیان تھا ان لوگوں کا جو شوق میں کمی اور ادب میں خلل کرنے والے ہیں، پس محقق وہ ہے کہ ــــ سب مراتب حسیہ ومعنویہ واجبہ ومستحبہ کا جامع ہو کما قیل ؎

برکفے جام شریعت برکفے سندان عشق ۔۔۔ ہر ہوسناکے نہ داند جام وسندان باختن

گاہ درد دل سازگہ دردیدہ جا ۔۔۔ ہر دو جائے تست یا بدر الدجیٰ

مگر بمقتضائے آیت لا تغلوا فی دینکم (النساء) [۱۷۰] مت مبالغہ کرو اپنے دین کی بات میں) وآیت تلک حدود اللہ فلا تعتدوھا (س۔ البقرۃ) [۲۲۸] یہ اللہ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں سو ان سے آگے مت بڑھو)

مندوبات میں کمی کرنے والے مستحق ملامت نہیں

یہ سمجھ لینا بھی ضروری ہے کہ ان میں جو لوگ مندوبات (مستحبات) میں کمی کرنے والے ہیں ان پر ملامت یا ان کی تحقیر یا ان پر تشدد یا ان سے نفرت رکھنا یہ خود بوجہ تجاوز عن الشرع النبوی کے احداث فی الدین اور موجبِ ناخوشیٔ سرکار ہوئی وعلامت ترکِ اتباع وخلافِ ادب ومنافیٔ تعظیم دربارِ مصطفویؐ ہے۔

مسند احمد میں ایک حدیث اس باب میں صریح ہے کہ ایک صحابی رضی اللہ عنہ نوافل کو چھوڑے ہوئے تھے، نماز میں بھی، روزے میں بھی، صدقے خیرات میں بھی، دوسرے صحابی ان سے نفرت رکھتے تھے، حضور پر نور کے دربار میں یہ مقدمہ پیش ہوا آپ نے ان نفرت کرنے والے صحابیؓ کے انکار کو ناپسند فرمایا۔ احقر نے اپنے رسالہ حقیقۃ الطریقہ میں یہ حدیث پوری نقل کی ہے ولنعم ما قیل ؎

بزھد وورع کوش وصدق وصفا

ولیکن میفزائے بر مصطفیٰ

زہد و تقویٰ اور صدق و صفا میں کوشش کرو مگر مصطفیٰ ؐ سے آگے مت بڑھو۔

البتہ ایسے لوگوں کو اگر نرمی و ترغیب سے تکمیلِ مراتب مستحبہ کی طرف متوجہ کیا جاوے، عینِ خیر خواہی و مطلوب فی الدین ہے۔

ضروری تنبیہہ

اور ایک ضروری امر قابل تنبیہہ یہ ہے کہ بعض اوقات شوق و محبتِ نبویہ کی کمی کا غلط شبہ ہو جاتا ہے اور یہ شبہ توقیر و توجہ الی الذات کے غلبہ کے محل میں غیر عارف کو ہو جاتا ہے۔ لیکن فی الواقع وہ بھی محبت نبویہ ہی کا ایک لون ہے۔ شرح اس کی رسالہ نشر الطیب[1] میں بضمن حکمتِ درود شریف کی ہے۔

بس شرح ضروری سب جماعات کی حالت کی ختم ہوئی اور طریقِ اصلاح سب کا بقدر کافی اصل مضمون میں مذکور ہو چکا ہے، اس میں شرح کی حاجت نہ سمجھی، اصل مضمون کو دیکھ کر سب اپنی اصلاح کر سکتے ہیں۔

ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللّٰہ علیہ توکلت والیہ انیب وان ربی قریب مجیب۔

---

[1] ۔ نشر الطیب ہمارے حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رح کا ایک رسالہ ہے جو سیرت نبویہ پر ہے ۔ محمد علی

نماز کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ نماز)

بعد ایمان اعمال میں نماز کا جو درجہ ہے وہ کسی عمل کو حاصل نہیں اور اس کا مقتضیٰ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس کا ایسا خاص اہتمام ہوتا کہ اس میں کوئی نقص نہ رہتا مگر ہماری کم توجہی و غفلت نے اس کو بھی کوتاہیوں سے خالی نہ چھوڑا جن میں سے بعض کا بیان اس موقع پر کیا جاتا ہے اور اس کے قبل یہ امر بھی قابل عرض کر دینے کے ہے کہ نماز میں اختلال کا جو وبال ہے وہ اس خاص حیثیت کے اعتبار سے بہ نسبت دوسرے اعمال کے اختلال کے زیادہ ہے کہ نماز فرض ہے اور ہر دن رات میں پانچ بار فرض ہے اس میں کوتاہی کرنا حق تعالیٰ کو دن بھر پانچ بار ناخوش کرنا ہے۔

بخلاف دوسرے اعمال کے کہ بعض فرض نہیں اور یا فرض ہیں تو روزانہ فرض نہیں، جیسے روزہ "کہ سال بھر میں فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ کہ وہ بھی سال بھر میں فرض ہوتی ہے اور "حج" کہ عمر بھر میں ایک بار فرض ہوتا ہے اور زکوٰۃ اور حج تو سب پر فرض بھی نہیں ہوتا، یہ تفاوت تو نماز کو اور افعال سے ہے۔

ترک غیبت، ہر وقت فرض

اب رہ گئے تروک جو فرض ہیں یعنی معاصی کا ترک کرنا کہ وہ بھی روزانہ بلکہ ہر وقت فرض ہیں مثلاً غیبت کا ترک کرنا، ہر وقت فرض ہے اور اس امر میں یہ تروک بھی مثل نماز کے فرض دائمی ہیں، مگر اس پر بھی ان کا اختلال نماز کے اختلال سے دو وجہ سے کم ہے۔

ایک یہ کہ یہ تروک ارکان اسلام سے نہیں، کیونکہ فرائض سب ارکان نہیں، تو اس اختلال سے ارکان کی تفویت لازم نہیں آئی گو معصیت اس سے بھی ہوئی اور نماز رکن اسلام سے ہے تو اس کے اختلال سے ایک رکن کی تفویت لازم آئی اور رکن کو نظرِ شارع علیہ السلام میں ایک خاص مقصودیت و اہمیت ہے، اس لئے رکن کا فوت ہونا شارع علیہ الصلوۃ والسلام کو زیادہ ناگوار ہوگا۔

دوسری وجہ یہ بشہادتِ حس، ترک سہل ہوتا ہے فعل سے، کیونکہ ترک میں اکثر احتیاج اہتمام نہیں اور فعل میں اہتمام کی حاجت ہے اور جو چیز سہل ہوتی ہے اس کا وقوع اکثری ہوتا ہے، اس لئے جو تروک فرض ہیں ان کا وقوع اکثر ہوگا اور اختلال کم اور جو افعال فرض ہیں اگر پورا اہتمام نہ کیا جاوے تو ان کا اختلال اکثر ہوگا اور وقوع کم، پس نماز میں اختلال کا احتمال زیادہ ہوا اور ان تروکِ مفروضہ میں کم اور یہی مدعا تھا، پس ثابت ہوگیا کہ تمام اعمال میں خواہ وہ وجودی ہوں یا عدمی، ہوں نماز میں کوتاہی کرنے کا ضرر اکثر اور اشد ہوگا، اس لئے اس کی اصلاح نہایت "مہتم بالشان" ہوئی۔

اس کے بعد بطور نمونہ کے بعض ان کوتاہیوں کا ذکر ہوتا ہے جو کثیر الوقوع ہیں، تاکہ ان پر متنبہ اور ان کی اصلاح کی طرف توجہ ہو۔

نماز نہ پڑھنے والوں کی کوتاہیاں

سو ایک کوتاہی جس کے کوتاہی ہونے میں کوئی خفاء ہی نہیں یہ ہے کہ بہت لوگ خود نماز ہی کے مطلقاً پابند نہیں ہیں، اس کے معصیت ہونے میں تو کلام کرنے کی اس لئے ضرورت

نہیں کہ متفق علیہ ہے، البتہ یہ حضرات جو اس میں عذر پیش کیا کرتے ہیں ان کی نسبت مختصراً یہ کچھ لکھا جاتا ہے۔

بعضے یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم کو دنیا کی ضرورت سے اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی، مگر غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ محض بہانہ بازی وسخن سازی ہے، سببِ اصل بے پرواہی ولاابالی پن ہے، کم فرصتی مانع نہیں، کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ جس روز یا جس وقت ان کو فرصت ہوتی ہے تب بھی ان کو نماز کی طرف توجہ نہیں ہوتی، اگر یہ امر مانع تھا تو اس حالت میں تو یہ مانع مرتفع تھا، پھر ترک کی کیا وجہ؟ اس سے معلوم ہوا کہ اصلی مانع بے پروائی ہے، جو اس حالت میں بھی مشترک ہے۔

دوسرے اگر یہ مانع ہوتا تو اگر وقت پر فرصت نہ تھی اور اس لئے ادا نہ پڑھ سکے تھے، تو قضا کے لئے تو کوئی وقتِ خاص نہیں اور کسی نہ کسی وقت تو فرصت ہوتی ہے، اس وقت میں قضا پڑھ لیتے، جیسے نماز کی پابندی والوں کی عادت ہے کہ اگر کسی روز وقت نکل جاتا ہے، تو اہتمام کر کے قضا پڑھتے ہیں۔

تیسرے اگر بے پرواہی سبب نہ ہوتا تو اس کوتاہی پر قلق ہوتا، جیسا مطالب دنیویہ کے فوت ہونے پر مدتوں حسرت ہوتی ہے، اس کی فکر لگ جاتی ہے، اس کی تلافی کی کوشش کرتے ہیں، تدبیریں پوچھتے پھرتے ہیں، کیا ان بے نمازوں کو اس فکر و کوشش اور قلق و سوزش میں دیکھا جاتا ہے؟ ان قرائن سے سبب اصلی کی اچھی طرح تشخیص ہوگئی، اس کے علاج کے لئے دو امر کی ضرورت ہے۔

نمازوں میں بے پرواہی سے بچنے کا طریقہ

ایک یہ کہ تارک نماز کے وعیدوں میں غور کیا کریں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے شخص کو کافر فرمایا ہے، خواہ تاویل ہی سے فرمایا ہو اور ایسے شخص کا دوزخ میں جانا، پھر فرعون، ہامان، قارون کے ساتھ جانا ارشاد فرمایا ہے، اور قیامت میں سب سے اوّل پرسش نماز ہی کی ہوگی اور ان وعیدوں کی تقویت کے لئے دوزخ کے حالات پڑھا اور سنا کریں

انشاء اللہ تعالیٰ بے پرواہی جاتی رہے گی۔

دوسرا امر یہ کہ اپنے نفس پر جبر کرے کہ بدون ہمت کے کیسا ہی آسان کام ہو دشوار ہو جاتا ہے اور جبر کی دو صورتیں ہیں۔

ایک کہ کسی کو اپنے اوپر مسلّط کردے کہ وہ زبردستی اس کو وقت پر اٹھا کر کھینچ کر نماز پڑھوا دیا کرے۔

دوسری صورت یہ کہ نماز کے ترک ہونے پر کچھ ہی جرمانہ اپنے نفس پر مقرر کرے جس کی مقدار اتنی ہو کہ نہ بہت قلیل ہو کہ نفس کو کچھ ناگواری ہی نہ ہو نہ بہت کثیر ہو کہ اس کا ادار کرنا مشکل ہو جائے، جب نماز ترک ہو وہ جرمانہ مساکین کو دیدیا کریں اور یہ صورت جرمانے کی سنت کے موافق ہے کہ نسائی[1] کی روایات میں ترکِ جمعہ وجماع فی الحیض پر تصدق کا امر آیا ہے، دوسروں سے جرمانہ لینا بوجہ حدیث اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ۔ خبردار! کسی کا بھی مال حلال نہیں ہے مگر اس کی خوش دلی سے۔ علماء کے نزدیک منسوخ ہے اور جائز نہیں، یا کوئی بدنی جرمانہ مقرر کرے اس کے بھی دو طریقے ہیں۔

ایک طریقہ یہ کہ اس پر عبادت کی مشقت ڈالے، یعنی مثلاً ایک نماز فوت ہو تو اس کو قضاء کرے اور بیس رکعت نفل مثلاً پڑھے، نفس دو تین چار مرتبہ میں ٹھیک ہو جاوے گا۔

وہ قضاء تہجد پر اپنے بدن پر قمچیاں توڑ ڈالتے تھے

دوسرا طریقہ یہ کہ اس پر عادت کی مشقت ڈالے یعنی مثلاً ایک نماز قضاء ہو تو ایک وقت کا کھانا نہ کھاوے اگر دو نمازیں قضاء ہوں تو دو وقت کا کھانا نہ کھاوے، چونکہ نفس پر یہ بہت شاق ہوگا۔ بہت جلدی اس سے صلح کرے گا۔

بعضے بزرگوں نے یہ معمول کر رکھا تھا کہ جس روز "تہجد" قضاء ہوتی تھی اپنے بدن پر کئی کئی قمچیاں توڑ ڈالتے تھے اور فرماتے تھے کہ اگر تو پھر ایسا کرے گا میں پھر ایسا ہی کروں گا ـــــ بعض

---

[1] حافظ ابوعبدالرحمٰن احمد بن شعیب بن علی النسائی ۲۱۴/۳۰۳ھ بہت بڑے محدث اور اپنے زمانے کے بہت بڑے امام تھے نساء (ایران) میں ایک جگہ کا نام ہے ۱۲ فیض محمو

معاصی پر شریعت میں روزے کے ساتھ کفارہ مشروع ہونا اور خود ترکِ صلوۃ پر فقہاء کا تعذیر کو جائز رکھنا اس مشقت عادیہ کا ماخذ ہو سکتا ہے۔

بعض لوگ حالتِ صحت وحضر وفراغ میں تو پابند ہوتے ہیں، مگر مرض وسفر وشغل میں پابند نہیں رہتے، اس کا سبب بھی بجز ضعفِ ہمت وبیفکری کے کچھ نہیں، اگر آدمی کسی کام کا ارادہ وفکر کرتا ہے، کچھ نہ کچھ صورت اس کی بن ہی جاتی ہے، ادنیٰ بات ہے کہ اگر ان حالات میں پیشاب پاخانہ کا دباؤ ہو تو کیا اس کی ضرورت ہے تھوڑی دیر کے لئے سفر یا شغل کو منقطع کرنا نہیں پڑتا؟ یا مرض کی حالت میں اٹھنا نہیں؟ اور کیا اٹھتا نہیں؟ پھر فرق بجز اس کے کیا ہے؟ کہ اس کو ضروری سمجھکر اس کا ارادہ کرتا ہے۔ اور یہ احوال مانع نہیں ہوتے اور نماز کو غیر ضروری سمجھکر اس کا ارادہ نہیں کرتا اور وہ مانع ہو جاتا ہے اور اس سے زیادہ کونسی حالت افسوسناک ہوگی!! کہ پیشاب پاخانہ کی ضرورت سے تو عین موانع میں وقت نکل آتا ہے اور نماز کی ضرورت سے وقت نہیں نکلتا! پھر خاص کر سفر ومرض میں تو رعائتیں وتخفیفیں بھی بہت سی دی گئی ہیں مثلاً

(۱) پانی پر قدرت نہ ہو تو تیمم جائز ہے (۲) قیام پر قدرت نہ ہو تو قعود جائز ہے۔
(۳) ارکان پر قدرت نہ ہو اشارہ جائز ہے (۴) قبلہ معلوم نہ ہو تحری[۱] ہی جائز ہے۔

جن کے احکام کی تفصیل کتب فقہ میں مذکور ہے، یہاں سے ریل میں سوار ہو کر نمازیں چھوڑنے والوں کے عذر کا اور گھر کے کاروبار میں مشغول ہونے والوں کے عذر کا بارد ولچر ہونا معلوم ہو گیا ہوگا بالخصوص بیماری میں نماز چھوڑنا اور بھی محل افسوس ہے!

کیونکہ ہر بیماری پیغام موت ہے گو اس سے صحت ہی ہو جاوے، مگر وہ حالت تو اس کی متحمل ہے کہ شاید موت کا سبب ہو جاوے، سو اس حالت میں تو نماز وانابت الی اللہ (رجوع الی اللہ) کا اور زیادہ اہتمام چاہیئے، تاکہ اگر مرے تو خاتمہ بالخیر ہو، اس میں غفلت سخت تعجب انگیز ہے....!

بعضے بیمار اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں کہ ان کا کپڑا اور بدن پاک نہیں ہوتا، خواہ بیماری

---

[۱] خوب غور وفکر کر کے قبلہ کے بارے میں کوئی رائے قائم کرنا ۱۲ فیض محمد سراوانی

چند روز ہو یا ممتد مثل سلسل بول[1] وغیرہ کے ہو مگر یہ عجیب ہے! اس لئے کہ دو حال سے خالی نہیں۔
یا تو وہ ان کے پاک کرنے پر بلا ضرر قادر ہیں یا نہیں، اگر یہ قادر ہیں تو عذر کیسا؟
اور اگر قادر نہیں؟ تو وہ معذور ہیں، ان کو اسی حالت میں نماز کا حکم ہے اور وہ نماز ان کی صحیح اور کامل ہے اور پھر ان کو اپنی رائے اور طبیعت سے اس کو ناجائز یا بیکار اور ناقص سمجھنے کا کیا منصب ہے؟

عورتوں کی بے پرواہی

ایک حالتِ خاص عورتوں کو علی الدوام پیش آتی ہے، جس کے احکام نہ جاننے سے یا جان کر بے پرواہی کرنے سے، بڑی بڑی پابند اور دین دار عورتوں کی نمازیں کھنڈت پڑ جاتی ہے۔
اور وہ حالت انقطاعِ حیض کی ہے، حکم تو یہ ہے کہ اگر انقطاعِ حیض کے وقت نماز کا آخر وقت ہو اور اتنا ہی باقی ہو کہ جلدی جلدی بدون سر میں سرسوں یا کھلی ڈال کر دھوئے یا بدن کا میل اتارے تمام بدن پر پانی بہا کر کپڑے پہن کر ایک بار "اللہ اکبر" کہہ سکے تو اس وقت کی نماز اس کے ذمے فرض ہو جاتی ہے اور گو اس وقت تکمیل کی گنجائش نہیں مگر ثمرہ اس فرض ہونے کا قضاء میں ظاہر ہوگا، یعنی اس نماز کو دوسرے وقت قضاء کرنا پڑے گا اور جن نمازوں کا پورا وقت انقطاع کے بعد ملا ہے، ان نمازوں کا تو ادا پڑھنا فرض ہوگا۔
اب عموماً عورتوں میں بے پرواہی دیکھی جاتی ہے کہ اول تو اس کا خیال نہیں رکھتیں کہ حیض کس وقت منقطع ہوا ہے، ممکن ہے کہ وہ کسی نماز کے اتنے اخیر وقت میں منقطع ہوا ہو، جس میں غسل ضروری ہے و تکبیر تحریمہ کی گنجائش ہو اور اس لئے وہ نماز ان پر فرض ہو گئی ہو، لہٰذا ان کے ذمہ یہ ضرور ہے کہ ہر نماز کے اخیر وقت میں ضرور پاکی و ناپاکی کو دیکھ لیا کریں، تاکہ ان کو معلوم ہو سکے کہ فلاں وقت کی نماز بھی ہمارے ذمہ فرض ہو گئی۔
دوسرے بعد علمِ انقطاع کے بھی پورے پورے کئی کئی وقت غسل میں دیر کر کے ٹال دیتی ہیں اور پھر ——— غضب یہ ہے ادا نہ کرنے کا گناہ تو اپنے سر لیا ہی تھا، ان اوقات

---

[1] ایک بیماری ہے جس میں پیشاب قطرے قطرے ہو کر آتا ہے۔ ۱۲ فیض محمد سراوانی

کی نمازوں کو قضا بھی نہیں پڑھتیں! اور اس طرح سے ہر مہینہ ان کے ذمہ کئی کئی نمازیں چڑھتی چلی جاتی ہیں جن کا مجموعہ عمر بھر میں ایک بڑی مقدار کو پہنچتا ہے، اگر ہر مہینہ تین ہی تین نمازیں جمع ہوتی رہیں تو سال بھر میں چھتیس اور تیس برس میں ایک ہزار سے زیادہ ہوتی ہیں، پھر ان کی نہ حیات میں قضاء ہے، نہ مرتے وقت ان کے فدیہ کی وصیت ہے، آخر انہوں نے قیامت کے لیئے کیا جواب تیار کر رکھا ہے؟ اور پھر اس پر یہ گمان کہ ہم نماز کے پابند ہیں جب قیامت میں یہ غلطی خلاف توقع ظاہر ہو گی، اس وقت کیا حال ہو گا؟

بے پرواہی کا علاج

ان سب کا علاج بھی وہی دو امر ہیں جو اوپر مذکور ہوئے یعنی

(۱) وعیدوں میں غور کرنا، نفس پر جبر کرنا، اور جو غلطی، احکام نہ جاننے سے ہے اس کے لیئے احکام کا سیکھنا پوچھنا۔

چونکہ عورتوں کو غالبِ احوال میں پوچھنے کا سامان کم میسر ہوتا ہے، اس لیئے مردوں پر واجب ہے کہ اپنے متعلقین کو احکامِ شرعیہ بتلاتے رہیں جو نہ معلوم ہوں علماء سے تحقیق کر کے بتلاویں اور عورتوں پر واجب ہے کہ جو صورت پیش آوے گھر کے مردوں کو فرمائش کریں کہ وہ علماء سے پوچھکر ان کو بتلاویں، اور اگر گھر کے مرد غفلت کریں، دوسرے شخص کے واسطے سے تحقیق کریں، اگر کوئی توجہ نہ کرے تو خود علماء کے گھر جا کر ان کے محارم یا بیبیوں کے ذریعہ سے دریافت کریں، ورنہ گناہ گار ہوں گی۔

اور ضروری احکام پوچھنے کے لیئے جب جانے کی ضرورت ہو اگر شوہر جانے سے منع کرے تو اس کی اطاعت واجب، بلکہ جائز بھی نہیں، اور اگر لکھنا آتا ہو تو جانے کی ضرورت نہیں بذریعہ خط کے دریافت کرتی رہیں، اور یہ سب، جب ہے جب کہ کوئی مرد خاندان کا ان کے کہنے سے علماء سے مسئلہ پوچھ کر ان کو نہ بتلاوے، ورنہ کسی کو خط لکھنا یا کہیں جانا اپنے شوہر کے خلافِ مرضی جائز نہیں۔

بعضی عورتوں کے پابند نہ ہونے کا ایک سبب اور ہے، وہ یہ کہ ایسی طبائع کم ہیں جو

محض خدا کے خوف سے بجا آوری احکام کا اہتمام کرتی ہوں، زیادہ سبب مدامت کا عادت ہے سو چونکہ عورتوں کو ہر ماہ میں بوجہ ایامِ معمولی کے کئی کئی روز تک نماز پڑھنے کا اتفاق نہیں ہوتا، اس کا اثر بعد پاک ہونے کے بھی یہ رہتا ہے، کہ بعض اوقات نماز میں سستی ہو جاتی ہے، گو اس کا اصلی علاج تو یہی ہے کہ خدائے تعالیٰ کا خوف دل میں پیدا کیا جاوے، مگر سبب ظاہری کا علاج کہ وہ بھی ایک درجہ میں کافی ہے، وہ ہے جس کو فقہاء نے ذکر فرمایا ہے۔

کہ عورت کو حالتِ حیض میں بھی مستحسن ہے کہ نمازوں کے اوقات میں وضو کر کے مصلّے پر جا بیٹھے اور تھوڑی دیر تسبیح و تہلیل میں مشغول رہے، اس سے وہ عادت محفوظ رہتی ہے اور جو سستی ترکِ عادت کے سبب ہو سکتی ہے وہ نہیں ہوتی۔

بے نمازیوں کا بہانہ

بعضے بے نمازوں کا عذر، شرعی پیرایہ لئے ہوئے ہے، کہتے ہیں کہ نماز بدون حضورِ قلب کے ہوتی ہی نہیں اور حضورِ قلب ہم سے ہو نہیں سکتا، اس لئے نماز ہی چھوڑ دی، درحقیقت اس استدلال میں انہوں نے خلط و تلبیس سے کام لیا ہے، کیونکہ جس حضورِ قلب پر نماز کی صحت یا کمال موقوف ہے وہ اور ہے اور جو ہمارے امکان سے خارج ہے وہ اور ہے، تو دونوں مقدموں میں حدِّ اوسط (علمِ منطق کی ایک اصطلاح) مکرر نہیں لہٰذا یہ استدلال غلط ہے، تفصیل اس کی یہ ہے کہ حضورِ قلب کے مراتب مختلف ہیں۔

ایک مرتبہ وہ ہے جس کو فقہاء نیت[1] کہتے ہیں اور وہ موقوف علیہ ہے صحتِ صلوٰۃ کا، یعنی بدون اس کے نماز ادا ہی نہیں ہوتی۔

اور دوسرا مرتبہ وہ ہے جس کو خشوع کہتے ہیں جس کی حقیقت انشاء اللہ تعالیٰ عنقریب مذکور ہوگی اور وہ موقوف علیہ ہے کمالِ صلوٰۃ کا یعنی اس کے نہ ہونے سے نماز تو صحیح ہو جاتی ہے مگر کامل نہیں ہوتی۔

---

[1] نیت دل سے ارادہ کرنے کو کہتے ہیں زبان سے کہنا ضروری نہیں ۱۲ محمد علی

ایک معقولی استدلال

تیسرا مرتبہ وہ ہے جس کو قطع وساوس سے تعبیر کرنا مناسب ہے، یعنی اصلاً کسی قسم کا خطرہ نہ آوے اور یہ ایک قسم کا استغراق اور حال ہے اس پر نہ صحت، صلوٰۃ کی موقوف ہے۔ اور نہ کمال صلوٰۃ کا، البتہ فی نفسہٖ ایک محمود حالت ہے، گو مقصود نہیں،

اوّل اور دوسرا مرتبہ اختیاری اور مقدور اور شرعاً مامور بہ بھی ہے اور اول مقدمہ میں یہی مراد ہے اور تیسرا مرتبہ غیر اختیاری اور غیر مقدور اور شرعاً غیر مامور بہ ہے اور دوسرے مقدمہ میں یہی مراد ہے،

جب حدِّ اوسط مشترک نہیں تو نتیجہ کیسے نکلے گا؟ اور اگر دونوں مقدموں میں ایک ہی مراد ہو تو پھر ایک مقدمہ باعتبار مادہ کے غلط ہو گا، مثلاً دونوں جگہ مرتبۂ اوّل وثانیہ مقدور ہے، جیسا ابھی بیان ہوا اور مقدور کو غیر مقدور کہنا غلط ہو گا، اور اگر دونوں جگہ مرتبہ ثالثہ مراد لیا جاوے تو دوسرا مقدمہ صحیح ہو گا مگر پہلا مقدمہ غلط ہو گا، کیونکہ مرتبۂ ثالثہ شرعاً غیر مامور بہ ہے، جیسا ابھی بیان ہوا اور غیر مامور بہ کو مامور بہ کہنا غلط ہو گا، جیسا مقدمہ اول میں لازم آتا ہے۔

کیونکہ کسی امر کا صلوٰۃ کے لئے صحۃً یا کمالاً موقوف علیہ ہونا، مستلزم ہے اس امر کے مامور بہ ہونے کو، جیسا کہ ظاہر ہے، جب ایک مقدمہ غلط ہوا تب بھی انتاج صحیح نہ ہوا۔

غرض خواہ ہیئت قیاس کی غلط ہو یا مادہ، نتیجہ دونوں حال میں غلط ہو گا، پھر علاوہ فی نفسہٖ غلط ہونے کے ان لوگوں کو یہ خبر نہیں کہ ان کے اس استدلال سے نصِ قطعی لَا یُکَلِّفُ اللّٰہُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَہَا۔ البقرہ [۲۸۵ - ۲۸۶] ترجمہ: (اللہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہے) کی تکذیب لازم آتی ہے۔ کیونکہ جو مرتبہ حضور کا ایسا ہے کہ بدون اس کے نماز نہیں ہوتی، خواہ مرتبہ صحت میں یا مرتبۂ کمال میں، لامحالہ شریعت میں اس کے حاصل کرنے کا حکم ہو گا۔ اور جس امر کا حکم ہوتا ہے اس کا داخل وسعت ہونا بنص بالا لازم ہے پھر اس کو وسعت سے خارج کہنا نص کی تکذیب ہے یا نہیں۔۔۔؟

عقل کے پتلوں سے سوال اور جہل کا علاج

پھر ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ نماز میں جتنے فرائض موقوف علیہ صلوٰۃ کے ہیں اگر وہ کبھی وسعت سے خارج ہو جاتے ہیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شریعت سے اس کا کوئی بدل اس کے قائم مقام کر کے اس کی اجازت دیتی ہے مثلاً قیام فرض ہے اگر قدرت نہ رہے، قعود اس کے قائم مقام ہوتا ہے، علیٰ ھذا پس اگر اس کو تسلیم بھی کر لیا جاوے کہ حضورِ قلب کا مرتبہ ضروریہ وسعت سے خارج ہے، تو ضرور ہے کہ شریعت میں کوئی اس کا بدل ہوگا؟ سو اس بدل کے ساتھ نماز پڑھنا ضرور ہوا پھر ترک کی کیسے گنجائش نکلی ......؟

یہ اس وقت ہے جبکہ حضورِ قلب اس کا رکن ہو اور اگر رکن نہ ہو، تو اس صورت میں سوچنا چاہئے کہ نماز بلا حضور پڑھنے میں تو نماز کے ایک تابع متعلق کا فوت ہے اور نماز نہ پڑھنے میں خود اصل متبوع ہی کا فوت ہے۔ تو متبوع کا فوت کر دینا اشد ہے یا تابع کا؟ پھر چونکہ تابع کا وجود بدون متبوع کے نہیں پایا جاتا اور متبوع کو فوت کر دیا ہے، تو لامحالہ تابع بھی فوت ہوگا، تو نماز پڑھنے میں تو صرف حضورِ قلب ہی فوت ہوتا اور نہ پڑھنے میں وہ حضور بھی گیا، اور نماز بھی گئی، تو صرف تابع کا فوت ہونا اھون ہے یا متبوع و تابع ہر دو کا؟

خوب سمجھ لو! چونکہ سبب ان کی غلطی کا جہل ہے، ہماری اس تقریر میں غور کرنا اس جہل کا علاج ہے۔

بعضے لوگوں کے نماز نہ پڑھنے کا یہ مبنی ہے کہ وہ باوجود دعویٰ اسلام کے نماز کو فرض نہیں سمجھتے پھر ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ (۱) بعض فلسفیت کے رنگ میں ہیں (۲) بعض تصوّف کے رنگ میں،

اہلِ فلسفہ کا دعویٰ اور اس کا ردّ

قسم اوّل کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود شارع کو تہذیبِ اخلاق ہے زمانۂ نزول حکم صلوٰۃ میں لوگوں میں صفات ذمیمہ کبر و ظلم وغیرہ کا غلبہ تھا، نماز کی ہیأت و اوضاع و اذکار تواضع ولین

کی تعلیم دیتے ہیں، اس لئے ان کو نماز کا حکم کیا گیا، ہم چونکہ مہذب ہو چکے ہیں لہٰذا ہم کو نماز کی ضرورت نہیں ..... !!

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ سب اس پر مبنی ہے کہ احکام شرعیہ کو مقصود بالذات نہ کہا جاوے مقصود بالغیر کہا جاوے اور پھر وہ غیر بھی وہ ہی امور ہوں، جو تم دعویٰ کرتے ہو، سو اس میں دو دعوے تمہاری طرف سے ہوئے ہیں جن کا ثابت کرنا تمہارے ذمہ ہے، "جس پر تم قیامت تک بھی قادر نہ ہو گے" بلکہ یہ احکام خود بھی مقصود بالذات معلوم ہوتے ہیں، بس ایسے بے سروپن شبہات سے یہ قطع ویقین زائل نہیں ہو سکتا۔

غرض عقلاً وسمعاً ایسا اعتقاد یقیناً الحاد وزندقہ ہے اور ایسا شخص ہرگز مسلمان نہیں اس کو نماز کے ساتھ تجدید ایمان کا خطاب کرنا ضروری ہے، یہ جواب جب ہے کہ ہم اس کو مان لیں کہ واقعی یہ لوگ اپنی تہذیب نفس سے فارغ ہو چکے ہیں، حالانکہ ہنوز اس میں کلام ہے ترفع وتجبر وتعلی وتکبر وظلم ونخوت وقساوت وغفلت جس درجہ ان مدعیوں میں بڑھی ہوئی ہے، اس زمانہ میں اس کا عشر عشیر بھی نہ تھا۔ اگر مشروعیت صلوٰۃ کی ان ہی مصالح کے لئے ہوتی تب بھی یہ لوگ بہ نسبت اس زمانے والوں کے نماز کے زیادہ محتاج ہوتے۔

اس مرض کا کہ جہل ہے ... نیز علاج ہماری اس تقریر میں غور کرنا۔ اور یہ کافی نہ ہو، تو محققین سے اپنے شبہات کو دفع کر لینا ہے۔

اہل تصوّف کی تقریر اور اس کا جواب

قسم ثانی کی یعنی جو تصوف کے رنگ میں ہیں ان کی تقریر یہ ہے کہ اصل مقصود قرب الٰہی ہے اور نماز دیگر طاعات بھی اس کا واسطہ ہے اور واسطہ بھی بالصورت نہیں بلکہ بالحقیقت اور وہ حقیقت ذکر ہے، پس اگر کسی کو ذکر دائم میسّر ہو جائے، اس کو نماز کی حاجت نہیں، یا نماز ہی پڑھ پڑھ کر مقام قرب میسر ہو جاوے، پھر بھی نماز کی حاجت نہیں اگر پڑھتا بھی رہے تو اس پر فرض نہیں رہی، فرائض اس کے حق میں نوافل ہو گئے۔

اس کے جواب میں بھی وہی تقریر بالا جو نفس کے مقابلہ میں لکھی گئی کافی ہے۔ اور اس پر بھی وہی فتوٰی اور وہی علاج عرض کیا جائے گا۔

اور دونوں کے خطاب میں اس مثال کا پیش کرنا مفید اور معین رفع شبہ معلوم ہوتا ہے کہ جس طرح بعض ادویہ طبیہ میں باوجود بعض فاعل بالکیفیت ہونے کے بعض فاعل بالخاصیہ ہوتے ہیں، اور اس کی تعین اعتبار ماہرین کے حکم سے ہوتی ہے۔ اسی طرح اگر ان سب عبادات شرعیہ کو محض اپنی صورت نوعیہ وخاصہ کے اعتبار سے خاص ثمرات، مثل اخلاق مرضیہ حق ونجات وقرب ورضا میں فاعل اور موثر کہا جائے اس کی نفی کی کیا دلیل ہے....؟

اور اس بات کی دلیل نصوص کا سیاق واطلاق ہے کہ کہیں ان کا فاعل بواسطہ ہونا نہیں بتلایا گیا اور جو کہیں بعض طاعات کی حکمت بتلائی گئی ہے تو غایت مافی الباب اس حکمت کا مرتب علی الاحکام ہونا ثابت ہوتا ہے، نہ کہ مرتب علیہ الاحکام ہونا اور دعوٰی کا موقوف ہے ثبوت امر ثانی پر، یہ سب صورتیں تھیں ایک کوتاہی کی یعنی نماز نہ پڑھنے کی؛

بعض مشائخ میں تاخیر صلوٰۃ کی عادت اور اس کا علاج

ایک کوتاہی نماز کے متعلق یہ ہے کہ بعضے آدمی حتی الامکان تو نماز فوت نہیں ہونے دیتے مگر وقت کا اہتمام نہیں کرتے اکثر تنگ وقت میں نماز پڑھتے ہیں بعض دفعہ قضا بھی ہوجاتی ہے گو کم سہی اور گو پھر فوراً قضا پڑھ بھی لیتے ہیں۔ پھر بعض کو تو کوئی مجبوری ظاہری ہوئی ہے گو وہ مجبوری اس لئے معتبر نہیں کہ اگر اس میں سعی وتوجہ کرتے تو ضرور کوئی صورت انتظام کی نکل آتی مگر بعض تو محض بیکار گپوں میں مشغول رہ کر وقت کو اخیر کر دیتے ہیں اور نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ بعض ان میں مشائخ ہیں اور محض تذلیل شیطانی یا تسویل نفسانی سے تاخیر صلوٰۃ کے خوگر ہوگئے ہیں، چنانچہ ہر ایک کے متعلق مختصر کلام کیا جاتا ہے۔

جو لوگ ظاہراً کوئی مجبوری بتلاتے ہیں ان میں بعض کو تو کسی درجہ میں بھی مجبوری نہیں جیسے تاجر ومزدور وحاکم اجلاس واہل حرفہ وامثالہم کہ یہ لوگ بالکل آزاد ہیں، تھوڑی دیر کے کام چھوڑ سکتے ہیں، سو ان کے عذر کے متعلق تو کسی جواب کی ضرورت نہیں۔

بعض کو البتہ کسی درجہ میں مجبوری ہے، جیسے نوکر ایسے افسر کا جس کے سامنے اپنی

دلائے سے کچھ نہیں کر سکتا، سو اس کے متعلق یہ ہے کہ اول تو اوقاتِ نماز میں اجازت حاصل کرنے کی کوشش کرے اور دیکھا سُنا اکثر یہی ہے کہ باستثنار شاذ و نادر کوئی افسر نماز سے منع نہیں کرتا اور اگر کسی طرح اجازت حاصل نہ ہو، نہ خود اس سے، نہ اس کے بالا افسر سے تو اس صورت میں ایسی نوکری ہی جائز نہیں، خدا تعالیٰ دوسرا سامان رزق کا کر دے گا، ایسی نوکری چھوڑ دینی چاہیئے ؟

البتہ جس شخص کے پاس بظاہر سرِدست کوئی سبیل ضروری معاش کی بھی نہ ہو، نہ نوکری میں نہ سرمایہ ہو کہ تجارت کرے، نہ مزدوری کی عادت ہو اور بدن عادت چلنا دشوار ہوتا ہے تو ایسی حالت میں نوکری چھوڑنے میں تعجیل نہ کرے اس فکر میں لگا رہے، دوسرے خیر خواہوں سے بھی سعی کراوے اور تا حصول کسی سبیل کے ہمیشہ اس بلائے اختلالِ وقتِ صلوٰۃ سے" استغفار اور دعائے استخلاص " اور دوسری سبیل کے استحصال کی کرتا رہے۔

اور جن کو برائے نام بھی مجبوری نہیں محض بیکار وقت ضائع کرتے ہیں، ان کو اپنی حالت پر خاص طور پر نظر کرنا چاہیئے اور نفس سے محاسبہ کرنا چاہیئے کہ جب پانچوں وقت نماز پڑھنا پڑے، تو تاخیرِ اوقات سے کون سی آسان و تخفیف نکلی اور مجبوری کچھ نہیں ہے تو نہ کوئی مصلحت تھی کہ تاخیر کے اختیار کرنے کا مرجح ہو، نہ کوئی مجبوری تھی کہ تاخیر بالاضطرار کا سبب ہو، پھر وبال لینے سے کیا حاصل ہوا ؟

اگر نفس یہ کہے کہ تاخیر کرنے سے مشغلۂ تفریح کا وقت زیادہ مل سکتا ہے، تو اس کو جواب دینا کہ اگر دو نمازیں اول وقت میں پڑھی جاویں تب بھی ان کے مابین اتنی ہی گنجائش ہوگی جتنی ان دونوں نمازوں کو اخیر وقت پر پڑھنے سے ملتی ہے۔

مثلاً اگر کسی نے ظہر چار بجے پڑھی اور عصر سات بجے تو درمیان میں تین گھنٹے ملے، سو اگر ظہر دو بجے پڑھتا اور عصر پانچ بجے تب بھی درمیان میں تین گھنٹے ملتے، تو جتنا کام درمیان میں تاخیر کی صورت میں کر سکتا ہے اتنا ہی تعجیل کی صورت میں کر سکتا ہے پھر تاخیر میں بجز مضرت کے کون سی مصلحت ہوئی ... ؟

تضلیلِ شیطانی

اور ایسے مشائخ کو اوّلاً تو تضلیلِ شیطانی اور کبھی تسویلِ نفسانی اس تاخیر کا سبب ہوتی ہے۔ تذلیلِ شیطانی اس طرح کہ انہوں نے اپنی تجویز سے یا اپنے شیخ کی تعلیم سے کوئی معمول یا ورد ایک خاص مقدار سے مقرر و ملتزم کر لیا اور اس میں وقت کی تعین محض کسی مصلحتِ زائدہ غیر ضروریہ کے سبب سے تھی، مگر بروئے غلو اس عالم ملتزم نے اس کو ایسا ضروری سمجھا کہ اس کی حفاظت کے لئے مہمات دینیہ کی بھی پروا نہ رہی! مثلاً بعض اوراد مابین سنّت و فرض فجر کے پڑھے جاتے ہیں۔

میں نے بعض متشددین و مصرین کو دیکھا ہے، جماعت کھڑی ہوگئی، مگر وہ اپنے ورد میں مشغول ہیں حتیٰ کہ جماعت فوت کر دی! اور بعض اوقات خود وقت بھی تنگ ہو گیا، مگر اس ورد کی ترتیب میں تغیر و تبدیل کو ہرگز جائز نہ رکھیں گے، حالانکہ یہ تغیّر فی نفسہٖ جائز تھا۔ اور جب عدم تغیر سے جماعت فوت ہو کُلاً یا بعضاً یا وقت تنگ ہو جاوے، اس وقت تغیر واجب تھا، مگر ان کو ترکِ واجب کی ذرا پروا نہیں! پھر اپنے اس التزام پر اس قدر شاداں و نازاں ہیں کہ اپنے کو صاحبِ استقامت سمجھتے ہیں کہ کبھی کوئی معمول میں تغیر نہیں ہوتا...!

میں نے ایک شخص کو یہ فخر کرتے سُنا ہے کہ صاحب میری فرض نماز کو ناغہ ہو جاتی ہے، مگر پیر صاحب نے جو کچھ بتلا دیا ہے وہ کبھی قضا نہیں ہوتا۔ غلو فی الدین اور اتخاذ احبار و رہبان کی یہ افسح افراد میں سے ہے، سبب اس کا جہل ہے علوم شرعیہ سے کہ حدود اعمال کی معلوم نہیں خواہ یہ بے علمی لبیط ہو یا مرکب ہو علیٰ اختلاف الاقوال یہ تو تضلیلِ شیطانی تھی۔

تسویلِ نفسانی

اور تسویلِ نفسانی اس طرح سے ہے کہ افراط فی الشفقۃ علی الخلق کے سبب یہ خیال ہوتا ہے کہ جلدی پڑھ لینے سے بہت لوگ جماعت سے رہ جائیں گے، خوب انتظار کرنا چاہیے، تاکہ

سب جماعت میں مل جاویں، اور کوئی محروم نہ رہے، اس کا نام "تسویل" اس لئے رکھا گیا کہ صورۃً یہ خیال نہایت محمود ہے اور نفسانی اس لئے کہا گیا کہ منشاء اس کا ایک صفت ہے صفاتِ نفسانیہ سے کہ وہ شفقت ہے اور گو وہ فی نفسہٖ صفتِ محمودہ ہے اور اس لئے جو خیال اس سے ناشی ہے کہ وہ خیر خواہی ہے آنے والے نمازیوں کی کہ کوئی محروم نہ رہ جاوے وہ بھی نیک ہے، مگر ہر محمود اسی وقت تک محمود ہے جب تک وہ کسی امر مذموم کو متضمن نہ ہو اور یہاں یہ شفقت اور یہ خیر خواہی سبب ہو گئی تضییقِ وقت کی حدِ غیر مشروع تک اور یہ مذموم ہے اس لئے وہ منشاء اور ناشی سب مذموم ہو گیا۔

اور ان سب نمازوں میں سب سے زیادہ قابلِ نظر ایسے حضرات کے لئے جمعہ کی نماز ہے، کیونکہ اور نمازوں کا اگر وقت نکل گیا اور علم نہ ہوا تو وہ فرد قضاء کی تو بن سکتی ہیں گو بعض فقہاء کے نزدیک سہی اور جمعہ کا وقت اگر نکل گیا تو اس کی قضاء ظہر سے ہو سکتی تھی نہ کہ جمعہ سے، پس جب جمعہ پڑھا تو وہ نہ ادا ہوا کیونکہ وقت نہ تھا اور نہ قضاء کیونکہ قضاء میں جمعہ نہیں پڑھا جاتا، تو بس یہ نماز ان سب کے ذمہ پر واجب رہی اور رہی وہ مصلحت کہ کوئی رہ نہ جاوے اوّل تو جب اس میں اتنا بڑا مفسدہ لازم ہے تو اس مصلحت کا کیا اعتبار؟

پھر وہ مصلحت بھی کچھ تاخیر کے ساتھ خاص نہیں، تجربہ سے یہ امر یقینی ہے کہ اس باب میں جس جگہ جیسی عادت کا التزام کر لیا جاتا ہے تمام لوگ اسی کے تابع ہو جاتے ہیں جہاں سویرے نمازیں ہوتی ہیں سب کو تقاضا رہتا ہے کہ جلدی چلو چنانچہ سب فوراً جمع ہو جاتے ہیں۔ اور کوئی بھی متخلّف نہیں رہتا اور جو رہنے والے ہیں وہ مشاہدہ سے دیکھا جاتا ہے کہ اس تاخیر میں بھی رہ جاتے ہیں، بلکہ اکثر رہتے ہیں، ان کو بے فکری رہتی ہے کہ میاں ابھی کیا جلدی ہے وہاں تو بہت دیر میں جماعت ہوا کرتی ہے، بس اسی میں رہ جاتے ہیں، تو تاخیر کی وہ بھی غرض حاصل نہ ہوئی اور اگر حاصل بھی ہوتی تب بھی وہ لاحاصل ہے جیسا اوپر مذکور ہوا۔

علماء میں بھی تاخیرِ صلوٰۃ!

بہر حال وقت کا اس قدر مؤخر کرنا نماز کا بالکل تباہ کرنا ہے، چنانچہ احادیث میں اس پر سخت زجر آیا ہے اور ایسی نماز کو منافقوں کی نماز فرمایا ہے اور گاہ گاہ اہل علم میں سے بھی

بعض کو اس میں ابتلا ہوتا ہے جس کا اکثر موقع یہ ہوتا ہے کہ مدرّس کو کوئی کتاب ختم کرانا ہے ـ یا سبق کسی خاص مقام تک پہنچانا ہے یا ممتحن کو کسی جماعت کو امتحان سے فارغ کرنا ہے ـــ یا مصنف کو کسی مضمون کا پورا کرنا ہے۔

تو ان مقاصد کو رعایتِ وقت پر بسا اوقات ترجیح دی جاتی ہے اس کا وقوع علماء سے بہ نسبت مشائخ کے اور بھی زیادہ عجیب ہے، کیونکہ یہ اصلِ وضع میں مقتدائے دین ہیں، جب مقتدا ایسا کرے گا پھر مقتدی کا کیا پوچھنا ہے ؟

(۳) ایک کوتاہی (گو ایسا شاذ ہوتا ہے مگر ہوتا ہے) اس کوتاہی مذکور کے مقابل کوتاہی ہے یعنی نماز میں اس قدر تعجیل کرنا کہ وقت بھی آنا یقینی نہ ہو۔

بعض لوگ فجر کی نماز صبح صادق سے پہلے شروع کرتے ہوئے دیکھے سنے گئے۔ بعض اہلِ افراط جمعہ کے روز دن بھی نہیں ڈھلنے دیتے اور کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بعضے مریضوں کو دیکھا گیا کہ مغرب کی تھوڑی ہی دیر بعد آسانی کے لئے عشاء پڑھ لیتے ہیں وقت بھی نہیں آتا اور جس کے مسلک پر مثلین کا قول بھی قوت رکھتا ہو اس کے لئے عصر کی نماز مثلین کے قبل پڑھ لینا احتیاط کے خلاف ضرور ہے۔

بہر حال وقت میں افراط و تفریط کرنا دونوں واجب التحرز ہیں، اگر اجلاس پر حاضری کا معین وقت پر حکم ہو تو قبل از وقت آکر اظہار دینا یا وقت ختم کرکے آنا دونوں بیکار ہیں ـ تو شریعت کی تعیین کی وقعت و عظمت کیوں نہ کی جائے ؟

عورتوں میں نماز کا اہتمام نہ ہونا

(۴) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ شرائط و ارکان میں ذرا سے عذرِ موہوم سے اسی رخصت پر عمل کرنے لگتے ہیں جو کہ عذر قوی کے متعلق ہے، مثلاً ذرا حرارت کا شبہ ہوا یا ذرا ہوا میں خنکی ہوئی بجائے وضو و غسل کے تیمم کر لیا، ذرا طبیعت میں کسل ہوا بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے، ریل میں ذرا جگہ کی تنگی ہوئی جس کا آسانی سے انتظام ہو سکتا تھا، بیٹھ کر اور بعض دفعہ بے رخ، بعض دفعہ اشارہ سے نماز پڑھنا شروع کر دی، بلکہ ریل میں تو بالکل نماز ہی

اُڑادی جاتی ہے، بالخصوص عورتیں توریل میں شاذونادر ہی نماز پڑھتی ہوں گی، اپنے دل کو سمجھالیتی ہیں کہ یہاں نہ تو پانی کا انتظام ہے نہ جگہ گنجائش کی رہی۔ نہ تختہ پاک ہے، نہ رُخ معلوم ہے، یا رخ کی طرف پڑھنا دشوار ہے نہ پردہ کا پورا انتظام ہے اوران عذروں سے مستورات کی نماز بیل گاڑی کے سفر میں بھی اکثر برباد ہوتی ہے۔

حجاج کی نمازوں میں کاہلی وسستی

اوران سے زیادہ ان لوگوں کی حالت قابلِ حسرت ہے جو حج کو جاتے ہیں اور ریل یا جہاز میں بیہودہ وساوس سے یا کاہلی سے نماز نہیں پڑھتے، ایک عبادت اداکرنے چلے اور پانچ فرض روزانہ برباد کیئے، اگر جہاز ہی کی ضائع شدہ نمازیں شمار کی جاویں اور ایک پھیرے میں پندرہ دن کی رفتار فرض کی جاوے تو پانچ نماز روز کے حساب سے پچھتر نمازیں ہوتی ہیں، اسی طرح اگر واپسی کا پھیرا لیا جاوے تو اتنی ہی اس میں ہوکر ڈیڑھ سو ہوئیں، کتنے افسوس کی بات ہے! کہ ایک فرض اداکیا اور ڈیڑھ سو فرض برباد کیئے!!! کیا ایسے شخص کے حج کو کہا جا سکتا ہے کہ خدا کا فرض سمجھکر کیا گیا ہے؟ اگر یہ تھا تو ڈیڑھ سو فرض بھی تو خدا ہی کے تھے ان کو کس دل سے ضائع کرنا گوارا کیا؟ سچ ہے کہ......... ہم لوگوں کو باعث عبادت کا بھی اکثر امورِ نفسانیہ امتیاز یا دفعِ ملامت وغیرہ ہوتا ہے یا اگر مجرد نہیں ہوتا تو امیزش زیادہ ضرور ہوتی ہے۔

بہرحال اگر ان لچر بناؤں پر نماز ترک کردی تب بھی اور اگر اس میں بلا فتوئ شرعی رخصت پر عمل کرلیا کہ وہ بھی ترک ہی کے حکم میں ہے تب بھی نہایت بددلی کی دلیل ہے، ایسی نماز پر تو خاصہ شبہ ہوتا ہے کہ محض دکھلاوے کے لیئے نام کرنے کو پڑھتے ہیں، ایسے نمازیوں کی شان میں فرمایا گیا ہے واذا قاموا الی الصلوۃ قاموا کسالی یراؤن الناس ولا یذکرون اللہ الا قلیلا ہ النساء [۱۴۱ - ۱۴۲] اور جب کھڑے ہوں نماز کو تو کھڑے ہوں ہارے جی سے لوگوں کو دکھانے اور یاد نہ کریں اللہ کو مگر تھوڑا سا۔

بڑی وجہ اس کی دو امر ہیں:۔

(۱) مسائل کی ناواقفی

(۲) نماز کی عظمت دل میں نہ ہونا۔

اول کا علاج "علم وواقفیت ہے" جس کا طریق سہل یہ ہے کہ نماز کے متعلق جو صورتیں پیش آجاویں یا جو جو احتمال ذہن میں آتے ہیں ان سب کو حافظہ میں یا کتابت میں مقیدّ و محفوظ کر کے زبانی یا بذریعہ خط علماء ماہرین سے پوچھتے رہیں۔

دوسرے کا علاج یہ ہے کہ دل میں وعیدیں مخالفتِ احکام کی سوچیں تاکہ ان احکام کی عظمت پیدا ہو، جب عظمت پیدا ہوگی تو ضرور اس کی کوشش وارادہ کرے گا، جب کوشش وارادہ کرے گا خود ان عذروں کا لغو ہونا سمجھ میں آجاوے گا، کیا کسی تقریب میں جانے کے وقت یا کسی معزز مہمان کے آنے کے وقت جبکہ بدن اور کپڑے میلے ہوں یہی شخص جو ادنیٰ بہانہ سے تیمّم کرتا ہے، غسل کر کے کپڑے بدلتا ہوا نہیں دیکھا جاتا... ؟

کیا ایسے ہی موقع پر اگر دیر تک کھڑا ہونا پڑے، بلکہ چلنے کی ضرورت ہو تو کیا اس کو آسان نہیں ہو جاتا ؟ مگر نماز میں کھڑا نہیں ہوا جاتا! کیا ریل میں اپنی آسائش کی ضرورت سے یا اپنے کسی مریض رشتہ دار کے آرام دینے کے لئے مسافروں سے جگہ دینے کی اس نے کبھی درخواست نہیں کی ؟ تو نماز کے لئے مہرِ سکوت منہ پر کیوں لگائی جاتی ہے۔

نماز کا اثر اور برکت

بلکہ ہمارا تجربہ یہ ہے کہ نماز میں وہ اثر اور برکت ہے کہ جب نماز کے لئے جگہ دینے کی درخواست کی جاتی ہے، تو شواذ تو ہر جگہ مستثنیٰ ہوتے ہیں اور شمار میں نہیں آیا کرتے، باقی کہیں نہیں دیکھا کہ کسی نے ذرا بھی عذر کیا ہو، مخالف مذہب والے تک رعایت کرتے ہیں، مگر خود ہی کوئی کچا اور کم ہمت ہو تو کیا علاج ؟ ورنہ ریل میں اچھے خاصے کھڑے ہو کر رکوع وسجدہ کے ساتھ اور رُخ کی طرف نماز ہوتی ہے اور اگر کبھی موقع پر واقعی عذر ہو تو وہاں شریعت نے تنگ نہیں کیا۔ رخص پر عمل جائز ہے۔

اور بعضے عذر بالخصوص مستورات کے جو عذر مذکور ہوئے مسائل جاننے سے رفع ہو جائینگے

ان ہی میں سے ایک عذر پردہ کا ہے کہ بہلی سے اتر کر نماز پڑھنے میں بے پردگی ہے تو اس کے متعلق حکم شرعی سمجھ لینا چاہئیے کہ ایسے وقت میں صرف برقعہ کا پردہ کافی ہے بہلی کے احاطہ میں رہنا ضروری نہیں اور حجاج کا نماز ترک کرنا اگر احکام کی عظمت نہ ہونے سے ہے تو اس کا علاج ابھی مذکور ہوا کہ وعیدیں مخالفت احکام کی سوچے اور اگر جہاز میں پاکی کا اہتمام نہ ہونا اس کا سبب ہے تو اس کے متعلق اول کی کوتاہی کے ضمن میں جہاں بیماروں کا نماز چھوڑ دینا بخیال نجاست بدون پارچہ کے مذکور ہے بیان کیا گیا ہے۔

اور اگر یہ حج نفل ہے اور کسی سبب سے اہتمام نماز کا نہ ہو سکے تو اس شخص کو اس حج کے لئے سفر کرنا ہی جائز نہیں وہ اپنے گھر رہ کر کام میں لگے وعلیٰ مثلہٖ تحمل ما قال العارف مسعود بک رحمۃ اللہ علیہ ؎

اے قوم بحج رفتہ کجائید کجائید ۔۔۔ معشوق در ینجاست بیائید بیائید

تعدیل ارکان نہ کرنا

(۵) ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ تعدیل ارکان و اتیان سنن کا اہتمام نہیں کرتے نہ قومہ ہے نہ جلسہ ہے رکوع بھی ہیئت مسنونہ پر نہیں قیام کبھی قدر قراءۃ مسنونہ سے کم ہے قراءت میں بھی غلط صحیح کی خبر نہیں، نماز کیا پڑھتے ہیں بیگار ٹالتے ہیں، ایک حدیث میں ایسے شخص کو نماز کی چوری کرنے والا فرمایا ہے اور ایک حدیث میں ایک ایسے شخص کو نماز کے اعادہ کا حکم اس ارشاد کے بعد دیا کہ جا پھر نماز پڑھ تو نے نماز نہیں پڑھی یعنی یہ نماز تیری نہیں ہوئی۔

یہ مسئلہ فقہیہ تو الگ رہا کہ اس کی نماز ہوئی یا نہیں ؟ لیکن اگر ہوئی بھی تو وہ بھی ایسی ہی ہوئی جیسے ایک کنیزک لنگڑی، لنجھی، اندھی، بہری، گونگی، اپاہج، بیمار ہو اور وہ ایک درجہ میں آدمی تو ہے مگر قابل اس کے نہیں کہ کسی صاحب کمال، صاحب جلال بادشاہ کی نظر میں پیش کی جا سکے اور وہ اس کو قبول کرے، اسی طرح یہ نماز ایک درجہ میں نماز کہلائی جاوے گی مگر جب اس کے ارکان جو بمنزلہ اعضاء کے ہیں ناقص ہیں تو وہ قابل اس کے نہیں کہ حق تعالیٰ کے حضور میں قبول ہو سکے، یا اعضاء درست ہوں مگر ہیئت مسنونہ پر نہ

ہونے سے ایسی ہوگی جیسے تندرست کنیزک خال وخط، نازوادا سے خالی ہو، جو بادشاہ کو مطبوعِ خاطر ہے پس درجۂ کمال میں مقبول نہ ہوگی یعنی محبوب نہ ہوگی گو لے لی جاوے اس لئے اس کی تعدیل اور تکمیل ضروری ہے۔

رکوع وسجود وغیرہ کی درستی کے لئے تو خالی ارادہ کافی ہے، کسی خاص اہتمام کی ضرورت نہیں، البتہ قیام بقدرِ مسنون کے لئے کچھ سورتیں خاص سیکھنا ضروری ہوں گی جس کے لئے عم کا سیپارہ حفظ ہونا کافی ہے کہ اس میں سورۂ بروج تک طِوالِ مفصّل ہے اور لم یکن تک اوساط اور اس سے سورۂ ناس تک قصار کہ ان کے یاد کرنے سے مختلف نمازوں میں سنت ادا ہوسکتی ہے اور تصحیح قرآن کے لئے کچھ توجہ کرنا پڑے گی، جس کے متعلق اس سے قبل عنوان "اصلاح معاملہ بہ قرآن مجید" کے ذیل میں عرض کرچکا ہوں اس کا ملاحظہ فرمانا اس باب میں کافی ہوگا۔

اور جس طرح اپنا قرآن صحیح کرنا ضروری ہے، اسی طرح یہ بھی ضروری ہے کہ اپنے گھر والوں کی نماز اور قرآن جس قدر نماز میں پڑھا جاتا ہے اہتمام کر کے درست کراویں، اگر دس منٹ روزانہ بھی اس کام میں چند روز صرف کریں تو بہت آسانی سے اس میں کامیابی ہوسکتی ہے غرض اس طرح سے نماز کی تکمیل وتعدیل میسر ہوجاوے گی۔

بعض بارہ مہینے اچھی خاصی نماز پڑھتے تراویح میں تعجیل کی مشق کرنے لگتے ہیں ان شاء اللہ تعالیٰ آئندہ اس کے متعلق خصوصیت کے ساتھ ذکر کیا جائے گا۔

نمازی امراء کی کوتاہیاں

(۶) ایک کوتاہی کہ وہ نمازی امراء میں بالخصوص کثرت سے ہے، جماعت کا ترک کرنا ہے، نصوص سے اس کا حد درجہ اہتمام ثابت ہوتا ہے حتیٰ کہ اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان پر نظر کر کے بہت علماء نے اس کو واجب کہا ہے اور بعض محققین فقہاء حنفیہ نے بھی اس کو اختیار کیا ہے اور واجب عمل میں اور ترک کے گناہ اور سزا میں برابر فرض کے ہے، پس ایک فرض کو ادا کرنا اور اس کے مساوی کو ادا نہ کرنا یہ کس درجہ کی غلطی ہے؟ اور تتبع سے

جہاں تک دیکھا گیا سبب ترکِ جماعت کا اکثر دو امر ہیں۔

(۱) سستی کہ اتنی دور کون جاوے دھوپ میں کون جائے ؟

(۲) تکبر کہ ذلیل لوگوں کے ساتھ کھڑا ہونا پڑے گا یا ایسے شخص کے پیچھے نماز پڑھنا پڑے گی۔

اور کبھی اس کا سبب مسجد میں ان لوگوں کی شان وعادت کے موافق سامانِ آسائش کا مفقود ہونا ہوتا ہے، چنانچہ میں نے ایک صاحب کو یہ عذر کرتے ہوئے دیکھا کہ وہاں وضو کا موقع ایسا ہے کہ وہاں بیٹھیں تو کپڑوں کو کائی لگ جاتی ہے، چٹائیاں سڑی ہوئی جن میں گرد وغبار بھرا ہوا بچھی ہیں، جن سے کپڑے میلے ہو جاتے ہیں ہوا کا گذر نہیں دل پریشان ہوتا ہے۔

سستی کے متعلق تو اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ اگر اسی وقت میں کوئی دنیا کا کام جس میں مال وجاہ کا نفع ہو نکل آوے یہی حضرات اس کی طرف اس طرح دوڑیں کہ ذرا بھی کسل نہ ہو نہ گرانی ہو، افسوس ! کیا آخرت کی ضرورت اس درجہ پر بھی نہ رہی !

میں نے ایک صاحب کو دیکھا ہے کہ ان کے دروازہ پر مسجد تھی مگر وہاں کبھی تشریف نہ لاتے تھے، ایک بار ان کے یہاں لڑکے کی تقریب بسم اللہ کی تھی اور ان کے ایک غریب بھائی کسی بات پر اینٹھ گئے تھے، عین جیٹھ بیساکھ کی دوپہر میں ایک بچہ کی چھتری کو وہ پورا سایہ بھی نہ کر سکتی تھی لگا کر ان کے پاس ایک دور محلہ میں گئے اور ان کو منا کر لائے۔ یا اللہ دنیا کی مصلحت کے وقت وہ سستی کہاں چلی جاتی ہے؟؟ علاج اس کا وہی وعیدوں کا یاد کرنا ہے۔

اور تکبر کے باب میں یہ معروض ہے کہ اول تو آپ کی شان ہی کیا ہے؟ شاید وہ مساکین خدا تعالیٰ کے نزدیک تم سے زائد محبوب ومقبول و ذی جاہ ہوں، اس کے سامنے دنیوی عزت گرد ہے، بلکہ عجب نہیں کہ قیامت میں تم کو ان ہی مساکین کی التجا کرنی پڑے اور ان کی استدعا سے تمہاری رہائی ہو تو باوجود قیامِ احتمال کے تم کو ان کے حقیر سمجھنے کا کیا حق حاصل ہے ....؟

دوسرے اگر تمہاری شان ان مساکین سے زیادہ بھی مان لی جاوے تو تم مساجد میں ان مساکین کی تعظیم کے لئے تو نہیں بھیجے جاتے کہ خلاف شان ہو بلکہ تم اور وہ سب ایک ایسے عظیم الشان کی تعظیم

کے لئے جمع ہوئے ہو جس کی تعظیم سے تمہاری شان بڑھتی ہے، کیا کسی بادشاہ کے دربار عام کے موقع پر کوئی شخص محض اس بنا پر حاضر ہو کر سلام کرنے سے اعراض یا اغماض کرنے کی ہمت کر سکتا ہے کہ وہاں تو غربا بھی جا کر سلام کرتے ہیں؟ اور اس سلام کے لئے جانا اہانت ہے، کیا سچ مچ ایسے دربار کے موقع پر سلام کرنا اہانت ہے؟ ہرگز نہیں، ——— ہرگز نہیں، کیا کوئی ایسا سمجھ کر نہ جاوے تو وہ سرکش اور گستاخ نہ سمجھا جاوے گا؟ ضرور، ضرور، تو تعجب ہے کہ دربار شاہی کے ساتھ تو یہ برتاؤ اور دربار الٰہی کے ساتھ یہ برتاؤ .... !! صَدَقَ اللہُ تعالٰی مَا قَدَرُوا اللہَ حَقَّ قَدْرِہٖ اِنَّ اللہَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ ۝ الحج [۲۲-۷۴] (اللہ کی قدر نہیں سمجھے جیسی اس کی قدر ہے بیشک اللہ زور آور زبردست ہے)

اور اگر کسی مسکین کے امام ہونے سے عار آتی ہے تو اول تو وہ عار کی بات نہیں، کیا حکام کے درباروں میں حاضر ہونے کے وقت اردلی خاص کہ رتبہ اور ریاست میں تمہاری برابر نہیں، پیشی کرنے کے وقت تمہارا پیش رو نہیں ہوتا؟ پھر اس وقت عار کیوں نہیں آتی؟ یہ ساری عار خدا ہی کے معاملہ میں کیوں ہے؟ اصل یہ ہے کہ وہاں تو خوشنودی مقصود ہے وہ جس طریق سے بھی حاصل ہو اور یہاں یہی مقصود نہیں ورنہ کسی طریق سے بھی عار نہیں آتی، وللّٰہِ دَرُّ العارف الرومی[1] رحمۃ اللہ علیہ حَیْثُ یَقُوْلُ ؎

شاد باد اے عشق خوش سودائے ما ۔۔۔ اے طبیب جملہ علت ہائے ما

اے دوائے نخوت و ناموس ما ۔۔۔ اے تو افلاطون و جالینوس ما

دوسرے اگر پھر بھی عار ہے تو آپ لیاقت علمی و عملی ان مساکین سے زیادہ حاصل کیجئے پھر آپ کے ہوتے ہوئے وہ غریب خود ہی امام نہ بنے گا، آپ امام بنئے! اس مسکین کو عار نہ آوے گی، وہ اقتدار کرے گا اور جماعت ہو جاوے گی، افسوس خود تو الحمد اور قل ھو اللہ بھی صحیح

---

[1] حضرت مولانا جلال الدین رومی رحمۃ اللہ علیہ بلخ میں ۶ ربیع الاول ۶۰۴ھ ۳۰ ستمبر ۱۲۰۷ء میں پیدا ہوئے مولانا روم رحمۃ اللہ نے مثنوی شریف کی تصنیف ۶۲۳ھ / ۱۳۲۵ء میں شروع کی اس کے سات دفتر ہیں جس میں ۵۴ ہزار سے زائد اشعار ہیں۔ سب سے زیادہ مثنوی شریف کی شروحات لکھی گئی ہیں۔ آپ نے ۵ جمادی الثانی ۶۷۲ھ / ۱۲ ستمبر ۱۲۷۳ء کو وفات پائی ۱۲ فیض محمد سراوانی

نہ جانتے ہوں! اس تک کی خبر نہ ہو کہ سجدہ سہو کن صورتوں میں واجب ہو جاتا ہے اس لئے توخود امامت کے قابل نہ ہوں اور جو دوسرا اس قابل ہو اس سے عار کریں یہ عار نہیں نار ہے ؎

زینہار از چنیں تکبر و عار وَقِنَا رَبَّنَا عَذَابَ النَّار

رہ گیا عذر مسجد میں سامانِ آسائش نہ ہونیکا، تو اس عذر کو تو زبان پر لاتے ہوئے بھی ان حضرات کو شرمانا چاہیئے، کیونکہ اس عذر کے معنی تو غور کرنے سے یہ نکلتے ہیں کہ مسجد غربا کا گھر ہے، وہ اگر ہم کو بلاتے ہیں تو ہماری شان کے لائق اس کو سامان سے درست کرنا چاہیئے ورنہ ہم نہیں جاتے۔

کیوں صاحب؟ کیا وہ سچ مچ غربا کا گھر ہے، اگر ان کا گھر نہیں تو پھر اس عذر کے کیا معنی؟ اگر یہ معنی ہیں کہ خدا کا گھر ہے، خدا کو ایسا کرنا چاہیئے، تو کیا اس کہنے کی جرأت کر سکتے ہو؟ اگر نہیں کر سکتے تو اس کے جواب کی کیا ضرورت ہے؟ اور اگر کر سکتے ہو تو جواب سنو! خدا تعالیٰ نے آپ کو اور غربا کو سب کو غلام بنایا ہے، اور منجملہ دوسری خدمتوں کے یہ خدمت بھی سپرد کی ہے کہ اس دربار میں آسائش و ضروریات کا سامان جمع کرو اور اس کے انتظام کے لئے سب کو رقم بھی دی ہے کیونکہ سب اموال مملوک خدائے تعالیٰ کی ہیں پس غربا سے زیادہ تمہارے ذمہ واجب ہے کہ اس دربار یعنی مسجد کا انتظام کرو اور جس سامان نہ ہونے سے آپ وہاں نہیں جاتے اس کو خود درست کرو اور وہاں جاؤ تو یہ عذر کرنا حقیقت میں اپنی کوتاہی کا اظہار و اقرار ہے کہ ہم نے خدمتِ دربار کے متعلق جو احکام تھے ان کی بجا آوری نہیں کی تو یہ غربا کے الزام کی بات ہوئی یا تمہاری شرم کی بات ہوئی؟ یہ تو دنیا دار امراء کے متعلق مضمون تھا،

بعض لوگ دیندا روں میں شمار ہوتے ہیں اور امام میں شرعی عیب نکال کر جماعت ترک کرتے ہیں، کبھی تو اصلی سبب اس کا کوئی دنیوی رنج ہوتا ہے بہانہ کے لئے کوئی عیب ڈھونڈ کر اس کی آڑ لیتے ہیں کہ وہ تو فلاں معصیت میں مبتلا ہے، فلاں بدعت میں مبتلا ہے بعض متکبروں کو اصل مانع تکبر و غربا کی تحقیر ہوتی ہے، مگر چونکہ دین دار کہلاتے ہیں اس لئے شرعی عنوان نکال کر اپنی غرض حاصل کرتے ہیں۔ مثلاً مفتی سے پوچھتے ہیں کہ جناب جس کی بیوی بے

پردہ پھرتی ہو وہ دیوث ہے یا نہیں ؟ اور اس کی امامت جائز ہے یا نہیں ؟ وعلیٰ ھذا۔

اور کبھی اصلی سبب تدین بھی ہوتا ہے، مگر احکام کے نہ جاننے سے یا اہتمام نہ کرنے سے غلطی میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ مثلاً دل سے بدعت سے نفور ہیں اس لیئے امام سے بغض للدین ہے اور کوئی رنج دینوی نہیں ہے، مگر اس مسئلہ کی ان کو خبر نہیں کہ انفراد سے ہر حالت میں جماعت کی نماز افضل ہے، اگرچہ امام مبتدع ہو بشرطیکہ بدعت اس کی حدِ کفر تک نہ پہنچ گئی ہو، اگر اصلی سبب دنیوی رنج ہو تو سمجھنا چاہیئے کہ دین کو اپنی اغراض دینویہ کا ذریعہ بنانا سخت نازیبا و ناپسندیدہ اور بے ادبی و گستاخی ہے جس کا قبیح ہونا محتاج بیان نہیں۔ اگر خلق سے اپنا عیب چھپالیا تو حق تعالیٰ پر تو ظاہر ہے اس کو کیا جواب دوگے؟

اگر اصلی سبب تکبّر ہے تب بھی یہی جواب ہے اور اس سے کچھ اوپر بھی مفصّل بیان تکبّر کا ہو چکا ہے اور یہ بے پردگی کا بہانہ جو تراشا گیا ہے، سو اس کا کلی جواب تو یہی ہے نفسانی غرض کو دین کی آڑ کیوں بناتے ہو اور جزئی جواب یہ ہے کہ خود معترض بھی اس اعتراض سے کم محفوظ ہوں گے، کیونکہ پورا پردہ شریعت کے موافق بڑے لوگوں میں بہت کم ہوتا ہے۔ اکثر ان کے متعلقات دور و نزدیک کے اعزہ کے روبرو بے حجاب آتے ہیں، اتنا فرق ہے کہ بعض غریبوں کی عورتیں خود گھر سے نکل کر نامحرموں کا سامنا کرتی ہیں اور امیروں کی عورتیں گھروں کے اندر بیٹھکر نامحرموں کا سامنا کرتی ہیں، تو دونوں برابر ہوئیں، بلکہ غریبوں کی بیویوں میں اتنی ترجیح ہے کہ وہ میلی کچیلی ہو کر نامحرموں کے سامنے آتی ہیں اور امراء کی عورتیں زیب و زینت کے ساتھ آتی ہیں، تو اب خود دیکھ لیجیئے کہ یہ اقبح ہے یا وہ اقبح ہے، تو اس حیثیت سے بھی اکثر غرباء اولیٰ بالامامت ہوئے اکثر امراء سے۔

اور اگر تدین ہی سبب ہے تو اس میں جو غلطی ہے وہ مسئلہ کے جاننے سے جاتی رہیگی، جیسا اوپر بیان کیا گیا کہ انفراد سے جماعت افضل ہے، رہی کراہت تو اوّل تو کراہت اقتداء اس کیلئے ہے جو اس امام کے معزول کرنے پر قادر ہو، پھر یہ کہ کراہت اخف ہے ترکِ جماعت کی کراہت یا حرمت سے، البتہ اگر ایسے مقام پر شریکِ جماعت ہونے سے احتمال فتنہ کا ہو تو یکسوئی بہتر ہے۔

ان تارکانِ جماعت میں بعض مشائخ دیکھے جاتے ہیں، ان کو یہ دھوکہ ہوا ہے کہ جماعت میں اختلاطِ خلق ہوتا ہے اور اختلاطِ خلق ذاکر و سالک کو مضر ہے،

اور بعض نے تنہا بیان کیا کہ یہ پڑھنے میں وساوس وخطرات کم آتے ہیں، اور جو نماز حضور قلب کے ساتھ ہو وہ افضل ہوتی ہے عدمِ حضور والی نماز سے اور جماعت میں یہ حضور میسر نہیں ہوتا، اس دھوکہ کا منشاء یہ ہے کہ یہ حضرات مواجید وکیفیاتِ ذوقیہ کو مقصود بالذات سمجھ بیٹھے اور وہ بعض اوقات خلوت میں زیادہ ہوتے ہیں بہ نسبت جلوت کے، لیکن واقع میں مقصود بالذات رضائے حق ہے جس کا ذریعہ بجاآوریٔ احکام ہے کہ منجملہ ان کے جماعت کی نماز ہے۔ اگرچہ اس میں ذوقیات ووجدانیات کی قلت ہو، پھر تجربہ ہوا ہے کہ بعض افعال شرعیہ گو سردست کسی کیفیتِ خاص کی قلت کا سبب معلوم ہوتے ہیں مگر ان کی مداومت سے دوسری کوئی کیفیت بتدریج ایسی حاصل ہوتی ہے کہ اس کیفیت فائتہ سے اعلیٰ واقویٰ وابقیٰ ہو اس وقت اس کی قدر معلوم ہوتی ہے۔

خشوع کا فقدان

(۷) ایک کوتاہی جس کو عوام تو عوام بعضے خواص بھی کوتاہی شمار نہیں کرتے اور اس حیثیت سے وہ خاص طور پر اہتمام کے قابل ہے نماز میں خشوع وحضور قلب کا نہ ہونا ہے، جس کے مطلوب ہونے کے لئے آیۃ قد افلح المؤمنون الذین ھم فی صلوٰتھم خاشعون ۞ المؤمنون [۱ـ۲] یعنی کام نکال لے گئے ایمان والے، جو اپنی نماز میں جھکنے والے ہیں۔

اور اس میں تقصیر کرنے کی مذمت کے لئے آیت الم یان للذین آمنوا ان تخشع قلوبھم الخ الحدید [۱۵ - ۱۶] (کیا وقت نہیں آیا ایمان والوں کو کہ گڑگڑائیں ان کے دل) کافی ہے اور سبب اس کا بالاستقراء دو امر ہیں:

(۱) بعض کو تو اہتمام ہی نہیں ان کے لئے تو یہ بے اعتنائی،

(۲) بعض کو اہتمام ہے مگر اس کی حقیقت نہ جاننے سے اس کو اختیار اور قدرت سے باہر سمجھتے ہیں اس لئے اس کی تحصیل کا ارادہ ہی نہیں کرتے۔

پہلے سبب کا علاج تو آیاتِ بالا کے مضمون میں غور کرنا ہے،

اور دوسرے سبب کا علاج اس کی حقیقت سمجھنا ہے جس کو مختصراً بیان کرتا ہوں جس کا وعدہ اس کوتاہی کے ضمن میں کیا گیا ہے کہ بعضے ترکِ نماز کا یہ عذر کرتے ہیں کہ ہم سے حضور قلب نہیں ہو سکتا اور نماز بدون اس کے ہوتی نہیں۔

خشوع کی حقیقت

سو حقیقت لغویہ خشوع کی، سکون ہے اور حقیقتِ شرعیہ اس کی، سکونِ ارادی ہے قلب اور جوارح کا۔ اور سکون مقابل ہوتا ہے حرکت کے، سو جیسی حرکت ویسا سکون تو جوارح کی حرکت اینیہ یعنی مکانیہ ہوتی ہے ان کا سکون یہی ہے کہ جس حرکت کا شرعاً امر نہیں وہ حرکت نہ کرے یعنی ارادہ سے ہاتھ پاؤں عبث نہ ہلاوے ادھر ادھر گردن یا نظر سے التفات نہ کرے، سر اوپر کو نہ اٹھاوے، بالوں کو، کپڑوں کو بار بار نہ سنوارے، بدون ضرورت نہ کھجلاوے، نہ کھنکارے ونحو ذالک

اور قلب کی حرکتِ فکریہ ہے اس کا سکون عدم الفکر ہے یعنی اپنے ارادہ سے کسی بات کو نہ سوچے، سو جیسی حرکت جوارح کی اگر بلا قصد ہو مثلاً رعشہ سے کسی کی گردن ہلتی ہو تو وہ منافی خشوع کے نہیں کیونکہ اختیار سے خارج ہے اور اضطراریات امر و نہی کے تحت میں نہیں ہیں، اسی طرح اگر حرکت قلب کی بلا مقصد ہو یعنی کوئی خیال خود بخود آجاوے تو وہ بھی اسی دلیل سے منافی خشوع کے نہیں پس غلطی لوگوں کی یہ ہے کہ خشوع کے معنی یہ ہیں کہ بالکل خیال نہ آوے اور اسی بنا پر اس کو محالِ عادی سمجھتے ہیں مگر اس بنا کا فاسد ہونا ہماری تقریر سے معلوم ہو چکا ہے، جس سے محرر ہو گیا کہ خشوع اختیاری فعل ہے اور ہر شخص اس پر قادر ہے اور بہت آسان ہے البتہ ارادہ و توجہ کی ضرورت ہے۔

حصول خشوع کا طریقہ

پس جیسے سب افعالِ ارادیہ کی شان ہے کہ ارادہ کرو تو آسان ارادہ نہ کرو تو مشکل حتیٰ کہ اگر منہ میں لقمہ لے کر بیٹھ جاوے اور نگلنے کا ارادہ نہ کرے تو وہ بھی آسان

نہیں پس اگر لقمہ نگلنا آسان ہے تو خشوع بھی اتنا ہی آسان ہے اور اگر خشوع محال ہے تو لقمہ نگلنا بھی اتنا ہی محال ہے، دونوں کے یُسر اور عُسر میں کچھ فرق نہیں اور سہل طریقہ اس کا یہ ہے۔

کہ نماز میں جو کچھ بھی منہ سے نکلے محض یاد سے نہ پڑھے بلکہ ہر ہر لفظ پر مستقل ارادہ کر کے اس کو منہ سے نکالے کہ اب سُبحَانَكَ اللّٰھُمَّ کہوں گا اب وَبِحمدِكَ کہہ رہا ہوں اب وَتبارَكَ اسمُكَ منہ سے نکل رہا ہے وعلیٰ ھذا،

پس جب ہر لفظ پر خاص توجہ رہے گی لامحالہ حسبِ قاعدہ عقلیہ کہ النفس لاتتوجہ الیٰ شیئن فی آنٍ واحدٍ دوسرے خیالات بند ہو جاویں گے۔ ترجمہ: نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوتا۔

اس مراقبہ کو اوّل سے آخر تک بالالتزام کرے انشاء اللہ تعالیٰ اول تو بلا قصد بھی کوئی خیال نہ آوے گا اور اگر فرضاً آ جاوے تو پھر اس سوچ میں نہ پڑے کہ ارے یہ تو پھر خطرات آنے لگے، یہ سوچ بھی خیال غیر ہے، بلکہ اسی عملِ تجدید تعلقِ ارادہ و توجہ کو بطریقِ مذکور آئندہ کے لئے پھر تازہ کردی پھر وہ خطرات دفع ہو جاویں گے۔ وھٰذا من افادات استاذی استاذ الکل حضرت مولانا محمد یعقوب علیہ رحمۃ اللہ علام الغیوب [۱]

اور اس احقر کا ایک وعظ خشوع کے ہر پہلو پر مفصل بحث میں شائع ہو چکا ہے جس کا نام "مواعظ اشرفیہ" ہے اس کے ملاحظہ سے انشاء اللہ تعالیٰ اس باب میں کسی قسم کا خفاء باقی نہ رہے گا۔

متفرق کوتاہیاں

ایک کوتاہی کہ ذی شعب مختلفہ ہے اور اسی پر اپنی تحریر کو ختم کرنا چاہتا ہوں یہ ہے

[۱] حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی ولد مولانا مملوک علی صابرؒ ۱۳ صفر ۱۲۴۹ھ / جون ۱۸۳۳ء میں پیدا ہوئے۔ تاریخی نام منظور احمد ہے۔ حدیث شریف آپ شاہ عبد الغنی رح سے ۔۔۔ھ سے پڑھی (حاشیہ دیکھیں صفحہ)

کہ نماز اتنی بڑی ضروری چیز اور پھر روزانہ پانچ بار ۔ واقع ہونے والی اور اس کے شرائط وارکان کے ہر جزو اور ہر موقع پر بے شمار صورتیں پیش آتی ہیں، جن کے احکام بہت لوگوں کو معلوم نہیں، مگر باوجود اس کے بہت کم دیکھا جاتا ہے کہ ان احکام و مسائل کو لوگ دریافت کرتے ہوں!

(۱) بہت لوگ ناواقفی سے بلا اضطرار اس طرح جمائی لیتے ہیں یا بلا عذر کھنکارتے ہیں کہ حروف ظاہر ہو کر نماز جاتی رہتی ہے،

(۲) بہت لوگ ایسے لباس غیر مشروع سے نماز پڑھتے ہیں کہ نماز ان کی قبول نہیں ہوتی بالخصوص بعض اقسام ریشم و مخمل کے استعمال میں تو خواص تک بے احتیاطی کرتے ھیں۔

(۳) بعض لوگ ہجوم میں امام سے پہلے نیت باندھ لیتے ہیں کہ وہ نماز ہی نہیں ہوتی۔

(۴) بعض لوگ امام کے ساتھ رکوع میں اس طرح شامل ہوتے ہیں کہ اللہ اکبر کہتے ہی رکوع میں پہنچ جاتے ہیں اور اول قیام نہیں کرتے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔

(۵) بعضے لوگ قعدۂ اخیرہ میں امام کے ساتھ شریک ہونا چاہتے ہیں مگر ان کی تکبیرِ تحریمہ ختم کرنے سے پہلے امام سلام پھیر دیتا ہے تو وہ اقتدار صحیح نہیں ہوتی اور نیت اقتدار موضع انفراد میں مفسدۂ صلوٰۃ ہے ان کی نماز بھی نہیں ہوتی از سر نو نماز شروع کرنا چاہیئے۔

(۶) اسی طرح بعض اوقات امام سہواً بعد قعدۂ اخیرہ کے کھڑا ہو جاتا ہے تو مسبوق بھی اقتدار کی حیثیت سے ساتھ اٹھ کھڑا ہوتا ہے حالانکہ اس وقت مسبوق کو اقتدار جائز نہیں تو اس کی نماز بھی فاسد ہو جاتی ہے

(۷) علیٰ ھذا اگر امام مسافر بعد دو رکعت کے سہواً کھڑا ہو جاوے مقتدی مقیم کو اس کے ساتھ مقتدی رہنا بھی مفسد صلوٰۃ فرض ہے۔

(باقی حاشیہ صفحہ ۱۰۱) معقولات، منقولات غرض کہ تمام فنون میں کامل تھے شاعری میں کسی کی شاگردی نہ کی۔ مگر کبھی جب طبیعت حاضر ہوتی تو اردو فارسی عربی میں بہترین شعر کہتے تھے شاعری میں غلو نہ تھا۔ بلا تکلف اگر کہہ لیا کہہ لیا ورنہ نہیں۔ گمنام تخلص فرماتے تھے۔ یکم ربیع الاول ۱۳۰۳ھ مطابق دسمبر ۱۸۸۴ء میں ہیضہ کی وبا میں وفات پائی! ۲ محمد مکی،

اس مقام پر مسائل کا استیعاب منظور نہیں اور نہ ممکن ہے، محض بعض مثالیں پیش کرنا ہے کہ ایسی صورتیں کس کثرت سے واقع ہوتی ہیں جنھیں نماز نہیں ہوتی اور لوگ اس سے بے خبر ہیں!

اسی طرح شرائط میں بھی بے پروائیاں کیجاتی ہیں:۔

(۸) بعضے آدمیوں کو دیکھا گیا ہے کہ کپڑے پر تکیہ پر اگرچہ غبار نہ ہو تیمم کر لیتے ہیں۔

(۹) بعض کو دیکھا ہے کہ اگر وضوء وغسل میں کہیں پاؤں وغیرہ خشک رہ جاتا ہے ویسے ہی تر ہاتھ پھیر لیتے ہیں جو کہ مسح ہے، پانی ڈال کر نہیں دھوتے۔

(۱۰) بعض آدمی باوجود اندیشۂ قطرہ کے فوراً صرف پانی سے استنجا کر لیتے ہیں اور پھر قطرہ آجاتا ہے، اگر خبر بھی ہوگئی اور وضوء بھی دہرالیا مگر پائجامہ پاک نہیں کرتے اور اس طرح کئی بار میں مقدار عفو سے بڑھ جاتا ہے اور اسی کپڑے سے نماز پڑھتے رہتے ہیں اور اگر علم نہ ہوا تو بے وضو ہی نماز پڑھی جاوے گی اور اگر شبہ ہو کہ بے خبری میں معذور ہے؟ جواب یہ ہے کہ معذور اس وقت ہے کہ جب نقضِ وضو کا احتمال غالب نہ ہو ورنہ اس احتمال کا انسداد واجب ہوگا اور جب قوی کا ضعف مشاہدہ ہو تو قطرہ کا قطع کرنا ضروری ہوگا اور تجربہ سے اس باب میں کلوخ سے بہتر کوئی چیز ثابت نہیں ہوئی۔

نااہل کو امام بنالینا

اسی طرح بہت جگہ امام ایسے ہیں کہ نماز لوگوں کی فاسد یا مکروہ ہوتی ہے، پھر بعض جگہ تو مقتدی ہی اس خرابی کا سبب ہوتے ہیں، یعنی امام تقرر کرنے کے وقت اس کی صلاحیت واہلیت کو نہیں دیکھتے بلکہ اکثر دیکھا جاتا ہے کہ محلہ بھر میں جو شخص سب سے نکما ہوتا ہے اس کو ارزاں سمجھ کر امامت کے لئے تجویز کیا جاتا ہے، چاہے اس کو قرآن پڑھنا بھی نہ آتا ہو، خواہ اس کو مسائل بھی یاد نہ ہوں اور بعض جگہ مقتدیوں کا کچھ دخل ہی نہیں ہوتا خود ہی براہ تکبر بعضے اہلِ وجاہت امام بن بیٹھتے ہیں اور قصبات میں جمعہ وعیدین کے اکثر ائمہ اسی شان کے ہیں اور اس خرابی کی ابتداء امامت کا موروث ہونا ہے جس کی بناء

بعض سلاطین کے وقت سے پڑی ہے اس وقت گو اس میں کوئی مصلحت ہو، مگر اب تو اس میں اس قدر مفاسد ہو گئے ہیں کہ اس کا توڑنا اور ایسے امام کو چھوڑنا واجب ہے، اگر اس کے معزول کرنے پر قدرت نہ ہو تو خود تو عزلت کرنا ممکن ہے۔
یعنی سب مل کر کسی دوسری جگہ جماعت کا انتظام کر لیں، اور کسی اہل کو امام تجویز کر لیں۔ البتہ جہاں امام سے ضرر رسانی کا اندیشہ ہو تو یہ بے چارے معذور ہوں گے، صبر کرنا چاہیئے، یہ تھے شعبے اس لاحق الذکر کوتاہی کے۔

علم دین، سب کا علاج

ان سب کا علاج ——— علم دین ہے، جو پڑھنے سے یا علماء کے پاس آنے جانے سے اور پوچھتے رہنے سے نہایت سہولت سے ممکن الحصول ہے۔
یہ تھا مختصر ضروری بیان ان کوتاہیوں کا جو کثیر الوقوع ہیں اور جن کا وقوع قلیل ہے ان کا ذکر مطوی (ختم) کیا گیا، اول بوجہ قلتِ وقوع کے دوسرے اس لئے کہ ان کا مذموم ہونا کسی پر مخفی نہیں، سو تنبیہ کے لئے یہ علم ہی کافی ہے۔
(۱) جیسے شرم سے بے وضو نماز پڑھ لینا یا پڑھا دینا
(۲) وضو کر کے سو رہنا اور کسی کے جگانے کے بعد سب کو جھٹلا لینا کہ میں تو نہیں سویا تھا اور اسی طرح نماز پڑھ لینا۔
(۳) نماز میں اخلاص نہ ہونا، یعنی صرف اسی لئے نماز پڑھنا کہ لوگ مجھ کو نمازی سمجھیں جس کو ریاء کہتے ہیں و نحو ذالک

وسوسہ، کفر نہیں!

گو یہ امور واقع ہوتے ہیں مگر کثرت نہیں ہے اور گو ریاء کثیر الوقوع ہے مگر استقراء سے معلوم ہوا کہ صرف نفل عبادات میں کثیر الوقوع ہے اور یہاں زیادہ بیان کرنا غیر نفل کا مقصود ہے اور نفل عبادات و ذکر وغیرہ میں بھی ریاء وہیں ہے جس جگہ

س کا قصد ہوا ور جو شخص اس کو برا سمجھے، دفع کرے، وہاں اس کا شبہ کرنا اور اس
نم میں مبتلا ہوجانا جیسے بعض سالکین کو پیش آتا ہے مضر ہے، جس خطرہ پر ان کو یہ گمان
ہوجاتا ہے، وہ وسوسہ ہے، ریا نہیں ہے، سو وسوسہ پر مؤاخذہ نہیں، اس کی موٹی
ور تسلّی بخش مثال یہ ہے کہ :-

بالاجماع وسوسہ کفر نہیں اور اس پر مؤاخذہ نہیں اسی طرح اس کو سمجھیے یہ نکتہ —
رچہ بہت چھوٹا ہے مگر نفع میں اگر اس کو علم عظیم کہا جاوے تو بجا ہے، والحمد للہ علی
اعلمنیہ وفہمنیہ اور بھی بعض کوتاہیاں ہوتی ہیں جس کی عدم ذکر کی وجہ ذکر
کی گئی ۔

روزے کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ صیام)

ارکانِ اسلام میں سے ایک "روزہ" رمضان شریف کا ہے جو مثل نماز کے عبادت بدنیہ ہے اس میں جو انقلاب ہوا ہے نماز کے بعد اس کا بیان بقدرِ ضرورت مع اصلاح ضروری معلوم ہوتا ہے اور بعض اعمال رمضان المبارک کے متعلق اور بھی ہیں روزے کے ساتھ ان کا بیان بھی مناسب ہے مجموعہ ان اعمال کا یہ ہے:

(۱) رویت ہلال (۲) صوم (۳) سحر (۴) افطار (۵) قیامِ رمضان یعنی تراویح اور دو عمل جو عید کے متعلق ہیں ان کو بھی اس کے ملحقات سے کہہ سکتے ہیں یعنی

(۱) صدقۂ فطر، (۲) نمازِ عید

یہ کل سات ہوئے ان سب کے متعلق مختصر مختصر مضامین مذکور ہوتے ہیں

رویتِ ہلال

اس میں (جہاں اسلامی ریاست نہیں ہے) ایک بے احتیاطی عظیم ہوگئی ہے وہ یہ کہ قریب قریب ہر شخص گو وہ علم دین بھی نہ رکھتا ہو اس میں بلا مراجعت علماء کے اپنی تحقیق پر گو کہ

وہ کسی اصل شرعی پر مبنی نہ ہو اعتماد کرتا ہے، جس روایت کو چاہا قبول کر لیا، اگرچہ وہ قابل قبول نہ ہو اور جس کو چاہا رد کر دیا اگرچہ وہ قابل رد نہ ہو،

اور ظاہراً رمضان کے چاند کی نسبت قبول کرنے میں زیادہ احتیاط معلوم ہوتی ہے اور لوگوں کو اکثر یہی دھوکہ ہو جاتا ہے کہ روزہ ہی تو رکھواتے ہیں اس میں کیا برائی ہے، لیکن ایک بے احتیاطی تو فی الحال ہو جاتی ہے کہ بدون ثبوت رمضان نیت با اعتقاد رمضان یعنی بہ نیتِ فرض روزہ رکھا جاتا ہے اور غیر رمضان روزہ رکھنا ممنوع آیا ہے چنانچہ حدیث نہی عن صوم یوم الشک کا یہی حاصل ہے جس کی لم اور راز ___ یہ ہے کہ حدود شرعیہ کی اس میں توہین اور ہتک لازم آتی ہے گویا شارع علیہ السلام کے نزدیک تو رمضان مثلاً ہفتہ کے دن سے شروع ہوگا، مگر اس شخص کے نزدیک جمعہ ہی سے شروع ہو گیا، حدود کی مزاحمت کے جرم ہونے میں کیا شبہ ہو سکتا ہے؟

ایک اور بے احتیاطی جو اس سے اشد ہے بعض اوقات فی المآل ہو جاتی ہے وہ یہ کہ مثلاً اسی بناء غیر صحیح پر روزہ شروع کیا اور ختم رمضان پر آفاق سے ابر وغیرہ ہوا تو یہ شخص اکمالِ ثلثین کے قاعدہ پر (یعنی تیس پورے کر کے) عید کرے گا اور ممکن ہے کہ وہ عین تیس تاریخ رمضان کی ہو تو کس قدر سخت بات ہے اور اس شخص کے اثر سے جتنوں نے عید کی اور ایک ایک فرض ان کا برباد ہوا سب کا وبال اس کی گردن پر رہا اور چونکہ اپنے نزدیک رمضان پورا کر چکے ہیں، اس لئے اس روز کی قضا بھی کوئی نہ کریگا تو سب کے ذمہ ایک ایک فرض چڑھا رہا اور اسی پر موت آ گئی . . . !

پس جب ایسی بے احتیاطیاں اس قبول کرنے میں ہوئیں تو اس قبول کرنے کو احتیاط نہیں کہا جا سکتا اور بلا وجہ شرعی رد کرنے میں تو بے احتیاطی کا لزوم ظاہر ہے، فرض روزہ کا ضائع کرنا لازم آتا ہے اور یہی خود رائی بعض اوقات ہلال عیدین میں ہوتی ہے تو وہاں دونوں شقوں میں صریح خرابی ہے یعنی اگر قابل قبول کو رد کر دیا تو عید کا روزہ رکھوایا جو حرام ہے اور قابل رد کو قبول کر لیا تو رمضان کا روزہ تڑوایا جو اس سے بڑھ کر حرام ہے۔

تار برائے شہادت کیوں معتبر نہیں ؟

میں نے بے علموں کو دیکھا ہے کہ محض افواہی خبر سن کر قبول کر لیتے ہیں ، ان کو یہ خبر نہیں کہ خبر کی حجت ہونے کی کیا شرائط ہیں ؟ کبھی کہیں سے تار آجانے پر اعتبار کر لیتے ہیں اور ان کو اس کے احکام فقیہہ کی اطلاع نہیں جو کہ مخصوص ہے علمار محققین و متقین کے ساتھ ، بس بڑا مدار استدلال اس کے قبول پر ان کے نزدیک یہ ہے کہ صاحب لاکھوں روپے کی تجارت تار پر چلتی ہے پھر اس کے اعتبار نہ کرنے کا کیا سبب ... ؟

لیکن اگر ان سے کوئی پوچھے کہ گواہ کے پاس سمن آنے کے بعد اگر تار پر شہادت ادا کر دے تو قانوناً کیوں معتبر نہیں ؟ اور معاملات تجارت اور اس شہادت میں کیوں فرق ہے ؟ اور اس شہادت میں اور رویت ہلال کی شہادت میں کیا فرق ہے ؟ تو اس کا معقول جواب نہیں دے سکتے ، اسی طرح میں نے بعض بے علموں کو محض اس بنار پر شہادت کو رد کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ شہادت ادا کرنے والا گنوار ہے کوئی معزز آدمی نہیں ، اگرچہ وہ گنوار دین میں ان معززین سے ہزار درجہ افضل ہو مگر ان کے نزدیک وہ آدمی بھی نہیں ! پھر اسی قسم کے لوگوں کو یہاں تک تنزل کرتے ہوئے دیکھا ہے کہ کہتے ہیں میرے چماروں نے دیکھا ہے ، ہمارے محلے کے فلاں فلاں نابالغ بچے نے دیکھا ہے ، پس یا آن شور اشوری یا باتیں بے تمیزی اور اس تمام تر خرابی کا منشار صرف یہی ایک امر ہے کہ علمار سے اپنے کو مستغنی سمجھتے ہیں بلکہ افسوس ہے کہ بعض اوقات ان کا فتویٰ سن کر ان سے مزاحمت کرتے ہیں اور اس میں جرح نکالتے ہیں ۔ انا للہ وانا الیہ راجعون .... !!

طریق علاج

سو اس کی اصلاح یہ ہے کہ ہر شخص اس میں دخل نہ دیا کرے ، دوسرے کی رویت پر حکم لگانا تو بڑی بات ہے مصلحت یہ ہے کہ خود اپنی رویت یعنی دیکھنے کو بھی ہر ایک کے رُوبرو

رویت ہلال کے موضوع پر دیکھئے حضرت مفتی محمد شفیع صاحب کا رسالہ " رویت ہلال " ۱۲

بیان کرتا نہ پھرے کہ اور لوگ حکم لگادیں گے، البتہ حاضرینِ مجلسِ رویت یا عقلاء کے روبرو ظاہر کرنا مضائقہ نہیں، بلکہ سب خبروں اور مشاہدات کو جمع کرکے کوئی عالم معتبر متدین قریب ہوں تو ان کے پاس جاکر اور اگر فاصلہ سے ہوں اور خود نہ جاسکے تو دو تین عاقل دین دار آدمیوں کو ان کی خدمت میں حاضر کرا کے پوری صورت حال واقعہ کی عرض کرکے وہ جو فتویٰ دیں اس پر عمل کریں اور اگر اس فتوے میں کوئی شبہ خیال میں آوے تو عوام کے روبرو اس کو ظاہر نہ کریں کہ انتظام دین میں خلل پڑے گا بلکہ بواسطہ یا بلاواسطہ اس کو بھی ان ہی عالم سے یا اور کوئی صحبت یافتہ علماء کا قریب ہو اس سے پیش کرکے حل کرے۔

علماء کو مشورہ

بلکہ میں تو بروئے تجربۂ واقعات یہاں تک ضروری سمجھتا ہوں کہ جس جگہ متعدد علماء ہوں وہاں ایک عالم بھی بدون مشورہ دوسرے علماء کے اس باب میں اپنی تحقیق و رائے عوام کے روبرو ظاہر نہ کرے، کیونکہ ممکن ہے کہ دوسرے عالم کی رائے میں کچھ اختلاف ہو اور اقوالِ مختلفہ کے شیوع سے عوام میں تشویش پھیل جائے بلکہ سب مشورہ کرکے اور اگر اختلاف ہو تو باہم طے کرکے ایک قول منقح کرکے وہی قول منقح عوام تک پہنچے اور جس عالم سے استفسار کیا جائے ایک ہی جواب سب جگہ سے ملے اور اگر رائے میں اتفاق نہ ہو تو جو شخص زیادہ مرجع خلائق و کبیر ہو فتویٰ اس کے سپرد کر دیں، باقی سکوت کریں، اگر ان سے کوئی پوچھے تو اسی مرجع موصوف کی طرف حوالہ کریں، خود خاموش رہیں اس میں ان شاء اللہ کبھی بدنظمی نہیں ہوسکتی، میں نے تو ایسی تشویشات کو دیکھ کر ایک مقام پر یہ انتظام کیا تھا کہ سب علماء کو متفق کرکے خاص ایک عالم کو اس باب خاص میں محط خبر و مدار حکم ٹھہرالیا کہ جو خبر ہلال سے متعلق جس عالم کے پاس آوے، وہ ان کی خدمت میں پہنچائی جاوے اور جو شخص جس سے فتویٰ پوچھنے آوے وہ سائل کو ان ہی کے پاس بھیج دے اور جس کو کوئی اختلاف کرنا ہو انہیں سے ظاہر کرے، غرض عوام کو اختلاف کی اطلاع نہ ہو اور حکم حاصل کرنے میں ان کو تشویش نہ ہو اور اس قرارداد کے بعد عام لوگوں میں اس کا اشتہار دے دیا گیا

پس سب خلجانوں سے نجات ہوگئی تھی اگر سب جگہ ایسا انتظام کرلیا جاوے تو اقرب الی الاتفاق
دابعد من الافتراق ہے۔

ضروری احتیاط

اور ایک انتظام یہ ضروری ہے کہ چاند دیکھنے پر یا اس کی خبر سننے پر بلا ضرورت دوسرے
مقامات پر تار نہ دوڑایا کریں، بلکہ کسی عامی کے پوچھنے پر بھی جواب نہ دیا کریں کہ دوسری
جگہ عوام کی ہاتھ میں ایسی خبریں پہنچ جانے کے بعد چونکہ اس وقت خود رائی کا غلبہ ہے
ضرور مفاسد پیش آتے ہیں کہ ان کا انسداد قابو سے باہر ہے، اور شرعاً کوئی ضروری امر ہے
نہیں کہ از خود دوسری جگہ خبر بھیجا کرو،

البتہ کوئی عالم دریافت کرے تو جواب دے دو، پھر وہ خود ہی حکم شرعی کے موافق
عمل کریں گے اور کسی مفسدہ کا احتمال نہ ہوگا اور جب ایسے استدلالات کہ کسی درجہ میں صلاحیت
استدلال ہونے کی رکھتے ہیں، بدون حکم علماء کے قابلِ اطمینان نہیں، تو جو استدلال اپنی
ذات میں بھی صلاحیت استدلال ہونے کی نہیں رکھتے ان سے دلیل پکڑنا تو کس قدر مذموم
اور اختراع فی الدین ہوگا۔

مثلاً رجب کی چوتھی کا لامحالہ غرہ رمضان کے موافق ہونا چاند کا بڑا ہونا یا دیر تک ٹھہرنا
اونچا ہونا یا بدر کامل ہونا بیٹھ کر اٹھنا دو شب تک غائب رہنا، فلاں جنتری میں ۲۹ یا ۳۰ کا
لکھا رہنا و مثل ذالک یہ سب شرع میں غیر معتبر ہیں۔

اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ اکثر ایسے امور حسابی اور مطابق واقع کے ہیں تو شرع نے امور
واقعیہ کی نفی کیسے کی اس میں تو اس کی طرف نسبت کذب کی لازم آتی ہے؟ وجہ اس شبہ
کے وارد نہ ہونے کی یہ ہے کہ شرع نے ان امور کے وقوع کی نفی نہیں کی کہ یہ محذور لازم
آئے بلکہ ان امور کے اعتبار کی نفی کی ہے یعنی ہم ان امور کے وقوع پر اپنے احکام کا مدار نہیں
رکھتے تو یہ حق ہر صاحب قانون کو حاصل ہے۔

مثلاً کوئی نوکری مشروط ہو بی اے کے ساتھ تو وہ انٹرینس والے کو نہ ملے گی تو اس کے یہ

معنی نہیں کہ اس شخص کے انٹرینس ہونے کی نفی کی گئی ہے بلکہ معنی یہ ہیں کہ انٹرینس ہونا معتبر اور مدار استحقاق نوکری کا اس موقع پر نہیں ہے تو اگر غرۂ شرعی غرۂ حسابی نہ ہو تو اس کو یکم کہنے کے یہ معنی نہیں کہ وہ واقع میں یکم ہے بلکہ معنیٰ یہ ہیں کہ خواہ وہ واقع میں کسی دوسرے حساب سے دوم ہو مگر بروئے قواعد فلاں فلاں روزہ اسی سے شروع کرنے کا حکم دیا جاتا ہے اور روزہ شروع کرنے کی تاریخ کو ہماری اصطلاح میں یکم کہا جاوے گا اور لغت و اصطلاح کا تطابق ضروری نہیں۔

جیسا اہل حساب تاریخ کو طلوع سے شروع کرتے ہیں اور اس کو کوئی محل اعتراض نہیں سمجھتا۔ یہاں تک رویت ہلال کے متعلق کلام ہو چکا۔

صوم

روزہ میں تفریط کرنے والوں کا ذکر

اس میں چند کوتاہیاں کی جاتی ہیں :

(۱) ایک یہ کہ بعض تو بلا کسی وجہ قوی یا ضعیف کے روزہ نہیں رکھتے، میں نے ایک شخص کو دیکھا تھا جس نے عمر بھر کبھی روزہ نہیں رکھا تھا، پھر ان میں بعض تو کم ہمت ہیں وہ سمجھتے ہیں کہ ہم سے روزہ پورا نہ ہو سکے گا، چنانچہ وہ شخص اسی بلا میں مبتلا تھا۔ میں نے کہا کہ تم بطور امتحان ہی رکھ کر دیکھو، چنانچہ رکھا اور پورا ہو گیا اور پھر اس کی ہمت بندھ گئی اور رکھنے لگا۔

کیسے افسوس کی بات ہے؟ کہ رکھکر بھی نہ دیکھا تھا اور پختہ یقین کر بیٹھا تھا کہ کبھی رکھا ہی نہ جاوے گا ..... !!

یہ لوگ سوچ کر دیکھیں کہ اگر طبیب کہہ دے کہ آج دن بھر نہ کچھ کھاؤ نہ کچھ پیو، ورنہ فلاں مرض مہلک پڑ جاوے گا، تو اس نے تو ایک ہی دن کے لئے کہا ہے یہ شخص دو دن نہ کھاوے گا کہ احتیاط اسی میں ہے، افسوس ہے کہ خدا تعالیٰ دن، دن کا کھانا، پینا چھڑا دیں

اور کھانے پینے سے عذابِ مہلک کی وعید فرماویں اور قولِ طبیب کے برابر بھی اس کی وقعت نہ ہو انا للّٰہ وانا الیہ راجعون ۔۔۔۔۔!!

(۲) اور بعض ان سے بھی بدتر بدعقیدت ہیں کہ روزہ کی ضرورت ہی میں ان کو کلام ہے، پھر بعضے تو ان میں مہذب ہیں، کہتے ہیں کہ روزہ جس غرض سے مشروع ہوا تھا کہ قوتِ بہیمیہ منکسر ہو جاوے، وہ غرض ہم کو بدولت علم وتہذیب کے حاصل ہے، اس لئے اب روزہ کی ضرورت نہیں،

ان کا جواب یہ ہے کہ اول تو تم کو اس غرض کا حاصل ہونا مشاہدہ کے خلاف ہے، قوتِ بہیمیہ کے آثار فخر و تعلی وظلم وقساوت جس قدر تم میں ہیں دوسروں میں اس کا عشر عشیر بھی نہیں، دوسرے اگر غرض حاصل بھی ہو جاوے تب بھی یہ مسلّم نہیں کہ روزہ بس اسی غرض کے لئے مشروع ہے، بلکہ خود اس کی صورتِ نوعیہ بھی مطلوب ہے، تفصیل اس جواب کی نماز کے مضمون میں بیان ہو چکی وہاں ملاحظہ فرمائیے۔

روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو!

(۳) اور بعضے تہذیب سے بھی گذر کر گستاخی اور تمسخر کے کلمات کہتے ہیں۔ مثلاً روزہ وہ رکھے جس کے گھر میں اناج نہ ہو، یا یہ کہ بھائی ہم سے بھوکا نہیں مرا جاتا، یا ایک اعلیٰ تعلیم یافتہ صاحب کو علانیہ رمضان میں کھاتے ہوئے جو ایک دیندار نے ٹوکا کہ رمضان میں دن کو کھاتے ہو؟ تو وہ فرماتے ہیں کہ " رمضان " کیا چیز ؟ اس دیندار نے کہا کہ صاحب رمضان مہینہ ہوتا ہے تو کہتے ہیں کہ جنوری، فروری، الخ اس میں رمضان تو کہیں نہیں آیا۔ اور امثال ان اقوال کے !!

سو یہ دونوں فریق بوجہ انکارِ فرضیتِ روزہ کے زمرۂ کفار میں داخل ہیں اور پہلے فریق کا قول محض ایمان شکن ہے اور دوسرے کا ایمان شکن بھی اور دل شکن بھی۔ اور فریقِ اول اس تاویل سے کفر سے نہیں بچ سکتا، کیونکہ یہ تاویل ہے ضروریات دین میں اور ایسی تاویل دافعِ کفر نہیں ہوتی کما تقرر فی محلّہٖ اور یہ مہذب فریق ظاہراً اس غیر مہذب سے

اہون ہے مگر عند التامل ضرر میں اس سے اشد ہے، کیونکہ غیر مہذب عنوان خود اپنے بطلان پر دلیل ہے اور مہذب عنوان میں تلبیس زیادہ محتمل ہے اور جس طرح بد عقیدت لوگوں میں دو فریق ہیں مہذب اور غیر مہذب جیسا ابھی بیان ہوا، اسی طرح کم ہمت لوگوں میں بھی دو فریق ہیں۔ ایک مہذب جو باوجود روزہ نہ رکھنے کے علانیہ نہیں کھاتے پیتے، بلکہ اپنے اس عیب کا اخفار کرتے ہیں اور ظاہر ہونے پر شرماتے ہیں۔

دوسرے غیر مہذب جو ذرا شرم نہیں کرتے علانیہ کھاتے پیتے ہیں اور روکنے پر کہتے ہیں کہ جب خدا کی چوری نہیں تو بندہ کی کیا چوری؟ حالانکہ یہ مضمون محض تلبیس ہے کیونکہ خدا تعالیٰ سے تو کسی معصیت کا اخفار ہو ہی نہیں سکتا، اور خلق سے اخفار ہو سکتا ہے، تو ممکن کا قیاس محال پر یہ خود سفسطہ[1] ہے دوسرے مخلوق سے معصیت کے اخفاء کا خود خدا تعالیٰ نے حکم دیا ہے تو اس کے ترک سے اور بھی معصیت اشد ہو جاتی ہے تو بلا وجہ اشد میں کیوں مبتلا ہو،

روزہ افطار کرنے کے لئے ادنیٰ بہانہ!

(۴) بعض بلا عذر تو روزہ ترک نہیں کرتے مگر اس کی تمیز نہیں کرتے کہ یہ عذر قوی اور شرعاً معتبر ہے یا نہیں ادنیٰ بہانہ سے روزہ افطار کر دیتے ہیں خواہ ابتداء ہی سے نہیں رکھتے، یا رکھ کر توڑ ڈالتے ہیں، ذرا پیاس لگی روزہ افطار کر دیا خواہ ایک ہی منزل کا سفر ہوا روزہ افطار کر دیا۔ کچھ محنت مزدوری کا کام ہوا اور روزہ افطار کر دیا اور ایک طرح سے تو یہ لوگ بلا عذر روزہ توڑنے والوں سے بھی زیادہ قابل مذمت ہیں وہ یہ کہ بلا عذر نہ رکھنے والے خود بھی اپنے کو صاحب عذر نہیں سمجھتے، اپنے کو فعل قبیح کا مرتکب سمجھتے ہیں اور یہ لوگ اپنے کو معذور جان کر بے گناہ سمجھتے ہیں، حالانکہ شرعاً وہ معذور نہیں، اس لئے گناہ گار ہوں گے، ان لوگوں کو چاہیئے کہ ایسے لوگوں پر نظر کریں جو سخت سے سخت حالت میں بھی روزہ نہیں چھوڑتے۔

---

[1] قیاس سفسطی:۔ وہ قیاس ہے جو ایسے مقدمات سے مرکب ہو جو محض وہمی اور جھوٹے ہوں جیسے ہر موجود شئے اشارہ کے قابل ہے اور جو اشارہ کے قابل ہے جسم والا ہے پس ہر موجود جسم والا ہے یا جیسے گھوڑے کی تصویر کی نسبت کہیں یہ گھوڑا ہے۔ اور ہر گھوڑا ہنہنانے والا ہے پس یہ ہنہنانے والا ہے ۱۲ عبد الرؤف

عادت وعزم سے مشکل سے مشکل کام بھی آسان ہو جاتا ہے

میں نے ریلوے کے ایک ڈرائیور کو دیکھا ہے کہ ہر وقت انجن میں رہتا تھا اور سخت گرمی کی فصل تھی اور روزے رکھتا تھا، بہت سے کھیتی کاٹنے والے دیکھے گئے ہیں کہ جیٹھ بیساکھ کے دنوں میں دھوپ میں بیٹھکر کھیتی کاٹتے ہیں اور روزے رکھتے ہیں، تجربے سے معلوم ہوا ہے کہ قدرے عادت اور زیادہ ہمت یعنی پختہ ارادہ ان دونوں کے جمع ہونے سے مشکل سے مشکل کام بھی سہل ہو جاتا ہے۔ اور ذوق وجدان سے کام لیا جاوے تو روزہ میں تسہیل وتائید خداوندی کا کھلی آنکھوں مشاہدہ ہوتا ہے، پھر اس پر بھی ہمت توڑ دینا اور بہانہ ڈھونڈنا سخت محرومی ہے!

عذرِ اختیاری کا حکم

(۵) بعضے لوگ عذر کی حد کو تو سمجھتے ہیں لیکن عذر اپنے اختیار سے قصداً پیدا کر لیتے ہیں مثلاً شرعی سفر واقع میں عذر ہے مگر اس شخص کو درحقیقت سفر کی ضرورت نہیں تھی، صرف اس نیت سے بلا ضرورت سفر کیا ہے کہ روزہ نہ رکھنا پڑے، رہا قضاء تو وہ چونکہ شرعاً موسع ہے اس لئے اس کے واسطے خاص فروری کو انتخاب کر لیا جاتا ہے،

نہایت افسوس کے ساتھ کہا جاتا ہے! کہ تھوڑے دنوں سے ایک نئے اجتہاد کی بدولت قضاء کے عوض فدیہ کے کافی ہونے کے اعتقاد سے نفع اٹھایا جا رہا ہے، جس پر میں نے مجمل کلام اپنے بعض[۱] رسائل میں بزبان اردو اور اسی رسالہ کے حاشیۂ ملحقہ بالاخیر میں بعبارت عربیہ کیا ہے۔

خوب سمجھ لینا چاہیئے! کہ اس باب میں نہ رائے محض معتبر ہے، اور نہ کسی آیت یا حدیث کے ظاہری مفہوم پر غیر مجتہد کو عمل درست ہے اور نہ عامی کو محض مطالعہ فقہ کا کافی ہے، بعد انقراض زمانہ اجتہاد کے عالم کو کتب فقیہہ کا اتباع، اور عامی کو علماء سے استفسار

---

[۱] اصلاح ترجمہ دہلویہ پوری تفصیل

کرکے عمل کرنا واجب ہے، اور یہی معیار ہے عذر کے معتبر ہونے یا نہ ہونے کا، بے علمی میں بعض اوقات قصد ہوتا ہے قرآن وحدیث وفقہ کے اتباع کا اور لازم آجاتا ہے اتباع اپنی رائے اور ہوئی کا، کیا یہ بات ظاہر نہیں ہے ؟ کہ جو شخص طبیب نہ ہو وہ اگر کتاب دیکھ کر کسی مریض کے لئے نسخہ لکھدے تو کچھ تعجب نہیں کہ وہ نسخہ قواعدِ طب کے بھی خلاف ہو، اور جس جگہ اتباع کتاب وسنت وفقہ کا قصد بھی نہ ہو اس کا ذکر ہی کیا۔

ایک اور کوتاہی

(۶) بعضے لوگوں کا افطار تو عذرِ شرعی سے ہوتا ہے مگر ان سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ بعض اوقات اس عذر کے دفع ہونے کے وقت کسی قدر دن باقی ہوتا ہے اور شرعاً بقیہ دن میں امساک یعنی کھانے پینے سے بند رہنا واجب ہوتا ہے، مگر وہ اس کی پروا نہیں کرتے مثلاً سفر شرعی سے ظہر کے وقت واپس آگیا، یا عورت حیض سے ظہر کے وقت پاک ہوگئی تو ان کو شام تک کھانا پینا نہ چاہیئے علاج اس کوتاہی کا ـــــ مسائل و احکام کی تعلیم و تعلّم ہے۔

بچوں کو روزہ نہ رکھوانے میں غفلت

(۷) بعض لوگ خود تو روزہ رکھتے ہیں لیکن بچوں سے (باوجود ان کے روزہ رکھنے کے قابل ہونے کے) روزہ رکھوانے کی پرواہ نہیں کرتے بلکہ بعض ان کے نابالغ ہونے کو دلیل بنا کر اپنی رائے و عمل کو صواب سمجھتے ہیں اور روزہ رکھوانے کو سختی سمجھتے ہیں، خوب سمجھ لیا جاوے کہ عدمِ بلوغ سے ان بچوں پر واجب نہ ہونا تو لازم آتا ہے لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ ان کے اولیاء پر بھی ان سے روزہ رکھوانا واجب نہ ہو، جس طرح نماز کے لئے باوجود عدمِ بلوغ کے ان کو تاکید کرنا، بلکہ مارنا ضروری ہے، اسی طرح روزہ کے لئے بھی اتنا فرق ہے کہ نماز میں عمر کی قید ہے اور روزہ میں تحمل پر مدار ہے۔ (یعنی جب روزہ کی تکلیف کو برداشت کرنے کی قابلیت وطاقت آجائے رکھوانا واجب ہے) اور اس میں راز یہ ہے کہ کسی کام کا دفعتہً پابند ہونا دشوار ہوتا ہے، تو اگر بالغ ہونے

کے بعد ہی تمام احکام شروع ہوں تو اس پر ایک بار گراں پڑ جاوے گا، اس لئے شریعت کی رحمت ہے کہ پہلے ہی سے شدہ شدہ سب اعمال کا خوگر بنانے کا قانون مقرر کیا، تاکہ مکلف ہونے کے وقت دشواری نہ ہو، پس اس قانون کی تنفیذ سرپرستوں کے ذمہ مقرر کی گئی، سو اگر سرپرستوں پر یہ واجب نہ ہو تو اس قانون کا کوئی فائدہ ہی نہ ہوگا، کیونکہ واجب نہ ہونے کی صورت میں ان کو ترک بھی جائز ہوگا، تو اگر اس جائز سے یہ منتفع ہوئے تو بلوغ کے بعد اس نئے نئے مکلف کو اسی مصیبت کا سامنا ہوگا، تو قانون کا عدم وجود برابر ہوا تو لامحالہ اولیاء پر اس کا وجوب ہوگا، تو ان لوگوں کی دو غلطیاں ہیں، ایک اس کو ضروری نہ سمجھنا،

دوسرے اس ضروری کو سختی سمجھنا جس میں شرع پر دھبہ لگتا ہے، کیونکہ نصوص میں بتلایا گیا ہے کہ شرع میں سختی نہیں ہے، قال اللہ تعالیٰ یرید اللہ بکم الیسر ولا یرید بکم العسر ہ (اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کرنا چاہتا ہے، مشکل پیدا کرنا نہیں چاہتا) اور وما جعل علیکم فی الدین من حرج (تمہارے لئے اللہ نے دین میں تنگی نہیں کی) وفی الحدیث الدین یسر (دین آسان ہے)

اور اس سے یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ نومسلم بالغ تو دفعۃً جمیع احکام کا مکلّف ہو جاتا ہے، کیونکہ شرع نے تو اس کے لئے بھی وہی قانونِ تسہیل مقرر کیا تھا، مگر یہ خود اس کی اور اس کے خاندان والوں کی غلطی ہے کہ اسلام میں دیر لگانے سے وہ سہولت ضائع کر دی، اسی لئے مراہق قبل بلوغ جبکہ وہ عاقل ہو ایک درجہ میں مخاطب بالایمان ہے جیسا اصولیون نے تصریح کی ہے۔

پس مخاطب ہونے کے بعد توقف کرنا اپنے ہاتھوں سے اس سہولت میں کمی کرنا ہے اور کمی اس لئے کہا کہ دفعۃً واحدۃً بھی جمیع احکام کا بجا لانا بوجہ اس کے کہ وہ احکام قلیل اور فی نفسہٖ سہل ہیں چنداں دشوار نہیں، لیکن شرع نے اور زیادہ سہولت کر دی تھی اور جس طرح یہاں تک روزہ میں تفریط کرنے والوں کا ذکر تھا۔

روزہ میں افراط کرنے والوں کا بیان

اسی طرح بعض لوگ اس میں افراط کرنے والے بھی پائے جاتے ہیں۔ اور ظاہر میں تو یہ لوگ اقرب الی الدین ہیں، لیکن چونکہ شریعت میں افراط بھی پسند نہیں اس لئے ان کی حالت کو بھی دین کے موافق نہ کہا جاوے گا مثلاً

بعضے لوگ سفر یا مرض میں جان کو آجاتے ہیں مگر دینداری جتلانے کو یا افطار پر صوم کی ترجیح دینے کو افطار نہیں کرتے اور یہ ..... سخت غلطی ہے اگر اول نیت ہے تو بہت ہی برا ہے اور اگر ثانی ہے تو اس لئے جہل ہے کہ صوم کو مطلقاً افطار پر ترجیح نہیں ہے بلکہ ایسی شدت کی حالت میں امر بالعکس ہے۔ ورنہ حدیث لیس من البر الصیام فی السفر (سفر میں روزہ رکھنا، نیکی نہیں ہے) کے کوئی معنی نہ ہوں گے بلکہ یہ جہل بوجہ اس کے کہ اس کا اثر عقیدہ تک پہونچتا ہے اول سے بھی اشد ہے کیونکہ علمی غلطی عملی غلطی سے اقبح و اشنع ہے اور عقیدہ تک اثر اس طرح ہے کہ شرع نے جس کو راجح قرار دیا یہ شخص اس کو مرجوح سمجھتا ہے اور جس کو مرجوح قرار دیا اس کو راجح اعتقاد کر رہا ہے اور رخصت شرعیہ میں اس کا دل تنگ ہے تو گویا اس کو ناقص سمجھتا ہے اور شرع کی طرف تجویز نقص کو نسبت کرنا کتنا برا عقیدہ ہے۔ حدیث اولئک العصاۃ (یہ لوگ نافرمان ہیں) اور حدیث ما بال اقوام یتنزہون الخ ایسے ہی موقع میں ہے۔

یہ ہی حکم ہے ان عورتوں کا کہ باوجود تیقن اس امر کے کہ روزہ رکھنا دودھ پینے والے بچے کو ضرر کرے گا۔ اپنی ہٹ دھرمی اور سیکڑی سے باز نہیں آتیں بلکہ ان کی حالت پہلے شخص سے بھی زیادہ منکر ہے کیونکہ اس نے تو صرف اپنا ہی نقصان کیا تھا۔ اس نے ایک بے گناہ بچہ کو بھی ضرر پہنچایا سو کسی کو ضرر پہنچانا پھر وہ بھی بچہ یہ حقوق العباد کی کس درجہ کی فرد ہے۔

اور ان سب صورتوں سے بڑھ کر افراط یہ ہے کہ بعضوں کو بہت چھوٹے کم سمجھ ناتوان بچے کو روزہ رکھانے کا شوق ہوتا ہے کچھ تو خود اس روزہ رکھانے کا فخر ہوتا ہے اور کچھ روزہ کشائی میں حوصلہ نکالنے کا ارمان ہوتا ہے سو اوّل تو مبنی ہی اس کا فاسد ہے پھر

لایکلف اللّٰہ نفسًا الا وسعہا ط البقرۃ [۲۸۵-۲۸۶] واللّٰہ تکلیف نہیں دیتا کسی کو مگر جس قدر اس کی گنجائش ہوتی ہے) کی مخالفت پھر اس پر بعض عوارض ایسے مرتب ہو جاتے ہیں کہ معصیت میں تضاعف ہو جاتا ہے۔

حسرت ناک ماجرا

مجھکو ایک جگہ کا قصہ معلوم ہے کہ اسی طرح کے ایک بچہ کو روزہ رکھوایا اور اپنی امارت اچھالنے کے لئے روزہ کشائی کا بہت زیادہ اہتمام کیا گرمی کے بڑے اور کڑے دن، عصر کے وقت تک جوں توں کر کے اس نے کھینچا آخر طاقت طاق ہوگئی اور صبر و توان نے جواب دیدیا ٹھنڈے پانی کے مٹکے بھرے رکھے تھے ان پر تر کپڑا لپٹا تھا برف گھولنے کا سامان ہو رہا تھا اس سارے سامان نے آگ بھڑکا دی ایک ایک سے خوشامد پانی کے لئے کرتا تھا، لیکن اگر پانی دیتے تھے تو روزہ کشائی کا سامان اکارت جاتا ہے اپنا سامان بچانے کے لئے پانی کو جواب دیدیا آخر سخت بیتاب ہو کر دوڑ کر ایک مٹکے کو جا لپٹا اور محبوب سے وصل ہوتے ہی روح نے قالب کو چھوڑ دیا۔ اس کی نعش زبانِ حال سے سراپاں تھی کہ:

> "لو بھئی! تم کو تمہارا سامان مبارک ہے ہم اپنی جان تمہارے سامان پر فدا کرتے ہیں"

کس قدر حسرتناک ماجرا ہے، یہ نتیجہ ہے غلو اور افراط کا آخر اللّٰہ تعالیٰ کا یہ ارشاد بے معنی تو نہیں ؟ لاتغلوفی دینکم (تم دین میں غلو نہ کرو) کیا اس ہلاک اور قتل کی نسبت کو تسببًا سہی ان ظالموں کی طرف نہ ہوگی ....؟؟

غرض تفریط اور افراط دونوں مذموم ہیں، شرع نے دونوں سے روکا ہے اور ان حدود کا علم بدون صحبت و استفسار و صحبتِ علماء کے نہیں ہوتا، پس ان سب کا علاج یہی ہے۔

روزہ محض نام کا

(۸) بعض لوگ نفس روزہ میں تو افراط و تفریط نہیں کرتے لیکن روزہ محض صورت کا نام سمجھ کر صبح سے شام تک اَجوفین یعنی فم و فرج کو بند رکھنے پر اکتفار کرتے ہیں۔ اور اس میں علاوہ مقصود بہ صورتِ نوعیہ کے کہ وہ بھی ثابت ہے اور حکمتیں موجود ہیں جن کی طرف قرآن مجید میں اشارہ بلکہ صراحت ہے لعلکم تتقون یعنی شاید تم متقی ہو جاؤ۔ ان سب کو نظر انداز کر کے اپنے صوم کو جسدِ بلا روح بنا لیتے ہیں، خلاصہ ان حکمتوں کا معاصی و منہیات سے بچنا ہے، سو ظاہر ہے کہ اکثر لوگ روزہ میں بھی اکثر معاصی سے نہیں بچتے، جو حالت ان کی معصیت میں قبل رمضان ہوتی ہے رمضان کے آنے سے اس میں کچھ تفاوت نہیں ہوتا۔

اگر غیبت کی عادت تھی وہ بدستور رہتی ہے، اگر نگاہِ بد کے خوگر تھے، وہ نہیں چھوڑتے، اگر حقوق العباد میں مبتلا تھے ان کی صفائی نہیں کی، بلکہ بعض کے معاصی تو تو غالباً بڑھ جاتے ہیں کیونکہ پہلے تو کسی کاروبار میں لگے رہتے تھے اب روزہ میں چلنے پھرنے محنت مشقت کا کام تو ہوتا نہیں دوستوں میں جا بیٹھے کہ روزہ بہلیگا۔ پھر دوستوں میں کوئی شغل تفریح کا بھی ضروری ہے یا تو باتیں شروع کر دیں جن میں زیادہ حصّہ غیبت کا ہوگا اور چوسر گنجفہ، تاش یا ہارمونیم یا باجا یا گراموفون لے بیٹھے اور دن پورا کر دیا۔ بھلا اس روزہ کا کوئی معتد بہ حاصل کیا؟ اتنی بات عقل سے سمجھ میں نہیں آتی کہ کھانا پینا جو کہ فی نفسہ مباح ہے، جب روزہ میں وہ حرام ہو گیا تو غیبت اور دوسرے معاصی نفسہ بھی حرام ہیں وہ روزہ میں کس قدر حرام ہوں گے!!

تو مباحِ اصلی سے بچنا اور غیر مباح میں مبتلا ہونا یہ روزہ کس قسم کا ہے؟ حدیث میں ہے کہ جو شخص بدگفتاری اور بدکرداری نہ چھوڑے خدا تعالیٰ کو اس کی کچھ پروا نہیں کہ وہ شخص اپنا کھانا پینا چھوڑ دے، اس سے کوئی یہ نہ سمجھے کہ بالکل روزہ ہی نہ ہوگا، کبھی یہ سمجھکر کہ جب روزہ نہ ہوگا تو پھر رکھنے سے کیا فائدہ؟ سو روزہ تو ہو جاوے گا مگر نہایت ادنیٰ درجہ کا، جیسا اندھا، لنگڑا، کانا، گنجا، اپاہج آدمی ہوتا ہے، مگر ناقص درجہ

کا اور بالکل روزہ نہ رکھنا تو اس سے بھی اشد ہے، کیوں کہ ذات کا سلب صفت کے سلب سے سخت تر ہے۔

ایک اشکال اور اس کا جواب

اگر کسی کو یہ شبہ ہو کہ جب غیبت چونکہ مباح فی نفسہٖ نہیں لہٰذا زیادہ شدید ہے اور اکل و شرب چونکہ فی نفسہٖ مباح ہیں وہ اس سے خفیف ہیں پس غیبت سے روزہ افطار نہ ہونا خورد و نوش سے افطار ہو جانا کیا معنی ...؟

جواب یہ ہے کہ روزہ جن خصوصیات کے لئے مشروع کیا گیا ہے، ان کے اعتبار سے اس کی ایک خاص ماہیتِ مشخصہ ہے، یعنی امساک عن المفطرات بالنیہ (نیت کر کے افطار کرنے والی چیزوں سے رکنا) سو اکل و شرب وغیرہ گو اہون ہوں مگر اس ماہیت کے منافی ہیں اور دوسری معاصی گو اغلظ ہوں مگر اس ماہیت کے منافی نہیں، گو اس ماہیت کی اغراض کے منافی ہوں، سو غایت ما فی الباب ان معاصی سے وہ اغراض فوت ہو جاویں گے، سو اس کو ہم بھی مانتے ہیں، چنانچہ اوپر کہا گیا ہے کہ بھلا اس روزہ کا کوئی معتد حاصل؟ اور اصل حقیقت صوم کے متعلق ہو جانے سے یہ اثر ہو گا کہ قیامت میں بازپرس نہ ہو گی کہ روزہ کیوں نہیں رکھا؟ بلکہ پوچھا جاوے گا کہ روزہ کو خراب کیوں کیا؟ سو بڑا فرق ہے! اس میں کہ حاکم کے حکم کے بعد سالانہ کاغذ ہی نہ بنایا اور اس میں کہ بنایا مگر کہیں کہیں غلطیاں رہ گئیں، اور یہ جو کہا گیا کہ ایسے روزہ سے معتد بہ فائدہ نہیں، یہ قید اس لئے لگائی کہ بالکل بے سود بھی نہیں اور وہ فائدہ ایک تو ظاہر ہے کہ کسی قدر تو تعمیلِ ارشاد ہے اور دوسرے ہر عمل میں ایک خاص برکت ہے، جب صبح سے شام تک لذاتِ مخصوصہ سے نفس کو روکا تو اس سے نفس ضرور منفعل و منصبغ (اثر قبول کنندہ و رنگ پزیرندہ) ہو گیا۔ جس کا اثر یا تو آئندہ ظاہر ہو کہ کسی معصیت سے رکنے کی توفیق ہو جائے یا اسی روز یہ اثر ہوا ہو کہ اگر یہ صورتِ صوم بھی نہ ہوتی تو کوئی خاص معصیت سرزد ہوتی اور روزہ کی برکت سے سرزد نہ ہوئی ہو، تو اس وجہ سے بالکل بے سود اور لاحاصل نہیں کہہ سکتے اور تدبیر

ان معاصی سے بچنے کی تین امر کا مجموعہ ہے۔

* ـــــ خلق سے بلا ضرورت تنہا اور یکسو رہنا،
* ـــــ کسی اچھے شغل میں لگے رہنا مثل تلاوت قرآن مجید وغیرہ،
* ـــــ نفس کو سمجھانا اور وقتاً فوقتاً دھیان کرتے رہنا کہ ذرا سی لذت کے واسطے صبح وشام تک کی مشقت کو کیوں ضائع کیا؟ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ نفس پھسلانے سے بہت کام کرتا ہے، سو نفس کو یوں پھسلا دے کہ

ایک مہینہ کے لیئے تو اس دستور العمل کی مجموعہ تین امورِ مذکورہ کا یہ پابندی کرے پھر دیکھا جاوے گا، یہ ایک مہینہ تو وہ پھسلانے میں آ کر مرضی کے موافق کر لے گا پھر یہ بھی تجربہ ہے کہ جس طرز پر آدمی ایک مدت تک رہ چکا ہو وہ آسان ہو جاتا ہے۔ بالخصوص اہل باطن کو رمضان میں یہ حالت زیادہ مدرک (معلوم) ہوتی ہے کہ اس مہینہ میں جو اعمال صالحہ کیئے ہوتے ہیں سال بھر تک ان کی توفیق رہتی ہے۔

شیاطین کے رمضان میں قید ہونے کا مطلب

پس اس طریق سے بعد رمضان بھی وہی عادت ترک معاصی کی تھوڑی توجہ سے انشاء اللہ محفوظ رہے گی۔ اور میں یہ نہیں کہتا کہ پھر معصیت کی طرف میلان ہی نہ ہوگا، بلکہ دعویٰ یہ ہے کہ اس میلان کا جس قدر پہلے تقاضا ہوتا تھا اب اس قدر تقاضا نہ ہوگا کہ بہت تھوڑی توجہ اور ضبط سے وہ میلان دفعہ یا مغلوب ہو جاوے گا اور میرے نزدیک یہی اثر ہے شیاطین کے مقید ہو جانے کا رمضان میں کہ قبل رمضان جو نفسانی خواہشیں طبعاً پیدا ہوتی تھیں۔ ان کی اعانت شیاطین بھی کرتے تھے اس لیئے تقاضا شدید ہوتا تھا کہ ضبط میں زیادہ مشقت ہوتی تھی رمضان میں گو ایسی خواہشیں پیدا تو ہوتی ہیں کیونکہ نفس اور طبیعت قید ہوتے مگر شیاطین چونکہ قید ہو گئے اس لیئے ان کی جانب سے اعانت نہیں ہوتی، تو تقاضا اس قدر نہ ہوگا اور رکنا اتنا دشوار نہ ہوگا، چنانچہ یہ امر تجربہ اور مشاہدہ سے دیکھ لیا جاوے کہ صحیح ہے اور اس تقریر سے بعض اشکالات بھی حل ہو گئے اور اسی کا ضمیمہ یہ بھی ہے کہ حتی الوسع رمضان میں غذائے حلال کا زیادہ اہتمام رکھے، شرم کی بات ہے کہ حلال سے دن بھر رکا رہے اور حرام سے افطار کرے!!

سحور یعنی سحری

اس میں غالبًا دو کوتاہیاں ہوتی ہیں، ایک تعجیل کے متعلق دوسرے تاخیر کے متعلق

(۱) اول کا بیان یہ ہے کہ اکثر لوگ آدھی رات سے سحری کھاکر بیٹھ رہتے ہیں، سو اول تو خود اس قدر تعجیل ہی امرِ شارع و غرضِ مشروعیتِ سحر کے خلاف ہے اور وہ غرض یہ ہے کہ مسلمین و اہلِ کتاب میں فرق رہے اور روزہ میں قوت و طاقت رہے اور دوسرے اکثر عوام کا اس کے ساتھ یہ اعتقاد منضم ہو جاتا ہے کہ جب سحر کھاکر روزہ کی نیت کرلی یا سو گئے تو اس کے بعد گو رات باقی ہی ہو مگر اب کھانا پینا جائز نہیں، سو یہ اعتقاد ایک (اختراع فی الدین) ہے جس سے توبہ واجب ہے۔

(۲) ثانی کا بیان یہ ہے کہ بعضے لوگ خصوص جن کے پاس نقشے اور گھڑیاں بھی ہیں اس قدر تاخیر کرتے ہیں کہ بعض اوقات یہ اشتباہ قوی ہو جاتا ہے کہ کہیں صبح صادق کے بعد تو نہیں کھایا گیا، اس قدر مبالغہ ضرور بے احتیاطی ہے، حدیث متفق علیہ کالراعی یرعی حول الحمی یوشک ان یرتع فیہ) اس سے صاف روک رہی ہے، اسی طرح گھڑیوں پر اتنا اعتماد کہ اس کی بنا پر اتنے بڑے فرض الٰہی کو خطرہ میں ڈالنے پر اقدام کر بیٹھے جسارت عظیمہ ہے، اور تجربہ کے بھی خلاف، کیونکہ ہزاروں واقعات بڑی بڑی قیمتی گھڑیوں کی غلطی نکلنے پر شاہد ہیں۔

اسی طرح اس کے مقابل بعض کا تشدد کہ گھڑی ہی کو بدعت کہتے ہیں اور نماز روزہ میں اس کے حساب کو کسی درجہ میں معتبر رکھنے کو بھی حرام سمجھتے ہیں، یہ بھی تعدی حدود ہے اس میں "قولِ فیصل" یہ ہے کہ اصل مدارِ معرفت اوقات میں، علامات خاصہ ہیں، اور ان علامات کی تحقیق میں جیسا مشاہدہ اور حس معتبر ہے اسی طرح اس مشاہدہ وحس کی مطابقت پر کوئی اصطلاح یا آلہ جس کا کثرتِ تکرار مشاہدہ سے صحیح و مطابق ہونا معلوم ہوا ہو مقرر کرلیں یا اور کوئی قدرتی چیز مطابق معلوم ہو تو اس کا اعتبار بھی جائز ہے۔ نہ من حیث الخصوصیت بلکہ من حیث المطابقۃ لتلک العلاماتِ المعتبرۃِ شرعًا (یعنی یہ کوئی خصوصیت اس

آلہ اور اصلاح کی نہیں، بلکہ یہ آلہ چونکہ ایسی علامتوں کے مطابق ہو گیا ہے جو شرعًا معتبر ہیں اس کا بھی اعتبار ہو گیا) پس گھڑی اسی قبیل سے ہے، نیز اس کی طبلِ سحور ہے، جس کے جواز اعتبار کو فقہاء متاخرین نے تنصیصًا فرمایا ہے، (یعنی صبح صادق کے لئے جو نقارہ بجایا جائے اس پر اعتبار کر لینے کی فقہاء نے تصریح فرمائی ہے)

لیکن بدل کسی طرح اصل کے برابر نہیں ہو سکتا، کیونکہ اصل میں تو غلطی کا احتمال ہی نہیں (مثلاً غروب کا آنکھوں سے دیکھ لینا، ہاں شاید کبھی حس میں غلطی ہو جائے) اور بدل میں احتمال ہے (جیسے گھڑی) اور یہاں سے سحر میں مرغ کی اذان کا اور انطار کے وقت شپرک کے نکلنے کا وقت بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ بدوں تجربۂ کامل کے اس پر اعتماد نہ چاہیئے۔

- بعض لوگ سحر مناسب وقت کھاتے ہیں مگر فضول حقّہ و پان میں اسقدر دیر لگادیتے ہیں کہ روزہ خطرہ میں پڑ جاتا ہے۔
- بعضے پان منہ میں دبا کر سو رہتے ہیں یہ سب بے عنوانیاں ہیں۔

سحری میں کوتاہی

- ایک بے عنوانی سحور کے متعلق بعض مقامات پر یہ دیکھی جاتی ہے کہ صبح کی اذان قبل الوقت کہتے ہیں، تاکہ سحر کھانے والے سحر چھوڑ دیں، مگر جن کے نزدیک اذانِ فجر قبل الوقت کافی نہیں (جیسے امام ابو حنیفہؒ وغیرہ) ان کے نزدیک اس اذان کا اعادہ ضروری ہے اور اعادہ نہیں کیا جاتا تو صبح کی نماز بدون اذان ہوتی ہے، دوسرے اگر لوگوں کو اس کی عادت ہو گئی اور ظاہر ہے کہ مؤذن نہ ایسے دیانتدار نہ ایسے واقف کارِ اوقات ہیں تو اگر کسی روز غلطی سے خلافِ معمول بعد صبح صادق اذان ہوئی، تو تمام لوگوں کے روزے اس اذان کے بھروسہ برباد ہوں گے، اس لئے مصلحت یہ ہے کہ اذان ایسے وقت کہی جایا کرے کہ اس اذان کے اعتماد پر کوئی شخص سحری نہ کھاوے، پھر خود ہی ہر شخص اپنے طور پر تحقیق کر کے اس پر عمل درآمد کرے گا۔

افطار

اس وقت ذہن میں اس کے متعلق بڑی کوتاہی ایک ہی آتی ہے وہ یہ کہ اکثر جگہ دیکھا جاتا ہے کہ افطار کے سامان میں جس کو عرف میں " افطاری " کہتے ہیں اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ اس کے کھاتے کھاتے مغرب کی جماعت بالکل یا کسی قدر فوت ہوجاتی ہے۔ اور یہ بات قصداً اور اکثر ہوتی ہے، جس میں شرعاً معذور بھی نہیں ہوسکتا، جماعت کی جو کچھ تاکید آئی ہے اس کے اعتبار سے یہ عادت نہایت منکر ہے، اول تو اس قدر اہتمام ہی کیا ضرور ہے؟ دوسرے یہ بھی تو ممکن ہے کہ نماز کے بعد یہ شغل ہو اور افطار کسی مختصر چیز پر ہو کر نماز میں حاضر ہو جاوے،

اس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ افطار خواہ مُطوّل ہو خواہ مختصر ہو مسجد میں ہونا چاہیئے، مکان پر روزہ کھولنے سے اکثر جماعت برباد ہوتی ہے، پھر جب جماعت ملنے سے مایوسی ہو جاتی ہے اکثر لوگ گھر ہی پر نماز پڑھ لیتے ہیں، تو روز روز مسجد کی برکات سے بھی محروم رہتے ہیں اگر دو چار کی دعوت ہو تو وہ سب بھی مسجد میں جا سکتے ہیں کیا بندہ کے گھر پہ جانا فخر اور خدا کے در پر حاضر ہونا عار ہے .... ؟ اگر یہی خیال ہے تو یہ تمام افطار بیکار ہی بیکار ہے۔

تراویح

اس عمل میں دو جزو ہیں قرآن پڑھنا، اور نماز، اور ایک ان دونوں کا مجموعہ ہے، اور دونوں جزو میں جو جو کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اس سے پہلے مفصل بیان کر چکا ہوں اس سے ایک بڑی فہرست تراویح کی کوتاہیوں کی بھی معلوم ہو سکتی ہے، اسوقت صرف ان بعض کوتاہیوں کا مختصراً ذکر کرتا ہوں جو مجموعہ میں پائی جاتی ہیں وہ یہ ہیں:-

(۱) اکثر لوگ فارغ ہونے کی جلدی میں وقت کے آنے سے پہلے ہی کھڑے ہو جاتے ہیں۔

(۲) اگر کھڑے بھی وقت پر ہوتے ہیں تو اذان ہی وقت سے پہلے کہہ دیتے ہیں۔

(۳) قرآن مجید اس قدر تیز پڑھتے ہیں کہ تجوید کیا تصحیح حروف بھی نہیں ہوتی! بعض دفعہ سامعین کو سمجھنا کجا سنائی بھی نہیں دیتا کہ کیا پڑھا جارہا ہے۔

(۴) اکثر ثنا وتسبیحاتِ رکوع و سجود و تشہد، مقتدی پورا نہیں پڑھنے پاتا کہ امام صاحب قرأۃ یا قومہ یا جلسہ یا قیام یا سلام کی طرف چل دیتے ہیں۔

(۵) ترویحہ میں بھی بعض جگہ نہیں ٹھہرتے۔

(۶) بعضے لوگ ایک ہی رات میں دو دو جگہ پوری تراویح پڑھا دیتے ہیں۔

(۷) بہت لوگ اجرت پر قرآن سناتے ہیں۔

(۸) بعضے حفاظ اپنا پڑھ کر یا کسی روز ناغہ کرکے دوسرے حفاظ کا اس نیت سے سننے جاتے ہیں کہ اس کی غلطیاں پکڑیں گے یا اس کو غلطی میں ڈالیں گے، خواہ غلط بتلاکر یا اس کے قلب کو مختلف نالائق حرکات سے پریشان کرکے، کہیں لاٹھی کھڑکھڑاتے ہیں کہیں پاؤں زور زور سے زمین پر مارتے ہیں، کہیں کھنکارتے ہیں، کہیں لالٹین کو الٹ پلٹ کرکے دکھاتے ہیں، کہیں کھڑے ہوکر زور سے باتیں کرتے ہیں، غلط گیری کا تجسس اور غلط اندازی شیطنت ہے یہ اسی کا خاصا ہے، عبادت میں دوسری طرف مشغول کرکے خلل ڈالنا۔

(۹) بعض ایسے بچوں کو امام بنادینا جن کو طہارت و نماز کے مسائل ضروری بھی معلوم نہیں، بلکہ ان پر یہ بھی اطمینان نہیں کہ ان کے کپڑے بھی پاک ہوں گے یا ان کو وضو بھی ہوگا اور نابالغ کے پیچھے تراویح کے جائز ہونے میں جو اختلاف ہے وہ اس سبب سے علاوہ ہے اول تو نماز کے بارہ میں احوط پر عمل مطلوب ہے، پھر جواز کی صورت میں بھی ان عوارض بالا کا کیسے انکار ہوسکتا ہے، ایسے بچے نوافل میں پڑھ دیا کریں کافی ہے۔

(۱۰) بعض دفعہ شبینہ اس طرح پڑھنا کہ نماز اور قرآن دونوں کے احترام و تعظیم کا بالکل ضائع ہونا لازم آتا ہے، یہاں تک کہ ایک مقام پر ایک حافظ صاحب چارپائی پر لیٹے ہوئے سب حفاظ کا سنا کئے اور سہواً و متشابہ بھی بتلاتے رہے اور سب نمازیں شب بھر کی

برباد کرتے رہے اور بہت سی خرابیاں اس کے متعلق بندہ نے " اصلاح الرسوم" میں لکھ دی ہیں اس کو بھی ملاحظہ فرما لیا جائے، چونکہ ان مذکورہ دس امور کا حکم کچھ مخفی نہیں نیز مراجعتِ علماء سے بآسانی ہو سکتا ہے اس لئے بخیال تطویل مختصر کر دیا۔

(۱۱) بعض امورِ متفرقہ منکرات میں سے ہیں، جیسے منجھلے روزہ کے لئے خاص طور پر اہتمام کرنا۔

(۱۲) آخری جمعہ کو خطبۃ الوداع کا التزام

(۱۳) ختم قرآن کے وقت شیرینی کو لازم و ضروری کرنا۔

(۱۴) بعض جگہ انیسویں شب کو بھی ختم تراویح پر تقسیم شیرینی کا انتظام۔

(۱۵) نامحرم حافظوں کو گھر میں بلا کر عورتوں کا قرآن سننے کے لئے جمع ہونا ونحو ذالك، ان میں بعض کا حکم اصلاح الرسوم میں ہے، بعض کا اہل علم سے معلوم کر لیا جائے، یہ سب رمضان المبارک کے متعلق بیان ہوا، اب دو امر اس کے متعلقات سے رہے جو عید کے متعلق ہیں، ان کے بارہ میں سنئے مگر مختصر ہی ہے۔

صدقۂ فطر

بہت لوگوں کو اس کے مامور بہ ہونے کی خبر نہیں (یعنی یہ بھی نہیں جانتے کہ خدا تعالیٰ نے اس کا حکم فرمایا اور واجب کیا ہے) بہت لوگوں کا یہ خیال ہے کہ یہ ان ہی کی طرف سے دیا جاتا ہے جنھوں نے روزے رکھے ہیں، سو وہ بچوں کی طرف سے ادا نہیں کرتے بہت لوگ خاص کر دیہات والے صدقۂ فطر جمع کر کے مسجد کے مؤذن یا امام کو یا کچھ مسجد کے سقہ کو دے دیتے ہیں اور یہ نہیں کہ ان کی حق المحنت و اجرت کے علاوہ مسکین سمجھ کر دیدیتے ہوں، بلکہ ان لوگوں کو ایسی ہی شرائط مقرر کرتے ہیں کہ تم یہ کام کرو تم کو یہ ملے گا، ان میں صدقۂ فطر بھی شمار کیا جاتا ہے، تو اسی طور پر وہ ان کے عمل کا عوض ہوا جو کہ اجرت ہے اور اجرت دینے سے وہ ادا نہیں ہوا اس لئے ان دینے والوں کے ذمہ مکرر ادا کرنا ضروری ہوگا۔

البتہ اگر مقرر کرتے وقت تصریح کر دیں کہ صدقۂ فطر سے تمہارا کچھ واسطہ نہ ہوگا اور پھر

مسکین سمجھ کر دیدیں وہ جائز ہے، بشرطیکہ واقع میں مسکین بھی ہو، ورنہ اگر وہ غنی ہو، جیسا کہ بعض جگہ نہ معطی کو اس کی پرواہ ہے نہ آخذ کو۔ (نہ دینے والوں کو نہ لینے والوں کو) تو اس دینے سے صدقہ فطر ادا نہ ہوگا مکرر دینا پڑیگا، لیکن اس غنی سے جبراً واپس بھی نہ لے سکے گا۔ رہا یہ کہ اس غنی کے لئے بھی وہ حلال ہوگا یا نہیں، اور اگر حلال نہیں تو آیا دینے والے کو واپس کر دینا واجب ہے یا صدقہ کرنا ان مسئلوں میں کسی قدر اختلاف ہے۔ کما فی رد المحتار باب المصرف تحت قوله ولو دفع بلا تحرٍّ (چنانچہ شامی میں مستحقینِ صدقہ وزکوٰۃ کے بیان میں لو دفع بلا تحرّ کے ذیل میں ذکر کیا ہے)

تنبیہ: اگر ناواقفیت مسائل یا بے پروائی سے گذشتہ زمانہ میں بچوں کا صدقہ فطر نہ دیا ہو یا مؤذن وغیرہ کو اجرت میں دے دیا ہو یا غنی کو دیدیا ہو، تو یاد کر کے اور حساب لگا کر اب مساکین کو اس مقدار کے موافق دیدیں تاکہ ذمہ فارغ ہو جاوے اور صدقۃ الفطر کے مسائل علماء سے دریافت کر کے یا بہشتی زیور میں مطالعہ کر کے خود بھی عمل کرنا اور دوسروں کو آگاہ کرنا چاہیئے۔

نمازِ عید

اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

(۱) ــــ ایک یہ کہ بعض لوگ اس نماز کا طریقہ ہی نہیں جانتے اور غضب یہ کہ اتنی توفیق بھی نہیں ہوتی کہ آٹھ دس دن پہلے یاد ہی کر لیں اس سے زیادہ کیا بے پروائی ہو گی۔ !!

(۲) ــــ ایک یہ کہ اکثر جگہ یہ نماز بہت ہی دیر میں پڑھتے ہیں، حالانکہ صریح سنت اس کے خلاف آئی ہے۔

(۳) ــــ ایک یہ بہت جگہ امام اور خطیب جاہل ہیں جو بنا بر دعویٰ استحقاق آبائی نماز پڑھاتے آئے ہیں، جن میں اکثر تو ایسے جاہل ہیں کہ خطبہ اور سورۃ تک صحیح نہیں پڑھ سکتے اور اگر نماز میں کوئی سانحہ پیش آجائے جس میں مسائل جاننے کی ضرورت ہو تو کچھ

نہیں کر سکتے، یہ تقدم انہوں نے اختیار تو کیا تھا ترفع کے لئے لیکن اس جہل کی بدولت ان کی اس قدر فضیحتی اور رسوائی ہوتی ہے کہ خدا کی پناہ اور اگر اس درجہ کے جاہل نہ ہوئے تب بھی مدعی مرائی متفاخر متصنع کے پیچھے نماز پڑھنے کو فقہاء نے خود مکروہ کہا ہے۔

اس کا انسدادِ سہل بجز اس کے کچھ نہیں کہ اہلِ حل وعقد یعنی بستی کے عمائد اس امام کو معزول کر کے کسی اہل کو مقرر کریں، اور آئندہ اس رسم کو موقوف کریں کہ امام کا بیٹا ہی امام ہو، بلکہ اس کی وفات کے بعد پھر جو سب میں زیادہ اہل ہو اس کو مقرر کریں وَهَلُمَّ جَرًّا (اسی طرح آگے تک)

(۴)ـــــ ایک کوتاہی یہ کہ بعضے جو بزعم خود مقتدا ہیں متبوع مستقل بننے کی غرض سے عیدگاہ کو چھوڑ کر اپنے محلہ کی مسجد میں عید کی نماز پڑھتے ہیں، جس مسجد کی یہ نفضیلت ہو کہ وہاں ایک نماز برابر پچاس ہزار نماز کے ہو (یعنی مسجد نبوی) جناب رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم اس کو تو چھوڑ کر عمر بھر عیدگاہ میں تشریف لے جاویں جس سے یہ بھی مستنبط ہو کہ وہ تضاعف مکتوبات کے ساتھ خاص ہے اور یہ مشتے چند مدعی اپنی مسجد کو عیدگاہ پر ترجیح دیں .... !!

البتہ معذورین کے لئے اگر کسی شخص کو شہر میں نماز پڑھانے کے لئے چھوڑ دیں مضائقہ نہیں مگر مقتدا لوگ خود نہ رہیں اپنے کسی متعلق قابل امامت چھوڑ دیں یا یہ کہ اتفاقاً کوئی عذر خود مقتدا کو یا عام لوگوں کو پیش آجاوے تو دوسری بات ہے، چنانچہ ایک بار خود حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعذرِ مطر (بارش) مسجد میں نماز ادا فرمائی ...

(۵)ـــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بہت لوگ عید میں غیر مشروع لباس پہن کر یا اپنے بچوں کو پہنا کر جاتے ہیں اور لے جاتے ہیں حالانکہ ایسے لباس سے علاوہ فی نفسہ حرام ہونے کے نماز کا قبول نہ ہونا بھی وارد ہے۔

(۶)ـــــ ایک کوتاہی یہ ہے صفیں نہایت بے ترتیب ہوتی ہیں۔ صفوف کے استوار (یعنی برابر کرنے) کی سخت تاکید آئی ہے۔

(۷)ـــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ خطبہ سننے کو بالکل امر فضول سمجھتے ہیں اگر سب

حاضرین ایسا ہی کریں تو خطیب خطبہ کس کے سامنے پڑھے ؟
اور بعضے بیٹھے ہیں مگر باتیں کرتے رہتے ہیں یہ اور بھی گناہ ہے اور بعضے منکراتِ عید کے متعلق " اصلاح الرسوم" میں مذکور ہوئے ہیں۔ اب اس مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

وآخر دعوانا ان الحمد للہ رب العلمین
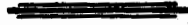
زکوٰۃ کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملۂ زکوٰۃ)

جس طرح عباداتِ بدنیہ میں نماز سب سے اہم ہے اسی طرح عباداتِ مالیہ میں زکوٰۃ سب سے اہم ہے، قرآن مجید میں جگہ جگہ اَقِیْمُوا الصَّلٰوۃَ کے ساتھ آتُوا الزَّکٰوۃَ آنا اس اہمیت میں شریک ہونے کی تائید کرتا ہے، اس لئے اس کے متعلق کوتاہیوں پر مطلع ہونا بھی نہایت اہم ہوگا، پس مختصراً ان کو لکھا جاتا ہے۔

(۱) — ایک کوتاہی تو جو سب سے بڑی ہے یہ ہے کہ بہت سے لوگ زکوٰۃ ہی نہیں دیتے، اس کی اصلاح یہ ہے کہ وہ لوگ زکوٰۃ کی تاکید و فرضیت کے نصوص اور اس کے ترک پر جو وعیدیں آئی ہیں ان کو دیکھیں سُنیں غور کریں اور اس کا جو اصلی سبب "بخل" ہے اس کا علاج کریں، اس علاج کا حاصل مال کی محبت کا گھٹانا ہے، جس کی سب سے اچھی تدبیر موت کا بکثرت یاد کرنا اور یاد رکھنا ہے۔

اور اگر اس کوتاہی کا سبب فرضیت کا اعتقاد نہ ہونا ہے گو آج کل ایسا شخص سنا نہیں گیا، لیکن اگر نادراً ایسا ہو تو اس کی اصلاح اپنے شبہات کا کسی محقق عالم سے رفع کرنا ہے اور اگر رفع نہ کیا اور منکرِ فرضیت رہا تو وہ کافر ہے۔

(۲) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے زکوٰۃ دیتے ہیں مگر حساب سے نہیں دیتے، جو کچھ جی چاہا دیدی، سو یہ بھی نہ دینے ہی میں داخل ہے کیونکہ ایک ہزار کے مال میں پچیس روپے واجب تھے اور اس نے دس روپے دیئے تو چار سو کی زکوٰۃ ادا ہوگئی اور چھ سو کی رہ گئی، لو

ایسا ہو گیا جیسے کسی کے پاس چھ ہی سو روپے ہوں اور بالکل زکوٰۃ نہ دے پس اس میں بھی وہی معروض ہے جو اوپر مذکور ہوا،

کون سے مال پر زکوٰۃ واجب ہے؟

(۳) — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ بعض اموال کی زکوٰۃ دیتے ہیں اور بعض اموال کی نہیں دیتے، اس کا زیادہ سبب یہ ہے کہ ان کو یہ خبر نہیں کہ کس کس مال میں زکوٰۃ ہوا کرتی ہے، اس لیے ان اموال کو بتایا جاتا ہے۔

ایک چاندی، سونا، خواہ سکہ کی صورت میں ہو خواہ زیور کی صورت میں ہو، خواہ گوٹہ ٹھپّہ ہو خواہ ویسے ہی ٹکڑے رکھے ہوں، اور خواہ پاس موجود ہو، اور خواہ موجود نہ ہو، مگر اس کا وصول کرنا یا اس سے منتفع ہونا ممکن ہو، جیسے نوٹ لے لئے ہوں یا بینک میں جمع ہو یا کسی کے ذمہ قرض آتا ہو خواہ نقد دیا ہو یا کوئی چیز فروخت کی ہو اور وصول سے ناامیدی نہ ہو، لیکن قرض میں یہ اختیار ہے کہ خواہ اور اموال کے زکوٰۃ کے ساتھ دیدے، خواہ جب وصول ہوتا رہے دیتا رہے لیکن اگر وصول کے وقت دے گا تو تمام ایام گذشتہ کی دینی پڑے گی۔ مثلاً دو سال میں سو روپے وصول ہوئے تو ان کی زکوٰۃ اڑھائی روپے سال کے حساب سے دو سال کی پانچ روپے دینا پڑیگی

★ دوسرا مال تجارت اور مالِ تجارت وہی ہے جس کے خریدنے کے وقت یہ نیت ہو کہ ہم اس کو بیچیں گے، خواہ وہ منقولات میں سے ہو خواہ غیر منقولات میں سے ہو، مثلاً ایک شخص کی یہ عادت ہے کہ مکانات و اراضی موقع کی خرید لیتا ہے اور پھر موقع پر بیچ ڈالتا ہے، یہ بھی مال تجارت ہو جاوے گا۔ اور زکوٰۃ اس میں واجب ہوگی اور جس کے خریدنے کے وقت بیچنے کی نیت نہ ہو گو بعد خرید بیچنے کی نیت ہو جاوے وہ مال تجارت نہیں اس میں زکوٰۃ واجب نہیں۔ اور اسی طرح اگر خریدنے کے وقت تجارت کی نیت تھی مگر حولان حول سے پہلے (یعنی جس وقت ختم سال پر اس پر زکوٰۃ واجب ہوا کرتی ہے اس ختم سال سے پہلے) وہ نیت تجارت کی فسخ ہو گئی ہو وہ بھی مال تجارت نہیں رہا اس میں بھی زکوٰۃ واجب نہیں اسی طرح اگر وہ مال خریدا ہوا نہیں بلکہ میراث میں پہنچا ہے اور مالک ہوتے ہی تجارت کی نیت کر لی یا گھر کا غلہ پیدا ہوا ہے اور تیاری کے وقت نیت تجارت کی کر لی وہ بھی مال تجارت نہیں اور اس میں زکوٰۃ واجب نہیں

★ تیسرا مال وہ مویشی ہیں جن کو نسل بڑھانے کے لیئے پالا ہو جیسے بعضے لوگ بکریاں یا گائیں یا گھوڑیاں پالتے ہیں، ان کے احکام و شرائط میں بہت تفصیل ہے۔ فقہ کی اردو کی کتابوں میں دیکھ لیا جاوے۔

★ چوتھا مال عشری زمین کی حقیقت کا حاصل یہ ہے کہ جو زمین اس وقت مسلمان کی ملک میں ہو اور اس کے قبل اس کا کسی کافر کی ملک میں آنا معلوم نہ ہو، خواہ واقع میں وہ جب سے اہلِ اسلام کی مفتوحات میں داخل ہوئی ہے کسی کافر کے ہاتھ میں نہ پہنچی ہو، خواہ درمیان میں کوئی کافر بھی برائے چندے اس کا مالک ہو گیا ہو، مگر کسی کو معلوم نہ ہو بس ایسی زمین عشری ہے اس میں جو کچھ پیدا ہو خواہ غلہ، خواہ نیشکر و چری وغیرہ، خواہ خشخاش یا خواہ تمباکو یا اور ادویہ یا پھول جو بغرض نفع بوئے گئے ہو، یا اس میں باغ کسی قسم کے پھل کا ہو ان سب میں بھی زکوٰۃ واجب ہے، اس زکوٰۃ کو عشر کہتے ہیں اور ہندوستان میں اس سے بڑی غفلت ہے، ان کی دو قسموں کے مال میں چالیسواں حصہ واجب ہوتا ہے اور تیسری قسم میں بہت تفصیل ہے جو فقہ کی اردو کی کتابوں میں ملے گی اور چوتھی قسم میں بارانی زمین میں دسواں حصہ کل پیداوار کا ہے اور چاہی اور نہری میں بیسواں حصہ کل پیداوار کا ہے۔

زکوٰۃ کے حساب میں غلطیاں

(۴) ۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ اپنے نزدیک حساب دیتے ہیں مگر واقع میں وہ حساب غلط ہوتا ہے مثلاً مالِ تجارت میں اپنی خرید یا لاگت کا حساب لگا لیتے ہیں فرض کیجئے کہ ایک شخص نے کچھ کتابیں تاجرانہ نرخ سے خریدیں یا اپنے پریس میں چھاپیں اور ہزار روپے میں اس کو پڑ گئیں مگر بازار میں وہ دو ہزار کی ہیں تو زکوٰۃ دو ہزار کی دینا چاہیئے اور اگر دو ہزار کی زکوٰۃ تو زکوٰۃ پچاس روپے دیتے ہوئے دل دکھے تو سہل یہ ہے کہ خود کتابوں کا چالیسواں حصہ دیدے مثلاً چالیس ہدایہ میں سے ایک ہدایہ دے دے یا ایسی کتاب دیدے جس کی ہدایہ کی برابر قیمت پر نکاسی ہوتی ہو۔

اور اس حساب غلط لگانے کی ایک اور باریک مثال ہے وہ یہ ہے کہ مثلاً ایک

شخص کے پاس سو روپے کی برابر وزن میں چاندی کا زیور ہے اور قیمت اتنی چاندی کی بوجہ ارزانی اسی روپے ہے، تو اکثر لوگ اس اسی روپیہ کا چالیسواں حصہ یعنی دو روپے دیدیتے ہیں، حالانکہ ہم جنس سے زکوٰۃ ادا کرنے میں صنعت اور سکہ کی قیمت کا اعتبار نہیں ہوتا پس اس کے ذمہ اڑھائی روپیہ بھر چاندی واجب ہے، اگر روپیہ دیا تو وہ چاندی کے حساب میں شمار ہوگا اس لئے اڑھائی روپیہ دینے میں زکوٰۃ ادا ہوگی دو روپیہ دینے سے آٹھ آنہ بھر چاندی اس کے ذمہ اور رہی اور اگر اڑھائی روپیہ دینے میں خسارہ سمجھے تو اس کی دو صورتیں اور ہیں۔ ایک یہ کہ روپیہ نہ دے خود چاندی اڑھائی روپیہ بھر دیدے اور وہ مسکین اس کو بیچ کر کارروائی کرے گا۔ دوسرا اس سے بھی سہل یہ ہے کہ دو روپے کے بالکل پیسے ہی پیسے کہ جس میں چاندی کی دونی تک نہ ہو مساکین کو دیدے کیونکہ ان پیسوں کی چاندی اڑھائی روپے بھر آسکتی ہے اور خلافِ جنس اس لئے ان پیسوں کی قیمت اڑھائی روپے بھر چاندی کی برابر سمجھی جاوے گی اور زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی۔

ایک مثال حساب غلط ہونے کی بہت ہی باریک ہے وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی عادت ہے کہ بوجہ اس کے کہ رمضان ہی تک میں ایک ذخیرہ ثواب برابر ستر فرض کے ہے۔ رمضان المبارک میں زکوٰۃ نکالتے ہیں۔ اور پھر رمضان ہی سے سلسلہ حساب کا رکھتے ہیں، پھر کبھی تو ایسا ہوتا ہے کہ نصاب کے مالک ہونے کی تاریخ سے جو سال شروع ہوا ہے وہ رمضان کے تین چار ماہ پہلے مثلاً ختم ہو گیا تھا تو اسی شخص نے رمضان شریف سے حساب رکھنے کے لئے ان تین چار ماہ کی زکوٰۃ بھی دیدی پھر آئندہ کے لئے رمضان سے رمضان تک حساب جاری رکھا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ رمضان سے تین چار ماہ بعد سال ختم ہوتا ہے، تو یہ رمضان میں زکوٰۃ ادا کر کے اپنے کو جلدی سبکدوش سمجھ لیتا ہے، مگر غلطی اس میں یہ ہوتی ہے کہ جب رمضان میں یہ شخص زکوٰۃ نکالتا ہے تو جتنا مال رمضان شریف میں اس کی ملک میں ہے یہ اسی کی زکوٰۃ نکالتا ہے، حالانکہ احتمال ہے کہ جو ختم سال

اس کا واقعی ہے اس میں نصاب اس وقت سے زیادہ ہوا ور زکوٰۃ واقع میں اسی زیادہ کے حساب سے واجب ہوگی تو اس طور پر حساب سے کچھ زیادہ زکوٰۃ اس کے ذمہ رہ جائیگی،

اور اس طرح سے یہ حساب غلط ہو جاوے گا مثلاً اس کا سال رجب میں ختم ہوتا تھا اور اس وقت اس کے پاس ایک ہزار روپے تھا، جس کی زکوٰۃ پچیس روپیہ ہوتی ہے اور رمضان شریف میں اس کے پاس آٹھ سو روپے رہ گئے جس کی زکوٰۃ بیس روپیہ ہوتی ہے، تو اب اگر اس شخص نے اسی وقت کا نصاب دیکھکر بیس روپیہ ادا کئے تو پانچ روپیہ اس کے ذمہ رہ گئے۔ اسی طرح اگر اس کا سال ذی الحجہ میں ختم ہوتا ہے اور رمضان میں اس کے پاس آٹھ سو روپے تھے مگر ذی الحجہ میں ہزار ہو گئے تب بھی بعینہ یہی غلطی ہوئی اسی طرح ہر ختم سال پر یہی احتمال ہے۔

سو فرض کیجئے اگر اتفاق سے پانچ سال تک یہی قصہ رہا کہ ختم سال پر تو ہزار روپے ہوتے ہیں اور رمضان میں آٹھ سو روپے تو پانچ روپیہ سال جمع ہو کر پانچ سال میں پچیس روپیہ اس کے ذمہ واجب الادا رہا، تو ایسا ہو گیا جیسے پانچ سال میں چار سال کی زکوٰۃ دی اور ایک سال کی نہ دی، اس لئے یہ ضرور ہے کہ ختم سال پر کے نصاب کو ضرور دیکھا جاوے اور اس کی زکوٰۃ کی مقدار کو یاد رکھے، پھر اگر سال رمضان سے پہلے ختم ہوا ہے، تو رمضان شریف میں اس مقدار کی برابر خیال کر کے زکوٰۃ دے اور اگر رمضان کے بعد سال ختم ہوتا ہے تو رمضان میں جتنا اندازے سے دیا ہے اس کو یاد رکھیں، پھر ختم سال پر جتنی مقدار زکوٰۃ کی ہے اس ادا کی ہوئی کو اس سے ملا دے، اگر کچھ ادا کرنے سے رہ گیا ہو تو پورا کرے اور اگر زیادہ دے دیا ہو تو اگلے سال میں لگا لینا جائز ہے۔

زکوٰۃ کو صحیح مصرف پر نہ دینا

(۵) ــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی زکوٰۃ نکال کر اس کے مصرفِ شرعی میں صرف نہیں کرتے مثلاً بعضے اپنے پیروں کو دیتے ہیں گو وہ صاحبِ نصاب ہو، بعضے مساجد کے ائمہ و مؤذنین کو ان کی تنخواہ کے حساب میں دیتے ہیں: بعضے چندہ مدارس میں

دیتے ہیں اور مہتمم کو اطلاع نہیں کرتے اور وہ اس کو تعمیر یا فرش یا تنخواہ مدرسین یا خرید کتب میں صرف کر دیتا ہے۔ بعضے مردہ کے کفن میں خرچ کر دیتے ہیں اور ان سب صورتوں میں زکوٰۃ سر پر رہتی ہے ادا نہیں ہوتی، اسی طرح سادات و بنی ہاشم، "بقول اصح" اس کے مصرف نہیں ہیں اور جن کو دینے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی ان کو اگر ملنے کے وقت اطلاع ہو جاوے کہ یہ زکوٰۃ ہے تو شامی نے بعض فقہا سے نقل کیا ہے کہ ان کو لینا بھی حرام ہے اور اگر ان قرآئن سے معلوم ہو کہ دینے والے کو ہمارا غیر مصرف ہونا معلوم نہیں تو اطلاع کرنا واجب ہے، اور اخفاء یا سکوت بالاتفاق حرام ہے اور اگر لے لیا تو صاحبِ نصاب کو مکرر زکوٰۃ ادا کرنا ہوگی۔

البتہ کفن میّت میں اس طرح صرف ہو سکتا ہے کہ اس میت کے کسی غریب قریب کو دے دیا جاوے پھر وہ اپنے اختیار اور رائے سے بلا اس کے کہ اس کو کوئی کسی طرح مجبور کرے اس کا کفن لا کر اپنی طرف سے ڈال دے، اسی طرح امام و مؤذن کو ان کے مقرر کئے ہوئے کے علاوہ اگر وہ مسکین ہوں تو زکوٰۃ دے سکتے ہیں،

اسی طرح مدارس میں دینے کے لئے شرطیں ہیں کہ مہتمم کو اطلاع کرے اور یہ کہ اس پر قلب مطمئن ہو کہ یہ غیر مصرف میں صرف نہ کرے گا تاکہ وہ مصرف میں صرف کر سکے اور کر دے، مثلاً مستحق طلباء کو دیدے کہ وہ اپنی خوراک پوشاک وغیرہ میں صرف کریں اور اگر اطلاع نہ ہوئی یا ہوئی مگر وہ مسائل نہیں جانتا یا جانتا ہے مگر محتاط نہیں، تو ان صورتوں میں چونکہ اطمینان نہیں کہ وہ مصرف میں صرف کرے گا، اس لئے ایسے شخص کو دینا ہی جائز نہیں۔

غرض جس جگہ صرف کرنے سے کسی خاص شخص کی ملک نہ ہو اور ملک بھی واقعی جیسے عمارت یا فرش مسجد میں صرف کرنا یا کفن لے کر مردہ پر ڈال دینا، یا ملک تو ہو جاوے مگر وہ شخص مصرف نہ ہو جیسے غنی یا بنی ہاشم یا اس کی خدمت کی اجرت میں دیا جاوے، جیسا مذکورین کی تنخواہوں میں دینا یہ سب غیر مصرف ہیں زکوٰۃ ادا نہ ہوگی اور دوبارہ دینا پڑے گی، سنا گیا ہے کہ بعض لوگوں نے چندہ حجاز ریلوے میں زکوٰۃ دے دی ہے سو

سو ان کو وہ زکوٰۃ دوبارہ دینا چاہئیے۔

اور ملکِ واقعی کے چندہ لگانے سے یہ بات معلوم ہو گئی ہو گی کہ بعض لوگ جو مدارس یا مساجد کے مصارفِ عامہ میں صرف کرنے کے لئے ایک حیلہ کیا کرتے ہیں کہ اوّل کسی مسکین مصرفِ زکوٰۃ کو سمجھا دیا کہ ہم تم کو سو روپیہ دیں گے پھر تم مسجد یا مدرسہ میں دے دینا۔ اور پھر اس کو دیتے ہیں اور وہ مسجد وغیرہ میں دے دیتا ہے اور اس کو "حیلہ تملیک" کہا جاتا ہے چونکہ یقینی بات ہے اس میں دینے والا حقیقتہً اس مسکین کو مالک نہیں بناتا محض صورت تملیک کی ہے اس لئے اس طور سے زکوٰۃ ادا کرنے کا حکم مشکل ہے۔

اور ایک خرابی اس میں یہ ہے کہ وہ مجبور ہو کر پھر واپس کر دیتا ہے، تو وہ دینا اس کا بہ طیبِ خاطر نہیں ہوتا جو کہ حلتِ مال کی شرط ہے، غرض لینا دینا دونوں قواعد کے خلاف ہیں، بعضوں کو شبہ ہو جاتا ہے کہ شرع تو ظاہر پر ہے تو خوب سمجھ لو! کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ باطن کی تفتیش مت کرو، لیکن اگر بلا تفتیش باطن کی اطلاع ہو کہ یہاں تملیک کی نیت نہیں اور طیب خاطر نہیں تو شرع نے یہ کب کہا ہے کہ اب بھی باطن کا اعتبار مت کرو؟ اگر یہ نہ ہوتا تو بنصِّ حدیث جو حلت مال کے لئے طیبِ نفس شرط لگایا گیا ہے جو کہ امرِ مبطن ہے یہ بے معنیٰ ہوتا ہے۔

اگر کہیں ایسے ہی موقع پر زکوٰۃ سے امداد کرنے کی ضرورت ہو اس کی ایک اور تدبیر جو کہ بالکل قواعد کے مطابق ہے یہ ہے کہ کسی مسکین کو مشورہ دیا جاوے کہ تم دس روپیہ مثلاً کسی سے قرض لے کر فلاں سیّد کو دے دو، یا فلاں مسجد و مدرسہ میں دے دو ہم تمہاری اعانت ادائے قرض میں کرائیں گے جب وہ مسکین وہاں دے دے تم اس مسکین کو دس روپے زکوٰۃ میں دے دو پھر اس سے اس کا قرض خواہ وصول کر لے گا، اس میں مسکین کو دینا بھی حقیقتہً ہوا۔ اور اس مسکین پر صدقہ دینے میں جبر بھی نہ ہوا۔ کیوں کہ وہ آزاد ہے خواہ قبول کرے یا نہ کرے، بخلافِ حیلۂ تملیک کے کہ اگر وہ مسکین موافق تعلیم کے نہ دے تو کدورت بلکہ نزاع واقع ہو جاوے اور ہر چند کہ بعد مل جانے اس روپیہ کے قرض خواہ اس سے جبراً لے سکتا ہے مگر قرض تو حق واجب عہد کا ہے اور

اس میں جبر جائز ہے اور چونکہ وہ روپیہ حقیقتاً اس مسکین کا ہو گیا اس لئے اس کو جبراً اپنے قرضہ میں لے لینا سہل ہے، جیسے اس مسکین کے پاس خاص اس کا مکسوبہ ہوتا اور اس کو جبراً لینا جائز تھا۔

زکوٰۃ سے دنیوی مقاصد کا حصول

(۶) ــــ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض آدمی زکوٰۃ سے دنیوی اغراض نکالنا چاہتے ہیں جو کہ خلوص کے خلاف ہے۔ مثلاً اپنے نوکروں کو زکوٰۃ اس خیال سے دیتے ہیں کہ یہ ہم سے زیادہ دبیں گے۔ اور کام خوب کریں گے اور اس میں کمی ہونے سے ان کو شکایت ہوتی ہے کہ دیکھو یہ لوگ کیسے ہیں کہ اس کا اثر نہیں مانا۔ بلکہ بعض تو زبان سے بھی جتلانے لگتے ہیں کہ نمک حرام تجھ کو اتنی تنخواہ دیتے ہیں اور زکوٰۃ سے بھی تیرا خیال رکھتے ہیں مگر تو ایسا احسان فراموش ہے وغیرہ ذالک گو ضابطہ سے یہ زکوٰۃ ذمہ سے ساقط ہو جاتی ہے لیکن حدیث لا یقبل اللہ الا الطیب کی رو سے یہ زکوٰۃ مقبول نہیں ہوتی، پھر اول اور دوسری کوتاہی والے بعضے عذر بھی پیش کرتے ہیں۔

مثلاً یہ عذر کہ اگر ہر سال زکوٰۃ دیتے رہیں تو بعضے مال تو تقریباً ختم ہو جاویں۔ مثلاً جس روپیہ سے ہم تجارت نہیں کرتے ویسے ہی رکھا ہے، یا زیور کہ تجارت کے کام ہی کا نہیں تو نشوونما تو کچھ ہو گا نہیں اور ہر سال ایک جزو زکوٰۃ کا نکلا کرے گا تو یوں ہی فنا ہو جاوے گا جواب یہ ہے کہ روپیہ سے تجارت کرنے کو کس نے منع کیا ہے اب اگر خود نہ کرو تو شریعت اس کی ذمہ دار نہیں۔

اسی طرح چاندی، سونا، زیور کے لئے اصل میں موضوع نہیں ہے بلکہ اصل خلقت میں وہ "ثمن" ہے جو تجارت کے لئے مخلوق ہوا ہے، سو زیور تم نے خود اپنی خوشی سے بنایا ہے شریعت اس کی ذمہ دار نہیں ہے، جب تم چاہو اس سے سکہ بدل کر تجارت کر سکتے ہو اور بڑھا سکتے ہو جس سے وہ اپنی زکوٰۃ کا خود کفیل و متحمل ہو سکتا ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ دوکان میں جب مختلف اقسام کا مختلف قیمتوں کا مال موجود ہے

اس کا حساب کیسے ہو سکتا ہے؟ .... اس کا جواب یہ ہے کہ اگر تمہاری دوکان میں خرید و فروخت کا حساب لکھا جاتا ہے تو کاغذات سے حساب تیار ہو سکتا ہے، اور اگر ایسا نہیں تو نظری تخمینہ کافی ہے، جو تخمینہ قرار پاوے احتیاط کے لئے کچھ اور بڑھا لو۔ مثلاً آٹھ سو روپے کا تخمینہ ہوا تم ہزار سمجھ لو اتنے میں اتنا بڑھا لینے سے احتمال غلطی کا ہرگز نہ رہے گا اور زکوٰۃ میں کل پانچ روپیہ بڑھتے ہیں جو کچھ گراں نہیں اور اسی طرح گوٹہ ٹھپہ کا اور اسی طرح زیور کا جس میں دوسری چیز بھی مرکب ہے تخمینہ کافی ہے۔

اور مثلاً یہ عذر کہ صاحب ہمارا مال تو حلال نہیں ہے، حرام مال میں زکوٰۃ ہی نہیں سو سمجھ لیا جاوے کہ یہ مسئلہ غلط ہے حرام مال جب اپنے مال میں مل گیا وہ ملک میں داخل ہو گیا، گو ملک خبیث ہی ہو، اور وجوبِ زکوٰۃ کے لئے ملک ہونا شرط ہے طیّب ہونا شرط نہیں، طیب ہونا مقبولیت کی شرط ہے سو زکوٰۃ واجب ہوگی، گو مقبول نہ ہوگی، پھر دینے سے کیا فائدہ؟ جواب یہ ہے کہ نہ دینے سے جو عذاب ہوتا ہے اس سے محفوظ رہے اور قبول نہ ہونے سے عذاب نہیں ہوتا بلکہ ثواب سے محرومی رہتی ہے، تو کیا عذاب ہونا اور ثواب نہ ہونا دونوں ایک بات ہیں؟؟ البتہ خود کسب حرام کا جو عذاب ہے وہ الگ ہے اس کی نفی نہیں کی جاتی، لیکن نہ دینے سے دو عذاب کا استحقاق ہوتا کسبِ حرام کا الگ اور زکوٰۃ نہ دینے کا الگ اور اب ایک ہی ہوگا۔ تو کیا یہ دونوں بھی یکساں ہیں؟ ہرگز نہیں!

ردّی چیزیں زکوٰۃ میں دینا

⑦ — ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ میں ایسی چیز دیتے ہیں جو ردّی اور ناکارہ ہو مثلاً تاجرِ کتب ایسی کتاب دے جس کی نکاسی نہ ہوتی ہو اسی طرح تاجر پارچہ پرانے تھان نکالے اور تاجرِ غلہ کرم خوردہ غلہ نکالے وعلیٰ ھٰذا سو جس حساب میں اس نے یہ چیزیں لگائی ہیں اگر بازار میں اتنے کو نہ نکل سکے تب تو زکوٰۃ ہی ادا نہیں ہوئی۔ بقدر کمی قیمت اس کے ذمہ رہ گئی اور اگر اتنی قیمت کی ہے تو زکوٰۃ تو ادا ہو گئی مگر بقدر کمی خلوص کے مقبولیت میں کمی رہی۔

دعوت کے ذریعہ زکوٰۃ کا حکم

⑧ ۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ زکوٰۃ کے روپیہ یا غلہ کا کھانا پکوا کر مساکین کو دعوت میں کھلا دیتے ہیں سو سمجھ لینا چاہئے کہ اگر کھانا پکا کر ان کے ہاتھ میں دے دیا جاوے کہ ان کو اختیار ہو لے جانے کا، یا بیٹھ کر کھا لینے کا اور اس کی ان کو اطلاع کر دی جائے اور وہ کھانا قیمت میں اس قدر ہو تب تو زکوٰۃ ادا ہو جاوے گی اور اگر لے جانے کا اختیار نہ ہو بلکہ بٹھلا کر کھلایا جاوے تو زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

اسی طرح اگر پکا ہوا کھانا اس قیمت کا ہو جتنی زکوٰۃ اس کے ذمہ واجب تھی تب بھی پوری زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔ مثلاً ایک شخص کو بیس روپے زکوٰۃ کے دینے ہیں اس نے جنس خرید کر پکوائی، کچھ خرید میں صرف ہوا، کچھ باورچی کو مزدوری میں دیا، غرض بیس روپے صرف ہو گئے۔ مگر کسی وجہ سے خواہ تو جنس خریدنے میں یہ ٹھگا گیا یا مزدوری زیادہ دیدی یا کھانا بگڑ گیا۔ غرض کسی طور پر تیار کھانا بیس روپیہ کا نہ ہوا بلکہ سترہ اٹھارہ کا ہوا تو یوں نہ کہیں گے کہ اس نے تو بیس ہی روپے خرچ کئے، اس لئے زکوٰۃ ادا ہو جانا چاہئے، بلکہ یوں کہیں گے کہ مساکین کو سترہ، اٹھارہ ہی روپیہ کی چیز پہنچی اس لئے اتنی ہی زکوٰۃ ادا ہوئی، دو یا تین روپے اور اس کے ذمے باقی رہے جس کا ادا کرنا واجب ہے، اس طرح زکوٰۃ کی رقم کا کپڑا خریدا اور سلوایا اگر وہ بعد تیاری کے اتنی رقم کا ہے تب تو اس کے دینے سے زکوٰۃ ادا ہو گی اور اگر کسی وجہ سے قیمت اس کی گھٹ گئی مثلاً کپڑا ناواقفی سے گراں ملا یا سلوانے میں بگڑ گیا تو بقدر گھٹنے کے اور زکوٰۃ دینا پڑے گی ...!

⑨ ۔ ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی دیکھتے ہیں کہ ہم کو پانچ روپیہ زکوٰۃ کے دینے ہیں اور فلاں غریب آدمی کے ذمہ کسی سبب سے ہمارا قرضہ بھی پانچ روپیہ ہیں لاؤ اس کو زکوٰۃ کی نیت سے معاف کر دیں، سو یاد رکھا جاوے کہ اس سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، کیونکہ زکوٰۃ میں تملیکِ کامل شرط ہے اور ابراء من وجہٍ اسقاط اور من وجہٍ تملیک ہے اس لئے زکوٰۃ ادا نہ ہوگی۔

البتہ ایک تدبیر اور جائز ہے وہ یہ کہ اول یہ پانچ روپیہ اس شخص کو بہ نیت زکوٰۃ دیدے جب وہ اس روپے کا مالک وقابض ہوجاوے، اس سے اپنا قرضہ مانگے اور اگر وہ نہ دے توجبراً چھین لینا بھی جائز ہے اس میں کچھ حرج نہیں۔

اغلاط

(۱) ـــ اگر کوئی پہلے زکوٰۃ دینے کا خوگر نہ ہوا اور اب توفیق ہو تو گذشتہ زکوٰۃ ادا کرنا واجب ہے، البتہ اگر درمیان میں بدون تلف کئے ہوئے مال خود تلف ہوکر نصاب سے کم رہ گیا ہو تو اس وقت کی زکوٰۃ ساقط ہوجائے گی۔

(۲) ـ اگر زکوٰۃ کی نیت سے مال نکال رکھا ہو اور وہ ضائع ہوجاوے تو زکوٰۃ ادا نہیں ہوئی، جداگانہ نکال کر رکھنے سے صرف اتنا فائدہ ہے کہ ہر جزو کے دینے کے وقت نیت ضروری نہیں ہوتی۔

الحاق

صدقۂ فطر اور چرم قربانی

چونکہ صدقۂ فطر کا ادا کرنا اور قیمت چرم قربانی کا بعد فروخت کرڈالنے چرم قربانی کے تصدق کرنا بھی واجب ہے، اس لئے وہ بھی اس حیثیت سے "ملحق بالزکوٰۃ" ہے اس لئے اس کے متعلق بھی بعض کوتاہیاں زکوٰۃ کے ساتھ بیان کرنا مناسب معلوم ہوا۔

● ایک کوتاہی صدقہ فطر کے متعلق بعض دیہات میں یہ ہے کہ اس کو جانتے ہی نہیں اس لئے ادا نہیں کرتے، اہل علم وواعظین کو چاہیئے کہ جمعہ کے خطبہ میں یا کسی موقع پر خود دیہات میں جاکر اس جگہ پر آگاہ کریں۔

● ایک کوتاہی اس کے متعلق یہ ہے کہ غیر مصرف میں صرف کرتے ہیں اس کا مصرف وہی ہے جو زکوٰۃ کا ہے جن مصارف میں صرف کرنے سے زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی۔ جن کا اوپر بیان

کیا گیا ہے ان میں صرف کرنے سے صدقہ فطر بھی ادا نہیں ہوتا۔

ایک غلطی بنا بر قواعدِ حنفیہ کے اس میں یہ ہے کہ یہ مشہور ہو گیا ہے کہ صدقہ فطر اگر بجز گیہوں کے اور کسی غلہ سے ادا کرے تو گیہوں کے مضاعف وزن میں دیدے اس میں دو غلطیاں ہیں ایک یہ کہ بہت چیزوں میں گیہوں کا مضاعف نہیں ہے بلکہ اس میں تفصیل ہے، وہ یہ کہ جو چیزیں منصوص ہیں جیسے جو و تمر مثلاً اس میں تو گیہوں کا مضاعف ہے اور جو چیزیں منصوص نہیں جیسے چنا، چاول اس میں یہ حکم ہے کہ کسی منصوص چیز کی برابر قیمت میں ہو مثلاً گیہوں نمبری سیر سے احتیاطاً دو سیر دیئے جاتے ہیں اور تیرہ سیر کے نرخ سے اڑھائی آنہ کے ہوئے۔ تو اگر چنا دینا چاہے تو اڑھائی آنے کے جس قدر چنے آتے ہوں اتنے چنے دینے چاہئیں۔ اسی طرح چاول بھی۔ اور مطلقاً مضاعف دینے میں تو کبھی تو واجب سے زیادہ دیئے جاویں گے تو مضائقہ نہیں، لیکن اگر کبھی کم کر دیئے گئے تو واجب کا ایک جزو اس کے ذمہ رہ جاوے گا۔ مثلاً اگر کبھی گیہوں آٹھ سیر ہوئے اور چنے چوبیس سیر تو مسئلہ مذکور کی بنا پر چھ سیر چنے واجب ہوں گے اور مشہور خیال کے حساب سے یہ شخص چار سیر دے گا تو ایک ثلث واجب اس کے ذمہ رہا۔

اور قیمت چرمِ قربانی کے متعلق بھی ایک عام غلطی وہی غیر مصرف میں صرف کرنا ہے الفاظِ سابق یہاں بھی ہے یعنی جس قدر صدقہ فطر یا قیمتِ چرم غلطی سے ادا نہیں ہوئی اس کا اعادہ ضروری ہے اور اگر نکال کر رکھنے کے بعد ضائع ہو جاوے پھر ادا کرنا ہوگا۔

حج کے بارے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ حج)

منجملہ ارکانِ اسلام کے ایک فریضۂ حج ہے جو بنسبت دوسرے ارکان کے اپنی ایک خاص شان کی وجہ سے زیادہ اہتمام کے قابل ہے وہ شانِ خاص ... یہ ہے کہ اس کی تکمیل کے لئے جس قدر سامان درکار ہے اس کا ہر وقت میسّر و مجتمع ہونا، گو پورا اختیاری نہیں اور اس میں موانع کا پیش آجانا چنداں مستبعد نہیں، کیونکہ مال بھی زیادہ چاہئے اور ہمت و قوت بھی زیادہ چاہئے وقت و فراغ بھی زیادہ چاہیئے۔

اگر ایک سال تساہل کیا آئندہ سال تک امورِ مذکورہ میں کلاً یا بعضاً تغیر ہو جانا زیادہ بعید نہیں، یہ مجموعی شان دوسرے ارکان میں نہیں اسی واسطے احادیث میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ جو کوئی حج کرنا چاہے وہ بہت جلدی کرے اور عجب نہیں کہ اسی شانِ خاص کے سبب یہ عمر بھر میں ایک ہی بار فرض کیا گیا ہے، اور گو اہل مکہ اور اس کے قرب وجوار والوں کے لئے یہ اشکال نہیں، مگر بمقابلہ آفاقیوں کے ان کی تعداد ہی کیا ہے؟ قواعدِ انتظامیہ میں اکثری حالات پر مبنی ہوا کرتے ہیں اور چونکہ اس میں افعال بھی متکثر و متعدد و مختلف ہیں اور متعلق

ہیں۔ امکنۂ خاصہ و ازمنہ خاصہ کے ساتھ اور اس اعتبار سے بھی یہ دوسرے ارکان سے ممتاز ہے اس لئے اس کے احکام و مسائل بھی لوگوں کو کم معلوم ہیں اور ان کا چرچا بھی کم ہے امرِ اوّل کے سبب اس میں عملی کوتاہی زیادہ واقع ہوتی ہے اور امرِ ثانی کے سبب علمی کوتاہی زیادہ ہوتی ہے۔

★ — عملی کوتاہی تو یہ ہے کہ اس کے ادا میں لوگ سستی بہت کرتے ہیں وہمی ضروریات وخیالی تعلقات سے فارغ ہونے کے منتظر رہتے ہیں کہ فلاں کام سے فارغ ہو کر چلیں گے ، پھر اس کام کے بعد دوسرے کام کا اسی طرح انتظار رہتا ہے۔ حالانکہ یہ سلسلہ عمر بھر منقطع نہیں ہوتا۔ بقولِ شاعر ؎

لا ینتھی ارب الا الی ارب

وبقول شاعر ؎

ہر شبے گویم کہ فردا ترک ایں سودا کنم
باز چوں فردا شود امروز را فردا کنم

اس کا علاج یہی ہے کہ بیچ ہی میں سارے کام چھوڑ کر اور ظاہراً سرسری طور پر ان کا انتظام کر کے اور باطناً خدا کے حوالے کر کے چل کھڑا ہو، اور اس علاج کی ہمت باندھنے کے لئے ان وعیدوں کو یاد کرے جو باوجود فرضیت کے اس کے ترک پر آئی ہیں، قرآن مجید میں ایسے ترکِ حج کو کفر سے تعبیر فرمایا ہے، اور حدیث شریف میں یہودیت ونصرانیت کی حالت پر موت آجانے کی برابر بتلایا ہے اس سے زیادہ کیا وعید ہوگی ؟؟

اگر فکرِ تعلقات زیادہ مشوش کرے تو یوں سوچے کہ اگر میں ابھی مر جاؤں تو اس تمام کارخانہ کا کیا انتظام ہو ؟ تو سفر کرنا موت سے تو بڑھ کر نہیں ، اس وقت ہمیشہ کے لئے ان سب کو چھوڑ دیتا اب تھوڑے روز کے لئے چھوڑنے پر دل کو سمجھا لے اپنے دل کو سمجھا لینا ہی کیا مشکل ہے ؟ اور وہ بھی مہتم بالشان ضرورت کے لئے !

اور علمی کوتاہیاں بکثرت ہیں مگر بعض تو عین موقع کے متعلق ہیں ان کا تو عام کو پہلے سے سمجھنا اور یاد رکھنا دونوں تکلف سے خالی نہیں ، اس کی تدبیر بجز اس کے کچھ نہیں کہ وہاں

پہنچ کر مطوّف ایسے شخص کو مقرر کیا جاوے جو احکامِ حج سے پورا آگاہ اور اپنے تدین کی وجہ سے اپنے حجاج کے افعالِ حج کا پورا نگران اور مطلع کر دینے والا ہو اکثر لوگ مطوفین کو اپنی دنیوی آسائش کے لئے مقرر کرتے ہیں، دنیوی حوائج تو کسی نہ کسی طرح پورے ہو جاتے ہیں۔ زیادہ ضرورت تو دینی حاجت کے انتظام کی ہے، سو جب حج کو جانے لگے جو علماء حج کر آئے ہیں اول ان سے دربارۂ تعیینِ مطوّف مشورہ کرے ورنہ ناواقفی سے بعض ایسی غلطیاں ہو جاتی ہیں کہ حج ہی فاسد یا کالفاسد ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ علماء کو بھی ہر وقت مسائل حج کے مستحضر نہیں رہتے اس لئے ان کے لئے بھی مناسب ہے کہ مناسک کے معتبر رسالہ خواہ کسی زبان میں ہوں سفر میں ہمراہ رکھے اور ان کا مطالعہ کرتے رہیں۔ اور پھر بھی جہاں اشتباہ واقع ہو وہاں کے علماءِ حاذقین سے پوچھ لیں کہ ان کو یہ احکام زیادہ مستحضر رہتے ہیں اور پوچھنے میں عار نہ کریں اور دوسروں کو اس وقت بتلاویں جب پورا اطمینان ہو، ورنہ وہاں کے علماء کے حوالہ کر دیں اور جو ان کی زبان نہ سمجھے وہ بذریعہ اپنے مطوّف، یا کسی اپنے ہم وطن بھائی کے جو وہاں مدت سے مقیم ہو اور ترجمہ کر سکے دریافت کر لے

یہ تو بیان تھا ان علمی کوتاہیوں کے متعلق جن کا عین موقع پر صدور ہوتا ہے، بعض علمی کوتاہیاں وہ ہیں جن کا صدور قبل سفر ہوتا ہے اور بعض ان میں باوجود امرِ شرع اس سفر سے مانع ہو جاتی ہیں اور بعضے باوجود نہی شرع اس سفر پر باعث ہو جاتے ہیں چنانچہ ہر ایک میں نظر کرنے سے معلوم ہو جاتا ہے۔

حج کے لئے سفرِ مدینہ ضروری نہیں

★ —— سو ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ سفرِ حج کو اس وقت فرض سمجھتے ہیں جب مدینہ منورہ کے سفر کے لئے بھی وسعت ہو، اور اگر اتنا خرچ ہو کہ صرف حج کر سکتا ہے مدینہ طیبہ نہیں جا سکتا، تو یہ لوگ اس حالت میں حج کو فرض نہیں سمجھتے۔

سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سخت غلطی ہے، مدینہ طیبہ کا سفر ایک مستقل طاعت ہے، واجب ہو یا مستحب علی اختلافِ الاقوال، خواہ روضۂ منورہ کے قصد سے جیسا کہ جمہور کا

قولِ منصور ہے یا صرف مسجدِ نبوی کے قصد سے جیسا کہ بعض قائل ہوئے (اور یہ مقام اس مسئلہ کی تحقیق کا نہیں ہے، "نشر الطیب" کی ستائیسویں فصل کے آخر میں بقدرِ ضرورت اس کو لکھ دیا گیا ہے)

بہرحال سفرِ مدینہ کی استطاعت پر فرضیت حج کی موقوف نہیں ہے، اگر صرف سفرِ حج کی استطاعت رکھتا ہو اور سفرِ مدینہ کی استطاعت نہ رکھتا ہو اس کے ذمہ حج فرض ہے اگر نہ کرے گا تو تمام ان وعیدوں کا مورد ہوگا جو ترکِ حج پر آئی ہیں، باقی حج کے بعد اگر کچھ سامان سفرِ مدینہ کا ہو جاوے گا یا پیادہ چلنے کی ہمت ہو جاوے جیسا شوق کے غلبہ میں ایسا ہو جاتا ہے، تو اس شرف کو بھی حاصل کرے، ورنہ برِ دست واپس آجائے اور عزم رکھے کہ خدا تعالیٰ توفیق دے گا تو مستقل سفرِ مدینہ کا کرلوں گا اور جب سامان ہو جاوے ایسا کرے بھی۔ اور اگر عمر بھر بھی سامان نہ ہوا تو انشاء اللہ تعالیٰ اس تمنا و عزم کا اجر بھی اس سفرِ مبارک کے اجر کے قریب قریب ہی ہوگا، جیسا کہ چند حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ فعلِ خیر کی نیت بھی اجر میں مثل فعلِ خیر ہی کے ہے۔

★ — اور ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اوقات اس شخص کے پاس مالِ حرام اس مقدار میں جمع ہو جاتا ہے کہ حج کو کافی ہو، مگر یہ سمجھتا ہے کہ یہ تو مالِ حرام ہے اس کا حج میں خرچ کرنا اور بھی زیادہ برا ہے اور مالِ حلال میرے پاس اس قدر ہے نہیں اس لئے میرے ذمہ حج فرض نہیں، اور یہی خیال بعض لوگوں زکوٰۃ میں بھی ہے پس یہ لوگ نہ حج کرتے ہیں نہ زکوٰۃ دیتے ہیں!!

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مدارِ فرضیت حج و زکوٰۃ کا خاص مقدارِ مال کا مالک ہونا ہے اس کے حلال ہونے کو فرضیت میں دخل نہیں، اس لئے ایسے شخص کے ذمہ حج اور زکوٰۃ دونوں فرض ہیں، البتہ حرام مال سے جو حج ہوگا وہ مقبول نہ ہوگا، لیکن فرض ادا ہو جائے گا۔ یعنی اس شخص پر مواخذہ نہ ہوگا کہ حج کیوں نہیں کیا، گو یہ مواخذہ ہو کہ مال حرام کیوں جمع کیا؟ اور اس سے کیوں منتفع ہوا؟ سو ادا ہو جانا اور چیز ہے اور قبول ہونا دوسری چیز، اگر قبول ہونا بھی چاہتا ہے اور بجز اس مال حرام کے اس کے پاس اور کچھ

نہ ہو تو ایسا کرے کہ کسی کافر سے قرض لے کر اس کو حج کے لئے الگ رکھے، پھر خواہ وہ قرضہ لگے ہی دن خواہ تھوڑی ہی دیر کے بعد اس مالِ حرام سے ادا کر دے۔ تو یہ روپیہ قرض لیا ہوا اس کی نسبت غنیمت ہوگا، اور بعضے جو کہا کرتے ہیں کہ دوسرے کے روپیہ سے بدل لے سو اگر ہاتھ در ہاتھ بدلا تو وہ بدلے کا روپیہ بھی ایسا ہی حرام ہو جاوے گا جیسا اصل کے پاس کا روپیہ تھا، دست بدست لینے کا اور حکم ہے اور قرض لے کر پھر ادا کرنے کا اور حکم ہے۔ اور اس تدبیر کا بتلانے کا یہ مطلب نہ سمجھا جائے کہ مال حرام جمع کرنے کی اجازت دی جاتی ہے یا ایسا کرنے کے بعد مال حرام جمع کرنے کا گناہ اتر گیا یا اس کے تدارک کی شرعاً ضرورت نہ رہی، حاشا و کلا ہرگز یہ مطلب نہیں حرام مال لینے کا جو گناہ ہے وہ اب بھی باقی ہے اور اس کا تدارک اب بھی واجب ہے یعنی جن لوگوں کا وہ حق ہے ان کو واپس کرنا جس کا مستحق نہ ملے اس کے ورثہ کو دینا اور جہاں معلوم نہ ہو اس قدر مال ان مستحقین کی طرف سے مساکین کو دے دینا اور اس سے سب کے ساتھ توبہ و استغفار کرنا اور اگر بالفعل تدارک پر قادر نہ ہو تو اس کی فکر میں رہنا اور جتنی جتنی گنجائش ہوتی جائے اتنا اتنا ادا کرتے رہنا یہ سب واجب ہے۔

غرض اس حیلہ سے حرام و حلال کے احکام نہیں بدل گئے یا رفع نہیں ہو گئے مقصود اس سے اس امر پر متنبہ کرنا ہے کہ یہ لوگ جو حج و زکوٰۃ اپنے ذمہ فرض نہیں سمجھتے یہ ان کی غلطی ہے۔

یہ دو علمی غلطیاں تو وہ ہیں جن میں حج کے امر شرعی کے ممانعت کی جاتی ہے۔

بھیک مانگ کر حج کرنا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ جن کے پاس نہ تو حج کا سامان ہے اور نہ قلب میں غنا اور قوت توکل ہے مگر لوگوں سے بھیک مانگ کر ان کو پریشان کر کے حج کو جاتے ہیں سو اس طرح حج کو جانا حرام ہے۔

بغیر محرم کے حج کرنا

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی یہ ہے کہ باوجود شوہر یا محرم کے ہمراہ نہ ہونے کے پھر حج کو جاتی ہیں اور گو بعض کو ائمہ کی قول پر بعض خاص قیود و شروط کے ساتھ اس کی گنجائش ہے لیکن اوّل تو عوام کو ایسی بے قیدی کی اجازت نہیں کہ جس وقت جس کا قول دل چاہا لے لیا دوسرے جانے والیاں ان قیود و شرائط کو نہ جانتی ہیں، نہ ان کی پرواہ کرتی ہیں۔ ہر حال میں چلی جاتی ہیں جو کہ ان ائمہ کے نزدیک بھی جائز نہیں۔

تیسرے اس وقت اتنا فساد نہ تھا ثقہ عورتوں کے ساتھ امن غالب تھا اور اس زمانہ میں فساد اس قدر غالب ہے کہ عورتوں کے ہوتے ہوئے بھی شریر طبیعتیں شرارت سے نہیں چوکتیں پھر تعاون و ہمدردی کم ہوتی جاتی ہے اگر بیماری وغیرہ پیش آ گئی تو کم عورتوں سے امید ہے کہ اپنا کام چھوڑ کر ان کی امداد کریں اکثر لوگوں کو خصوصاً ضعفاء و نسوان کو نفسی نفسی میں مشغول دیکھا ہے تو بوجہ مجبوری مرد ہی امداد کریں گے تو لامحالہ اتارنے میں چڑھانے میں اجنبی مرد اس کا ہاتھ بھی پکڑیں گے کمر بھی تھامیں گے تو ایسے وقت فتن سے محفوظ رہنا جانبین کا یا ایک ہی جانب کا مشکل ہے خاص کر قلب اور عین کا فتنہ سے تو ایسے حج کی ضرورت ہی کیا ہے؟ جب شریعت اس کو حاضر ہونے کا حکم نہیں کرتی بلکہ روکتی ہے تو پھر یہ کیوں مصیبت میں پڑتی ہے؟ اگر اس عورت کو مالی استطاعت ہو اور محرم و شوہر موجود نہ ہو یا جانے پر آمادہ نہ ہو کیوں کہ اس کو شرعاً اس کا اختیار حاصل ہے تو اس میں فقہاء مختلف ہیں کہ آیا استطاعت مالی سے نفس وجوب حج کا اس کے ذمہ ہو گیا ہے یا نفس وجوب بھی نہیں ہوا پہلے قول پر اس عورت کے ذمہ حج بدل کی وصیت کرنا واجب ہو گا۔ اور دوسرے قول پر نہیں لیکن احتیاط اسی میں ہے کہ وصیت کی جائے اگر یہ وسوسہ ہو کہ اگر وصیت نافذ نہ کی گئی تو حج میرے ذمہ رہے گا، اس کا جواب یہ ہے کہ لیکن گناہ گار نہ ہوگی کیونکہ اس نے اپنے ذمہ کے واجب کو یعنی وصیت کو ادا کر دیا اب نفاذ اس کا جبکہ مال چھوڑ جائے ورثہ کی ذمہ واجب ہے اگر وہ کوتاہی کریں گے اس کا مواخذہ ان سے ہوگا۔

یہ کوتاہیاں علمی وہ ہوئیں جن پر شرائط حج سے نہی شرعی کی ممانعت کی جاتی ہے۔ در سب کے اوپر ایک عملی کوتاہی تھی یہ سب پانچ کوتاہیاں ہوئیں، جو شرائط حج کے متعلق ہیں علاوہ ان غلطیوں کے جو نفس حج میں ہوتی ہیں جن پر مطوف عالم شفیق مطلع کر دے گا یا علماء کو کتب مناسک مطلع کر دیں گی۔ دو کوتاہیاں حج سے خارج مگر اسی سفر سے متعلق یاد آگئیں پس وہ پانچ مل کر یہ سب سات ہو جاویں گی۔

ایک کوتاہی یہ کہ بعض لوگ حج کو جاتے ہیں اور ریل میں یا جہاز میں یا اونٹ پر فرض نمازیں برباد کرتے ہیں سو انہوں نے ایک فرض تو ادا کیا اور راستے کیثر فرض فوت کئے اور اگر حج فرض نہیں تھا نفل تھا تو اور بھی غضب ہوا کہ ایک نفل کے لیے اتنے فرض گئے گذرے سو ایسے شخص کو حج کرنا جائز بھی نہیں۔

ایک کوتاہی جو باعتبار تعدیہ ضرر کے سب سے اشنع و اقبح ہے یہ کہ بعض لوگ حج کر کے آتے ہیں اور وہاں کے مصاعب اور مصائب اس طرح سے بیان کرتے ہیں کہ سننے والا حج کو جانے سے ڈر جائے ایسے شخص کے یصدون عن سبیل اللہ (یہ لوگ اللہ کے راستے سے (لوگوں کو) روکتے ہیں) کے مصداق ہونے میں کیا شبہ ہے؟ اور اگر وہ شکایات غیر واقعی ہوں چنانچہ اکثر یوں ہی ہوتا ہے کہ بات بہت بڑھا کر کہا جاتا ہے اور نیز اس مصیبت کی بنیاد کو تو ضروری ہی غلط ظاہر کیا جاتا ہے جس کی وجہ یہ ہوتی ہے کہ اکثر ایسے واقعات کا سبب اپنی حماقت ہوتی ہے تو اپنی حماقت کون بیان کرتا ہے؟ تو اس طور پر وہ شکایات یا ان کے بعض اجزاء غیر واقعی ہوتے ہیں تو اگر ایسا ہو تو یہ لوگ یصدون عن سبیل اللہ کے ساتھ ویبغونہا عوجًا کے بھی مصداق ہوں گے اور چونکہ باوجود علم واقعہ کے غصہ میں ایسا کرتے ہیں اس لئے جملہ وانتم شہداء کے بھی یہ مخاطب ہوں گے اور اس کے جواب میں ان کو بھی وہی کہا جائے گا۔ وما اللہ بغافل عما تعملون۔

اور عجیب لطیفہ یہ ہے کہ یہ آیت جس کے جملہ اس حالت آخیرہ کی تقریر میں جا بجا نقل کئے گئے ہیں قرآن مجید میں بھی بعد ذکر حج کے متصل وارد ہے اور مجھ کو بھی حج ہی کے اس خاص مضمون کے ساتھ یاد آئی تو قرآن مجید میں یہ اتصال میرے اس استدلال کا ایک خاص لطافت کے ساتھ مؤید ہو گیا اگر مصائب واقعی بھی ہوں تب بھی یہ سمجھنا چاہئے کہ

یہ سفرِ عشق ہے محبوب کے دربار میں حاضری دینے کے لئے تو سفرِ عشق میں خار بھی گل اور زاغ و زغن بھی بلبل معلوم ہونا چاہیئے و نعم ما قیل ؎

ای دل آں بہ کہ خراب از مئے گلگون باشی
بی زر و گنج بصد حشمت قارون باشی
در رہ منزل لیلیٰ کہ خطرہاست بجان
شرط اول قدم آن است کہ مجنوں باشی

وصلی اللہ علی سید المرسلین الذی
ولد و نبی فی بلد اللہ الامین

قربانی سے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ قربانی)

جس طرح ملحقات زکوٰۃ میں سے صدقۂ فطر ہے جس کے متعلق پہلے بقدر ضرورت مضمون لکھا جاچکا ہے، اسی طرح اس کے ملحقات میں سے قربانی بھی ہے انقلاب کے اثر میں مثل دیگر اعمال دینیہ کے یہ بھی شریک اور اس حیثیت سے واجب الاصلاح ہے۔

اس میں ایک کوتاہی جو راس التفریطات ہے یہ ہوتی ہے کہ بعض لوگ باوجود وسعت اور وجوب کے قربانی نہیں کرتے بلکہ بعض خاندانوں میں کئی پشت سے قربانی نہیں ہوئی، بلکہ بعض دیہات کے لوگ، اس کو جانتے تک بھی نہیں۔ بعض سستی و بے پروائی کے سبب نہیں کرتے۔ بعض بخل کے سبب کوتاہی کرتے ہیں۔

پس اگر سبب اس کا ناواقفی و بے خبری ہے تو اس کی اصلاح یہ ہے کہ ان کو اس کے وجوب سے اور ترک پر جو وعید ہے جیسا ابن ماجہ میں حدیث مرفوع ہے من وجد سعۃ ولم یضح فلا یقربن مصلانا (یعنی جس کے شخص کے پاس قربانی کرنے کی گنجائش ہو اور پھر بھی وہ قربانی نہ کرے تو ایسا شخص ہرگز ہماری عیدگاہ میں نہ آئے) اس

پر ان کو اطلاع دی جائے بالخصوص واعظین وطلبا، یا ان اہل علم کو جو دیہات میں وعظ و تبلیغ کی غرض سے جاتے ہیں، ضرور ہے کہ وہ دیہات کے لوگوں کو جب کہ وہ جمعہ میں حاضر یا خود دیہات میں جاتے ہیں اس کے وجوب پر بلکہ اس کے متعلق ـــــ احکام پر بھی آگاہ کر دیں۔

بعض باوجود اس قدر وسعت کہ جس پر قربانی واجب ہوتی ہے اپنے ذہن میں اسے اس لئے سبکدوش سمجھے ہوئے ہیں کہ ان کو اس وسعت کی مقدار معلوم نہیں، تو ان کو اس سے آگاہ کیا جائے کہ جس کے پاس حوائج ضروریہ سے زائد تخمیناً پچاس روپیہ نقد یا مال تجارت یا زیور یا جائیداد و مکانات علاوہ مکان سکونت و کفایت معاش سالانہ کے موجود ہو، پس اتنی وسعت پر قربانی واجب ہو جائیگی۔ خواہ مرد ہو یا عورت البتہ بچوں پر یا بچوں کی طرف سے واجب نہیں۔

اور اگر بے پروائی اس کا سبب ہے تو ان لوگوں کو غور کرنا چاہیئے کہ دنیا کی جلب منافع و دفع مضار کے لئے اگرچہ وہ درجہ ضرورت میں نہ ہوں اور اگرچہ وہ موہوم بھی ہوں، کس قدر روپیہ موقع پر بلکہ ہر روز ہی خرچ کیا کرتے ہیں اور پھر وہ فانی تو کیا آخرت کے اتنے بڑے ثواب کی تحصیل کے لئے کہ اس سے زیادہ کوئی منفعت نہیں اور اتنے بڑے گناہ و عذاب سے بچنے کے لئے کہ اس سے بڑھکر کوئی مضرت نہیں اور پھر دونوں یقینی اور باقی اور ضروری الرعایت بے پروائی اور سستی کی جائے کتنی بڑی نادانی ہے۔

اور اگر سبب اس کا بخل ہے تو فوری علاج تو اس کا ان ہی منافع و مضار کا استحضار ہے جس کا ابھی بیان ہوا اور باقاعدہ علاج اس کا یہ ہے کہ مادہ بخل کا استیصال کیا جائے جس کی تدبیریں کتب فن میں ملیں گے۔

قربانی کے عبادت ہونے میں شبہ

بعض لوگوں کو اس سے بڑھ کر ایک سبب اس ترک کا ہو گیا ہے کہ وہ اس کے عبادت ہونے میں شبہ کرتے ہیں بالخصوص حج کی قربانی کو بوجہ کثرت ذبائح محض اضاعت مال ہی سمجھتے ہیں ان کی اصلاح یہی ہے کہ وہ علماء محققین سے اپنی تسلی مفصل شبہات

پیش کرکے کرلیں۔

مجمل یہ ہے کہ عبادت کی حقیقت امتثال امر الٰہی ہے جب اس کا مامور بہ ہونا ثابت ہے پھر عبادت ہونے میں کیا شک ہے۔

رہا یہ سوال کہ امر الٰہی کس حکمت سے ہوا گو ایسے سوالات کے جوابات میں اس وقت خاص دلچسپی سے کام لیا جاتا ہے، مگر سچا جواب یہ ہے کہ یہ سوال ہم سے پیش نہیں کیا جاسکتا کیونکہ ہم بانی قانون نہیں جو قانون کی لم جاننے کے مدعی ہوں ہم ناقل وحاکی قانون ہیں جب واضع قانون کے روبرو کھڑے کئے جائیں گے اگر ہمت ہوگی پوچھ لینا پھر جو جواب ان کے نزدیک مصلحت ہوگا عنایت کر دیں گے خواہ تقریر ومقال سے، خواہ تعذیر ونکال سے۔

دفعات قوانین کی علل وکلاء یا مجسٹریٹ وجج سے پوچھنا سخت نادانی ہے۔ اگر کوئی پوچھے بھی ان کو یہ جواب دینے کا حق ہے کہ واضعان قانون سے پوچھو ہم اس کے ذمہ دار نہیں تو علماء ایسے سائلوں کو ایسا جواب کیوں نہیں دے سکتے اور جب دے سکتے ہیں تو کیوں نہیں دیتے؟ کیوں سائل کی بے محل فرمائش کا اتباع کرتے ہیں؟

اسی طرح اضاعت مال کے شبہ کا جواب ہے کہ اضاعت اس وقت ہوتی ہے جب اس میں کوئی فائدہ نہ ہوتا اور جب فائدہ اس میں رضائے حق ہے جس کا مقابلہ کوئی فائدہ نہیں کرسکتا تو اضاعت کیسے ہوئی؟

سستی قربانی کی تلاش

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض وسعت والے قربانی تو کرتے ہیں تو مگر بڑی کوشش اس کی ہوتی ہے کہ کوئی حصہ سستا مل جائے گو اس میں کچھ عیب بھی ہو مگر ایسا نہ ہو جو مانع جواز قربانی ہو اور وجہ اس کی دو ہیں۔ ایک بخل جس کا علاج اوپر گذر چکا ہے اور دوسرے یہ خیال غیر واقعی کی قیمت کے بڑھنے سے یا مال کے عمدہ ہونے سے ثواب میں زیادتی نہ ہوگی بلکہ ایک حصہ میں جس قدر ثواب ہوتا ہے وہ قانون حال میں برابر ہوگا اگر زیادتی بھی ہوئی

توہم زیادتی کو کیا کریں گے ؟ پس اتنا ہی کافی ہے کہ برأت ذمہ حاصل ہو جائے اس کی اصلاح یہ ہے کہ یہ خیال بالکل غلط ہے بلکہ جس قدر مال عمدہ ہو گا یا قیمت زیادہ ہو گی ثواب زائد ہوتا جائیگا لن تنالوا البر حتیٰ تنفقوا مما تحبون (تم اس وقت تک نیکی حاصل نہیں کر سکتے جب تک اپنے محبوب اموال میں سے خرچ نہ کرو)

یعنی :-

اور لَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ تُنفِقُونَ وَلَسْتُم بِآخِذِيهِ إِلَّا أَن تُغْمِضُوا فِيهِ - یعنی (اللہ کی راہ میں خرچ کرتے وقت خراب مال دینے کا قصد نہ کرو کہ اس سے خرچ کرو اور (جب کبھی لینے کا موقع ہو تو) تم اسے لینے والے نہیں ہو، اِلّا یہ کہ چشم پوشی سے کام لو) اور حدیث سمنوا ضحایاکم (اپنے قربانی کے جانوروں کو فربہ کرو) اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا قصہ ہے کہ ایک اونٹنی ذبح کی تھی جس کے تین سو دینار ان کو ملتے تھے (رواہ فی التفسیر المظہری) یہ سب دلائل واضح ہیں اس دعویٰ کے۔

اور یہ خیال کہ ہم زیادتی کو کیا کریں گے ؟ صرف برأت ذمہ کافی ہے، اس کا محل وہاں ہو سکتا ہے جہاں صرف مواخذہ سے بچنا ہو اور اس حاکم سے کوئی خاص تعلق نہ ہو نہ خاص تعلق پیدا کرنا مقصود ہو، کیا حق جل وعلیٰ شانہ کے تعلقات کے وجود یا مطلوبیت حصول کا کسی کو انکار ہو سکتا ہے، اگر نہیں ہو سکتا تو اس خیال کی گنجائش کہاں رہی ؟

حقوق العباد چھوڑ کر قربانی کرنا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ محض نادار ہیں یا ذخیرہ سے زیادہ ان کے ذمہ حقوق العباد ہیں جن کا ادا و ایفاء فرض مقدم ہے مگر یہ لوگ ان سب حقوق کو نظرانداز اور پشت افگندہ کر کے محض فخر اور وضع قدیم نباہنے کے لئے قربانی کی پابندی کرتے ہیں اور پاس نہیں ہوتا تو ادھار کرتے ہیں۔

بعض کو دیکھا ہے کہ متعدد حصص مردوں تک کے کرتے ہیں اور زندوں کے واجب حقوق کو مردہ کرتے ہیں حالانکہ یقینی بات ہے کہ دس روپیہ قرض میں ادا کرنا اس سے بہتر

ہے کہ ان دس روپے کے حصے خرید ے جائیں تو اضافہ حقوق کا الزام الگ اور فساد نیت یعنی تفاخر و ترفع کا الگ ۔

حضرات سلف سے اس مباہات پر انکار منقول ہے اور اس انکار کے ساتھ ان کا یہ قول بھی مروی ہے کہ ہم تو گھر بھر کی طرف سے ایک بکری ذبح کر لیتے تھے یعنی عدم وجوب کی صورت میں ایک نے اپنی طرف سے کر لی اور گھر بھر نے کھا پی لیا کیونکہ ایک حصہ تو کئی کیطرف سے ہو ہی نہیں سکتا، البتہ کوئی حق ضائع نہ ہوا اور تفاخر بھی نہ ہو تو تطوع کے مستحب اور دلیل محبت ہونے میں کوئی کلام نہیں اسی طرح عام مردوں کی طرف سے یا اپنے بزرگان دینی کی طرف سے بالخصوص حضور پر نور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے قربانی کرنا بھی احب المندوبات اور مقتضا ان حضرات کے حقوق کا ہے لیکن منفعت جب ہی مطلوب ہے جب اس میں کوئی مفرت نہ ہو۔

ناواقفیت سے ہونے والی کوتاہیاں

اور بعض کوتاہیاں مسائل فرعیہ فقہیہ کے نہ جاننے سے ہوتی ہیں جیسے ایسے جانور کی قربانی کرنا جو رعایا سے گھاس چرانے کے عوض میں لیا گیا ہو یا جو جانور حصہ پر کسی کو پرورش کرنے کے لیے دیا گیا تھا اور وہ اس پرورش کنندہ کے حصہ میں لگا دیا گیا پھر اس سے کسی نے خرید یا خریدنے کے وقت کھال استثنار کر لینا یا جانور خرید کر پھر اس کو کلا یا بعضاً دوسرے کے ہاتھ بیع ڈالنا یا اپنا حصہ کسی سے بدل لینا یا دوسرا اول خرید کر پھر پہلا بیع ڈالنا کہ ان استبدال کی صورتوں میں غنی اور فقیر کے احکام میں نہایت طویل تفصیل ہے یا ان سب سے بڑھکر ایک ایسی صورت میں جو ایک مقام میں سنی گئی کہ جانور ذبح کرنے کے بعد اس کا ایک حصہ ایک شخص کے نام زد کر کے اس کی قربانی کے لئے کافی سمجھا گیا یا مشترک گوشت محض تخمینہ سے تقسیم کرنا یا گوشت کے تین حصہ برابر کرنے کو واجب سمجھنا یا کھال بیچ کر کسی کی تنخواہ و اجرت میں لگا دینا، جب بعض دیہات میں امام و مؤذن کو یہی کہہ کر رکھتے ہیں کہ تم کو قربانی کی کھال بھی ملے گی یا ان داموں سے مسجد کے بوریئے وغیرہ خریدنا یا مسجد کی تعمیر میں لگا دینا یا اپنے خرچ میں لئے آنا کیونکہ بعد بیع چرم کے اس کی قیمت کا مصرف

مثل زکوٰۃ ہوتا ہے، یا کہیں منی آرڈر کرکے بھیجنے کی صورت میں اسی میں سے فیس ادا کرنا، ومثل ذالک ان سب کی اصلاح مسائل فقہیہ کی تحقیق کرکے ان کے موافق عمل کرنا چاہئے۔

بعض دوسری مالی عبادتوں میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ بعض طاعات مالیہ)

مثل وقف کفارہ یمین، نذر، فدیہ، نماز، روزہ وصدقہ نافلہ وغیرہ، جس طرح زکوٰۃ کے ملحقات میں سے صدقہ فطر وقربانی ہے جن کے متعلق اس کے قبل بیان ہو چکا ہے اسی طرح اس کے ملحقات میں سے دوسری بعض طاعات مالیہ بھی حقوق اللہ میں سے ہیں جن میں سے بعض کا نام سرخی بالا کے ضمن میں ہے ترمذی کی حدیث مرفوع انّ فی المالِ لحقًّا سوی الزکوٰۃِ۔ یعنی (بلاشبہ مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی کچھ حق ہے) کے عموم میں یہ سب داخل ہیں اور چونکہ ایسی طاعات میں زکوٰۃ راس واساس ہے اور اسی وجہ سے ان سب میں وہی شعائر وارکان اسلام سے ہے، اور باقی سب اس کے بعد کے درجہ میں اسی بنا پر اوروں کو اس کے ملحقات میں سے کہہ دیا گیا، ورنہ یہ مقصود نہیں ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ زکوٰۃ فرض ہے اور دوسرے تطوع، یا یہ کہ جس کے ذمہ زکوٰۃ نہ ہو اس کے ذمہ دوسرے حقوق مذکورہ میں سے کچھ نہ ہوگا، یہ دونوں حکم غلط ہیں۔ واقفان احکام جانتے ہیں کہ صدقہ فطر، قربانی، کفارہ یمین، ایفاء نذر، فدیہ، صوم وصلوٰۃ کا بھی واجب ہے، گو وقف صدقہ نافلہ واجب نہ ہو،

اور اسی طرح بعض کے ذمہ زکوٰۃ نہیں ہوتی مگر دوسرے حقوق مالیہ واجبہ اس کے ذمہ ہوتے ہیں۔
مقصود یہ ہے کہ اعمال درجہ میں تو زکوٰۃ کے بعد میں مگر پھر بھی شرعاً مطلوب ہیں جنمیں بعض واجب اور بعض مندوب ہیں چونکہ ان میں بھی مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں اس لئے ان پر مختصراً بقدر ضرورت متنبہ کرنا ضروری ہے چنانچہ تھوڑا تھوڑا عرض کرتا ہوں، اور حقوق اللہ اس لئے قید لگائی کہ جو حقوق مالیہ منجملہ حقوق العباد میں وہ از قبیل معاملات ہیں جن کا یہاں ذکر نہیں ہے اس وقت صرف دیانات کا بیان ہے۔

اس میں بعض کوتاہیاں وقف کرنے والے کے طرف سے ہوتی ہیں، اور بعض منتظم اور متولی کی طرف سے اور بعض واقف کی اولاد سے بعض دوسرے اجنبی لوگوں کی طرف سے۔
چنانچہ واقف کی طرف سے ایک کوتاہی یہ ہوئی ہے کہ جس چیز کو وقف کیا ہے اس میں یہ بھی رعایت نہیں کی جاتی کہ حلال سے حاصل ہوئی ہے یا حرام سے محض تفاخر اور شہرت کیلئے نام کرنے کو یہ عمل کرتے ہیں حدیث میں صاف ارشاد ہے:

عَنْ عَبْدِ اللّٰهِ بْنِ مَسْعُوْدٍ عَنْ رَسُوْلِ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ قَالَ لَا يَكْسِبُ عَبْدٌ مَالَ حَرَامٍ فَيَتَصَدَّقُ مِنْهُ فَيُقْبَلُ مِنْهُ وَلَا يُنْفِقُ مِنْهُ فَيُبَارَكُ لَهُ فِيْهِ وَلَا يَتْرُكُ خَلْفَ ظَهْرِهٖ اِلَّا كَانَ زَادَهٗ اِلَى النَّارِ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَمْحُو السَّيِّئَ بِالسَّيِّئِ وَلٰكِنْ يَمْحُو السَّيِّئَ بِالْحَسَنِ اِنَّ الْخَبِيْثَ لَا يَمْحُو الْخَبِيْثَ رواہ احمد وکذا فی شرح السنۃ۔

"حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ کوئی بندہ ایسا نہیں جو مال حرام کما کر اس سے صدقہ کرے اور اس کا صدقہ قبول ہو جائے، اور کوئی بندہ ایسا نہیں کہ ایسے مال سے (اللہ کی راہ میں) خرچ کرے اور اس میں برکت ہو اور کوئی بندہ ایسا نہیں جو اپنے پیچھے مالِ حرام چھوڑ کر جائے، مگر وہ جہنم تک جانے کے لئے اس کا توشہ بن جاتا ہے، بلاشبہ اللہ تعالیٰ بری چیز کو بری چیز سے نہیں مٹاتا، لیکن بری چیز کو اچھی چیز سے مٹاتا ہے، گندی چیز گندی چیز کو نہیں مٹاتی"

بلکہ اگر حلال بھی ہو مگر ہو تفاخر کے لیئے وہ بھی غیر نافع وغیر مقبول ہے، ریار کی مذمت معلوم اور ظاہر ہے، خصوص مساجد بنانے والے اس بلا میں بکثرت مبتلا ہیں، یہی وجہ ہے کہ گو کسی جگہ مسجد قدیم موجود ہو مگر محتاج مرمت ہو لیکن اس کی مرمت نہ کریں گے۔ اور اس کو منہدم ہونے دیں گے اور اپنے نام کے لیئے ایک مسجد بنا دیں گے اور یہی راز ہے اس کا اکثر بستیوں میں بکثرت مسجدیں ویران ہیں۔

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ خود وقف ہی مقصود بالذات نہیں ہوتا بلکہ نیت صرف جائیداد کی حفاظت ہوتی ہے اور اسی کو مقصود بالذات قرار دیتے ہیں اور وقف کو اس کا ذریعہ بناتے ہیں۔

پس دین تو مقصود بالعرض ہے اور دنیا مقصود بالذات ہوئی جس کی نسبت ارشاد نبوی ہے۔

اِنَّمَا الاَعْمَالُ بِالنِّیَاتِ وَاِنَّمَا لامرِئٍ مَّا نَوٰی فَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ فَھِجْرَتُہٗ اِلَی اللّٰہِ وَرَسُوْلِہٖ وَمَنْ کَانَتْ ھِجْرَتُہٗ اِلٰی دُنْیَا یُصِیْبُھَا اَوِ امْرَأَۃٍ یَتَزَوَّجُھَا فَھِجْرَتُہٗ اِلٰی مَا ھَاجَرَ اِلَیْہِ رواہ الشیخان۔

"بلا شبہ تمام اعمال کا مدار نیتوں پر ہے اور بیشک ہر انسان کو وہی ملے گا جس کی اس نے نیت کی ہے، پس جس شخص کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول کی طرف ہو اس کی ہجرت اللہ اور اس کے رسول ہی کی طرف شمار ہوگی جس کی اس نے نیت کی"

دیکھیئے اس مہاجر نے ہجرت کی مگر نیت اس میں غرض دینوی کی تھی اس لئے ثواب سے محروم رہا اور اسی قبیل سے ہے بعض اوقات وقف علی الاولاد کرنا۔

اس سے یہ مقصود نہیں کہ وقف علی الاولاد صحیح نہیں یا کسی حالت میں موجب ثواب نہیں، صحیح تو ہر حال میں ہے خواہ نیت کچھ ہی ہو، جیسا کہ نماز کو اگر کوئی تمام شرائط وارکان کے ساتھ ادا کرے مگر نیت یہ ہو کہ لوگ ہم کو نمازی سمجھیں باجماع اہل علم نماز اس کی صحیح ہو جائے گی مگر ثواب سے محروم رہے گا، اسی طرح سے یہ وقف صحیح تو ہو ہی جائے گا۔ گو ثواب

بعض احوال میں نہ ہو اسی طرح بعض حالات میں ثواب بھی ملے گا جب مقصود اعانت اولاد کی دین کے لئے ہو۔

یعنی یہ غرض ہو کہ معاش سے مطمئن رہیں گے تو دین میں مشغول رہیں گے۔ اور کسی کے حق کا ضائع کرنا بھی مقصود نہ ہو اور اگر مقصود اولاد کی اعانت کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ یہ ہمیشہ صاحب ثروت وجاہ رہیں گے یا یہ کہ کسی سے قرض لے کر اندیشہ ہو اکہ اب جائیداد نیلام ہو جائے گی، اس وقت وقف کی پناہ لے کر صاحب حق کا حق ضائع کیا، تو نیکی برباد گناہ لازم ہو گا اور اس سے بڑھ کر ایک دوسرے مضمر قبیح غرض ہے کہ اس کا درجہ الحاد تک پہنچتا ہے وہ یہ کہ اصل میں مسئلہ میراث کو خلاف مصلحت و خلاف حکمت اور موجب ضرر اور نامناسب اعتقاد کرتا ہے اور صریح اعتراض کرنے کو بدنامی سمجھکر ایک شرعی عمل کی پناہ لیتا ہے یعنی وقف علی الاولاد کو ترجیح دیتا ہے۔ اور قواعد میراث کو موجب تجزیہ و تضییع جائیداد خیال کرتا ہے پس مبنی اس کی اس تجویز کا ایک حکم شرعی یعنی میراث کو نامناسب اعتقاد کرنا ہی تو اس کا بددینی ہونا ظاہر ہے اور شیطان کے کافر ہونے کا اصل سبب یہی ہے کہ اس نے ایک حکم منصوص کو خلاف حکمت قرار دیا۔ اور صرف ترک سجود ایک معصیت تھا نہ کہ کفر پس اس وقت بھی ایسے عقیدہ والوں کی تکفیر کرنے والے کو متعصب کہنا خود تعصب ہے۔ جس کے معنی باطل کی حمایت کرنا ہے نہ کہ دین کی پختگی اور تمسک شریعت کے ساتھ ..... اس وقت تصلب کا نام نافہمی سے تعصب رکھ لیا گیا ہے۔

وقف کا غلط مصرف میں استعمال

ایک کوتاہی تو یہ ہوتی ہے کہ اس کے مصارف میں بعض بدعات و معاصی کو بھی جزء بناتے ہیں کہ اس کی آمدنی سے فلاں مزار پر عرس کیا جاوے، جس کا مشتمل بر بدعات کثیرہ ہونا ظاہر ہے۔ یا یہ کہ اس کی آمدنی کا ایک حصہ متعارف انگریزی تعلیم میں صرف کیا جاوے جس کا متضمن و مورث قبائح و مفاسد عظیمہ ہونا مشاہد ہے اور بعض کوتاہیاں متولی و منتظم کی طرف سے ہوتی ہے مثلاً بعض وقف کی آمدنی کو اس کے مصارف میں نہیں صرف کرتے۔

بلکہ اپنی راستے کے موافق جائز و ناجائز سے قطع نظر کر کے جو چاہیں تصرف کرتے ہیں بعض اوقات اس کی شرائط کی مخالفت کی جاتی ہے۔ مثلاً اس میں واقف نے ایک جماعت کو مشیر قرار دیا۔ مگر جس کا زور ہوا وہی قابض ہو کر مستقل و مستبد بالرائے بن بیٹھا۔ اور دوسروں کو پوچھا بھی نہیں۔ اور اگر واقف نے حساب داخل کرنے کی شرط لکھدی اور کوئی دباؤ بھی پڑا تو فرضی حساب تصنیف کر لیا۔ بعض اوقات اپنی دنیوی اغراض کے لئے وقف کی مصلحتیں برباد کی جاتی ہیں مثلاً کوئی خوش معاملہ کاشتکار اس متولی کی دوسری مملوکہ زمین اس شرط پر رکھتا ہے کہ وقف زمین کا ارزاں ٹھیکہ اس کو دیا جاوے اور دوسرا اجنبی کاشتکار گراں کرایہ پر لیتا ہے۔ اور وہ بھی خوش معاملہ ہے۔ مگر اس کو دینے میں اس کی مملوکہ زمین چھوٹتی ہے۔ تو یہ شخص محض اپنے مصلحت کے لئے وقف کا نقصان کرتا ہے۔ بعض اوقات یہ منتظم تمام آمدنی اس کی خود ہی کھا جاتا ہے۔ پھر کبھی تو اول ہی سے نیت اس کی ادا کی نہیں ہوتی۔ اور کبھی اول میں نیت اچھی ہوتی ہے۔ مگر پھر ٹلتے ٹلتے تساہل ہو کر بے فکری ہو جاتی ہے اور وہ رقم ضائع ہو جاتی ہے .... بعض متولی منافع سے متجاوز ہو کر خود رقبہ وقف میں تصرف باطل کرتے ہیں۔ کبھی خوش نیتی سے مگر جہل احکام کے سبب اور کبھی بدنیتی سے اول اس طور سے مثلاً اس وقف کے اچھے دام ملتے ہیں۔ اور اس کی نیت یہ ہے کہ کہ ان داموں سے اور اچھی زمین لے کر اس کو وقف کر دیں گے۔ پھر کبھی کبھی وہ روپیہ بھی ضائع ہو جاتا ہے۔ اور وہ وقف مفت میں برباد ہوتا ہے یا اس کے عوض اس سے اچھی زمین ملتی ہے حالانکہ وقف کا مبادلہ بالکل باطل ہے البتہ جہاں اس کا انکار ہی نہ چلے تو بالکل چھوڑ دینے سے بدل ہی لے لینا کافی ہے۔ اور اس طور سے کہ اس پر مالکانہ تصرف کرنے لگے۔ حتیٰ کہ کبھی اس کو رہن یا بیع بھی کر دی۔ ہزاروں اوقاف ان خائنوں کے بدولت بے نام و بے نشان ہو گئے یا اگر معلوم بھی ہے تو ان کا استخلاص بوجہ رقم کثیر و وقت کثیر کے صرف پر موقوف ہونے کے دشوار ہو گیا ہے۔

افسوس ہے بعض مسلمانوں نے مسجدوں کے ساتھ استعمالاً و بیعاً گھروں کا سا معاملہ کر لیا ہے اور بعض کوتاہیاں اولاد واقف کی طرف سے ہوتی ہے اور وہ کوتاہیاں وہ سب

ہیں۔ جو ابھی منتظم کی کوتاہیوں کی فہرست میں مذکور ہوئیں۔ اور بعض ان سے زائد بھی ہیں۔ اور زائد پر قادر ہونے کا سبب یہ ہو جاتا ہے کہ عرفاً اولاد واقف کو عام لوگ بہ نسبت اجنبی متولی کے وقف میں تصرف کرنے کا زیادہ مستحق سمجھتے ہیں مثلاً لوگوں کو ایسے قبرستان میں دفن کرنے سے روکنا یا کسی کو اپنے باپ دادا کی بنائی ہوئی مسجد میں نہ آنے دینا یا اس کی شکستگی کی حالت میں خود توبوجہ عدم استطاعت کے اس کی مرمت نہ کر سکنا۔ یا بے پروائی کے سبب نہ کرنا۔ اور اوروں کو بوجہ عار اور سبکی کے اجازت نہ دینا حتیٰ کہ وہ اسی طرح اول منہدم ہو جاتی ہے پھر یہی لوگ اس کا ملبہ بیچ کھاتے ہیں حتیٰ کہ وہ منہدم ہو جاتی ہے پھر اس کی زمین بیچ لیتے ہیں خواہ اس میں مجالس فسق ہونے یا کوئی غیر مسلم اس میں گھر بنا کر یا خانہ تک پھر اکرے جو عار اس فضیحت کا سبب ہوئی ہے، اسی کے حق میں کہا جا سکتا ہے

اختار النار علی العار

عار کے مقابلہ میں آگ کو اختیار کر لیا

بعض کوتاہیاں عام اجنبی لوگوں کی طرف سے ہوتی ہیں مثلاً ایک یہ کہ مسجد میں کسی ظالم کا تصرف دیکھ کر یہ رائے گھڑ لینا اور اپنی طرف سے فتویٰ دے لینا کہ اب یہ مسجد ہی نہیں رہی، اس میں ویسا ثواب نہیں ہوگا، یا یہ کہ اس میں اذن عام نہ رہا اس لئے یہاں جمعہ درست نہیں، اور یہ تجویز تراش کر دوسری مسجد کے بنانے کا سامان شروع کر دینا جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یا تو دوسری مسجد آباد نہیں ہوتی، یا پہلی ویران ہو جاتی ہے اور آئے دن کے جھگڑے رہتے ہیں وہ الگ، خود یہ مسئلہ ہی سمجھنا غلط ہے۔ کہ ظالم کے تصرف سے وہ مسجد نہیں رہی یا اذن عام باطل ہو گیا۔ مسجد مسجد ہی ہے اور وہ ظلم اس کا مخلِ اذن عام نہیں ہے۔ اذن عام کا شرط ہونا ارض مملوکہ میں ہے نہ کہ ارض موقوفہ میں، وہاں شریعت کا اذن عام ہے جس کو کسی کا ظلم زائل نہیں کر سکتا، بجائے اس مسئلہ تراشنے کے اس ظلم کو بشرط قدرت روکنا چاہیئے۔ اور وقف کی حفاظت چاہیئے اور مثلاً ایک یہ کہ وقف کو برباد ہوتے ہوئے . . . . دیکھتے ہیں۔ اور وجود قدرت کا التفات نہیں کرتے، کہتے ہیں کہ ہم کو کیا غرض پڑی ہے صاحبو! کیا دین بھی ایسی چیز ہے کہ جس کی نسبت

بی غرض کا دعویٰ کیا جاوے۔ ہم کو تو بہت بڑی غرض ہر وقت ثواب کی پڑی ہے۔ ہاں قدرت نہ ہونے پر مجبوری ہے اور مثلاً ایک یہ کہ بعض لوگ جو مصرف اس وقف کے نہیں ہیں وہ بھی اس سے منتفع ہوتے ہیں۔ مثلاً ایک مسافر خانہ خاص مساکین کے لئے بنایا گیا مگر اس میں اغنیاء امراء بھی بوجہ تجمل کے قیام کرتے ہیں جو کسی طرح جائز نہیں نیز ہر طبقہ کی طبقات مذکورین سے اور بھی کوتاہیاں ہیں مگر نمونہ کے لئے انشاء اللہ اس قدر بھی کافی ہے ان ہی محذورات کو دیکھ کر بعض دانشمندوں کی رائے یہ ہونے لگی ہے کہ اکثر اوقات ایسے اوقاف سے تو یہی بہتر ہے کہ بجائے وقف کرنے کے اس جائیداد وغیرہ کو بیچ کر اس کے دام اپنے ہاتھ سے کسی نیک کام میں صرف کر دے لیکن یہ ایک رائی ہے جس کا منشاء ایک تعلق طبعی ہے کوئی حکم شرعی نہیں خائنوں کی خیانت وقف کے مرغوب فیہ ہونے میں مخل نہیں ہو سکتی واقف کو بوجہ نیت کے بقاء ذات وقف تک باقیات باقیات صالحات کا ثواب ملتا رہے گا۔ سے انتفاع منقطع ہو جائے۔

ساری جائیداد وقف کر دینا

ایک کوتاہی اور ہے کہ رنگ اس کا عبادت ہے۔ مگر اس کے آثار پر نظر کر کے شریعت نے اس کو پسند نہیں کیا، یہ ہے کہ کوئی شخص جس کا قلب متحمل تنگی و تہیدستی کا نہ ہو اپنی تمام جائیداد یا متاع کو وقف کر دے۔ بعض صحابہؓ نے جوش سخاوت میں ایسا ارادہ کیا بھی تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا چنانچہ حدیث میں امسک علیک بعض مالک (اپنے پاس اپنا کچھ مال روک رکھو) مصرح ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ بعض اوقات ناداری میں وساوس پریشان کرتے ہیں کہ تو نے سب دیدیا اگر کوئی حاجت پیش آئی اور آمدنی کی کوئی سبیل نہیں، تو کہاں سے کام چلے گا۔ ان وساوس کا بعض اوقات اس قدر ہجوم ہوتا ہے کہ نماز وغیرہ میں خرابی پڑنے لگتی ہے بعض اوقات نیت ڈانواڈول ہو کر غیروں کے مال پر نظر پڑنے لگتی ہے۔ بعض اوقات حرام ذرائع کا قصد کرنے لگتا ہے۔ چوری کا جھوٹے مقدمے جھوٹی گواہی کا، کسی سے قرض لے کر مار لینے کا ونحو ذالک

اور اگر ان وساوس کے بعد اتفاق سے کوئی کلفت و تنگی بھی پیش آ گئی تو وہ وساوس

اس وقت عمل کی صورت اختیار کرتے ہیں۔ اور معاصی کا صدور ہونا شروع ہوتا ہے جس سے آخرت کا خسارا تو ظاہر ہی ہے۔ بعض اوقات کسی جرم قانونی کا مرتکب ہوکر گرفتار بلا ہونا بھی ہوتا ہے یہ دنیا کی مغفرت ہوئی تو وقف کرنے سے اتنی خیر نصیب نہ ہوئی تھی جس قدر اس سے شر پیدا ہوا۔ تو شریعت مطہرہ نے جو اس سے روکا ہے تو واقع میں خیر سے نہیں روکا۔ بلکہ ان شرور سے (جن پر شریعت کی نظر پڑی) وہ ہماری نظر سے مستور ہے۔ روکا ہے۔ حق تعالیٰ کا ارشاد اپنے عموم سے ان صورتوں کو بھی شامل ہے۔ عَسٰی ان تحبّوا شیئًا وّھو شرّ لکم واللہ یعلم وانتم لا تعلمون۔

تجربہ سے معلوم ہوا کہ اصلی مفلس کو افلاس سے اس قدر پریشانی نہیں ہوتی جس قدر فقیر بعد الغنیٰ کو کیوں کہ وہ پہلے سے اس کا خوگر ہوتا ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے وَارْحَمُوْا ثلثۃ وعَدَّ منھم غَنِیُّ قوم افتقر (تین آدمیوں پر رحم کرو) اور ان میں سے ایک اس شخص کو بھی شمار کیا جو" کسی قوم میں مالدار آدمی تھا، بعد میں فقیر ہوگیا)

ہمارے حضرت مرشد رحمۃ اللہ علیہ سے ایک صالحہ بی بی نے اپنی جائیداد کی نسبت ایسی ہی رائے ظاہر کرکے مشورہ طلب کیا۔ حضرتؒ نے فرمایا۔ بھائی ایسا مت کرنا، آدمی کو اپنے نفس کی تسلّی کے لئے بھی کچھ رکھنا ضروری ہے۔ اور اسی نکتہ کے سبب حضرتؒ ضعیف القلوب و مالوف بالاسباب لوگوں کے لئے اسباب و تعلقات مثل تجارت و نوکری وغیرہ کے ترک کو پسند نہیں فرماتے تھے۔ بعض اوقات یہ مفاسد مذکورہ اس درجہ پر نہیں پہنچتے، مگر اتنا ہوتا ہے وقف کرکے پچھتاتا ہے کہ میں نے یہ غلطی و ناعاقبت اندیشی کی، تو اس خیر کا کیا ثواب مل سکتا ہے جس کو کرکے پچھتاوے اور افسوس کرے؟ البتہ جو خود بھی قلب قوی رکھتا ہو اور اس کے اہل و عیال یا تو ہوں ہی نہیں۔ یا اگر ہوں تو وہ بھی اس شخص کے ساتھ اس میں متفق اور راضی ہوں اور اس کو بھی قرآئن سے شہادت قلب مظنون ہو کہ یہ پھر بھی پریشان نہ ہوں گے اور پریشان نہ کریں گے۔ ایسی حالات میں تمام سرمایہ کا وقف "کر دینے کا بھی کوئی مضائقہ نہیں بلکہ عزیمت اور ہمت کی بات ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جناب صدیق اکبرؓ حضور پرنور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت مبارک میں تمام نقیر و قطمیر جو کچھ ان کی

ملک میں تھا۔ سب لے آئے۔ اور آپؐ نے اس کو بطیب خاطر جائز رکھا۔ اور اس عمل پر مدح میں وحی نازل ہوئی وَسَیُجَنَّبُهَا الْاَتْقَی الَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یَتَزَکّٰی الآیۃ۔ (جہنم سے بچالیا جائے گا، اس متقی ترین شخص کو جو اپنا مال دیتا ہے پاک صاف ہوتے ہوئے) ورنہ جس کو یہ قوت نہ ہو اس کے لئے یہ مشورہ وارد ہے۔ افضل الصدقۃ ما کان عن ظہر غنیً اوکما قال (افضل صدقہ وہ ہے جو اپنے پیچھے مالداری چھوڑ جائے) اور قوی کے لئے یہ وارد ہے (اَنْ تَصَدَّقَ وَاَنْتَ صَحِیْحٌ شَحِیْحٌ تَخْشَی الْفَقْرَ وَتَاْمُلُ الْغِنٰی او مثل ذالک (تم اس حالت میں صدقہ کرو کہ تندرست ہو، مال کی رغبت کرنے والے ہو، فقر سے ڈرتے اور مالداری کی امید رکھتے ہو)

سُبْحَانَ اللّٰہ! شریعت مطہرہ کیا عادل ملت ہے؟ فضل اللہ تعالیٰ من جاءنا بھا بیضاء نقیۃ وغراء سویۃ زکیۃ

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کبھی آدمی رنج وغیرہ کے سبب وارثوں کو محروم کرنا چاہتے ہیں اور اسی غرض سے اپنا متروکہ وقف کر دیتے ہیں، تاکہ وارثوں کو نہ ملے۔ سو سمجھ لینا چاہئے کہ ورثہ کو ضرر پہنچانا جو کہ اس شخص سے صادر ہولے خود معصیت ہے۔ قرآن مجید میں غَیْرَ مُضَآرٍّ[1] کی قید موجود ہے۔ حدیث میں ہے۔

اِنَّ الرَّجُلَ لَیَعْمَلُ وَالْمَرْاَۃُ بِطَاعَۃِ اللّٰہِ سِتِّیْنَ سَنَۃً ثُمَّ یَحْضُرُھُمَا الْمَوْتُ فَیُضَارَّانِ فِی الْوَصِیَّۃِ فَیَجِبُ لَھُمَا النَّارُ وکذا فِی الْمِشْکوٰۃ۔

"بعض مرتبہ مرد وعورت اللہ کی ساٹھ سال تک اللہ کی عبادت کرتے ہیں، پھر ان کی موت قریب آتی ہے تو وہ وصیت میں اپنے وارثوں کو نقصان پہنچاتے ہیں تو ان پر دوزخ کی آگ لازم ہوجاتی ہے"

ایک اور حدیث میں ہے

"من قطع میراث وارثہ قطع اللہ میراثہ من الجنۃ یوم القیامۃ"

جو شخص اپنے وارث کی میراث قطع کرے، اللہ قیامت کے دن جنت سے اس

---

[1] یہ الفاظ قرآن مجید میں اس جگہ آئے ہیں جہاں وصیت کے احکام ہیں، اور اس کا مطلب یہ ہے کہ وصیت کرنا جائز تو ہے، لیکن شرط یہ ہے کہ اس وصیت سے وارثوں کو محروم کرنا یا انہیں نقصان پہنچانا مقصود نہ ہو۔ محمد تقی عثمانی۔

کی میراث قطع کر دے گا۔"

بعض آدمی ضرر پہنچانا تو نہیں چاہتے مگر یہ سمجھتے ہیں کہ وقف کرنے میں تو ثواب ہوگا۔ اور وارثوں کے لئے چھوڑ جانے میں کیا ثواب ہے؟ سو ایسا سمجھنا خود غلط ہے، ثواب صرف وقف میں منحصر نہیں، بلکہ وارثوں کے لئے ترکہ چھوڑ جانے میں بھی اجر اور فضیلت ہیں ہے:۔

"انک ان تذر ورثتک اغنیاء خیرٌ من ان تذرھم عالۃً یتکففون الناس۔"

کذا فی المشکوٰۃ

"بلا شبہ اگر تم اپنے وارثوں کو مالدار چھوڑ کر جاؤ تو یہ بہتر ہے اس سے کہ تم انہیں محتاج چھوڑ کر جاؤ، جو لوگوں کے دست نگر ہوں"

غرض بجائے خود وقف بھی موجب ثواب ہے، اور وارثوں کے لئے چھوڑ جانا بھی موجب ثواب ہے۔ اب ایک دوسرے پر ترجیح دینا۔ یا کسی خاص نسبت سے دونوں پر جائیداد کو تقسیم کر دینا یہ محتاج ہے رجوع کا قواعد شرعیہ اور ماہران شریعت سے استفسار کرنے کی طرف۔

وقف کو استعمال کرنے والوں کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی غیر وقف کرنے والوں کی اور یہ بہت عام ہے۔ یہ ہے کہ وقف میں ہر قسم کے تصرفات کو جائز سمجھتے ہیں۔ اور کوئی منع کرتا ہے تو کہتا ہے کہ کیا تمہاری ملک ہے؟۔ یہاں تک کہ اکثر دیندار لوگ تک اس میں مبتلا ہے کہ مسجد کے لوٹے بدھنے میں مریض کے لئے پانی پڑھوا کر لے جاتے ہیں۔ پھر بعض دفعہ وہ کئی کئی روز تک گھر ہی میں رکھا رہتا ہے۔ اور اگر فوراً بھی واپس آجاوے تب بھی خود لیجانا ہی جائز نہیں کیونکہ جس نے مسجد میں رکھا ہی اس کی نیت صرف مسجد میں کام لینے کی ہے۔ نہ کہ گھر لے جانے کی اور خلاف شرط معطی کے جو کہ اس کی نیت سے متعین ہے اور وہ نیت قرآئن سے معلوم ہے اس سے کام لینا جائز نہیں اور مانع سے یہ کہنا کہ کیا تمہاری ملک ہے؟ بالکل لغو عذر ہے کیا منع کرنا اسی پر موقوف ہے کہ وہ دوسرے ہی کی ملک ہو۔ قواعد شریعت نے جس طرح ملک غیر

ہونے کو سبب منع قرار دیا ہے۔ اسی طرح ما فیہ الاستعمال غیر ما وقف لہ، ہونا بھی شرعاً سبب منع ٹھہرایا گیا ہے۔ کیونکہ اصل حق منع شرع کو ہے، یہی وجہ ہے کہ ملک غیر ہونا بھی وہاں سبب منع ہے۔ جہاں اس کو شرع نے سبب منع قرار دیا ہے ورنہ نہیں۔ کحالۃ المضطر فی مخمصۃ حیث یباح بل یفرض تناول مال الغیر اذا لم یجد غیرہ وان ضمنہ اسی میں داخل ہے وہ بے احتیاطی بعض طلباء کی مسجد کے لوٹے پنکھے اٹھا اٹھا کر حجروں میں رکھ لیتے ہیں۔ یا بعض آدمی مسجد کے کلوخ استنجے کے لئے یا گرم پانی مسجد کے سقادہ سے وضو کے لئے گھر لے جاتے ہیں، یا بعض آدمی مسجد کا فرش یا شامیانہ لینے یا کسی دوسرے مدرسہ و انجمن و مسجد کی ضرورت میں خلاف نیت معطی کچھ اینٹ چونہ دوسری مسجد میں یہ سمجھ کر کہ مسجد مسجد سب ایک ہے۔ لگا دیتے ہیں یہ سب اسی فہرست میں داخل ہے۔ اسی طرح مدارس میں جو اشیاء خاص غریب طلباء کے لئے آتی ہیں۔ اس میں سے اغنیاء کو لینا یہ بھی اسی قبیل سے ہے۔

کفارہ مالیہ یمین

اس میں ایک بڑی کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگوں کا یہی گمان ہے کہ جب قسم ٹوٹے پس کفارہ میں تین روزہ رکھ لینا کافی ہے۔ ان کو یہ خبر ہی نہیں کہ بعض حالتوں میں روزے.... کافی نہیں ہوتے۔ کسی دوسرے طریقے کی ضرورت ہے۔ سو اس میں تفصیل یہ ہے کہ جب قسم ٹوٹنے کے بعد ارادہ ادائے کفارہ کا کرے اس وقت دیکھنا چاہیئے کہ اس شخص کے پاس قدر کفاف کو مستثنیٰ کر کے آیا اتنی گنجائش ہے یا نہیں کہ دس مسکینوں کو دو وقت شکم سیر کھانا کھلا سکے یا ان دس مسکینوں کو فی مسکین بقدر ایک حصہ صدقہ فطر کے حسب شرائط مذکورہ کتب فقہ غلہ یا اس کی قیمت دے سکے۔ یا دس مسکینوں کو اس طرح کپڑا دے سکے کہ فی مسکین متوسط قیمت کا کپڑا بقدر ایک جوڑا کے دے سکے۔ جس کی تفاصیل جزئیات کتب فقہ میں مذکور ہے۔

پس اگر اس قدر گنجائش رکھتا ہو تو اس کا کفارہ میں روزہ رکھنا کافی نہیں ہوگا۔ بلکہ ان طریقوں میں سے ایک طریقہ اختیار کرنا ضروری ہوگا۔ تب کفارہ ادا ہوگا۔ اور اگر گنجائش نہیں ہے تب البتہ تین روزے رکھ لینا درست ہوگا۔ اور اس میں قدر کفاف سے زائد ہونا کفارہ مالیہ کے

وجوب کے لئے کافی ہے۔ صاحب زکوٰۃ ہونا شرط نہیں۔ اور قدر کفاف یہ ہے۔ رہنے کا گھر پہننے کا کپڑا اور ایک دن کی خوراک (کذا فی الحاشیۃ الشامیۃ عن الخانیہ)

اور حنفی مذہب میں اس گنجائش کو عزم ادا ر کفارہ کے وقت دیکھا جاوے گا۔ قسم ٹوٹنے کے وقت نہ دیکھا جاوے گا۔ پس اگر حنث کے وقت گنجائش ہو اور ادا کے وقت گنجائش نہ ہو تو روزہ سے کفارہ ادا ہو جاوے گا۔ اور اگر حنث کے وقت گنجائش نہ ہو اور ادا کے وقت گنجائش ہو تو کفارہ مالیہ دینا پڑے گا۔ کذا فی الشامیۃ عن الزیلعی

اس تفصیل سے معلوم ہو گیا ہو گا کہ ایسے لوگ بہت کم نکلیں گے جن کے لئے روزہ کافی ہو جاوے کیونکہ غربا ءمیں اسی کثرت سے ہیں جن کے پاس کفاف بالتفسیر المذکور سے زائد بقدر خوراک و پوشاک دس مسکینوں کے موجود ہے میں کتنی بڑی کوتاہی ہے کہ ایک طرف سے سب نے روزہ ہی کو کافی سمجھ لیا ہے

کفارہ کے احکام و شرائط کی تحقیق نہ کرنا

(۲) ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو لوگ کفارہ مالیہ ادا بھی کرتے ہیں وہ بھی اس کے احکام شرائط کی تحقیق و رعایت نہیں کرتے چنانچہ بعض مطلق مسکین کو اس کا مصرف سمجھتے ہیں حالانکہ اس کا مصرف زکوٰۃ ہونا شرط ہے۔ (کذا فی ردالمحتار)

بعضے ایک مسکین کو دو تین حصے ایک تاریخ میں دیدیتے ہیں۔ حالانکہ یہ غلط ہے۔ اگر ایسا کیا تو ایک ہی حصہ ادا ہو گا (کذا فی الشامیۃ)

لیکن اس غلطی کے معلوم ہونے کے وقت اس مسکین سے زائد کا واپس کرلینا جائز نہ ہو گا اس کو جو کچھ دے دیا وہ اس کی ملک ہو گیا (کذا فی الشامیۃ عن الفتح)

اگر ایک ہی مسکین کو زیادہ نفع پہنچانا مقصود ہو۔ تو اس کو مختلف تاریخوں میں ایک ایک حصہ ہر روز دیدے۔ یہ درست ہے (کذا فی الشامیۃ)

اور یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ تاریخ غروب آفتاب سے بدل جاتی ہی پس اگر ایک مسکین کو دو حصوں کا غلہ یا قیمت دینا ہو اور ایک حصہ دن میں دیدیا اور ایک حصہ بعد غروب آفتاب کے تو یوں سمجھا جاوے گا کہ دو تاریخوں میں دیا۔ اور کافی ہو جاوے گا۔ اور اگر ایک حصہ

غروب آفتاب کے بعد دیا اور دوسرا حصہ اس شب کے بعد دن میں دیدیا۔ تو یوں سمجھا جاوے گا کہ ایک ہی تاریخ میں دونوں حصے دیئے اس لئے ایک ہی حصہ ادا ہوگا۔

بعضے بے خبری سے ایک حصہ دو مسکینوں میں آدھا آدھا تقسیم کردیتے ہیں۔ اور صدقہ فطر پر قیاس کرتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیئے کہ وہ حصہ ادا نہ ہوگا (کذا فی الشامیۃ عن الجوھرۃ)

بے خبری میں جو کوتاہیاں ہوئیں ان کا تدارک ضروری ہے

(۳) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بے خبری کے زمانہ میں جو کوتاہیاں ہوگئیں ان کو بلا تدارک معاف سمجھ جاتے ہیں۔ یا صرف توبہ کو موجب تدارک سمجھتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہیئے کہ یہ بدون ادا کیئے ہوئے ساقط نہ ہوگا حتیٰ کہ موت سے بھی ساقط نہیں ہوتا (کذا فی الشامیۃ عن القھستانی)

پس اس بناء پر جب ان کوتاہیوں کی اطلاع ہو ان کا تدارک کرے اور جس قدر تاخیر کرے گا گنہگار ہوگا (کذا فی الشامیۃ عن القھستانی ایضاً)

اور اگر قبل تدارک کے موت آجاوے تو مرنے کے وقت اس کے متعلق وصیت کریں۔

"متعدد قسموں کے لئے ایک کفارہ کافی نہیں"

(۴) ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے کئی کئی قسموں کے بعد ایک کفارہ کو کافی سمجھ لیتے ہیں حالانکہ ہر قسم کا جدا کفارہ ہے۔ بلکہ شیخینؒ کے نزدیک متعدد یمین میں یہ تعدد کفارہ کا ایسا قوی ہے کہ ایک تاریخ میں ایک مسکین کو دو قسموں کی طرف سے دو حصہ دینا بھی درست نہیں وہ ایک ہی حصہ سمجھا جاوے گا (کذا فی الشامیۃ عن کافی الحاکم)

پس اس بناء پر اگر دو قسمیں اس کی ٹوٹی ہوں تو اگر ایک تاریخ میں دونوں کفارے ادا کرنا چاہیئے۔ تو ایک کفارہ کے لئے جدا دس مسکین تجویز کرے۔ اور دوسرے کفارے کے لئے جدا دس مسکین اور اگر بیس مسکینوں سے کم کو زیادہ نفع پہنچانا چاہے۔ تو تاریخیں متفرق کردے جیسا کہ اوپر بیان ہوا۔

مدرسہ یا انجمن میں کفارہ ادا ہونے کا طریقہ

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ کفارہ یمین عہ کا داموں سے حساب کر کے یا حساب کرا کے کسی مدرسہ اسلامیہ میں اہل مدرسہ کو سپرد کر دیتے ہیں۔ اور اطلاع نہیں کرتے کہ یہ کفارہ یمین ہے۔ جب ان لوگوں کو اس کی خبر ہی نہ ہو تو وہ کسی طرح رعایت اس کے احکام کی نہیں کر سکتے۔ اور اس لئے نہیں کرتے اور اس صورت میں وہ کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اور حق واجب اس شخص کے ذمہ رہتا ہے۔ تو دیا بھی اور ادا نہ ہوا اس لئے نہایت ضروری ہے کہ اصل مدرسہ کو تصریحاً اس کی اطلاع دے دیا کریں۔

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ کسی انجمن وغیرہ میں ایسے کارکن کے سپرد کرتے ہیں۔ جو بیچارہ خود ہی ان احکام سے بے خبر ہے یا اگر باخبر ہے۔ تو قلت تدین کے سبب اس پہ وثوق نہیں کہ وہ ان احکام کی رعایت کرے گا اور اس لئے وہ شخص خواہ بے علمی سے یا قلت مبالاۃ یعنی بے پروائی سے اپنی رائے یا خواہش کے موافق اس رقم یا جنس کو صرف کرتا ہے۔ اور اس دینے والے کا کفارہ ادا نہیں ہوتا۔ اور خود یہ کارکن بھی وبال میں مبتلا رہتا ہے۔ اس لئے بے حد ضروری ہے کہ ایسے جاہل بیباک آدمی کو ہرگز ایسی چیز سپرد نہ کریں بلکہ جہاں یہ احتمال ہو اور اس کے ساتھ ہی مدرسہ یا انجمن میں پہنچانا بھی ہو تو اس کی بہتر صورت یہ ہے کہ وہاں جا کر مستحقین طلباء یا یتامیٰ کو جو کہ مصارف زکوٰۃ ہو تحقیق و انتخاب کر کے اپنے ہاتھ سے حسب احکام شرعیہ تقسیم کر دے اور مدرسہ اور انجمن کے حساب میں جمع کرا دے تاکہ وہ اپنی اعانت کے وقت اسکو محسوب کر سکیں اور طور پر مدرسہ و انجمن کو مدد پہنچ جاوے۔

اگر کسی کے جبر و اکراہ سے قسم توڑ دی اس کا کفارہ بھی واجب ہے

بعض عوام ایک عجیب کوتاہی میں مبتلا ہیں کہ کسی کے مجبور کرنے پر اگر قسم توڑ دیں تو اپنے اوپر کفارہ واجب نہیں سمجھتے یا اس جابر کے کہنے پر کہ میرے ذمہ گناہ رہا یا میں کفارہ دیدوں گا

عہ قسم ۱۲

اپنے کو سبکدوش سمجھتے ہیں یا اس کے روزہ رکھدینے کو کافی سمجھتے ہیں سو یہ سب غلطیاں ہیں جو قسم توڑے گا۔ اس پر کفارہ واجب ہوگا۔ پھر اگر یہ حانث کفارہ مالیہ پر قادر نہیں، تو خود ہی اس کو تین روزے رکھنے پڑیں گے اور اگر قادر ہے تو واجب اسی کے ذمہ ہوگا۔ اس جابر کے کہنے سے بے فکر ہونا درست نہیں۔ بلکہ اگر اس جابر نے ادا بھی کیا۔ لیکن اس حانث نے کہا تھا جب بھی ادا نہیں ہوا۔ البتہ اگر اس حانث نے اس کو وکیل بنا دیا۔ اور اس نے ادا کر دیا صرف اس صورۃ خاصہ میں ادا ہو جاوے گا پس عوام کا تمام تر اس تفصیل سے غض بصر کرنا بڑی غلطی ہے۔ ھذا ما حضرنی الآن ولعل عند غیری اسبغ من ھذا البیان

تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور

احقر اشرف علی تھانوی عفی عنہ عرض کرتا ہے کہ میرے مضامین مندرجہ رسالہ ھذا کی نسبت بعض ناظرین نے تقریراً و تحریراً عام لوگوں کے سمجھ میں نہ آنے کی بعض اوقات شکایت ظاہر کی بعد تکرر سماع کے مجھ کو بھی کسی کسی وقت اس کی تلافی کا خیال ہوتا تھا۔ یہ تو مجھ سے ہو نہ سکا اور مناسب بھی معلوم نہ ہوا کہ مضمون کے لکھنے کا طرز بدل دوں کہ اس میں تکلف بھی زائد تھا۔ اور اہل علم کو بھی اس سے انس نہ رہتا۔ یہ سہل اور مصلحت معلوم ہوا کہ اول اپنے طرز سابق میں بیساختہ مضمون لکھ لیا جایا کرے۔ پھر اگر کسی حصہ یا پورے مضمون میں ضرورت ہوئی تو اسی کی عبارت کو دوسرے عنوان سے خوب سلیس کر دیا جایا کرے اس تجویز کے شروع ہونے میں بھی اتفاق سے دیر ہوتی رہی مگر آج اس کے نفاذ اور آغاز کا بتوفیقہ تعالیٰ وقت آگیا۔ چنانچہ مضمون کفارہ مالیہ یمین مذکور بالا کو سہل عبارت میں اعادہ کرتا ہوں اور سہولت ہی کے لئے معلوم ہوتا ہے کہ مضمون کو مسلسل نہ رکھا جاوے گا۔ بلکہ اس کے چھوٹے چھوٹے جدا جدا ٹکڑے کر دیا جایا کرینگے بعنوان مسئلہ یا اور جو عنوان مضمون کے مناسب ہو۔

خلاصہ مضمون سابق

اعادہ بغرض تسہیل بعنوان مسائل

مسئلہ: جس شخص کی قسم ٹوٹ جاوے۔ یا وہ توڑ دے۔ تو ہر شخص کو کفارہ میں تین روزہ رکھ لینا کافی نہیں بلکہ جس کے پاس ضروری گذر سے زائد اتنی گنجائش ہو کہ وہ دس مسکینوں کو دو وقت پیٹ بھر متوسط معمولی کھانا کھلا سکے۔ یا دس مسکینوں کو فی مسکین اتنا اناج دے سکے جتنا عید کے دن صدقۂ فطر میں دیا جاتا ہے۔ یا دس مسکینوں کو فی مسکین معمولی قیمت کا جوڑا مثلاً کرتہ پاجامہ یا چادر لنگی یا کرتہ لنگی یا چادر پاجامہ دے سکے۔ تو اس کا اس وقت ادا ہوگا جب اس طرح دس مسکینوں کو کھانا یا کپڑا یا ان کے دام دے۔

اور ضروری گذر کا مطلب یہ ہے کہ رہنے کا گھر پہننے کا کپڑا اور ایک دن کا کھانا اگرچہ غریب ہی ہو۔ اور زکوٰۃ اس پر واجب نہ ہو۔ اور جس کے پاس اتنی گنجائش بھی نہ ہو اس کا کفارہ البتہ تین روزے پے در پے رکھنے سے ادا ہو جاوے گا۔

اور اس سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بہت کم لوگ ایسے ہیں جن کا کفارہ روزے سے ادا ہوتا ہو۔ کیونکہ اتنی گنجائش والے تو کثرت سے ہیں۔

مسئلہ: یہ گنجائش ہونا یا نہ ہونا اس وقت دیکھا جاوے گا جب کفارہ ادا کرنے کا قصد ہو۔ قسم ٹوٹ جانے کے وقت نہ دیکھا جاوے گا۔ سو اگر قسم توڑنے کے وقت گنجائش نہ تھی اور ادا کرنے کے وقت گنجائش ہو گئی تو دس مسکینوں کو بطریق مذکور کھانا یا غلہ یا کپڑا یا دام دینا ہوگا اور اگر قسم توڑنے کے وقت گنجائش تھی پھر ادا کے وقت گنجائش نہ رہی تو روزے ہی سے کفارہ ادا ہو جاوے گا۔

مسئلہ: ہر مسکین کو دینا کفارہ میں درست نہیں۔ بلکہ وہ مسکین ایسا ہو سید اور بنی ہاشم میں سے نہ ہو۔ اور اسی دینے والے کا باپ، دادا، نانا، ماں، دادی، نانی، بیٹا، پوتا، بیٹی پوتی، نواسی، نواسہ، میاں بی بی نہ ہو۔ البتہ بیٹے کی بی بی کو یا داماد کو دینا درست ہے۔

مسئلہ ایک مسکین کو ایک تاریخ میں دو تین حصے دینا درست نہیں اگر ایک ہی مسکین کے

ساتھ زیادہ احسان کرنا منظور ہو تو اس کو ہر روز ایک حصہ دے دیا کرے اور تاریخ شریعت میں دن چھپنے سے شروع ہو کر اگلے دن کے چھپنے پر ختم ہوتی ہے۔

مسئلہ: اگر غلطی سے کوئی کفارہ ادا نہ ہوا تو توبہ کافی نہیں بلکہ پھر یاد کر کے ادا کرنا چاہئے اور بلا عذر دیر کرنے سے گناہ ہوگا۔

"اگر زندگی میں کفارہ ادا نہ کر سکا تو کیا کرے"

مسئلہ: اگر کفارہ ادا نہ کرنے پایا تھا کہ موت آگئی۔ تو اس کے ذمہ واجب ہے کہ وارثوں کو وصیت کرے کہ وہ اس کے ترکہ سے اس کو ادا کریں۔ اور وارثوں پر اس کا ادا کرنا اس شرط سے واجب ہے کہ وہ اس میت کے ترکہ کے تہائی حصہ سے نکل سکے۔ مثلاً اس کے ذمہ چار قسموں کا کفارہ واجب تھا اور وہ پانچ روپے کے غلہ سے ادا ہو سکتا ہے اور میت کا ترکہ اتنا ہے کہ اسکی تجہیز و تکفین کر کے اور قرضہ مہر وغیرہ دے کر پندرہ روپیہ یا زائد بچتے ہیں تو اس صورت میں اس کی وصیت کا پورا کرنا ان کے ذمہ واجب ہوگا۔ اور جو مثلاً ساڑھے سات روپے بچتے ہیں تو صرف دو کفاروں کا ادا کرنا اڑھائی روپے سے واجب ہوگا اور اگر مثلاً تین ہی روپے بچتے ہیں تو ایک کفارے کا بھی ادا کرنا واجب نہ ہوگا۔

اسی طرح نرخ کے اختلاف سے کفارہ کی قیمت کی کمی بیشی کا حساب دیکھ لیا جاوے۔ البتہ ایسی صورت میں اگر کوئی وارث بالغ اپنے حصے ترکہ سے یا اپنے سرمایہ سے ادا کر دے تو بڑا ثواب ہے۔ لیکن وارث کے روزہ رکھنے سے کفارہ ادا نہ ہوگا۔

اگر میت کے پاس نقد نہ ہو لیکن غلہ یا کپڑا سلا ہوا یا بے سلا تہائی ترکہ کے اندر اتنا ہو کہ وہ دس مسکینوں کو فی مسکین بقدر صدقہ فطر یا ایک جوڑا تقسیم ہو سکے تب بھی کفارہ دینے کی وصیت کو پورا کرنا واجب ہے۔

"اگر متعدد قسمیں ٹوٹیں تو ایک کفارہ کافی نہیں"

مسئلہ: اگر دو قسمیں ٹوٹیں تو کفارہ (۲) دینا واجب ہے۔ اور امام ابو حنیفہؒ اور

امام ابو یوسف رح کے نزدیک اگر ایک تاریخ میں ایک مسکین کو دونوں کفاروں کا ایک ایک حصہ دینا چاہے تو درست نہیں اگر ایسا کیا تو ایک ہی حصہ ادا ہوگا دوسرا اس کے ذمہ رہے گا۔ جیسا ایک قسم کے کفارہ کے دو حصے ایک مسکین کو ایک تاریخ میں دینا درست نہیں۔ البتہ اگر ایک تاریخ بدل جائے تو درست ہے۔

"کفارہ ادا ہونے کیلئے تملیک شرط ہے"

مسئلہ: کفارہ کی رقم یا جنس یا کپڑا جب تک کسی خاص مسکین کی ملک نہ کیا جاویگا اس وقت تک وہ کفارہ ادا نہ ہوگا۔ خواہ اپنے ہاتھ سے کسی کو مالک کردے یا دوسرے شخص کے سپرد کر دے کہ وہ کسی کو مالک کر دے۔ مثلاً کسی مدرسہ کے مہتمم کو دے دیا۔ یا کسی انجمن کے کارکن کو دیدیا۔ اس صورت میں وہ اس کفارہ والے کا وکیل ہو جاوے گا۔ اور کفارہ محض اس کے سپرد کرنے سے ادا نہ ہوگا۔ بلکہ جب وہ وکیل موافق احکام شرعیہ کے مساکین کو دے گا۔ تب ادا ہوگا۔ پس اگر اس وکیل نے کوئی غلطی کی تو کفارہ دوبارہ دینا پڑے گا۔ اس لئے ایسے شخص کو وکیل نہ بناوے جو احکام شرعیہ سے بے خبر ہو۔ یا کہ خبردار ہو مگر دیندار اور احتیاط والا نہ ہو۔

مسئلہ: اوپر کے مسئلہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا ہو گا کہ جن کارخانوں میں کوئی خاص تملک نہیں ہوتا گو وہاں رفاہ عام کے کام ہوتے ہوں وہاں دینے سے ایسی رقمیں جیسے کفارہ ہے، زکوٰۃ ہے، صدقہ فطر ہے، چرم قربانی کی قیمت ہے۔ خواہ خود مالک چرم نے فروخت کی ہو خواہ اس کے وکیل نے۔ اور بھی جن جن رقموں میں تملیک خاص شرط ہے۔ ادا نہیں ہوتے۔ پس جنہوں نے چندہ حجاز ریلوے میں ایسی رقمیں دی ہوں ان کو چاہیئے کہ وہ دوبارہ پھر موافق شرعیت کے ادا کرے۔

"وکیل اگر روزہ رکھدے یا بغیر اجازت کے کفارہ ادا کرے تو ادا نہ ہوگا"

مسئلہ: اگر قسم توڑنے والے کی طرف سے دوسرا شخص کفارہ ادا کرنا چاہے۔ تو

اگر کفارہ میں اس دو سے کر نے روزے رکھے تب بھی کفارہ ادا، نہ ہوگا - اور اگر دس مسکینوں کو موافق مسائل مذکورہ بالا کھانا یا کپڑا یا غلہ یا دام دیئے تو اگر کفارے والے نے اجازت نہیں دی تھی - تو بھی کفارہ ادا نہ ہوگا - اور اگر تصریحًا اجازت دیدی ہے تو ادا ہو جاویگا فقط (باقی اجزاء مضمون کے آسان ہے محتاج تسہیل نہیں)

"منت مالی کے متعلق کوتاھیاں"

(ایفاء نذر مالی)

منجملہ طاعات ملحقہ بالزکوٰۃ کے نذر مالی کا ایفاء ہے - اس میں بھی مثلاً دیگر طاعات کے چند کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

اگر نذر کو کسی شرط پر معلق کیا تو اس شرط کے وجود سے ایفاء واجب ہو گیا چاہے اس شرط کا دوام نہ ہو۔

ایک کوتاہی تو یہی ہے کہ بعضے لوگ شوق شوق میں نذر تو کر لیتے ہیں مگر اس کا ایفاء نہیں کرتے یا تو یاد نہیں رکھتے یا یہ سمجھ کر کہ اب تو کام نکل گیا - بے پروائی و سستی کرتے ہیں۔ یا اس کامیابی کا اگر بقاء نہ ہو تو عدم بقاء کو مثل عدم حدوث[1] کے قرار دے کر ایفاء کو واجب نہیں سمجھتے مثلاً کسی نے نذر کی کہ اللہ تعالیٰ فلاں مریض کو شفا دے تو میں دس روپے خیرات دوں گا - اور وہ تندرست ہو گیا - مگر نذر پورا کرنے سے پہلے وہ پھر بیمار ہو گیا - تو یہ گمان غلط ہوگا کہ اب نذر پورا کرنا ضروری نہیں رہا - کیونکہ معلق تندرست ہونے پر کیا تھا - نہ کہ عمر بھر تندرست رہنے پر جب معلق بہ پایا گیا ایفاء نذر واجب ہوگا علاج ان کوتاہیوں کا مسائل معلوم کرنا اور جزاء معصیت کو پیش نظر رکھنا ہے - تاکہ نہ غلطی ہو نہ بے پروائی۔

○

---

[1] وجود - ۱۲

"غیر اللہ کی منت شرک ہے"

ایک کوتاہی[1] یہ ہے کہ بعضے نذر غیر اللہ کی کرتے ہیں بعض تو کھلم کھلا کہ اے فلاں بزرگ اگر ہمارا کام ہوگیا۔ تو آپ کی نام کا کھانا کریں گے۔ یا آپ کی قبر پر غلاف چڑھا دیں گے۔ یا آپ کی قبر پختہ بنا دیں گے یہ تو بالکل شرک جلی ہے۔ کیونکہ نذر بھی عبادت کی ایک قسم ہے (رد المحتار عن الاختیار اول احکام النذور وقبیل باب الاعتکاف)

عبادت میں کسی کو شریک کرنا صریح شرک ہے اس کا علاج توبہ اور عقیدہ کی درستی ہے۔ اور وہ نذر بھی منعقد نہیں ہوتی۔ اس کو پورا نہ کرے۔ اور اگر انتساب بغیر اللہ سے قطع نظر کرکے بھی وہ غیر مشروع ہو۔ تو اس کا مضاعف وبال ہے جیسا قبر پر غلاف چڑھانا۔ یا قبر پختہ بنانا کہ خود بھی غیر مشروع ہے۔ اور غیر اللہ کے تقرب کا ذریعہ بنانا یہ دوسری معصیت ہے۔ اور ایسا کھانا مَا اُھل بہ لغیر اللہ میں داخل ہونے کے سبب مباح التناول بھی نہیں اور ایسا غلاف دوسرے سبب سے بھی کسی کے لیے جائز الاستعمال نہیں۔ جیسا بعض مجاورین اس میں تصرف درست سمجھتے ہیں اور دوسرا سبب مالک کا اس کے لئے اذن نہ ہونا ہے۔ کیونکہ اس کی نیت صرف قبر پوشی کے لیے ہے نہ کہ مجاور کے گھر لے جانے کی البتہ اگر ناذر[1] توبہ کرے۔ تو پھر وہ کھانا مجاور کے لئے اور وہ غلاف مالک کے اذن سے کھا لینا اور استعمال کر لینا حلال ہے اور اگر کوئی جانور تھا۔ جو اسی نیت پر ذبح ہوچکا۔ تو اب توبہ سے وہ حلال نہ ہوگا۔ اسی طرح ایسی قبر کی اینٹیں لے جانا غیر مالک کے لئے حلال نہیں۔ البتہ مالک کو اختیار ہے کہ قبر سے اکھاڑ کر جو چاہے کرے۔

قبر کی کوئی چیز نیک کام میں بھی استعمال کرنا جائز نہیں ہے

یہ بے احتیاطی بعض اتقیا سے بھی ہوتی ہے کہ پختہ قبر کو منہدم کر دینے کو ثواب سمجھتے ہیں اور یہاں تک تو ٹھیک سمجھے مگر آگے یہ بھی گمان کر لیتے ہیں کہ بعد انہدام ان

---

[1] منت ماننے والا ۱۲

اینٹوں کو کسی اچھی جگہ لگا دیا جاوے۔ سو یہ غلط ہے۔ اسی طرح قبروں پر جو مورچھل یا جاروب وغیرہ رکھی رہتی ہیں یا پھول چڑھے ہوتے ہیں ان کا استعمال کرنا کسی کو جائز نہیں۔ گو ان کا چڑھانا گناہ ہوا۔

بعض دفعہ شرک ظاہر نہیں ہوتا بلکہ مدفون ہوتا ہے

اور بعض لفظاً تو اللہ ہی کے لئے نذر کرتے ہیں لیکن اس کے تحت میں شرک مدفون ہوتا ہے کہ ذرا التفات و تامل سے کام لیا جاوے تو اس کا ادراک ہوتا ہے مثلاً نذر کی کہ اے اللہ اگر میرا فلاں کام ہو جاوے تو آپ کے نام کی ایک دیگ کھانے کی پکوا کر کھلا کر بڑے پیر صاحب کو ثواب بخشوں گا۔ اور یہ نہایت ہی احتیاط کا صیغہ سمجھا جاتا ہے۔ تو یہ ظاہر میں تو نذر اللہ کے لئے ہے لیکن یہ یقینی ہے کہ یہ لوگ اس مقصد میں ضرور ان بزرگ کو کسی قدر معین اور دخیل اور متصرف سمجھتے ہیں چنانچہ اگر ان سے کہا جاوے کہ ان بزرگ کو دوسرے وقت ثواب پہنچا دینا اس وقت اس منضم مت کرو خالی نفع مساکین کی نیت رکھو تو ان کے دل میں ضرور یہ خطرہ قریب مرتبہ اعتقاد گذرے گا کہ اس کے منضم نہ کرنے سے اس نذر میں اثر ضعیف ہو جاوے گا جس کا سبب ان بزرگ سے روحانی امداد کا پہنچنا ہے۔

پس ہر مسلمان اس پر غور کر کے دیکھ لے کہ یہ خلاف توحید ہے یا نہیں اور اس کا ایک امتحان ہے۔ وہ یہ کہ اگر وہ کام ہو جانے کے بعد اس ناذر سے کہا جاوے کہ صرف اللہ کے نام مساکین کو دیدو اور کسی کو ثواب مت پہنچاؤ، یا جن کے ثواب پہنچانے کی نیت کی ہے ان کو نہ پہنچاؤ۔ اور کسی بزرگ کو بخش دو کیونکہ نذر میں ایسی تخصیصات شرعاً لازم و معتبر نہیں ہوتیں۔ (جیسا آگے بھی آتا ہے) تو اس وقت نذر کرنے والوں کی حالت دیکھنے کے قابل ہے کہ اس کو گوارا کر سکتے ہیں۔ یا نہیں۔ اگر گوارا نہ کیا تو سمجھ لیجئے کہ اعتقاد میں خلل ہے اس کا علاج بجز اس کے کچھ نہیں کہ اگر عقیدہ میں بھی فساد محسوس نہ ہو تب بھی حاجت کے لئے نذر کرنے کے وقت ہرگز کسی بزرگ کے ایصال ثواب کو منضم نہ کیا کریں۔ اس کو دوسرے وقت بلا نذر ثواب بخش دیا کریں۔

اغنیاء کو دینے سے منت پوری نہیں ہوتی

ایک کوتاہی یہ ہے یہ کہ بعضے لوگ نذر کے مصرف میں اغنیاء اور رہر مستحقین کو بھی شامل سمجھتے ہیں چنانچہ دیکھا جاتا ہے کہ قبول کی ہوئی شیرینی مسجد میں لاکر سب نمازیوں کو تقسیم کرتے ہیں۔ جن میں اغنیاء اور ناذر کے اصول وفروع بھی ہوتے ہیں جن کو دینے سے نذر ادا نہیں ہوتی ــــ
(ردالمحتار قبیل باب الاعتکاف)

بلکہ جس قدر ان لوگوں کے حصہ میں آیا ہے اسی قدر دوبارہ مساکین کو دینا واجب ہوگا۔ البتہ نذر ہی کرنے کے وقت، یہ کہہ دیا کہ میں اغنیاء وغیرہم کو بھی دوں گا تو ان کے حصے کی نذر ہی منعقد نہیں ہوتی (درالمختار عن القنیۃ)

یہاں سے مانی ہوئی گیارھویں کی شیرینی کے حصے خوش حال دوستوں کے گھر بھیجنے کا بھی حکم معلوم ہوگیا ہوگا۔ اور خود اس گیارہویں کی تحقیقات کا بدعت ہونا یا نیت عوام کا شرک جلی یا خفی ہونا یہ مستقل بحث ہے۔

نذر کی تمام تخصیصات کا التزام ضروری نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ نذر کی تمام تر تخصیصات کو لازم و واجب سمجھتے ہیں مثلاً نذر کی کہ دو روپے کی مٹھائی دوں گا یا کسی مسجد میں دوں گا یا اتنی رقم مکہ معظمہ بھجواؤں گا۔ یا رمضان میں خیرات کروں گا تو اس کا اہتمام کرنا کہ مٹھائی ہو اور مسجد میں جاوے۔ یا مکہ معظمہ ہی میں بھیجے یا رمضان کا انتظار کرے ضروری نہیں۔ بعض اوقات بعض تخصیصات کی ایفاء پر قدرت نہ ہونے سے اصل نذر ہی ادا ہونے سے رہ جاتی ہے۔

مثلاً مکہ لے جانے والا کوئی نہ ملا اور یہاں ادا نہ کی۔ اسی میں موت آگئی۔ تو گنہگار مرا۔ یا اگر ایفاء تخصیصات پر قدرت بھی ہوئی لیکن کسی وجہ سے دوسرا مصرف یا دوسری صورت افضل ہو۔ تو ملتزم تخصیص اسی فضیلت سے محروم رہتا ہے مثلاً اکثر اوقات مسجد میں مٹھائی بانٹنے والوں سے یہ افضل ہے کہ گھر بیٹھنے والوں محتاجوں کو ۲ روپے نقد یا اس

کاغلہ دیدیا جاوے۔ تو ایسے التزام مالایلزم میں کیوں مبتلا رہو۔ البتہ جو نذر معلق ہو اس میں قبل وجود شرط ادا صحیح نہیں بس اتنی تخصیص شرعًا معتبر ہے اور دوسری تخصیصات نذر معلق میں بھی معتبر نہیں (درمختار)

یہاں سے زنان عوام کی اس تخصیص کا حکم بھی معلوم ہو گیا ہوگا کہ فلاں کام ہو جاوے تو میں مسجد کا طاق بھروں گی سو یہ قید بھی شرعًا معتبر نہیں، البتہ اگر کوئی نذر کرے کہ اگلے سال قربانی کروں گا۔ یہاں تخصیص ایام نحر کی ہو جاوے گی (ردالمحتار) نہ اس وجہ سے کہ زمان مقصود بلکہ اس لئے کہ جو ایام نحر میں نہ ہو وہ قربانی ہی نہیں جو کہ مقصود ہے اور جو صدقہ مکہ میں نہ ہو وہ بھی صدقہ ہی ہے اور صدقہ ہی مقصود ہے یہ فرق ہے دونوں تخصیصوں میں۔

ناجائز فعل کی نذر اور اس کا ایفاء جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ نہیں دیکھتے کہ ہم جس فعل کی نذر کر رہے ہیں۔ وہ شرعًا جائز ہے یا ناجائز اور اس لئے بعض معاصی کی نذر کرتے ہیں مثلاً قبروں پر غلاف چڑھانا، عرسوں میں جانا، یا بطریق بدعت مولود شریف کرانا سو ظاہر ہے کہ یہ نذر خود معصیت ہے اور اس کا ایفاء جائز نہیں۔ بلکہ توبہ واجب ہے۔ علاج اس کا علم دین ان ابواب میں حاصل کرنا اور اہل حق کی صحبت اختیار کرنا ہے۔ البتہ اگر نذر ہو طاعت کی اور معلق کیا ہو۔ اس کو معصیت کے ساتھ وہ نذر منعقد ہو جاتی ہے پھر اگر وہ معصیت سرزد ہو جاوے تو اگر مقصود اس قائل کا اس تعلیق سے اس معصیت کے ترک کا عہد ہے تو خواہ نذر پوری کرے یا کفارہ یمین دے۔ اور اگر مقصود اس معصیت کی تحصیل پر اظہار مسرت ہے یعنی وہ معصیت اس کو مرغوب ہے تو اس نذر کا ایفاء اس پر واجب ہے (درمختار ور دمحتار)

اور اگر وہ فعل جائز بھی ہو مگر قربت مقصودہ نہ ہو، مثلاً وضو تب بھی گو جواز اصلی کی وجہ سے اس فعل کا کرنا جائز ہے مگر نذر منعقد نہ ہوگی اور وہ واجب نہ ہوگا۔ یہاں سے حکم معلوم ہو گیا ہوگا مولد بطریق مشروع کی نذر کا کہ اس کا ایفا واجب نہیں ہوگا۔

جو چیز ملک میں نہیں ملک کیطرف اضافت کئے بغیر اسمیں نذر منعقد نہیں ہوتی۔

ایک کوتاہی علمی یہ ہے کہ بعض دفعہ جوش میں اس قدر مال کثیر کی نذر کر لیتا ہے جو اس کی ملک میں نہیں۔ اور پھر اس کا پورا کرنا دشوار ہوتا ہے یا ملک غیر میں نذر کر لیتا ہے۔ پھر یا تو ایسے امر میں کوتاہی کرتا ہے جس کو واجب سمجھتا ہے اور یا ادا کرنے کا ارادہ کرتا ہے اور پریشان ہوتا ہے اور تمام محاصل اور مکاسب اس کے نذر کرتا ہے اور دوسرے حقوق واجبہ تلف کرتا ہے حالانکہ جو چیز ملک میں نہ ہو۔ اس کے ساتھ نذر متعلق نہیں ہوتی۔

مثلاً کسی نے ایک ہزار روپے دینے کی نذر کی۔ اور نذر کے وقت اس کی ملک میں سو روپیہ ہے۔ جبکہ نذر مطلق ہو اور اگر معلق ہو تو وجود شرط کے وقت (کمافی رد المختار) سو روپے یا اتنے کا سامان ہو تو اس شخص پر ہزار روپے واجب نہ ہوں گے۔ (در مختار ورد محتار)

اور اگر ہزار روپے نقد نہ ہوں لیکن اتنا سامان موجود ہو تو اس کو بیچ کر دینا واجب ہوگا (رد محتار) لیکن اگر سب دے ڈالنے میں تکلیف ہو تو بقدر کفاف کے رکھ کر بقیہ دیدے پھر جب گنجائش ہو۔ جتنا پہلے حاجت کی وجہ سے رکھ لیا۔ اتنا پھر دیدے (رد محتار)

اسی طرح اگر نذر کرے کہ فلاں شخص سے گائے خرید کر اللہ کے واسطے ذبح کرونگا یہ نذر بھی منعقد نہیں ہوتی (در مختار) البتہ اضافت الی سبب الملک حکم ملک میں ہے۔ مثلاً اگر یہ نذر کی کہ اگر فلانی گائے خریدوں تو اس کی ذبح للتصدق کی نذر کرتا ہوں تو گو وہ اس وقت ملک میں نہیں لیکن اسی طور سے نذر منعقد ہو جاوے گی اور بعد اشتراء (خریداری) اس نذر کا ایفاء واجب ہوگا۔

اور ملک غیر میں نذر کرنے کی ایک فرع یہ بھی ہے کہ کسی یتیم کے تندرست ہونے پر نذر کرتے ہیں کہ اسی کے روپیہ میں سے اتنے مساکین کو کھانا کھلادیں گے۔ یہ نذر بھی باطل ہے۔

ایسی چیز کی نذر نہ کرے جو اپنی طاقت سے باہر ہو اگر کرلی تو ایفا واجب ہو گا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جس طرح صورت بالا میں نذر مالی اس قدر کرلی تھی جو ملک میں نہ تھی اسی طرح بعضے ایسے عبادات بدنیہ کی نذر کرلیتے ہیں جو ان کی طاقت سے خارج ہوتی ہے۔ مثلاً یہ نذر کرلی کہ عمر بھر روزے رکھا کروں گا۔ یا تا زیست ہر سال حج کروں گا۔

اور کبھی ایسا ہوتا ہے کہ خفیف خفیف نذریں بہت سی جمع ہونے سے وہ ثقیل ہو گئیں مثلاً کئی بار میں دس دس روزوں کی نذر کی مگر ادا میں سستی کرنے سے وہ جمع ہو کر ایک ہزار روزے ہو گئے۔ جو تین سال میں جبکہ بلا ناغہ رکھے جائیں پورے ہو سکتے ہیں جس کا موقع بظاہر ملنا نہایت بعید ہے۔ پھر اس کے بعد ناواقفی سے یہ کوتاہی ہوتی ہے کہ اس میں سے جتنا جی چاہا پورا کردیا بقیہ کا کوئی تدارک نہیں کیا جاتا سو سمجھ لینا چاہیئے کہ اولاً ایسی نذر نہ کرے اور اگر ہو جائے تو اس کو پورا کریں اور اگر پورا ہونے سے رہ جائے۔ اس کا بدل کرے اور اگر موت آجاوے تو اپنے ترکہ میں اس کے متعلق وصیت کریں۔ مثلاً عمر بھر کے روزے رکھنے کی نذر کرلی تو جتنے روزے نہ رکھ سکے اس کا فدیہ دے (درمختار) اور جو مرنے کے وقت رہ جاویں فدیہ کی وصیت کرے (درمختار و ردالمحتار قبیل از باب اعتکاف) یا تیس حج کی نذر کرلی اور نہ کر سکا تو وصیت کرجاوے (ردالمحتار)

حل شبہ: ایک حدیث میں ارشاد ہے کہ نذر مت کرو کہ نذر سے تقدیر نہیں ٹلتی۔ البتہ اس کے ذریعہ سے بخیل کے پاس سے کچھ (نیک کام میں) نکل آتا ہے (جو بلا نذر اس نیک کام میں خرچ نہ کرتا) اھ (بالحاصل) اس سے شبہ یہ ہوتا ہے کہ اوپر نذر کا عبادت ہونا ثابت ہو چکا ہے اور عبادت مامور بہ ہوتی ہے گو درجہ ندب ہی میں ہو اور اس حدیث سے اس کا منہی عنہ ہونا ثابت ہوتا ہے گو درجہ کراہت ہی میں ہو پس ان میں جمع ہونے کی کیا صورت ہے۔ جواب یہ ہے کہ نذر خود عبادت مقصودہ نہیں بلکہ اس کا عبادت ہونا اس لئے ہے کہ وہ دوسری عبادت مقصودہ سے متلبس و متعلق اور ان کا ذریعہ اور سبب ہے (فی ردالمختار، احکام الیمین والنذر ما کونہ قربۃ فلما یلازمہ من القرب

کالصلوٰۃ والصوم والحج والعتق ونحوھا)

اوران عبادات مقصودہ کے عمل میں لانے کی دو صورتیں ہوسکتی ہیں۔ ایک بدون نذر کے۔ اور دوسری بعد نذر کے اور اوّل صورت افضل ہے دوسری سے اور مقبول بمقابلہ فاضل وافضل کے اولیٰ بالترک ہوتا ہے۔ پس نہی عن النذر اس درجے میں ہے۔ تو یہ منافی نہیں اس کے مامور بہ فی درجۃ التوسل بہ الی الطاعات المقصودہ (یعنی طاعات مقصودہ کے لئے وسیلہ بننے کے درجہ میں) ہونے کے اس حدیث میں یہ تو عمل کی اصلاح ہے۔ اور ایک عقیدہ کی اصلاح ہے کہ عوام کی طرح یوں نہ سمجھو کہ نذر کرنے کو اس کارروائی میں کچھ خاص دخل اور اثر درجۂ مزعومہ عوام کا ہے۔ اور اگر نذر نہ ہوتی تو یہ کام نہ ہوتا کام تو ہر حال میں اس طرح ہوتا جس طرح مقدر تھا اس میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی بلکہ اور اسباب طبعیہ یا دعا جن کا اثر مشاہدہ و سمع سے ثابت ہے نذر میں اتنا اثر بھی ہونے کے لئے دلیل کی حاجت ہے اور ظاہراً یہ حدیث بھی اس کی نفی کر رہی ہے۔ ورنہ نہی نہ ہوتی بلکہ مثل دواؤ دعا اس کی ترغیب ہوتی اور اس میں بھی مثل ان کے تبدیل قدر کے شبہ کے جواب میں یہ ارشاد ہوتا وذالک من القدر) (اور یہ بھی تقدیر میں سے ہے)

مقصود حضور نبوی صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ہے کہ نذر کے دباؤ سے خیر کرنا بخل ہے۔ بلا نذر خیر کرنا زیادہ بہتر ہے اھ

اور اگر شکریہ کارروائی میں خیر کرنے کی نیت ہو تو زبان سے کہنے کی کیا ضرورت ہے دل میں رکھے اور موقع پر عمل کرے۔ نیت کرنے سے نذر بھی نہیں ہوتی (لانہ مما یتعلق بالقول (یعنی اس کا تعلق قول سے ہے) کما فی الدر المختار۔ اور اصل مقصود بھی حاصل ہوجاتا ہے شارع کا بھی کہ نفس عبادت ہے۔ اور اس عامل کا بھی کہ اقتران، انجاح حاجت و قصد طاعت ہے۔ واللہ اعلم بالصواب ۱۲

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

بعنوان مسائل ؛ مسئلہ شرعی منت کا ادا کرنا فرض ہے۔ مسئلہ اگر منت مانی کہ

تندرست ہو جاؤں تو اتنا خیرات کروں پھر بالکل تندرست ہو گیا۔ اور اتفاق سے پھر بیمار ہو گیا تو پہلی منت اس کے ذمہ رہے گی ادا کرنا ضروری ہے۔ مسئلہ: خدا کے سوا کسی کی منت ماننا جائز نہیں۔ جیسے بعض عوام کا طریقہ ہے کہ بزرگوں سے عرض کرتے ہیں کہ ہمارا فلاں کام ہو جاوے تو آپ کے نام کی دیگ کریں گے یمسئلہ۔ اور اگر صورت مذکورہ میں خود وہ فعل بھی ناجائز ہو تو دو گناہ ہوئے۔ ایک غیر اللہ کی منت دوسرے معصیت کی منت، مسئلہ: ایسی منت کی چیز استعمال میں لانا نہ چاہیئے۔ مسئلہ: البتہ اگر نذر کرنے والا توبہ کرے تو وہ چیز درست ہو جاوے گی۔ مسئلہ: اگر اسی نیت پر جانور ذبح ہو چکا تو اب توبہ سے کچھ نہ ہوگا۔ مسئلہ: اگر نیت اللہ کے واسطے ہو تب بھی منت میں کسی کے ایصال ثواب کو ملا دینا خلاف احتیاط ہے۔ عوام کو یہ خیال ہو ہی جاتا ہے کہ ان بزرگ کا نام لگا دینے سے کچھ سہارا ان بزرگ کی طرف سے بھی لگے گا۔ مسئلہ: منت کی چیز خوش حال لوگوں کو یا بنی ہاشم کو جن میں سید بھی داخل ہے۔ یا اپنے ماں، باپ، دادا، دادی، نانا، نانی، یا بیٹے، بیٹی، نواسا، نواسی، پوتا، پوتی، کو دینا درست نہیں۔ اگر ایسا کیا تو جتنا ان کو دیا ہے اتنا پھر محتاجوں کو دینا پڑے گا۔ اگر مسجد میں بانٹے تو خوش حال لوگوں کو نہ دے۔ مسئلہ: منت ماننے میں کسی کھانے کی یا کسی مسجد کی یا مکہ کی تخصیص لازم نہیں ہے پس اگر مٹھائی یا کھانے کی منت مانی تو روپے پیسے کپڑے دینا بھی درست ہے۔ داموں میں دونوں چیزیں برابر ہوں۔ اسی طرح بجائے مسجد میں بانٹنے کے گھروں میں دے دینا بھی درست ہے اسی طرح بجائے مکہ معظمہ کے ہندوستان کے حاجت مندوں کو دے دینا بھی درست ہے۔

مسئلہ: جو فعل خود یا کسی خاص طریقے سے شرعاً درست نہ ہو۔ اس کی منت ماننا درست نہیں۔ جیسے یوں کہنا کہ میرا فلاں کام ہو جاوے تو خواجہ صاحب کے عرس میں جاؤں۔ یا جس طرح سے اکثر جہلاء و عوام مولود شریف پڑھتے ہیں ایسے مولود کی نذر کرنا، یہ درست نہیں۔ اور اگر ذکر نبوی صلی اللہ علیہ وسلم بطریق سنت ہو جائز ہے۔ مگر نذر کرنے سے وہ بھی واجب نہیں ہوتا جیسا وضو کے باوجود عبادت ہونے کے اس کی نذر منعقد نہیں ہوتی۔

مسئلہ: جو چیز اپنی ملک میں نہ ہو۔ اس کی نذر صحیح نہیں ہوتی۔ مثلاً کسی نے منت مانی کہ اگر فلاں کام ہو جاوے تو ہزار روپیہ دوں گا۔ اور کام ہو گیا اور ہزار روپیہ اس وقت موجود نہیں نہ اتنا سامان ہے تو یہ نذر نہیں ہوئی پس اگر ایک مہینہ کے بعد ہزار روپیہ اس کو مل گئے تو اس نذر کا پورا کرنا واجب نہ ہوگا۔ البتہ کام پورا ہونے کے وقت جتنے روپیہ یا جتنا سامان اس کی ملک میں ہے اس کا دینا واجب ہوگا۔ اگر نقد نہ ہو تو سامان بیچ ڈالنا واجب ہوگا۔ اگر سب کے بیچنے سے تکلیف اور حرج ہو تو بقدر ضرورت سامان لے پھر گنجائش ہونے کے وقت جتنا سامان لیا تھا وہ بھی بیچ کر دے ڈالے مثلاً ہزار روپیہ کی منت مانی تھی مگر کام ہو جانے کے وقت پانچ سو روپیہ کا سامان موجود ہے تو وہ نذر پانچ سو روپے کے ساتھ متعلق ہوگی۔ اس میں اگر سو روپے کے سامان اپنی ضروریات کے لئے رکھ لیا تو چار سو اب دیدے اور سو کا سامان پھر دے۔ اسی طرح دوسرے کی ملک میں نذر نہیں ہوتی مسئلہ نذر کرنے سے پہلے سوچ لے کہ جس عبادت کی نذر کرتا ہوں مجھ سے اس کا سرانجام ہو سکے گا یا نہیں۔ کیونکہ جو نذر کرے گا وہ اس کے ذمہ واجب ہو جاوے گی۔ پھر ادا کرنا مشکل ہوگا۔ یا بھول جاوے گا تو اس کے ذمہ وبال اور گناہ رہے گا۔ اگر ہزار روزوں کی نذر کر لی یا کئی نذریں جمع ہو کر ہزار روپئے ہو گئے تو ان سب کا ادا کرنا واجب ہوگا۔ اور جب طاقت نہ رہے گی فدیہ دینا پڑے گا۔ اور جب مرنے لگے گا تو وصیت کرنا پڑے گی کہ میرے ترکہ میں سے اس قدر فدیہ ادا کر دیا جاوے۔

تتمہ آخر مضمون نذر

(وھو جوھر نفیس لا یجوز ان یطرح)

اور یہ نہی نذر کرنے سے جو حدیث میں وارد ہے جس کی تحقیق اس سے مضمون میں مذکور ہوئی ہے۔ مخصوص ہے نذر معلق کے ساتھ جیسا کہ اس نہی کی اس تعلیل سے صاف ظاہر ہے انه لا یرد شیئا وانما یستخرج به من البخیل۔ یعنی یہ نذر (تقدیر میں سے) کسی چیز کو نہیں ٹال سکتی بلکہ اس نذر کے ذریعہ بخیل سے (مال) نکالا جاتا ہے۔

جس کا حاصل یہ ہے۔ انہ لم یخلص من شائبۃ العوض حیث جعل القربت فی مقابلۃ الشفاء ولم تسمح نفسہ بہا بدون العلق علیہ مع ما فیہ من ایہام اعتقاد التاثیر للنذر فی حصول الشفاء اھ یعنی اس کا یہ عمل عوض کے شائبہ سے خالی نہ رہا کیونکہ اس نے ایک عبادت کو شفاء کے مقابلے میں لاکھڑا کر دیا اور ساتھ اس میں اس بات کا بھی احتمال ہے کہ وہ حصول شفاء میں نذر کو مؤثر اعتقاد کرنے لگے (جو ایک خلاف شرع عقیدہ ہے)

بخلاف نذر منجز کے کہ اس میں یہ علت نہیں فہو تبوع محض بالقربۃ للہ تعالیٰ والزام النفس بما عساہ لا تفعلہ بدونہ فیکون قربۃ کذا فی ردالمختار ج ۱، ص۱۳۱) (یعنی نذر منجز ایک زائد چیز ہے جس سے مقصد اللہ کی عبادت ہے اور نفس کو ایک ایسی چیز کے ساتھ لازم کرنا ہے جسے بغیر نذر کے نفس کرنے کے لئے تیار نہیں ہوتا لہٰذا یہ عبادت ہوگی۔

"نماز و روزہ کے متعلق کوتاہیاں"

(فدیہ صوم و صلوٰۃ)

مثل دیگر طاعات مالیہ (مذکورہ سابقہ) اس میں بھی متعدد کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

اگر کسی کی کچھ نمازیں یا روزے رہ گئے ہوں جو اپنی زندگی میں ادا نہ کرسکے، مرتے وقت فدیہ کی وصیت کرنا ضروری ہے۔

مثلاً ایک کوتاہی یہ ہے۔ کہ باوجود اس کے کہ ان کے ذمہ بہت سی نمازیں اور روزے چڑھے ہوتے ہیں۔ مگر مرنے کے وقت بھی فدیہ کی وصیت نہیں کرتے حالانکہ ایسے شخص کو فدیہ کی وصیت کرنا واجب ہے۔

لوجوب الفدیۃ عن الصوم نصًا وعن الصلوٰۃ قیاسًا)

مقدار ایک روزہ اور ایک نماز کی فدیہ کے برابر صدقہ فطر کی ہے۔ خواہ غلہ یا قیمت یا ایک مسکین کو دو وقت کھانا کھلا دینا اور نمازیں ایک دن کی پانچ فرض اور ایک وتر کل چھ ہیں۔

فدیہ کے بھروسے پر نمازیں اور روزے قضا نہیں کرنے چاہئیں

اس کے مقابل ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی فدیہ کے بھروسہ اپنے اوپر نمازیں اور روزے چڑھاتے چلے جاتے ہیں کہ ہم مالدار ہیں۔ فدیہ کی وصیت کر جائیں گے۔ تو اس میں ایک تو بڑی بیباکی ہے کہ گویا نماز روزہ اس کے نزدیک قابل اہتمام ہی نہیں۔ خصوصاً مالداروں سے گویا اس کا جرمانہ لے کر ان کو سبکدوش کر دیا گیا ہے (نعوذ باللہ من ذالک)

دوسرے چونکہ نمازوں کا بہت عدد بڑھ جاتا ہے۔ اور اس لئے اس کا مجموعہ فدیہ اکثروں کی وسعت سے متجاوز ہو جاتا ہے۔ تو اگر کل ادا کیا گیا تو وارثوں کو ضرر پہنچایا گیا اور اگر کل ادا نہ ہوا تو اس کے ذمہ بار رہا اور یہ دونوں امر غیر مشروع ہیں۔
اور اسی فدیہ کے بھروسہ پر رہنے کے متعلق اس زمانہ میں نئی غلطی مگر بہت گندی غلطی یہ ایجاد کی گئی ہے کہ روزہ قضا ہو جاوے تو باوجود صحت بدن کے بھی اس کی طرف سے فدیہ دیدینا کافی ہے۔ روزہ رکھنا فرض نہیں (اس کا بطلان اچھی طرح سے احقر نے رسالہ اصلاح ترجمہ دہلویہ کے متن میں مختصراً اور اس کے خاتمہ یہ بعبادت عربیۂ مبسوطاً اور عزیزم مولوی شبیر احمد صاحب سلمہ دیوبندی نے القاسم کے نمبر ۲ جلد میں عقلاً و نقلاً ثابت کر دیا ہے۔ ملاحظہ فرمایئے)

قدرت یا امید قدرت کے ہوتے ہوئے فدیہ دینا درست نہیں ہوتا

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ باوجود اس کے کہ وہ نمازیں قضا کر سکتے ہیں۔ اور صحت سے بھی مایوس نہیں ہوئے اور صحت کے بعد روزے قضا کر سکتے ہیں۔ مگر پھر بھی ارزاں نسخہ فدیہ کا یاد کر کے اس کے استعمال کو کافی سمجھتے ہیں۔ سو سمجھ لینا چاہئے، کہ قدرت یا امید قدرت ہوتے ہوئے فدیہ دینا درست نہیں ہوتا۔ پس نماز پر تو انسان ہر وقت قادر ہے۔ اگر رکوع وسجود نہ ہو سکے اشارہ ممکن ہے۔ پس مرض میں بھی وقتیہ کو ادا اور

فائتہ کو قضا کر سکتا ہے۔ اس کا فدیہ تو اس لئے جائز نہیں رہا۔ روزہ تو جب تک صحت کی امید ہے۔ بعد صحت کے بقدر زمانہ صحت اس پر قضا کرنا واجب ہوگا۔

البتہ اگر ایسا مرض ہوگیا کہ اب بالکل امید صحت کی نہیں رہی۔ یا ایسا بوڑھا ہوگیا کہ اب بالکل امید قوت کی نہیں رہی۔ یا کسی نے عمر بھر روزہ رکھنے کی نذر کر لی تھی۔ مگر اب اس سے بالکل عاجز ہوگیا۔ حاصل یہ کہ ایسا عذر لازم ہوگیا کہ اب قضا پر قادر ہونے کا قطعاً احتمال نہیں رہا۔ ان حالات میں حیات میں بھی روزہ کا فدیہ دینا جائز اور کافی ہے۔ (ردالمحتار ج ۲ ص ۱۹۱)

اور اس کا مقتضا یہ ہے کہ اگر قضا نمازیں بہت کثرت سے ہوگئیں اور مرض کی ایسی حالت ہو کہ اشارہ سے بھی زیادہ قضا نہیں پڑھ سکتا۔ اور امید صحت کی منقطع ہوگئی۔ تو بقدر قدرت قضا کرنا واجب ہوگا۔ اور بقیہ کا فدیہ حیات میں بھی دینا درست ہوگا (لکن لم اراہ فلیراجع)

زندگی میں جواز فدیہ کی صورت

اور جو نمازیں اور روزے قضا اور فدیہ سے رہ جاویں۔ ان کے فدیہ کے لئے وصیت کرنا واجب ہوگا۔ البتہ اگر ناامیدی کے قبل بھی اس نظریہ سے فدیہ دیدے کہ معلوم نہیں میرے ورثہ وصیت پر عمل کریں یا نہ کریں۔ اور یہ بھی نیت رکھے کہ بعد فدیہ کے اگر قدرت قضا کی ہوگئی تو قضا کر دوں گا۔ اور اگر قدرت نہ ہوئی۔ اور مسائل بالا کی رو سے حسب مقدار فدیہ کا ناکافی ہونا ثابت ہوگا وصیت بھی کر دوں گا۔ ایسے فدیہ کا کچھ مضائقہ نہیں۔ بلکہ مستحسن اور احتیاط ہے۔ بشرطیکہ اگر مرض الموت میں ہو تو ثلث سے زیادہ نہ دے۔

اور قضا سے ناامیدی ہونے کی حالت میں جو روزہ کے فدیہ کا جواز اوپر مذکور ہوا ہے اس میں ایک اور بھی شرط ہے وہ یہ کہ یہ روزہ کسی اور واجب کا بدل نہ ہو ورنہ اس میں یا اصل واجب کو ادا کرے۔ اور وہ نہ ہو سکا تو صرف وجوب وصیت متعین ہے فدیہ کسی حال میں نہیں ہو سکتا جیسا کفارہ یمین میں روزہ اس وقت ہوتا ہے جب اعتاق و اطعام وکسوت پر قدرت نہ ہو، پس اس روزہ کا فدیہ حیات میں درست نہیں اگر اصل اور بدل دونوں پر

قدرت نہ ہو تو مرتے وقت ترکہ میں فدیہ کی وصیت واجب ہوگی (رد المختار ج ا ص ۱۹۱)

وارثوں کی کوتاہیاں

ایک کوتاہی وارثوں کی ہے کہ باوجود وصیت اور وسعت کے اس کی کچھ پرواہ نہیں کرتے اور میت پر گرانبار رہتا ہے حالانکہ ثلث کے اندر وصیت مقدم ہے ترکہ پر بھی۔

ایک کوتاہی پہلی کوتاہی سے کم درجہ کی یہ ہے کہ وہ بلا وصیت مر جاوے تو اس فدیہ سے کم درجہ کے مصارف میں بلکہ اس سے بڑھ کر یہ کہ فضول مصارف میں اور اس سے بھی مزید یہ کہ معاصی میں میت کا ترکہ اڑاتے ہیں۔ مگر اس طرف کسی کو توجہ نہیں ہوتی کہ اور مصارف بند کر کے کچھ فدیہ میں دیدے۔ اور گو ایسی حالت میں دینا بعض فقہاء کے نزدیک مسقط واجب نہ ہوگا لیکن بعض کے نزدیک مثل حالت وصیت کے یہ بھی مسقط واجب ہو جاوے گا۔ اور جو مسقط واجب نہیں ان کے نزدیک بھی اس طرح سے نافع ہونا تو یقینی ہے۔ کہ میت کو اس کا ثواب ہی پہنچ جاوے گا۔ کیا عجب ہے کہ وہ ثواب اس ترک واجب کے عذاب کو زائل کردے۔ (رد المختار ج ا ص ۱۹۱)

اور یہ کوتاہی کم درجے کے اس لئے ہے کہ صورت سابقہ میں بوجہ وصیت کے فدیہ واجب تھا اور اس صورت میں بوجہ وصیت نہ کرنے کے واجب نہیں ہوا۔ لیکن جب اس سے ان محل میں صرف کیا ہے تو یہ اس سے احق و اسبق و اقدم و اہم ہے۔

جو فدیہ قواعد شرعیہ کے موافق نہ ہو وہ ادا نہیں ہوتا، اس کی ایک مثال

ایک کوتاہی ورثہ ہی کی یہ ہے کہ بعضے مقامات پر بزعم خود فدیہ ادا کرتے ہیں اور وہ بوجہ قواعد شرعیہ پر منطبق نہ ہونے کے ادا نہیں ہوتا اور ورثہ پر ارتکاب منہی عنہ کا اور مورث پر ترک عمل واجب کا بار رہتا ہے۔

اور وہ طریق غیر منطبق یہ ہے کہ میت کی تمام عمر کے نمازوں اور روزوں کا حساب کرکے اس کی ایک رقم مثلاً دس ہزار روپے تجویز کرکے ایک ملا کے ہاتھ ایک قرآن مجید دس ہزار

روپے کو ہدیہ کرتے ہیں، پھر وہ قیمت اس ملّا کو بہ نیت فدیہ کے معاف کر دیتے ہیں اور عمل کو اسقاط کہتے ہیں اور یہ صورت ان سب اسقاط کی صورتوں سے اسلم جن کو جہلاء عمل میں لاتے ہیں کہ ان میں تو کوئی شائبہ بھی انطباق علی القواعد کا نہیں ان میں سے یہ صورت سرسری نظر میں منطبق سمجھی جاتی ہے۔

لیکن ظاہر ہے کہ جب یہاں بیع مقصود نہیں تو ثمن بھی واجب نہ ہوگا۔ پھر فدیہ کس رقم سے ادا ہوا۔ اور دلیل بیع مقصود نہ ہونے کے علاوہ وجدان کے یہ ہے کہ اگر ملّا کو ثمن معاف نہ کیا جاوے بلکہ اس کا مطالبہ کرنے لگیں تو کیا اور تمام دیکھنے والے اس ثمن کو واجب اور اس مطالبہ کو حق سمجھیں گے؟ ہرگز نہیں پھر یہ تو ایک قسم کا فریب دینا ہوا۔ البتہ جس کو وسعت کم ہو اس کے لئے دوسرا طریق درمختار میں لکھا ہے۔ وہ قواعد پر منطبق ہے مثلاً ایک روپیہ مسکین کو فدیہ میں دیا اور اس نے بخوشی ولی کو ہبہ کر دیا ولی نے پھر اس کو فدیہ میں دیا۔ اسی طرح اگر ہزار بار کیا تو ہزار روپیہ ادا ہو گئے۔ اور اس میں ہر بار میں اختیار ہے۔ جب چاہے رکھ لے دوسرے کو نہ دے۔ فقط

تنبیہ: صوم و صلوٰۃ کے فدیہ میں اباحت و تملیک اور ایک مسکین کو نصف صاع سے زائد دیدینا سب درست ہے لیکن نصف صاع سے کم نہ دے یہ یقینی ہو (ردالمحتار ج ۱ ص ۱۸۸ ص ۱۸۹) واللہ اعلم بالصواب

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

بعنوان مسائل

مسئلہ: جس شخص کے ذمے کچھ نمازیں اور روزے قضا ہوں اور ان کو قضا نہ کر سکا ہو اس کو واجب ہے کہ مرنے سے پہلے ان کے فدیہ کی وصیت کر جاوے۔

مسئلہ: ایک روزے کا فدیہ اس قدر ہے جس قدر صدقہ فطر دیا جاوے۔ اسی طرح ایک نماز کا بھی اسی قدر ہے اور ہر روز کی چھ نمازیں شمار کی جاتی ہیں۔ پانچ تو فرض اور ایک واجب یعنی وتر۔ مسئلہ: فدیہ کے بھروسے نماز اور روزہ کا قضاء کر ڈالنا

یا جو قضا ہو گئے ہیں ان کی ادا میں سستی کرنا سخت گناہ ہے۔

مسئلہ: بیماری میں جو روزے قضا ہوئے اگر اس بیماری کے بعد زمانہ صحت اتنا ملا جس میں کل روزے یا بعض روزے قضا رکھ سکتا تھا۔ اسی قدر واجب ہوں گے باقی واجب نہ ہوں گے تو اگر بیس روزے قضا ہوئے۔ دس کی طاقت مل سکی اور قضا رکھنے نہ پایا تھا کہ موت آ گئی تو دس روزے کے فدیہ کی وصیت واجب ہو گی۔ **مسئلہ:** فدیہ کی وصیت ثلث ترکہ سے زائد میں صحیح نہیں یعنی تجہیز و تکفین اور قرض سے مثلاً تین سو روپے بچ گئے تو سو روپے سے زائد میں وصیت صحیح نہ ہو گی۔ البتہ اگر بالغ وارث اپنے حصہ میں جائز رکھے تو ان کو اختیار ہے **مسئلہ:**۔ جبتک روزہ قضا کرنے کی قدرت رہے اس وقت تک فدیہ دینا کافی نہیں۔ بلکہ قضا ہی رکھنا فرض ہو گا۔ ایک مترجم قرآن کے حاشیہ پر وعلی الذین یطیقونہ فدیۃ الایۃ کی تفسیر میں جو اس کے خلاف لکھدیا ہے وہ بالکل غلط ہے اس پر عمل حرام ہے۔ اہل علم نے اپنی تحریرات میں اس کی غلطی کھول دی ہے۔

مسئلہ: اسی طرح جب تک امید صحت اور قوت کی ہو فدیہ دینا کافی نہیں۔ البتہ اگر کوئی ایسا مرض ہو کہ اس سے صحت کی امید نہ رہے اور مرض کی حالت میں قوت نہ ہو یا بہت بوڑھا ہو گیا اور قوت روز بروز گھٹتی جاتی ہو۔ تو ایسے شخص ادا اور قضا روزہ کے بدلے فدیہ دینا درست ہے۔ اسی طرح سے اگر نادانی سے بارہ مہینہ روزہ سے رہنے کی نذر کر لی تھی اور اب ہار گیا تو اس کو بھی روزانہ روزے کا فدیہ دینا درست ہے۔ **مسئلہ:** لیکن مرض و ضعف میں نماز چونکہ اشارہ سے بھی درست ہے۔ اس لئے قضا نمازوں کا فدیہ اس وقت درست ہو سکتا ہے۔ جب اشارہ سے بھی ان کے پورا کرنے کی امید نہ رہے۔ جیسے مرض الموت میں ایسی حالت ہو جاتی ہے (مگر اس مسئلہ کو زیادہ تحقیق بھی کر لیا جاوے)

مسئلہ: اگر کوئی ایسی حالت میں کہ فدیہ کافی نہ ہو۔ اس نظر سے فدیہ دیدے کہ شاید میری وصیت کو وارث پورا نہ کریں اور یہ بھی نیت رکھے کہ اگر صحت و قوت عود کر آئے تو اس فدیہ کو کافی نہ سمجھوں گا بلکہ نمازیں اور روزے قضا کروں گا تو اس کا مضائقہ نہیں۔ **مسئلہ:** جو روزہ قسم کے کفارہ میں اس پر واجب تھا۔ حیات میں اس کا فدیہ درست نہیں بلکہ اگر اخیر عمر تک ادا سے عاجز رہے تو مرتے وقت فدیہ کی وصیت کرے۔

مسئلہ: اگر میت بلا وصیت مرجاوے۔ تب بھی ورثہ کو بہت ثواب ہوگا۔ اگر اس کی نماز اور روزہ کا فدیہ ادا کردیں۔

مسئلہ: ایک عمل بعض جگہ عوام میں اسقاط کے نام سے مشہور ہے۔ اس سے فدیہ ادا نہیں ہوتا۔

مسئلہ: جہاں رقم فدیہ بہت زیادہ ہو اور اس قدر گنجائش ہو نہیں تو بالکل اس کو نظر انداز کرنے سے یہ صورت کرلیں کہ مثلاً وارث ۱۰ روپے کسی مسکین کو بہ نیت فدیہ دیں پھر وہ اپنی خوشی سے اس وارث کو وہ رقم ہبہ کردے۔ یہ وارث پھر اس کو بہ نیت فدیہ کے دیں۔ تو گویا بیس روپے فدیہ میں پہنچے اسی طرح اگر سو بار کیا تو ہزار روپے ادا ہوگئے مگر گنجائش ہوتے ہوئے ایسا نہ کرے۔

مسئلہ: فدیہ میں اختیار ہے خواہ مساکین کو بٹھلا کر کھلاوے۔ خواہ غلہ بقدر صدقہ فطر دیدے یا اتنی قیمت دیدے کہ ایک مسکین کو ایک حصہ سے کم نہ دے۔ زیادہ دینا درست ہے یعنی ایک مسکین کو کئی حصے ایک تاریخ میں دیدینا بھی درست ہے۔

صدقۂ نافلہ کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بصدقۂ نافلہ)

منجملہ طاعات ملحقہ بزکوٰۃ جن کا اوپر سے ذکر چلا آرہا ہے۔ ایک صدقۂ نافلہ ہے اس میں بھی مثل دیگر اعمال کے متعدد کوتاہیاں واقع ہو رہی ہیں۔

شریعت میں صدقات نافلہ کا بھی حکم ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ باوجود زائد علی الحاجۃ ہونے اور مصارف دینیہ ضروریہ پیش آنے کے محض بوجہ بخل کے بجز زکوٰۃ اور صدقات واجبہ کے صدقہ نافلہ میں ایک کوڑی خرچ نہیں کرتے بلکہ میں نے ان میں سے بعض سے سُنا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک فہرست دیدی ہے۔ ہم کو اس سے تجاوز کرنا کیا ضرور۔ تو ایسے لوگ صرف یہی نہیں کہ صدقات نافلہ میں بے رغبت ہوں بلکہ اس سے ترقی کر کے ان کو ناپسند اور ان کو زیادت علی الشرع سمجھتے ہیں۔ یہ شیطان کی بہت بڑی رہزنی ہے جو براہ تلبیس دین کے

پردہ میں کی ہے۔ اور مکروہ کو بصورت مستحسن دکھلایا ہے۔ چونکہ منشاء اس کا بخل ہے۔ اس لئے ناپسندیدہ ہونا اس ترک صدقہ کا ظاہر ہے اور علاوہ قواعد کلیہ شرعیہ کے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی کسی درجہ میں مہتم بالشان ہونے کی تصریح بھی فرمائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ ان فی المال لحقا سوی الزکوٰۃ۔ یعنی مال میں زکوٰۃ کے سوا اور بھی بعض حقوق ہیں۔ اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے استشہاد میں اس آیت کی تلاوت فرمائی۔ داتی المال علی حبہ ذوی القربی والیتامیٰ والمساکین وابن السبیل والسائلین وفی الرقاب واقام الصلوٰۃ والتی الزکوٰۃ۔ ترجمہ: اور مال دیتا ہو اللہ کی محبت میں رشتہ داروں کو اور یتیموں کو اور محتاجوں کو اور مسافروں کو اور سوال کرنے والوں کو اور گردن چھڑانے میں اور نماز کی پابندی رکھتا ہو اور زکوٰۃ بھی ادا کرتا ہو

اور وجہ استشہاد ظاہر ہے کہ آتی المال الخ کو اٰتی الزکوٰۃ سے علیحدہ فرمایا جس سے معلوم ہوا کہ یہ علاوہ زکوٰۃ کے ہے۔ اور اس کو صدقات واجبہ کے ساتھ خاص نہیں کہہ سکتے۔ چنانچہ آتی المال کے بعد مصارف کو بعنوان استحقاق واحتیاج کے بیان فرمانا مشیر اس طرف ہے کہ مسوق لہ الکلام ان کے حقوق وحاجات کو پورا کرنا ہے۔ اور ان کے مصارف زکوٰۃ کی حیثیت سے مذکور نہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس کے بعد زکوٰۃ کا مستقلاً بیان ہے جس سے ثابت ہوا کہ زکوٰۃ کے علاوہ جو اتنا مال ہو وہ اس حیثیت سے مطلوب ہے کہ ان مصارف کی اعانت ہے۔ اور ظاہر ہے کہ صدقات واجبہ میں خود وہ تصدق بھی شرعاً مقصود ہوتا ہے۔ اعانت کی یہ خصوصیت مقصود نہیں ہوتی۔ پس یہ قرنیہ ہے اس کا کہ یہ شامل ہے صدقات نافلہ کو بھی۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور بعد استشہاد بالآیت کے اس شبہ کا جواب بھی ہو گیا۔ کہ اللہ تعالیٰ نے ہم کو ایک فہرست دیدی ہے پھر اس سے تجاوز کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ جواب یہ ہوا کہ اس فہرست میں صدقہ نافلہ بھی تو داخل ہو گیا۔ چنانچہ ابھی ظاہر ہوا۔ پھر اگر فہرست سے مراد فہرست واجبات کی لی جاوے۔ تو اول تو جب دونوں فہرستیں ہم کو دی گئی ہیں پھر وجہ کیا کہ ایک فہرست کو لیا جاوے اور دوسری کو چھوڑا جاوے۔ دوسرے تجاوز کرنے کے یہ معنی ہی غلط

ہیں۔ کہ نوافل کو ادا کیا جاوے۔ اگر یہ ہے تو نوافل کے فضائل منصوصہ کا کیا جواب ہوگا۔ بلکہ مطلب اس کا یہ ہے کہ حدود کو نہ چھوڑا جاوے۔ مثلاً جس جگہ صرف کرنا ممنوع ہے وہاں پر صرف کیا جاوے۔ یا اتفاق غیر واجب کو واجب سمجھ لیا جاوے۔ پہلا تجاوز عملی اور معصیت ہے اور دوسرا تجاوز اعتقادی اور بدعت ہے۔ اور جب یہ نہ ہو تو وہ تجاوز نہیں ہے۔

اور بعض صدقات نافلہ کے اعتبار سے ایک اور بھی جواب ہو سکتا ہے۔ وہ یہ کہ بعضے ان میں سے تامل کرنے سے فہرست واجبات ہی میں داخل معلوم ہوتے ہیں اور ان کو نفل کہنا با عتبار ان کی ذات کے قطع نظر خصوصیات سے ہے ورنہ عوارض کے اعتبار سے وہ واجب ہی ہے۔

"واجبات کی دو قسمیں ہیں"

پس واجبات کی مشہور فہرست مطلق واجب کی فہرست نہیں ہے بلکہ وہ واجبات موظفہ کی فہرست ہے۔ یعنی ایک وہ واجبات ہیں۔ جو فی نفسہ واجب ہے۔ عوارض و خصوصیات کا اس میں دخل نہیں۔ جیسے زکوٰۃ صدقۂ فطر وغیرہما خواہ کوئی مستحق پیش نظر ہو یا نہ ہو مال میں سے مقدار خاص نکالنا ضروری ہے۔ پھر مستحق کو تلاش کر کے اس تک پہنچانا ضروری ہے۔ ان کو واجبات موظفہ کہنا چاہیئے۔

دوسرے وہ واجبات کہ اگر کوئی مستحق معلوم نہ ہو تو اس کا تلاش کرنا ضروری نہیں۔ اس مرتبہ وہ نفل ہے لیکن اگر کوئی مستحق روبرو آجاوے اور اس کی احتیاج درجۂ اضطرار تک ہو یا کوئی مصرف دینی عارض ہو جاوے اور اس کی تکمیل درجۂ ضرورت تک ہو تو اس وقت اس میں خرچ کرنا واجب ہوگا۔ کہیں علی الکفایہ کہیں علی العین، مثلاً کوئی مسافر محلہ کی مسجد میں اترے اور سب اہل محلہ اپنے گھروں میں کھائیں پئیں اور اس کو نہ پوچھیں تو سب گنہگار ہوں گے۔ اس وقت اس کی اعانت سب اہل محلہ پر اور ان کی اعانت نہ کرنے کی صورت میں جس کو خبر پہنچی ان سب پر واجب ہے علی الکفایہ۔

اور اگر کوئی کھانا لے کر بیٹھا اور کھانا اس کی حاجت سے بہت زائد ہے اور ایسے میں کوئی گرسنہ آیا جس کی جان بھوک سے نکل جاتی ہے اور اس نے آکر اس شخص سے سوال کیا

تو حضرت استاذی مولانا محمد یعقوبؒ صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرماتے تھے کہ کیا کوئی اس کا قائل ہوسکتا ہے۔ کہ اس شخص پر اس سائل کو بقدر ضرورت کھانا دینا واجب نہیں اور یہ وجوب اس وقت علی العین ہوگا۔

پس حاصل یہ ہوا کہ بعض صورتیں صدقہ نافلہ کی بھی واجب ہیں اور تنفل اور وجوب کے اجتماع کا اشکال ابھی مرتفع کردیا گیا ہے۔ اور بعض صدقات نافلہ جو ہر حال میں نافلہ ہیں گو ایسے بہت کم نکلیں گے لیکن جتنے بھی ہوں وہ گو فہرست واجبات میں داخل نہ ہوں مگر ان میں جواب سابق جاری ہوگا۔ یعنی ہم کو دوسری فہرست بھی ملی ہے۔ پس دونوں فہرستوں پر عمل کرنا چاہیئے اور تارکین صدقہ نافلہ کے ذم میں یہ قید جو لگائی گئی کہ محض بخل کی وجہ سے الخ وجہ اس کی یہ ہے کہ سبب اس کا کبھی کوئی مصلحت باطنی ہوتی ہے یعنی افتقار وانکسار واسطے معالجہ عجب وادلال کے یا عدم حصول خشوع وخلوص یا حسم مادۂ مدح ومثل ذالک سو وہ مذموم نہیں لیکن یہ ترک اس مصلحت کے وجود تک محدود ہوتا ہے۔ اس کے بعد یہ ترک متروک ہوجاتا ہے۔ اور یہ مسئلہ فن سلوک کا ہے یہ مقام اس کے ذکر کا نہیں ہے۔ ایسے تارک نوافل کو اصطلاح میں قلندر کہتے ہیں۔ یہاں تک بحث تھی ترک صدقات نافلہ کی جو کہ اس کے متعلق ایک کوتاہی ہے۔

”صدقہ نافلہ میں زیادہ غلو بھی درست نہیں“

ایک کوتاہی اس باب میں اس کے مقابل یہ ہے کہ ان کو اس باب میں اس قدر غلو ہوتا ہے کہ گو حقوق واجبہ ضائع ہوجاویں۔ گو قرض خواہ روتے پھریں۔ مگر ان کو اس کا شوق ہے کہ کوئی سائل اور مسافر محروم نہ جاوے۔ خاص خاص تاریخوں میں خاص صدقات قضا نہ ہوں اور اس پر بعض اوقات خود بھی فخر کرتے ہیں اور دوسرے خود غرض لوگ اور بعضے بے غرض مگر کم فہم لوگ مدح بھی کرتے ہیں حدیث وابدأ بمن تعول (اپنے زیر پرورش والوں سے شروع کرو) اس طرز کو ناجائز بتلا رہی ہے حقوق واجبہ اہل وعیال کے ہوں یا قرض

خواہوں کے یہ ان نوافل سے مقدم ہے بلکہ اگر کسی کے ذمہ کوئی حق واجب بھی نہ ہو مگر اپنی طبیعت کے انداز سے جانتا ہے کہ ناداری کا تحمل نہ کرسکے گا تو ایسے شخص کو بھی جائز نہیں کہ تمام ذخیرہ مصارف خیر میں صرف کرکے خالی ہاتھ رہ جاوے۔ حدیث "افضل الصدقۃ ماکان عن ظھر غنی" بہترین صدقہ وہ ہے جو (کہ انسان تمام مصارف ضروریہ سے) بے نیاز ہوکر کرے" اس پر صاف دال ہے۔ اور اکثر تو ایسے لوگ ریاءً یا وافتخاراً خرچ کیا کرتے ہیں۔ سو اس کا مذموم ہونا ظاہر ہی ہے (یہاں چندہ جمع کرنے والوں کو بھی متنبہ ہونا چاہیئے کہ ایسے لوگ جو اپنی حیثیت سے زائد جوش میں آکر دینا چاہیں تو یہ حضرات نہ لیا کریں)

صدقہ صرف اللہ کے نام پر دینا چاہیئے کسی دوسرے کے نام پر دینا شرک ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی جو صدقہ نافلہ نکالتے ہیں ان کا دل گوارا نہیں کرتا کہ محض حق تعالیٰ کی خوشنودی کے لئے خرچ کریں۔ بلکہ وہ ہر چیز کو کسی پیر فقیر شہید ولی کے نامزد کردیتے ہیں۔ سو اگر خود وہ بزرگ ہی اس سے مقصود ہے تو وہ مااھل بہ لغیر اللہ۔ الآیۃ (یعنی جس پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو) میں داخل ہوکر بڑی دور یعنی حد شرک تک پہنچ گیا۔ اور بعض غلاۃ جہلاء کا واقعی یہی عقیدہ ہے۔ سو ایسی چیز کا تناول بھی درست نہیں۔

اور اگر مقصود اس عمل سے حق تعالیٰ ہے اور ان بزرگ کو محض ثواب ہی بخشنا ہے تو وہ اس حد تک تو نہیں پہنچا اور ظاہراً جائز بھی ہے۔ لیکن عوام بلکہ بعض خواص کالعوام کے حالات وخیالات کی تفتیش سے، معلوم ہوتا ہے کہ وہ لوگ محض ثواب ہی پہنچانے کو مقصود نہیں سمجھتے بلکہ ان کی نیت یہ ہوتی ہے کہ فلاں ولی کو ثواب پہنچے گا تو وہ خوش ہوں گے اور ہماری اس حاجت میں مدد کریں گے خواہ تصرف باطن سے اور زیادہ عقیدہ یہی ہے اور اس کا بھی قریب شرک ہونا ظاہر ہے۔ اور خواہ دعاء سے سو احتمال دعاء کا عقیدہ تو ناجائز نہیں۔ لیکن دو عقیدے اس میں بھی فاسد ہیں ایک اس احتمال

کے وقوع کا عقیدہ کرنا کہ جس پر کوئی دلیل نہیں اور بلا دلیل عقیدہ کرنا کذب نفس اور مخالف ہے۔ آیت "لاتقف مالیس لک بہ علم" جس کا تجھے علم نہیں اس کے پیچھے نہ پڑ" کی دوسرے بعد فرض وقوع دعا اس دعا کے بالقطع مقبول ہو جانے کا عقیدہ کرنا دعا تو بعض اوقات حضرات انبیاء علیہم السلام کی بھی کسی مصلحت سے قبول نہیں ہوتی۔ تا بغیر انبیاء چہ رسد۔

اس لئے مصلحت یہی ہے کہ جب بزرگوں کو کچھ بخشنا ہو اپنی حاجت کا خیال ان میں نہ ملایا کریں۔ کہ توحید کے خلاف ہے کما ذکر۔ اور اگر بہت ہی احتیاط کی تو اخلاص کے تو خلاف ہے۔ ایسی مثال ہو گئی کہ کسی زندہ کو ہدیہ دیا وہ سمجھا کہ محبت سے دیا۔ اور خوش ہوا پھر معلوم ہوا کہ کسی مطلب کو دیا فوراً وہ مکدر ہو جاوے گا۔

صدقہ میں ردّی اور خراب چیز نہ دینا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے۔ کہ اکثر لوگ اللہ کی نام کی وہ چیزیں نکالتے ہیں جو کسی کے کام کی نہ رہی ہو۔ مثلاً کھانا جب دیں گے کہ سڑ جاوے کپڑا جب دیں گے کہ گل جاوے۔ وعلی ھذا حق تعالیٰ کا ارشاد ولا تیمموا الخبیث منہ تنفقون ولستم باخذیہ الا ان تغمضوا فیہ واعلموا ان اللہ غنی حمید اور ردی چیز کی طرف نیت مت لے جایا کرو کہ اس میں سے خرچ کرو حالانکہ تم کبھی اس کے لینے والے نہیں۔ ہاں مگر چشم پوشی کر جاؤ (تو اور بات ہے) اور یہ یقین کر رکھو کہ اللہ تعالیٰ کسی کے محتاج نہیں تعریف کے لائق ہیں۔ اس باب میں کافی ہدایت ہے۔ حق تعالیٰ کا اس میں یہ ارشاد ہے :-

لن تنالوا البر حتی تنفقوا مما تحبون لے ط .... تم خیر کامل کو کبھی حاصل نہ کر سکو گے یہاں تک کہ اپنی پیاری چیز کو خرچ نہ کرو گے۔ اور اس سے یہ نہ سمجھا جاوے کہ پرانا کپڑا مثلاً خدا کی راہ میں دینا ممنوع ہے۔ حدیث میں نیا کپڑا پہن کر پرانا دیدینے کی خود فضیلت آئی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ یہ برا ہے۔ کہ جب دے ناکارہ چیز ہی دے اور اگر اصل عادت تو عمدہ چیز دینے کی ہو۔ اور پرانی چھوٹی چیز بھی دیدیا کرے تو مضائقہ نہیں تو ان دونوں میں فرق یہ ہے کہ پرانی ہی دیا

کرے اور پانی بھی دیا کرے۔ اول مذموم دوسرا ماذون فیہ

وارثوں کو محروم کر کے تمام مال خرچ نہیں کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے آدمی صرف وارثوں کو محروم کرنے کے لئے سب اندوختہ خیرات کر ڈالتے ہیں۔ مبنی اس غلطی کا یہ ہے کہ وارثوں کے لئے چھوڑ جانے کے ثواب کی ان کو خبر نہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسے ہی موقع پر یہ ارشاد فرمایا ہے:۔ وانک ان تذرو رثتک اغنیاء خیر من ان تذرھم عالۃ یتکففون الناس۔ اور تم اپنے ورثہ کو غنی، چھوڑ نا یہ بہتر ہے تیرے لئے اس سے کہ تم ان کو فقر کی حالت پر چھوڑ دو اور وہ لوگوں سے (بھیک) مانگتا پھرے۔ اور گو وہ ملک اضطراری ہے۔ جس میں مورث کے قصد کو بھی دخل نہیں۔ لیکن حدیث میں ہے کہ کھیت میں سے اگر کوئی بہیمہ کھا جاوے تو کھیت والے کو ثواب ملتا ہے۔ تو کیا مسلمان وارث بہائم سے بھی گئے گذرے ہوئے۔

کوئی تاریخ متعین کر کے صدقہ دینا بدعت ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض صدقات کو بطریق بدعت خرچ کرتے ہیں۔ جیسے خاص تاریخوں کی پابندی سے یا میت کے رسوم میں اس کی تفصیل اصلاح الرسوم میں ملاحظہ فرمائی جاوے۔

میت کی کوئی چیز وارثوں کی اجازت کے بغیر صدقہ کرنا درست نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر شرائط شرعیہ کا لحاظ نہیں کرتے۔ خواہ وہ شرائط ظاہرہ ہوں۔ مثلاً میت کے کپڑے حسب رواج سب نکال کر مدارس و مساجد و مساکین کو دیدیئے جاتے ہیں۔ حالانکہ ترکہ مشترکہ میں بالغین کا اذن شرط ہے اور اذن بھی وہ جو بطیب خاطر ہو شرم اور لحاظ اور پابندی رسم کی مجبوری سے نہ ہو۔ اور نابالغوں کا اذن بھی معتبر نہیں یہ بلا بھی بہت عام ہے۔ اور خواہ شرائط باطنہ ہوں مثلاً قبول ہونے کی یہ شرط ہے کہ ریا و افتخار سے نہ ہو مال حرام سے نہ ہو اس میں بہت بے پروائی ہے۔ اکثر نمائش کے لئے خرچ ہوتا ہے۔ اکثر سود اور رشوت سے نیک

کاموں میں لگاتے ہیں اور یہ بھی شبہ نہ کرے کہ حلال اس زمانے میں کہاں ہے۔ تو کیا نیک کاموں میں خرچ کرنا بالکل ہی چھوڑ دیں۔ جواب یہ ہے کہ یہی غلط ہے کہ اس زمانہ میں حلال نہیں۔ ابواب فقیہہ دیکھنے سے معلوم ہوگا کہ معاملات میں بہت توسع ہے۔ پھر اگر حلال غالب بھی ہو تب بھی صرف کرنا امور خیر میں جائز ہے۔ گو اس میں جتنا جز حرام ہے۔ اس کی تحصیل کا گناہ مستقل ہوگا۔ فمن یعمل مثقال ذرۃ خیرا یرہ ومن یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ ط جو شخص ذرہ برابر نیکی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا اور جو شخص ذرہ برابر بدی کرے گا وہ اس کو دیکھ لے گا۔

خلاصہ مضمون سابق

(تسہیل مضمون مذکور برعایت تفہیم جمہور)

مسئلہ: علاوہ صدقات واجبہ کے کبھی کبھی کسی قدر نفل صدقہ بھی نکالا کرو اور حاجتمندوں کو دیا کرو اور نیک کاموں میں خرچ کیا کرو۔ مسئلہ: نفل صدقہ میں یہ خیال کیا کرو کہ کسی کا حق واجب ضائع نہ ہو۔ مثلاً اپنے اہل وعیال کو پہلے دو۔ کسی کا قرض آتا ہو۔ اس میں پہلے دو۔ جب ان سب سے بچے نیک راہ میں اٹھاؤ۔

مسئلہ: بعض نفل صدقہ بعض خاص موقع پر واجب ہو جاتے ہیں۔ جیسے کوئی بھوکا آجاوے۔ تو ہمارے پاس کھانا زیادہ موجود ہو تو اس کی امداد واجب ہوگی۔ یا کہیں اشاعت علوم دینیہ کی ضرورت ہو۔ اور وہاں مدرسہ قائم کیا جاوے۔ تو سب پر واجب ہوگا کہ چندہ

علوم دینیہ کی ضرورت ہو۔ اور وہاں مدرسہ قائم کیا جائے تو سب پر واجب ہوگا کہ چندہ سے اعانت کریں مسئلہ: اتنا خیرات نہ کر ڈالے کہ خود محتاج ہو کر بیٹھ رہے۔ اور پھر صبر نہ ہو سکے۔ اس لئے گناہوں میں مبتلا ہو جاوے۔ مسئلہ: جو شخص اپنی گنجائش سے زیادہ دے لینے والے کو چاہیئے نہ لے اور سمجھاوے۔ مسئلہ: بعضے لوگ بزرگوں کو اس لئے ثواب پہونچاتے ہیں کہ وہ خوش ہو کر ہمارا کام کر دیں گے۔ سو یہ شرک ہے اور اگر یہ سمجھے کہ دعا کریں گے اور وہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ تو یہ دونوں مقدمات بھی غلط ہیں۔ نہ تو کہیں یہ ثابت ہے کہ وہ ضرور دعا کریں گے۔ اور نہ یہ ثابت ہے کہ دعا ضرور قبول ہوگی۔ پس ایسی مشکوک بات کا پختہ یقین کر لینا بھی گناہ ہے۔ مسئلہ: اللہ کی راہ میں جو چیز دی جاوے وہ اچھی کارآمد ہونا چاہیئے۔ ایسا شخص کبھی پرانے پھٹے بھی دیدے۔

تو اجازت ہے اور ہمیشہ نکمی ہی چھانٹ کر دینا یہ برا ہے۔ مسئلہ: جس کے وارث موجود ہوں۔ اپنا تمام مال خیرات میں نہ لٹا دیوے۔ خاص کر جب وہ حاجت مند ہوں۔

مسئلہ: بعض بدعات کا رواج ہوگیا ہے۔ ان میں صرف کرنے سے ثواب نہیں ہوتا پس ان میں خرچ نہ کرے۔ مسئلہ: مردہ کے سب کپڑے اللہ کی راہ میں اس طرح دیدینا کہ نہ غیر حاضر وارثوں سے اجازت لی جاوے۔ اور نہ نابالغوں کے حصہ بدلا ان کو دیا جاوے۔ جیسا عام رواج ہو رہا ہے جائز نہیں۔

مسئلہ: صدقہ قبول اس وقت ہوتا ہے جب کہ اس میں نمائش نہ ہو۔ فخر و قصد شہرت نہ ہو۔ اور مال بھی حلال ہو۔ اگر کسی کے حلال خالص نہ ہو۔ تو حلال غالب ہو۔ مثلاً دس روپے میں اگر چھ حلال۔ اور چار حرام ہوں۔ اور ان سب روپیوں میں تمیز نہ رہے تو مجموعہ کو نیک کام میں کرنا جائز ہے۔ اگرچہ ان چار روپیوں کے کمانے کا گناہ الگ ہوگا۔

مختلف مالی تبرعات کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بہ تبرعات مالیہ متفرقہ)

منجملہ تطوعات مالیہ ملحقہ بزکوٰۃ کے اور بھی بعض اعمال ہیں۔ جن میں مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں مختصراً ان کا بیان بھی مناسب مقام ہے۔ ایک ان میں سے سائل کو دینا ہے۔ اس میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ بعض دینے میں اور بعض نہ دینے میں۔

سائل سے بے رخی اور اسے تکلیف نہیں پہنچانا چاہیئے بلکہ اسے دیکھ کر اللہ کی نعمت یاد کرنا چاہیئے۔

چنانچہ بعضے تو بوجہ بخل یا بے رحمی کے سائل سے نہایت نفرت اور بے رخی کرتے ہیں۔ گو وہ کیسا ہی محتاج یا اپاہج ہو۔ اس کے حال پر ذرا توجہ نہیں کرتے بلکہ بعضے تو بالعکس اس سے تمسخر یا اس کے ساتھ سختی کرتے ہیں۔ دھکے دلوا دیتے ہیں۔ پٹواتے ہیں۔ قرآن و حدیث میں سائل کا بڑا حق آیا ہے۔ دوسرے سائل کو دیکھ کر حق تعالیٰ کی نعمت کو یاد کرنا چاہیئے کہ ہم کسی کے دروازے پر سائل نہیں ہوئے۔ اور اس نعمت کے شکر میں سائل پر رحم اور اس کی اعانت کرنا چاہیئے۔

اس مضمون کو شیخ شیرازی رحمۃ اللہ علیہ نے نظم میں خوب ادا فرمایا ہے۔

نہ خواہندہ بر در دیگراں

بشکرانہ خواہندہ از در مراں

البتہ یہ ضروری نہیں کہ جو مانگے وہ ضرور ہی دے۔ یہ اس کی حاجت اور اپنی گنجائش پر ہے اور اگر اتفاق سے دینے کو نہ ہو تو اس کو نرم جواب دیکر سمجھا دے کہ اس وقت میرے پاس گنجائش نہیں ہے۔ اگر دوسرے وقت وسعت ہوئی اور تمہاری حاجت اس وقت تک رفع نہ ہوئی تو انشاء اللہ تعالیٰ خیال رکھوں گا۔

صدقہ دیکر احسان جتلانا ممنوع ہے

اور بعضے دے تو دیتے ہیں لیکن دیکر اس کو خریدنا چاہتے ہیں یعنی اس کے منتظر رہتے ہیں کہ وہ ہمارا احسان مند ہو۔ ہمارا شکریہ ادا کرے۔ جب ہم سے ملے ہم کو سلام کرے۔ اگر ہم کچھ حکم دیں تو وہ اس کا امتثال کرے اور اگر سائل کی طرف سے کسی امر میں کوتاہی ہو تو اس کو سخت تعجب ہوتا ہے اور ناگوار گذرتا ہے اور آئندہ کو سلسلہ احسان کا بند کرنے کا ارادہ کر دیتے ہیں بالخصوص اگر اس کی طرف سے کسی معاملہ میں، گو اس میں وہ سائل ہی حق پر ہو۔ صفائی کا برتاؤ عمل میں آوے تو اس وقت تو صاف صاف کہتے ہیں کہ یہ بڑا نمک حرام ہے۔ ہم نے اس اس طرح اس پر احسان کئے اور اس نے ہمارا خیال نہ کیا۔

اس طرح بے مروتی کی من و اذیٰ جس کی ممانعت قرآن مجید میں آتی ہے وہ یہی ہے۔ اس سے صدقہ کا اجر باطل ہو جاتا ہے حق تعالیٰ شانہ نے ایسے دینے والوں کی مدح و فضیلت بیان فرمائی ہے جو دیکر اس کا صلہ اور شکریہ نہیں چاہتے۔ لوجہ اللہ خدمت کرنا یہی ہے ــ قال اللہ انما نطعمکم لوجہ اللہ لا نرید منکم جزاء ولا شکورا۔..... ہم تم کو محض خدا کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں۔ نہ ہم تم سے (اس کا فعلی) بدلہ چاہیں اور (اس کا قولی) شکریہ (چاھیں)

بعضے اس کے مقابل یہ افراط کرتے ہیں کہ ہر سائل کو دنیا فرض سمجھتے ہیں بعضے تو تفاخر

کے واسطے کہ نام ہوگا کہ فلاں شخص کے پاس سے کوئی سائل محروم نہیں آتا اور بعضے بوجہ غایت تدین
وقلت علم کے کہ اس کی حاجت روائی کو فرض شرعی سمجھتے ہیں۔ اور بعضے بوجہ طمع یا خوف دینوی،
کے کہ وہ سمجھتے ہیں کہ شاید اس پردہ میں کوئی کامل ہو۔ اس کی خدمت کرنے سے ہم مالامال
ہوجاویں گے۔ مال میں اولاد میں ترقی ہوگی۔ اور اگر نہ دیں گے۔ شاید بددعا کریں۔ یا ناراض
ہوجاویں۔ تو ہم برباد ہوجاویں گے اور اس افراط کے سبب (جس کا منشا مختلف ہے
کہ بعض میں تفاخر بعض میں کثرت تدین ہے اور قلتہ العلم بعض میں غرض دینوی) یہ لوگ
اکثر قرض دار بھی ہوجاتے ہیں اور اس قرض کا خمیازہ کبھی اپنے کو بھگتنا پڑتا ہے۔ کبھی اولاد
کو کبھی ادا نہیں ہوتا۔ اور آخرت کا گناہ سر پر رہتا ہے۔ حق تعالیٰ نے یہ نہیں اجازت دی
کہ خود ننگے ہوجاؤ مگر سائل کا پیٹ بھرو۔ قال اللہ تعالیٰ لا تجعل یدک مغلولۃ الی عنقک
اور نہ رکھ اپنا ہاتھ بندھا ہوا اپنی گردن کے ساتھ۔ اس میں تفریط مذکور اولاً کی اصلاح ہے)۔
ولا تبسطہا کل البسط فتقعد ملوما محسورا۔ اور نہ کھول دے اس کو بالکل، پھر تو بیٹھ رہے
الزام کھایا ہارا ہوا (یعنی ایسی کشادہ دستی نہ دکھلا کہ پھر بھیک مانگنی پڑے)

کمانے کے قابل شخص کو سوال کرنا جائز نہیں

بلکہ بعض اوقات باوجود اپنی گنجائش دینے کے بھی بعض مسائل کو دینا بجائے ثواب یا
جائز کے گناہ اور ناجائز ہوتا ہے۔

فقہاء نے تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک سائل قوی مکتسب ہو۔ یعنی ہاتھ پاؤں سے درست
ہو اور معاش کی قدرت رکھتا ہو تو ایسے سائل کو سوال کرنا بھی حرام ہے اور سوال پر اس کو
دینا بھی بدیں وجہ کہ اعانت علی المعصیت ہے۔ ناجائز ہے اور جب ناجائز ہوا۔ تو ایسے دینے
سے وہی مثل ہوگئی۔ نیکی برباد گناہ لازم اور اکثر تو بلا ٹالنے کے لئے اس طرح دیتے ہیں کہ ثواب کی
بھی نیت نہیں ہوتی۔ تو اس صورت میں ثواب نہ ملنا اور زیادہ ظاہر ہے۔
اور ان لوگوں نے ایک غلطی یہ کی کہ یہ تو سمجھ لیا کہ ہم پر سے بلا ٹل گئی لیکن یہ نہ سمجھا کہ ہمارے
دینے سے سائل یہ سمجھے گا کہ لپٹنے سے اور سر ہوتے ہی سے ملا کرتا ہے۔ تو یہ سمجھ کر اور بھائی

مسلمانوں کو پریشان کرے گا۔ تو اپنی بلا تو ٹالی مگر وہ بلا اوروں کے سر ڈالی۔ البتہ اگر ایسے قوی مکتسب کو بلا سوال دیدے تو کچھ مضائقہ نہیں یا باوجود قوی مکتسب ہونے کے بعض صورتوں کا استثنا بھی آیا ہے۔ ان مواقع استثنا میں سوال پر دیدے بھی تو جائز ہے۔ کیونکہ ان مواقع میں سوال بھی جائز ہے۔ اور وہ مواقع یہ ہیں۔

لا تحل الصدقة لغنی ولا لذی مرة سوی الا لذی فقر مدقع او غرم مفظع او لذی دم موجع الحدیث.... صدقہ نہ غنی کے لئے حلال ہے اور نہ قوی و تندرست کے لئے مگر (تین شخصوں کے لئے) ایسے[۱] فقیر کے لئے جس کو فقر نے مٹی کے ساتھ ملا دیا ہو یا[۲] بھاری قرض دار کے لئے یا[۳] ایسے شخص کے لئے جس پر دیت واجب ہو اور اس کو ادا کرنے کی طاقت نہ ہو۔

حاصل ان مواقع کا یہ ہے کہ اس شخص پر بوجہ قرض کے یا کسی مقدمے کے یا ایسے ہی کسی سبب کے مالی بار اتنا پڑا کہ اگر یہ کمانا شروع کرے تب بھی اتنا ذخیرہ جمع نہ ہو سکے کہ روز مرہ کے حوائج پورے ہو کر اس بار سے سبکدوشی حاصل کر سکے تو ایسا شخص اگر سوال نہ کرے تو پھر کیا تدبیر کرے اس لئے ایسے شخص کو سوال کی اجازت ہے جب سوال جائز ہے تو پھر کیا تدبیر کرے اس لئے ایسے شخص کو سوال کی اجازت ہے جب سوال جائز ہے تو اس کے سوال پر دینا بھی جائز ہے اور اسی حکم میں ہے۔ وہ مسافر جس کو سفر میں کوئی خسارہ یا حاجت ایسی پیش آ گئی کہ اگر کمانا شروع کرے تو بس سفر ہی میں رہا کرے۔ گھر نہ پہنچ سکے اور گھر سے بھی خرچ منگانا یا تو ممکن نہ ہو، یا اتنی مہلت نہ ہو اور اسی حکم میں وہ شخص بھی ہے جو قوی تو ہے مگر بوجہ خوگر نہ ہونے کے متحمل تعب کا نہیں اس لئے مکتسب نہیں ہو سکتا۔ پس ان سب لوگوں کو سوال پر بھی دینا جائز ہے۔

اور اگر سبب اس افراط کا تفاخر و شہرت یا طمع وخوف دنیوی ہے تو اس دینے کا بیکار ہونا بلکہ موجب گناہ ہونا بہت ہی ظاہر ہے اور بالخصوص اگر یہ طمع وخوف بے شرعی فقیروں سے ہے جیسا اس زمانہ میں اکثر دنیا پرست لوگ ایسے بھنگڑوں کو غوث وقطب سمجھ کر اپنا مال اور دین دونوں خراب کرتے ہیں تو اس کو تو مصداق طلب بعضہا فوق بعض کا کہیں گے۔

یہ ذکر تھا سائل کے دینے نہ دینے کے متعلق کوتاہیوں کا۔ اور ایک ان اعمال مالیہ مقصودہ بالذکر میں سے قرض مانگنے والے کو قرض دینا ہے۔ اس میں بھی چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔

اگر گنجائش ہو تو قرض مانگنے والے کو قرض دینا چاہیئے

ایک یہ کہ بعضے لوگ باوجود اس کے کہ اپنے پاس حاجت سے زائد رقم رکھی ہے یا بآسانی انتظام کر سکتے ہیں اور مانگنے والا سخت حاجت مند ہے اور بے اعتبار بھی نہیں مگر پھر بھی غایت بے رحمی سے قرض دینے سے انکار کر دیتے ہیں۔ بعض اوقات جھوٹ بولتے ہیں کہ ہمارے پاس نہیں ہے۔ وجہ اس کی یا بخل ہے یا بے رحمی ہے یا جہل، کہ یہ سمجھتا ہے کہ قرض دینے سے فائدہ کیا ہوگا اس لئے نہ دینا تجویز کرتا ہے اگر بخل یا بے رحمی ہے تو اس کا مذموم ہونا ظاہر اور مسلم ہی ہے۔ محتاج بیان نہیں اور اگر جہل ہے تو اس کا فائدہ سمجھانا ضرور ہے۔ تاکہ اس علم سے وہ جہل مرتفع ہو جاوے سو اول تو جس قلب میں ترحم کا جوش ہوتا ہے وہ اسوقت فائدہ کو بھی نہیں سوچتا خود ترحم حامل علی الاعانۃ ہوتا ہے۔ کیا جو شخص اپنی اولاد کی پرورش کرتا ہے گو اسمیں فائدہ بھی ہے دنیا کا بھی آخرت کا بھی۔ مگر کیا پرورش کے وقت اس فائدہ کو سوچتا ہے کیا اگر فائدہ نہ سوچے تو پرورش نہ کرے گا۔ پس مسلمانوں میں باہم وہی تراحم و توادد ہونا چاہیئے جو اقارب میں ہوتا ہے۔

اگر بدون فائدہ سمجھے ہوئے قرض دینے کی ہمت نہ ہو تو فائدہ بھی سمجھ لینا چاہیئے اور گو فائدہ دنیوی بھی ہے مثلاً ممنون کے قلب میں محسن کی محبت پیدا ہونا باہم الفت و ہمدردی بڑھنا، لیکن مسلمانوں کو مسلمان ہونے کی حیثیت سے فائدہ دنیویہ کو مطمح نظر نہ بنانا چاہیئے اس لئے اس سے قطع نظر کر کے فائدہ اخرویہ سمجھنا چاہیئے اور وہ ثواب ہے جو کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور اقدس رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ میں نے جنت کے دروازہ پر لکھا دیکھا کہ صدقہ دینے سے دس گنا ثواب ملتا ہے اور قرض دینے سے اٹھارہ گنا اور حدیث میں اس کی وجہ بھی آئی ہے کہ صدقہ تو وہ شخص بھی مانگ لیتا ہے جس کو حاجت نہ ہو۔ مگر قرض بدون حاجت کے (اور حاجت بھی اکثر اضطراری) کوئی نہیں مانگتا کیوں کہ اپنی گردن کو کون بندھائے) یعنی غالب عادت یہی ہے۔ پس صدقہ دینے میں ضروری نہیں کہ رفع اضطرار ہوا ہو اور قرض دینے میں رفع اضطرار ہوتا ہے اور اضطرار اور پریشانی کا رفع کرنا ظاہر ہے کہ کس قدر عظیم راحت پہنچاتا ہے اس

لئے اس کا ثواب زیادہ ہوا۔

رہ گئی تخصیص اٹھارہ عدد کی۔ گو اس کا نکتہ نہ سمجھنا ہم کو ضروری ہے اور نہ سمجھانا۔ کیونکہ طبیب کے نسخہ میں مریض کو منصب نہیں اوزان ادویہ کی لم دریافت کرنے کا بلکہ استعمال اور اعتقاد ضروری ہے۔ اسی طرح ہمارا مذہب بندہ ہونے کی حیثیت سے یہ ہونا چاہئیے۔

زبان تازہ کردن باقرار تو
نینگیختن علت از کار تو

حدیث میں اٹھارہ عدد کی تخصیص کیوں کی گئی۔

مگر تبرعاً و تفریحاً اگر کوئی تقریبی بات سمجھ میں آجاوے تو اس کے ذکر کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں لیکن چونکہ وہ تقریبی اور تخمینی مضمون ہوگا اس لئے اگر اس میں کوئی خدشہ نکل آوے تو مضر بھی نہیں کیونکہ اصل ایمان نص پر ہے نہ کہ اپنے نکات و لطائف پر غرض وہ نکتہ جو خاطر فاتر میں اس کے متعلق آیا ہے یہ ہے کہ اصل میں ثواب قرض کا صدقہ سے بحیثیت مذکورہ دونا ہے۔ پس صدقہ اگر دس تک مضاعف ہوتا ہے تو قرض بیس تک ہونا چاہیئے۔ تو قرض کا ایک درہم صدقہ کے دو درہم کے برابر ہوا لیکن چونکہ وہ درہم واپس آجاوے گا۔ اس لئے بیس کے عدد میں سے دو عدد کم ہوگئے اس لئے اٹھارہ رہ گئے۔ واللہ اعلم

اور جب قرض کا ثواب صدقہ سے مضاعف ہونا معلوم ہوگیا۔ تو اسی سے یہ بھی سمجھ لینا چاہئیے کہ نصوص سے ثابت ہے کہ دس حصہ تک ثواب کا بڑھنا یہ ادنیٰ درجہ ہے۔ ورنہ تفاوت خلوص سے اس سے بڑھ کر سینکڑوں ہزاروں تک پہنچتا ہے۔ پس صدقہ کا ثواب دس سے زائد بھی ہوتا ہے او قرض کا ثواب اس سے مضاعف بھی ہے اور اخیر میں ایک عشر منہا ہوجاتا ہے پس قرض کا ثواب بھی اٹھارہ تک محدود نہیں بلکہ کبھی چھتیس حصہ ہوگا۔ یعنی چالیس حصہ ہو کر چار گھٹ جاوے گا اور کبھی اسی ہو کر اس میں سے آٹھ گھٹ کر بہتر رہ جاوے گا۔ حتیٰ کہ اگر صدقہ کا ثواب سات سو تک ہو تو قرض کا ثواب چودہ سو تک ہوگا جو اخیر میں بارہ سو ساٹھ رہ جاویں گے تو کیا یہ فائدہ نہیں ہے کہ ایک روپیہ قرض دیا اور آخرت میں مثلاً بارہ سو ساٹھ روپے کا ثواب ملا۔

خود کہ یابد ایں چنیں بازار را
کہ بہ یک گل میخری گلزار را

نیم جاں بستاند و صد جاں دہد
آنچہ در وسعت نیاید آں دہد

اور یہ عدد تو بطور مثال کے فرض کیا گیا ورنہ جب صدقہ میں سات سو کی حد نہیں لقولہ تعالیٰ بعد قولہ۔ انبتت سبع سنابل فی کل سنبلۃ مائۃ حبۃ واللّٰہ یضاعف لمن یشاء واللّٰہ واسع علیم ط

اگیں سات بالیں ہر بال میں سو سو دانے، اور اللہ بڑھاتا ہے جس کے واسطے چاہے، اور اللہ نہایت بخشش کرنے والا ہے، سب کچھ جانتا ہے۔

تو قرض میں بھی بارہ سو ساٹھ کی حد نہ ہو گی۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ توقع ہے۔ کیا اس کو بھی فائدہ نہ کہے گا۔

اور تضاعف ثواب القرض علی ثواب الصدقۃ کی تقریر کی تفصیل میں جہاں خاطر فاترہ کا حوالہ ہے بحیثیت مذکورہ کی قید اس لئے لگائی گئی کہ اس سے کوئی نہ سمجھ جاوے کہ قرض کا ثواب علی الاطلاق صدقہ سے مضاعف ہوتا ہے۔ اور یہ سمجھ کر یا تو صدقہ کی جگہ بھی قرض ہی دینے لگے۔ اور یا کہ صدقہ میں بے رغبت ہو جاوے۔ اور اس میں خسارہ سمجھے۔ سو یہ بات ہے کہ مختلف احکام مختلف حیثیات سے ہوتے ہیں۔ سو ایک حیثیت سے تو جس کا کہ ذکر ہوا قرض کا ثواب زیادہ ہے مگر دوسری حیثیات سے صدقہ کا ثواب قرض سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔ مثلاً قرض میں واپسی ہوتی ہے۔ صدقہ میں واپسی نہیں ہوتی۔ اور اس وجہ سے صدقہ لینے والے کے قلب پر کوئی بار نہیں رہتا۔ اور قرض لینے والے کے قلب پر بار رہتا ہے۔

ایک خدشہ کا ازالہ

اور ہم نے قرض دینے میں فائدہ دنیویہ بیان کیا ہے کہ باہم الفت و محبت و ہمدردی بڑھتی ہے گو یہ فائدہ مقصود نہیں۔ مگر چونکہ واقعی ہے اس لئے اس پر کوئی خدشہ واقع ہو۔

تو اس کا رفع کرنا ضروری ہے۔ تو اس میں ظاہراً ایک خدشہ ہے وہ یہ کہ ہم تو اکثر اس کے خلاف یہ دیکھتے ہیں کہ قرض دینے سے پہلی الفت بھی قطع ہو جاتی ہے اور ہمیشہ کے لئے باہم رنج و کدورت پیدا ہو جاتی ہے۔ چنانچہ ایک تجربہ کار بزرگ کا ارشاد ہے۔

مدہ شان قرض و ستان نیم حبہ
فان القرض مقراض المحبہ

تو آلہ فصل کو آلہ وصل کہنا کیسے صحیح ہوگا۔ دفع اس خدشہ کا یہ ہے کہ یہ قطع محبت اثر قرض کا نہیں ہے اس کا اثر تو وہی ہے جو اوپر مذکور ہوا یعنی ازدیاد محبت و الفت، بلکہ یہ اثر متقرضین، یعنی لینے والوں کی بدتدبیری کا ہے۔ وہ یہ کہ اکثر لوگوں کی حالت دیکھی جاتی ہے۔ کہ قرض لے کر بے فکر ہو جاتے ہیں۔ باوجود گنجائش کے اور تمام فضول کارروائیوں کے قرض کے ادا کا اہتمام نہیں کرتے۔ بعضے تو بہت ہی ٹال کر دیتے ہیں اور بعضے دیتے ہی نہیں۔ اگر تقاضا کیجئے برا مانتے ہیں۔ اور ان کی اس حرکت سے مقرض (یعنی قرض دینے والے کو) کلفت ہوتی ہے۔ اور جب یہی کلفت روز مرہ مدتوں تک پہنچے تو ضرور اس کا اثر یہ ہوگا کہ محبت قلب سے نکل جاوے گی اور رنج و شکایت پیدا ہو جاوے گی۔ تو اپنی بے عنوانی کے اثر کو قرض کی طرف منسوب کرنا بڑی غلطی ہے۔ پس خدشہ رأساً و اساساً منقلع و منقطع ہو گیا۔

لیکن معمولی کلفت سے تنگ دل ہو کر قرض دینے کا سلسلہ بند نہ کرنا چاہیئے کیونکہ یہ بھی اجر سے خالی نہیں۔ احادیث میں اس سے کم تنگ دلی پر وعدۂ ثواب آیا ہے کہ اگر کوئی چیز کہیں رکھ کر بھول جاؤ اور اس کی تلاش میں قدرے پریشانی ہو۔ پھر وہ مل جاوے تو اس میں بھی ثواب ہے۔ تو قرض وصول نہ ہونے پر یا وقت پر وصول نہ ہونے پر تو اس سے بہت پریشانی ہوتی ہے۔ تو اس میں اس سے زیادہ اجر کیوں نہ ملے گا۔ اس لئے بقدر تحمل اتلاف کو بھی برداشت کر لینا چاہیئے لیکن اس کے ساتھ قرض لینے والے کو بھی وصیت کرتا ہوں کہ اس کو بھی چاہیئے کہ قرض دینے والے کا احسان مانے۔ اور اس کو تکلیف نہ دے۔ اور وقت پر اس کی امانت پہنچا دے تاکہ پھر بھی قرض لینے کا منہ رہے۔

اور اس نادہندی کی بدولت آپس میں قرض نہیں ملتا۔ پھر کافروں سے سودی لیتے ہیں۔

اور تباہ ہوتے ہیں۔ ورنہ اگر وقت پر دوسرے کا حق پہنچ جایا کرے۔ تو بہت مسلمان ایسے ہیں کہ وہ خود اپنی مصلحت سے اپنے روپیہ کا قرض پر چلتا رہنا زیادہ پسند کرتے ہیں کہ حفاظت سے بچتے ہیں۔ اور تجارت کو یہ لوگ پسند نہیں کرتے۔ یا تو بوجہ احتمال خسارہ کے اور یا بوجہ توحش تعلقات کے۔ یا بوجہ عدم مناسبت کے تو ایسے لوگوں کا روپیہ قرض میں بآسانی مل سکتا ہے اور غیر قوموں کو سود دے کر اپنا گھر تباہ ہونے سے بچا سکتے ہیں۔ لیکن معاملات خراب ہیں کہ لے کر دینا نہیں چاہتے۔ دو چار جگہ ٹھوکر کھا کر سب سے متوحش ہو جاتا ہے اور بقول شخصے دودھ کا منہ جلا چھاچھ کو بھونک پھونک کر پیتا ہے۔ وہ کسی کو بھی قرض نہیں دیتا۔ اور ایک باب عظیم خیر کا بند ہو جاتا ہے جس کا وبال ان نادہندوں کی گردن پر ہوگا۔ اس کوتاہی مذکور کا حاصل تو قرض نہ دینا ہے۔ جس کا مفصل بیان ہو چکا۔

نادار کو مہلت دینا قرآن کی رو سے واجب ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قرض تو دیدیتے ہیں لیکن تقاضا بیڈھب کرتے ہیں وقت آنے پر مہلت دینا جانتے ہی نہیں۔ حالانکہ بنص قرآنی "وان کان ذو عسرۃ فنظرۃ الیٰ میسرۃ" اور اگر وہ تنگ دست ہے تو (اس کو) کشادہ حالی تک مہلت دینی چاہیئے"

تنگ دست نادار کو مہلت دینا واجب ہے اور اس کی بھی فضیلت احادیث میں آئی ہے۔

رہن کی چیز سے نفع حاصل کرنا سود میں داخل ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بدون سود کے قرض نہیں دیتے۔ پھر سود کے طریقے مختلف ہیں۔ بعضی صورتیں تو وہ ہیں جن کو یہ لوگ بھی سود سمجھتے اور کہتے ہیں یعنی آدہ آنہ روپیہ پر لینا یا آنہ روپیہ پر لینا۔ اور بعضی وہ صورتیں ہیں جن کو سود نہیں سمجھتے۔ مگر واقع میں وہ سود ہیں۔ جیسے رہن رکھکر اس سے نفع حاصل کرنا۔ اس کا سود ہونا مع جواب شبہات عوام وخواص کے رسالہ صفائی معاملات میں احقر نے ثابت کر دیا ہے۔ اور بھی تاجروں میں بہت صورتیں متعارف ہیں پھر ان دونوں قسم کے سود لینے والوں میں بعضے ایسے جری ہیں کہ اس کو حلال سمجھتے ہیں۔ کوئی بعض عبارات فقہیہ سے

بزعم خود تمسک کرتا ہے۔ کوئی تمدنی و قومی مصلحتوں کو شریعت پر مقدم ثابت کرنے کی کوشش کرتا ہے کوئی حربی کی روایت کو پیش کرتا ہے۔ علمار شکر اللہ تعالیٰ سعیہم (اللہ تعالیٰ ان کی کوشش کا بدلہ دے) نے ان سب کی اچھی طرح اپنی تحقیقات لسانیہ و کتابیہ میں خدمت کر دی ہے۔ بندہ نے بھی بقدر ضرورت رسالہ صفائی معاملات میں جس کا اوپر حوالہ ہے اور رسالہ تحذیر الاخوان میں اور اپنی تفسیر بیان القرآن تحت آیۃ یاایہا الذین امنوا اتقوا اللہ وذروا ما بقی من الربوا الخ لے ایمان والو ڈرو اللہ سے اور چھوڑ دو بقایا سود کو، میں اس کی کافی بحث لکھدی ہے۔ اور اس کا مطالعہ منصف کے لیئے انشاء اللہ کافی ہے۔

اور سود کی ان صورتوں میں سے کوئی صورت ظاہر میں بھی تو کسی ضابطہ فقیہہ پر منطبق نہیں۔ بجز ایک صورت بیع بالوفار کے اور ایک صورت اس کی بھی خارج از ضابطہ ہے۔

بیع بالوفار کی تحقیق

تفصیل یہ ہے کہ اس وقت کے عرف میں دو معنے بیع بالوفار کے مشہور ہیں۔ ایک تو یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ ہم کو ایک ہزار روپے قرض دے کر ہمارا باغ رہن رکھ لو اس شرط پر کہ اگر ہم دس سال کے اندر ہزار روپیہ ادا کردیں تو اپنا باغ چھڑالیں اور اگر نہ ادا کریں تو وہ باغ اسی ہزار روپے میں تمہارے ہاتھ بیع ہے اور دوسرے یہ کہ زید نے عمرو سے کہا کہ تم ہمارا باغ ہزار روپے میں خرید لو اور زر ثمن ہمیں دیدو۔ اور یہ وعدہ ہے کہ اگر ہم دس سال میں تمہارا زر ثمن واپس کردیں تو تم ہمارا باغ واپس کردو۔ اور بیع کا اقالہ یعنی فسخ کردو۔

سو اول معنی کے اعتبار سے تو بالاجماع حرام اور سود ہے اور دوسری صورت کو بھی فقہار متقدمین نے منع کیا ہے لیکن بعض متاخرین نے لوگوں کو مبتلا سود دیکھ کر اجازت دیدی ہے۔ اگر کسی شخص کا دل بوجہ غایت بے مروتی کے ویسے قرض دینے کو گوارا نہ کرے اور بوجہ ضعف قوت تقویٰ کے وہ متقدمین کے قول کو بھی نہ لے۔ تو خیر سود کی اور صورتوں سے بیع بالوفار (یعنی بالمعنی الثانی) پھر غنیمت ہے کہ حرمت اس کی متفق علیہ تو نہیں لوگوں کی کم ہمتی پر نظر کرکے بادل ناخواستہ کہتا ہوں کہ خیر اسی کو کرلیا کریں اور وں سے تو بچیں۔ یہ بحث تھی قرض کے متعلق کوتاہیوں کی۔

کوئی چیز عاریت دینے میں بخل نہ کرنا چاہیئے

اور ایک ان اعمال مالیہ مقصودہ بالذکر میں سے کسی کو کوئی چیز عاریتاً دینا ہے۔ اس میں بھی بعض لوگ بہت بخل کرتے ہیں۔ حق تعالیٰ نے اس میں بخل کرنے کو ناپسند اور اعمال منافقین سے فرمایا ہے۔ حیث قال فویل للمصلین الذین ھم عن صلوتھم ساھون الذین ھم یراؤن ویمنعون الماعون (سو ایسے نمازیوں کے لئے بڑی خرابی ہے جو اپنی نماز کو بھلا بیٹھتے ہیں جو ایسے ہیں کہ ریاکاری کرتے ہیں اور برتنے کی چیز تک نہیں دیتے۔

اور اسی حکم میں ہے وہ چیز جو بطور رعایت نہ مانگی جاوے بطور تملیک ہی مانگی جاوے۔ لیکن وہ بہت کم قیمت جیسے ایک تولہ نمک جیسے ایک لوٹا پانی جہاں پانی کی فراغت ہو۔ جیسے ایک مٹھی گھاس اور عاریت جیسے دیگچی، پتیلی، چمٹا، قلم بنانے کا چاقو، ایک خط لکھنے کے لئے قلم دوات ومثل ذالک البتہ اگر کوئی عذر ہو۔ مثلاً ایک شخص کا تجربہ ہوگیا ہے کہ وہ چیز لے کر نہیں دیتا، یا خراب کردیتا ہے۔ یا بے پروائی سے کہیں ڈال دیتا ہے اہتمام کرکے ادا نہیں کرتا تو ایسے شخص کو عاریت دینے سے انکار کردینا جائز ہے لیکن کم قیمت چیز کے دینے سے بھی انکار نہ کرے۔

ان طاعات مذکورہ کے علاوہ اور بھی تطوعات مالیہ ہیں کہ وقتاً فوقتاً ان کو عمل میں لانا موجب نفع خلائق ہے۔ جیسے مہمانوں کی خدمت استادوں کی اور پیروں کی خدمت، دوستوں کو ہدیہ دینا، روزہ داروں کے لئے افطاری لے آنا، اقارب کے ساتھ صلہ رحمی کرنا۔ اور بعض صورتوں میں اقارب کی خاص خدمات وانفاق واجب ہے۔ جس کی تفصیل کتب فقہیہ میں مذکور ہے بالخصوص جو صدقات جاریہ ہیں۔ جیسے مساجد کی اعانت تعمیر، یا لوٹا بوریہ وتیل سے مدارس اسلامیہ کی اعانت۔ کنواں بنا دینا پل بنادینا، راہ پر درخت لگادینا، قرآن مجید یا کتب دینیہ وقف کردینا، ومثل ذالک کہ ان کا ثواب مرنے کے بعد بھی لکھا جاتا ہے۔

اب میں طاعات مالیہ کی فہرست میں ان مذکورات بعد الزکوٰۃ پر اکتفا کرتا ہوں۔ طالب دین صاحب فہم اور متروک صورتوں کو اس سے بخوبی سمجھ کر عمل کرسکتا ہے۔

میت کے معاملہ کے متعلق کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بموتٰے)

یہ معاملے تین قسم کے ہیں۔ ایک قبل الموت (یعنی حالت مرض میں) دوسرے وقت الموت (یعنی موت کے بہت قریب) تیسرے بعد الموت (یعنی موت کے بعد جب تک اس کے متعلق کوئی تذکرہ یا کوئی کارروائی جاری رہے)، اور ان تینوں قسموں میں مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔ جو اختصار کے ساتھ ذکر کی جاتی ہے۔

"حالتِ مرض"

حالت مرض میں بھی حتی الامکان نماز کی پابندی ضروری ہے

اس میں ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ بوجہ غایت ترحم مریض کو نماز کے وقت کی اطلاع نہیں کرتے اور نماز پڑھنے کے لئے اس سے نہیں کہتے کہ اس کو تکلیف ہوگی۔ بعضے مریض تو خود بھی جاہل یا کاہل ہوتے ہیں گو پہلے سے نماز کے پابند ہوں مگر مرض میں (یا وسوسہ سے کہ کپڑے خراب ہیں، بدن ناپاک ہے یا صاف نہیں ہے۔ یا یہ کہ وضو وغسل نہیں کیا جاتا۔ اور تیمم کو دل نہیں گوارا کرتا۔ اور اس سے

طبیعت صاف نہیں ہوتی۔ وشل ذالک) نماز قضا کر دیتے ہیں۔ یہ تو جہل ہے۔ یا کم ہمتی سے کہ کون اہتمام کرے تیمم کا یا رخ سیدھا کرنے کا کہ اس میں تکلیف ہوتی ہے۔ اگر چہ وہ تحمل سے زائد نہیں۔ مگر کسی قدر آرام تو فوت ہوتا ہے۔ اور دل کو سمجھا لیتے ہیں کہ اچھے ہو کر سب پوری کر لیں گے۔ اس لئے نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ اور یہ کاہلی ہے۔

اور علاج اس کا یہ ہے کہ اس کو سمجھایا جاوے کہ شریعت نے ہر حال میں آسانی کی رعایت کی ہے۔ بدن یا پارچہ کا صاف ہونا تو کچھ فرض نہیں اگر میلے ہیں ہونے دو۔ اسی طرح نماز پڑھو اور اگر ناپاک ہے تو ان کے پاک کرنے میں زیادہ تکلیف نہیں ہوتی۔ تو پاک کرنا کیا دشوار ہے۔ آخر تھوڑی بہت مشقت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں۔ چنانچہ مرض میں دوا پینا کیا مشقت نہیں؟ بعض اوقات کروٹ بدلنا مشقت ہے مگر مصلحت بدنی کے لئے اس کو گوارا کرتے ہیں۔ مگر نماز کے لئے بھی کہ مصلحت روحانی ہے۔ جس کی رعایت بدن سے بھی اہم اور اقدام ہے۔ کسی قدر مشقت گوارا کر لی جاوے۔ تو کیوں گرانی ہے۔ اور اگر پاک ہونے میں سخت تکلیف ہوتی ہے۔ تو بدون پاک کئے ہوئے نماز پڑھ لو۔ کہ شرع کی اجازت ہے۔ صرح الفقہاء بہ اور وضو اور غسل اگر نہیں ہو سکتا تو تیمم کی اجازت ہے اور اگر وضو ہو سکتا ہو اور غسل نہ ہو سکتا ہو تو وضو کر لو اور بجائے غسل کے تیمم کر لو اور طبیعت کا صاف ہونا نہ ہونا کوئی چیز نہیں اور اگر نماز نہ پڑھی تو اس سے طبیعت کون سی صاف ہو گئی اگر آدمی کو حس ہو تو معلوم ہو کہ اس سے اور بھی گندی اور میلی ہو جاتی ہے۔ یہ جہل کا علاج ہے۔

اور ناپاک کپڑے اور بدن کے پاک کرنے کے متعلق جو ابھی مضمون لکھا گیا ہے وہ علاج ہے کاہلی کا بھی کہ کم و بیش مشقت تو ہر کام میں ہوتی ہے مثلاً ناگوار دوا پیتے ہی ہیں بلکہ ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ بعض اوقات غذا کھانے میں بھی بعض مشقتیں لاحق ہو جاتی ہیں مثلاً مرچ لگ گئی منہ جل گیا۔ لقمہ گلے میں اٹک گیا یا شوربے وغیرہ کا بلکہ بعض اوقات پانی کا پھندا پڑ گیا۔ کیسی بری حالت ہو جاتی ہے بعض اوقات پان کھانے میں چونا زیادہ ہوا یا تیز ہوا، اور منہ اور زبان کے ٹکڑے اڑ گئے مگر ان عارضی مشقتوں کے سبب کوئی بھی کھانا پانی نہیں چھوڑتا اگر اسی مریض کو کہا جاوے کہ تم منہ ہاتھ دھو کر کپڑے بدل کر اگر فلاں شخص سے جا کر ملو جو کہ یہاں سے ایک فرلانگ پر ہے تو تم کو دس روپیہ یا سو روپیہ یا ہزار روپیہ مل جاویں تو اس وقت بیماری

مشقتیں راحت معلوم ہونے لگیں۔ تو کیا خدا تعالیٰ کے یہاں کا اجر اتنی قدر بھی نہیں رکھتا۔ خصوصاً جبکہ دینوی کاموں سے بہت زیادہ ان دینی کاموں میں سہولت رکھی گئی ہے۔ چنانچہ جب کھڑے نہ ہو سکیں بیٹھ کر پڑھیں۔ اگر بیٹھ کر نہ پڑھ سکیں تو لیٹے لیٹے پڑھیں اور رکوع سجدہ سر کے اشارے سے کریں۔ اور ایسا شاذو نادر ہے کہ اس قدر ضعف ہو جاوے کہ سر سے بھی اشارہ نہ کر سکیں لیکن اگر اتفاق سے ایسی نوبت آجاوے تو پھر شریعت کی سہولت دیکھئے کہ نماز کا مؤخر کر دینا اور بعد میں قضا کر لینا اس حالت میں جائز فرما دیا۔ پس ان سہولتوں کے بعد کسی کے پاس کیا عذر ہے اور یہ خیال کہ اچھے ہو کر قضا پڑھ لیں گے نہایت ہی جرارت کا خیال ہے۔ کیا ان کے پاس کوئی سند و پروانہ اس معاہدہ کا ہے کہ یہ اس مرض سے ضرور اچھے کر دیئے جاویں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ان کا اخیر ہی مرض ہو۔ مرض میں بوجہ اس کے کہ ہر مرض پیام موت ہے۔ آدمی کو زیادہ تنبیہہ اور تہیۂ آخرت کے طرف زیادہ توجہ چاہیئے۔

ع شاید ہمیں نفس نفس واپسیں بود

یہ تو ان مریضوں کا ذکر تھا جن کو خود بھی جہل یا کسل سے نمازوں کا اہتمام نہیں ہوتا۔ بعض مریض ایسے بھی ہوتے ہیں جن کو پورا اہتمام ہے لیکن مرض کے غلبہ سے ان کو پورے طور سے اوقات وغیرہ کی اطلاع نہیں ہوتی یا نماز کے وقت کچھ نیند کا غلبہ ہو جاتا ہے یا غایت ضعف سے آنکھیں بند ہو کر غفلت سی ہو جاتی ہے لیکن اگر ان کو نماز کے لئے آگاہ کیا جاوے تو ہرگز کوتاہی نہ کریں۔ مگر اوپر کے لوگ اس وجہ سے کہ ان کو اس مریض کی راحت جسمانیہ کے ساتھ تو اعتناء ہے لیکن دین کی کچھ مبالات نہیں۔ اس مریض کو اطلاع ہی نہیں کرتے۔ یا اگر اس کو کسی طرح اطلاع بھی ہو گئی تو اس کی امداد نہیں کرتے مثلاً اس کے لئے پانی یا تیمم کے لئے کلوخ نہیں لاتے اس کی چارپائی قبلہ کی طرف نہیں بدلتے۔ اس کو پاک کپڑے نہیں بدلوا دیتے۔ اس تساہل میں یا تو مریض پھر غافل ہو گیا۔ یا اس پر بھی کسل غالب آ گیا اور ایسی اس کی نماز برباد ہوئی۔ ان لوگوں کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ اپنے جس عزیز کی تھوڑی سی معمولی تکلیف گوارا نہیں۔ اس کے دوزخ میں جلنے کی تکلیف کیسے گوارا کر لیتے ہیں۔ اور اگر غایت بے رحمی سے اس کی یہ تکلیف گوارا کر لیں تو اپنی کیسے گوارا کر لیں گے۔ اس لئے کہ یہ تعاون فی الدین واجب ہے۔ اور یہ امر بالمعروف بالید کی ایک فرد ہے جو کہ محل قدرت اور

توقع قبول میں فرض ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ جب اس کو اوقات نماز کا ہوش نہیں ہے تو بے ہوشی میں نماز معاف ہوئی تو اس کا دفعیہ یہ ہے کہ اس بے ہوشی میں نماز معاف نہیں ہوتی وہ وہ بے ہوشی ہے کہ جس میں آگاہ کرنے سے بھی آگاہ نہ ہو پھر اس میں بھی مطلقاً معافی نہیں بلکہ یہ تفصیل ہے کہ اگر چھ نمازیں متصل بے ہوشی میں گذر جائے تب تو بالکل معاف ہے یعنی نہ ادا نہ قضا اور اگر اس سے کم بے ہوشی ہوئی ہے مثلاً چار نمازیں یا پانچ نمازیں اس حال میں گذر گئیں تو اس وقت تو ادا کا مکلف نہیں۔ مگر ہوش میں آنے کے بعد ان کی قضاء واجب ہوگی۔ اور اگر قضاء میں سستی کی تو فدیہ کی وصیت مرتے وقت واجب ہوگی۔ اور اگر وصیت میں بھی غفلت ہوئی تو وارث کو ثواب ہوگا۔ اگر فدیہ ادا کر دیا لیکن اس صورت میں اپنے حصے میں سے ادا کرے مشترکہ ترکہ سے ادا نہ کرے۔

وضو اور قیام کی قدرت ہوتے ہوئے تیمم سے اور بیٹھ کر نماز نہیں ہوتی

بعضے مریض یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ باوجودیکہ وضو سے کوئی ضرر نہیں پھر تیمم کر لیتے ہیں۔ بعض دفعہ اوپر کے لوگ وضو سے روکتے ہیں کہ میاں تیمم کر لو شرع میں آسانی ہے۔ اسی طرح بعض دفعہ باوجود قدرت علی القیام بیٹھ کر نماز پڑھ لیتے ہیں۔ بعض دفعہ نماز ہی میں باوجود قدرت ضبط کے غایت کم ہمتی سے کراہتے ہیں۔ آہ آہ خوب صاف لفظوں سے کہتے ہیں اور اس کی پروا ہی نہیں کرتے کہ ہماری نماز رہیگی یا جائے گی۔ سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ مطلق مرض سے تیمم یا قعود کی اجازت نہیں اس میں ابواب فقہ کی تحقیق کرنا ضروری ہے۔ اسی طرح قدرت ضبط ہوتے ہوئے آہ یا ہائی وغیرہ کرنے سے نماز جاتی رہتی ہے۔ نماز بڑی احتیاط کی چیز ہے اس کو بے کار نہ سمجھیئے۔

بعضے ان ظاہری بے احتیاطیوں کے مقابل ایک دقیق بے احتیاطی کرتے ہیں۔ جو ظاہراً ان کے زعم میں بڑا تقویٰ ہے وہ یہ کہ خواہ ان پر کچھ ہی مصیبت گذر جاوے۔ خواہ کیسا ہی مرض بڑھ جاوے اور خواہ مر ہی جاویں مگر تیمم جانتے ہی نہیں مریں گے۔ کہیں گے، مگر وضو ہی کرینگے

سو حقیقت میں اس غلو کے معنی یہ ہیں کہ حق تعالیٰ نے ایسا حکم دیا ہے جو واقع میں ناقص ہے اس لئے ہم اس کو قبول نہیں کرتے۔ اصل میں شیطان کی مطرودیتہ[ف] کا مبنیٰ اس کا یہی خیال ہے کہ یہ حکم حق تعالیٰ کا نامناسب ہونے کے سبب قابل عمل نہیں یہ معصیت تو اس کے عقیدے کے ہوئی۔ اور اگر اس کو کوئی ضرر شدید پہنچا... تو اہلاک نفس سے معصیت عملی ہوگی خوب فرمایا ہے ؎

بزھد و ورع کوش و صدق و صفا

ولیکن میفزائے بر مصطفٰے

ولیس من البر الصیام فی السفر...

اور دوسری حدیثیں بھی اس کی صاف ادلہ ہیں۔ یہ کوتاہیاں تو نماز کے متعلق تھیں۔

حالت مرض میں بھی مریض کا ستر بغیر ضرورت کے دیکھنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ مریض کا ستر چھپانے کا اہتمام نہیں کیا جاتا۔ اگر زانو کھل گیا تو کوئی پرواہ نہیں کی جاتی۔ اگر ران کھل گئی تو کچھ خیال نہیں کیا جاتا۔ اگر بضرورت تداوی کسی موقع کے کھولنے اور دیکھنے کی حاجت ہوئی تو اس کی احتیاط نہیں کہ بقاعدہ الضروری یتقدر بقدر الضرورۃ اتنا ہی بدن کھلے جس کے کھلنے کی ضرورت ہے۔ یا صرف انہیں لوگوں کے سامنے کھلے جن کا تعلق اس تداوی سے ہے۔ وہ بھی دیکھتے ہیں اور دوسرے حاضرین اور عیادت کرنے والے بھی بے تکلف دیکھیں گے۔ بلکہ اس کو ہمدردی سمجھیں گے۔

غرض نہ دوسروں کو دیکھنا جائز اور نہ مقدار ضرورت سے زیادہ دیکھنا جائز یہاں تک کہ اگر عورت کے جننے کے وقت کافر دائی جاوے تو موقع تولد کا دیکھنا تو اس کو اگر حاجت ہو درست ہے لیکن بوجہ اس کے کہ کافر عورت نامحرم مرد کے حکم میں ہے۔ اس کے روبرو عورت کو سر کھولنا حرام ہوگا۔ کیونکہ اس کا کھولنا بلا ضرورت ہے۔

اسی طرح اگر عورت کے ہاتھ میں فصد لی جاوے تو فصّاد کو تو موقع فصد کا دیکھنا جائز ہے مگر دوسرے حاضرین کو وہاں سے ٹل جانا یا آنکھ بند کر لینا یا منہ پھیر لینا واجب ہے۔ اور وں کو اجازت

[ف] اللہ کے دربار سے دور کیا جانا ۱۲

نہیں کہ اس کے ہاتھ کا وہ حصہ کھلا ہوا دیکھیں۔ اسی طرح ختنہ میں اگر بچہ سیانا ہو جس کا کھلا ہوا بدن دیکھنا جائز نہیں تو ختان کو تو بقدر ضرورت دیکھنا درست ہے۔ دوسروں کو درست نہیں۔ اسی طرح اگر کسی عضو مستور میں دنبل وغیرہ میں شگاف دیا جائے تو جراح یا ڈاکٹر کے سوا یا ایسے شخص کے سوا جس کے دیکھنے میں کوئی مصلحت معالجہ کی ہو دوسروں کو اس موقع کے دیکھنے کی اجازت نہیں۔ یہ جزئیات استطراداً ذکر کر دیئے گئے اصل مقصود بیان کرنا مریض کے ستر کا ہے کہ اس میں بے پروائی برتی جاتی ہے۔

ناپاک اور حرام دوا سے پرہیز کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی دوا کے متعلق یہ کی جاتی ہے کہ دوا کے حلال وحرام طاہر ونجس ہونے کی کچھ پروا نہیں کی جاتی خصوص امراء کے یہاں کہ برانڈی تک سے پرہیز نہیں خواہ تناول یا استعمال کے ساتھ ہی دم نکل جاوے مگر کچھ انقباض ہی نہیں ہوتا۔ مسلمانوں کے حال پر تعجب ہے کہ جس چیز کو طبیعت قابل نفرت بتلاوے مثلاً پیشاب پینا اس سے تو نفرت ہو اور جس چیز کو شریعت قابل نفرت بتلاوے۔ مثلاً شراب پینا اس سے نفرت نہ ہو تو گویا اس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ یہ شخص اپنے کو نفس کا بندہ سمجھتا ہے خدا کا بندہ نہیں سمجھتا۔ تو کیا مسلمان ہونے کے یہی معنی ہیں مصرع

ببیں کہ از کہ گسستی وبا کہ پیوستی

ایک وسوسہ کا ازالہ

اور اگر یہ وسوسہ ہو کہ دوا کے لئے تو شرع میں بھی اجازت ہے تو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس کا دعویٰ علی الاطلاق محض غلط ہے اصل مذہب میں تو کسی حالت میں بھی دوا کے لئے ایسی چیز کی اجازت نہیں ہاں مضطر بالمخمصہ یا مغصوص باللقمہ کے لئے ایسی چیز سے ابقاء حیوٰۃ مشروع ہے اور تداوی کا اس پر قیاس اس لئے صحیح نہیں کہ مقیس علیہ میں نفع عادۃً متیقن ہے اور مقیس میں غیر متیقن، چنانچہ اطباء خود فن ہی کو ظنی کہتے ہیں اس لئے نفس معالجہ ہی واجب نہیں بخلاف اساغۃ مغصوص کے کہ واجب ہے اس دوا میں ایسی چیز کی اصلاً اجازت نہیں خواہ مرض کیسا ہی مہلک ہو

اور نفع کیسا ہو مجرب سمجھا جاوے۔

البتہ بعض متاخرین نے ضرورت شدیدہ اور تجربۂ نفع کی قید کیساتھ اجازت دیدی ہے۔ مگر جو بے احتیاطی کرتے ہیں وہ ان قیدیوں کا کب لحاظ کرتے ہیں بلکہ وہ تو محض احتمال نفع ہی پر سرعت برار یعنی تعجیل صحت ہی کے لئے بلکہ بعض اوقات بدون مرض کے محض تقویت طبیعت ہی کے لئے یا مرض کے غیر خطرناک ہونے پر بھی بے تکلف ان چیزوں کا استعمال کرتے ہیں پس وہ اس فتویٰ سے کیسے تمسک کرسکتے ہیں۔ یہ تو جواز و عدم جواز میں گفتگو تھی باقی جو لوگ قلب سلیم طبع طاہر رکھتے ہیں وہ تو اختلافی اجازت سے بھی منتفع ہونا پسند نہیں کرتے۔ جس طرح بعض لطیف المزاج لوگ بعض اشیاء مکروہ طبعی کو حلق سے اتار نہیں سکتے اور اگر دھوکہ سے اتر جاوے تو معدہ اس کو قبول نہیں کرتا۔ اسی طرح جن کا مزاج لطافت دینی رکھتا ہے ان کی ان اشیاء مکروہ شرعی کے تناول یا امساک فی المعدہ کے ساتھ یہی کیفیت ہے اور ادویہ محرمہ کچھ برانڈی ہی وغیرہ کے ساتھ خاص نہیں۔ بہت سی ادویہ طب یونانی میں بھی ایسی ہی حرام و نجس ہیں جیسے جند، بیدستر، دمایہ شتر اعرابی اور لبوب کبیر میں قضیب گاؤ۔

میں نے اپنے ایک طبیب دوست سے استدعا کی ہے کہ ایسے ادویہ کی ایک فہرست شائع کردے۔ اور خاص کر ایسی چیزوں کا استعمال ایسی جگہ کرانا تو ظلم عظیم ہی ہے جہاں مریض خود محتاط اور ایسی اشیاء سے نفور ہو۔ مگر اس کی بے خبری میں یا اس کو دھوکہ دے کر کھلا پلا دیا جاوے۔ کبھی تو اس کو اگر خبر ہوگئی تو بعید کلفت ہوتی ہے اور اس کلفت سے اس کا مرض بڑھتا جاتا ہے۔ اور اس طرح سے اس کو جسمانی ضرر بھی لاحق ہوتا ہے اور اگر خبر بھی نہ ہوئی تو اس خیر خواہ نے پرائی دنیا کی درستی کے لئے اپنا دین برباد کیا۔ جس کا برباد کرنا خود اپنی دنیا کی درستی کے لئے بھی مذموم و مبغوض عنداللہ ہے۔ اور یہ تو اس سے بھی بڑھ کر ہوا کہ حظ آخرت تو فوت ہوا ہی کوئی حظ دنیا بھی نصیب نہ ہوا۔ خسر الدنیا والآخرۃ کا مصداق بنا۔

دعا غلاموں کی طرح کرنی چاہیئے نہ کہ شکایت کرنے والوں کی طرح

ایک کوتاہی دوسرے قسم کے معالجہ یعنی دعا ختم یا صدقہ و نذر میں ہوتی ہے کہ ان میں حدود شرعیہ

کو ملحوظ و محفوظ رکھنے کی طرف توجہ نہیں ہوتی۔ مثلاً دعا بصیغہ شکایت ہوتی ہے۔ اللہ میاں سے کہا جاتا ہے۔ اے اللہ کیا ہوگا۔ بس میں تو بالکل ہی تباہ ہو جاؤں گا۔ یا تباہ ہو جاؤں گی۔ یہ بچے کس پر ڈالونگی بس جی میرا تو کہیں ٹھکانہ ہی نہ رہے گا۔ اے اللہ ایسا تو نہ کیجیو۔ گویا شکایت الگ کی جاتی ہے۔ اور رائے الگ دی جاتی ہے۔

استغفراللہ، کیا حق تعالیٰ کا یہی ادب ہے۔ یہی عظمت ہے۔ دعا کرو غلاموں کی طرح اجازت ہے بلکہ محبوب ہے آگے رضا بالقضا واجب ہے۔ مصرع

ہرچہ آں خسرو کند شیریں بود

ختم پڑھا جاتا ہے بعض جگہ تو غیر مشروع الفاظ سے مثلاً یا شیخ عبدالقادرؒ شیأ للہ اور بعض جگہ اس سے غامض خرابی مضمر ہوتی ہے کہ الفاظ تو مشروع مگر اس کا ثواب بزرگوں کو اس عقیدہ سے بخشا جاتا ہے کہ وہ خوش ہو کر کچھ سہارا لگا دیں گے۔ یا بجائے امداد کے دعا ہی کا اعتقاد ہوا مگر اس طرح سے کہ وہ دعا ان کی رد ہو ہی نہیں سکتی۔ جس کے متعلق احقر نے بقدر ضرورت القاسم کی جلد (۳) نمبر ایک[1] کے پرچہ میں صفحہ ۱۴ پر کچھ مفصل بھی لکھ دیا ہے۔

صدقہ کے متعلق کوتاہیاں

صدقہ میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں۔ بعض لوگ یہ کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکوا کر تقسیم کرتے ہیں کہ کسی بزرگ کے نام کا کھانا پکوا کر تقسیم کرتے ہیں۔ یا کھلاتے ہیں اور مثل ختم مذکور عنقریب کے اس میں بھی اعتقاد امداد روحانی ان بزرگ کے متعلق رکھتے ہیں جس کی نسبت ابھی لکھا گیا ہے بعض لوگ کچھ غلّہ یا بکرا وغیرہ شب بھر مریض کے پاس رکھ کر اور بعض لوگ اس کا ہاتھ لگوا کر خیرات کرتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ اس تلبس سے یا اس لمس سے مریض کی تمام بلائیں گویا اس صدقہ کی طرف منتقل ہو جاتی ہیں پھر اس کے دینے کے ساتھ وہ بھی چلی جاتی ہیں۔ سو یہ اعتقاد محض خلاف شرع ہے۔

صدقہ دینا جو ایک فعل ہے اس کا اثر حدیث میں آیا ہے کہ بلا دفع ہو جاتی ہے۔ اس فعل کے قبل خود جرم صدقہ میں لپٹ کر مریض سے دور ہو جانے کا اعتقاد یہ مزاحمت ہے منصوص کی

منصوص تو اس کا اندفاع ہے اس فعل سے اور معتقد عوام کا اس کا ایک گونہ اندفاع ہے۔ قبل اس فعل کے، اور مزاحمت نص کی دلیل ضعیف سے بھی جائز نہیں نہ کہ بلا دلیل۔ بعض لوگ مریض کی طرف سے بکرا ذبح کرتے ہیں اور خصوصیت ذبح کو دافع بلا میں موثر سمجھتے ہیں۔ جس کی حقیقت افتداء ہے جس کا ادراک مشاہدہ یا رائے سے تو نہیں ہو سکتا بلکہ ضرورت ہے نقل کی، اور نقل مفقود ہے۔ اس لئے یہ اعتقاد تقول علی اللہ ہونے کے سبب ناجائز ہے۔ اور اگر کوئی عقیقہ پر قیاس کرے۔ تو وہ خود غیر مدرک بالقیاس ہے۔ اور حکم غیر قیاسی مقتصر رہتا ہے مورد نص پر اس میں قیاس جائز نہیں۔ اور اگر کوئی کہے کہ میں صدقہ کو مقصود سمجھتا ہوں تو اس کی تکذیب کے لئے یہ امتحان کافی ہے کہ اگر اس سے کہا جاوے کہ تم اس بکرے کو خریدنے کے عوض اسی کی قیمت میں گوشت خرید کر کہ وہ یقیناً اس بکرے کے گوشت سے زیادہ آوے گا مساکین کو تصدق کر دو تو ہرگز اس عمل کا التزام کرنے والے اس پر راضی نہ ہوں گے اور یہ سمجھیں گے کہ اس میں وہ اثر نہ ہوگا۔ سو اگر محض تصدق ہی مقصود ہے تب تو بدیں وجہ کہ یہاں تصدق زیادہ گوشت کا ہوا۔ اس میں زیادہ اثر سمجھنا چاہیئے تھا۔ مگر جب اس پر بھی ایسا نہیں سمجھتا تو پھر اس میں بجز فعل

ذبح کے کیا چیز کم ہے۔ جس کی کمی سے اثر کم ہو گیا۔ اس سے صاف معلوم ہوا کہ عوام الناس اس طریق میں ذبح کو ہی مقصود سمجھتے ہیں۔ پس دعوئ قصد تصدق کا غلط ٹھہرا۔ بعض لوگ ذبح کا اہتمام نہیں کرتے بلکہ گوشت خریدتے ہیں۔ لیکن بجائے آدمیوں کے چیلوں کو کھلاتے ہیں سو اس میں دو بدعت ہیں۔ گوشت کے خصوص کا موثر سمجھنا پھر چیلوں کے کھانے کی خصوصیت میں اثر جاننا ایسی تخصیصات پر ابھی گفتگو آتی ہے۔ بعض لوگوں نے صدقہ کے لئے خاص خاص چیزیں تجویز کر رکھی ہیں جیسے ماش اور تیل اور پیسے جن میں امر مشترک سیاہ رنگ کی چیز معلوم ہوتی ہے جس کے معنی دوسرے لفظوں میں یہ ہیں کہ بلا کو ایک کالی چیز سمجھ کر اس کے جلب للسلب کے لئے بھی کالی چیزوں کو تجویز کیا۔ سو اول تو بلا کوئی جسم نہیں جو سواد کے ساتھ موصوف ہو اور اگر کوئی تو بیہ اس کی صورت مثالیہ کے اعتبار سے اس کی کو بھی لی جاوے تب بھی خود یہ ایک خلاف شرع دعویٰ ہے کہ اس کا دافع بھی تصدق بالاسود ہی ہوگا۔ نص میں مطلق تصدق کو دافع بتلایا ہے۔ خواہ

بالاسود ہو یا بالا بیض ہو۔ پھر تصدق کا محل سب سے اچھا مسلمان مساکین ہے۔ بعضے بھنگیوں کو اور بعضے چیلوں کو اس کا مصرف متعین قرار دیتے ہیں۔ خود اس مصرف کے مساوی ہونے یا راجح ہونے کا دعویٰ مزاحمت ہے نص کی نہ کہ متعین ہونا۔ اس میں تو نص کا بالکل ابطال ہی ہے۔

وصیت کے متعلق کوتاہی

ایک کوتاہی وصیت کے متعلق ہے وہ یہ کہ بعض اوقات مریض اپنے بعد کے لئے خلاف شرع وصیت کرتا ہے اور کوئی اس کو تنبیہ بھی نہیں کرتا تاکہ اس کی اصلاح دیجاوے اور بعض اوقات دوسرے لوگ مریض کو ایسی وصیتوں کی رائے اور ترغیب دیتے ہیں مثلاً ثلث سے زیادہ کی وصیت یا کسی وارث کیلئے وصیت یا کسی وارث جائز کے محروم کرنے کی وصیت یا کسی معصیت کی وصیت کہ میرے مرنے کے متعلق فلاں کام بدعت کا یا فاخر کا کیجیو۔ مثلاً تیجہ، دسواں وغیرہ کیجیو یا قبر میں عہدنامہ وغیرہ رکھیو یا ایسا ایسا کھانا کیجیو یا میرا عرس کیا کیجیو و مثل ذالک اسی طرح ان کاموں کیلئے کچھ وقف کرجانا اس کا بھی یہی حکم ہے۔ اگر مریض اسمیں غلطی کرے تو دوسروں کو اصلاح کردینا چاہیئے اور اگر وہ اصلاح قبول نہ کرے تو وہ وصیت لازم نہیں ہوتی بلکہ بعض پر تو عمل جائز نہیں ہوتا جیسے وصیت بالمعاصی۔ ان احکام میں فقہاء وعلماء سے وقت پر تحقیق کرکے عمل کرنا چاہیئے یہ چند کوتاہیاں ہیں حالت مرض میں جو اس وقت خیال میں آئیں۔ تتبع یا تامل سے اور بھی کوتاہیاں نکلیں گی جن کے لئے مذکورہ کوتاہیوں کے ضمن میں جو اصول شرعیہ بیان کئے گئے ہیں یا تو وہی یا بعض کوتاہیوں کے لئے علماء سے رجوع کرنا کافی ہوگا۔ اب دوسری حالت کے متعلق کچھ ضروری امور عرض کرتا ہوں۔

"حالت وقت الموت"

حالت نزع میں رونے پیٹنے کی بجائے اس کو کلمہ کی تلقین اور اس کے خاتمہ بالخیر کی دعا کرنی چاہیئے۔

اس وقت کی کوتاہیوں میں عورتیں زیادہ مبتلا ہیں۔ مثلاً اس وقت بجائے اس کے کہ کچھ کلمہ پڑھیں حق تعالیٰ سے میت کی سہولت نزع وختم بالخیر کی دعا کریں رونا پیٹنا پھیلاتی ہیں۔ کلمات جزع وفزع کے کہتی ہیں کہ اگر مریض کو کچھ ہوش ہوا تو وہ پریشان ہوتا ہے اور اس پریشانی سے دو

خرابیاں ہیں، کبھی تو ناامیدی وجہ اس سے دل شکستہ ہوتا ہے اگر اس وقت تک ناامیدی نہ ہوئی ہو اور مریض کے دل شکنی اور اتنا ط خود مذموم ہے حدیث میں نص ہے کہ مریض کو امید دلایا کرو۔ اس سے وقت تو نہیں ملتا۔ لیکن اس کا دل خوش ہو جاتا ہے تو یہ حرکت اس حکم کے کس قدر خلاف ہے اور کبھی اس سے وہ خلق کی طرف مشغول ہوتا ہے حالانکہ وہ وقت خالص توجہ الی اللہ کا ہے۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ اگر وہ خود بھی اس عالم کی طرف بلاضرورت شرعیہ (مثل وصیت وغیرہ) متوجہ ہوتا تو اس کی توجہ کو حق تعالیٰ کی طرف منعطف ومنصرف کیا جاتا۔ نہ کہ خود ہی اس ظلمت کدہ کی طرف اس کو متوجہ کرنے کا سبب بن جاویں۔ اور اگر ان کلمات میں کچھ الفاظ اس میت کے غلو فی المدح کی ہوئی کہ تو ایسا تھا اور ایسا تھا تو ایک ضرر میت کا (جیسا کہ حدیث میں ہے) یہ ہے کہ فرشتہ اس کو ڈھکیلتے ہیں۔ اور یہ کہتے ہیں کہ کیا ایسا ہی تھا۔

غرض اس نامعقول حرکت سے پریشانی در پریشانی ہوتی ہے۔ اور مثلاً بعض عورتیں اس وقت اس کی بی بی کو سامنے لاکر کھڑا کرتی ہیں۔ یا کبھی بی بی صاحبہ خود ہی تشریف لاکر کھڑی ہوتی ہیں۔ اور پوچھا جاتا ہے کہ اس کو یا مجھ کو کس پر چھوڑے جاتے ہیں اور اس غریب کو جواب پر مجبور کرتے ہیں اسی طرح بعض اوقات اس کے بچوں کو سامنے لاتی ہیں کہ ان کا کون ہوگا، یا یہ کہ ان کو پیار تو کرلو، ان کے سر پر ہاتھ تو رکھدے۔ جس سے وہ غریب تو پریشان ہوتا ہی ہے اور توجہ علی المخلوق کا ضرر الگ پہنچتا ہے لیکن بچے کس قدر دل شکستہ اور ناامید ہو جاتے ہیں یہ حماقت شعار اتنا نہیں سمجھتیں کہ اس وقت کا تو مقتضا یہ تھا کہ اگر خود بھی بچوں کو یاد کرتا تو اس کو کہا جاتا کہ تم حق تعالیٰ کی طرف خیال رکھو البتہ اگر بہت ہی یاد کرے تو سرسری طور پر سامنے کردیں تاکہ اس کا دل ان میں اٹکا نہ رہے لیکن اگر خود یاد نہ کرے تو ہرگز اس کو یاد نہ دلاوے اور یہ بھی مقتضا تھا کہ بچوں کو وہاں سے ہٹا دیا جاتا۔ تاکہ وہ پریشان نہ ہوں اور اگر وہ گھبراتے تو اپنے آنسو پونچھ کر ان کو دلاسا دیا جاتا کہ تم کیوں گھبراتے ہو اس سے زیادہ ہم تمہارے شفیق اور خدمت کرنے والے موجود ہیں۔ یاد رکھنا چاہیئے کہ تطییب قلب مسلم اور تسلیہ محزون عبادۃ عظمیٰ ہے۔ اسی طرح بیوی کی تسلی کرتے کہ بھائی لاعلاج کا علاج ہمارے قبضہ سے باہر ہے۔ اور اس کا علاج تمہاری پریشانی سے بھی نہیں ہو سکتا۔ باقی تمہاری راحت رسانی اور دلجوئی کے لیئے ہم حاضر ہیں۔ تم اس قدر پریشان نہ ہو۔

غرض اس میں ایک تو یہ پریشانی ہے دوسرے وہی مخلوق کی طرف اس کو متوجہ کرنا جس کا

اوپر ذکر ہوا ہے۔ اسی طرح بعض مرد بھی جو زنانہ مزاج کے ہیں وہ بھی یہی ناشائستہ حرکت کرتے ہیں۔ اسی واسطے سخت ضرورت اس امر کی ہے کہ قرب موت کے وقت میت کے پاس عاقل دیندار لوگ ہوں۔ اگر گھر کی عورتیں اتفاق سے ایسی ہوں تو ان کے رہنے کا مضائقہ نہیں ورنہ مردوں میں جو ایسے لوگ ہوں ان کو پاس رہنا چاہیئے۔ اور وہ ان سب امور کی احتیاط اور انتظام رکھیں۔

بعضے لوگ یہ کرتے ہیں کہ بدفالی کے خیال سے یا قلت مبالات بالدین کی وجہ سے نہ اس وقت یٰسین پڑھیں اور نہ پڑھنا گوارا کریں۔ یا اس طرف التفات نہ کریں۔ اور نہ کلمہ کا اہتمام کریں۔ نہ اس کو متوجہ کریں جب کہ اس کو ہوش ہو اور نہ خود اس میں مشغول ہوں۔ جبکہ اس کو ہوش نہ ہو بلکہ دنیا کے فضول قصوں میں خصوص ان بکھیڑوں میں جن کی ضرورت بعد میں ہوگی مگر ابھی سے مشغول ہو جاتے ہیں۔ بعض جگہ تو کوئی اس کے پاس بھی نہیں رہتا اور وہ تنہا ہی ختم ہو جاتا ہے۔ سب ادہر ادہر مال و متاع پر قبضہ کرنے کی فکر میں بھاگتے بھاگتے پھرتے ہیں اور بعض جگہ اس لئے اس کے پاس نہیں پھٹکتے کہ اس کی بیماری لگ جانے کا خوف ہوتا ہے۔ اول تو بعض محققین کے نزدیک نفس تعدیہ ہی غلط ہے دوسرے بعض قول پر کہیں ہوا بھی تو بلا اذن خالق نہیں ہوتا اور نہ اذن دائم ہوتا ہے چنانچہ مشاہدہ شاہد ہے کہ اکثر جگہ کچھ بھی نہیں ہوتا پھر کتنی سنگدلی کی بات ہے کہ اپنے کو تو ضرر متحمل سے بھی بچایا۔ اور اپنے ایک بھائی مسلمان (یعنی اس مریض کو) ضرر متیقن میں مبتلا کیا۔ کیونکہ اس طرح تنہا رہ جانے سے اس کی بعض ضروریات میں فروگذاشت ہونے سے اس کو تکلیف بھی ہوگی اور اس کی دل شکنی بھی ہوگی۔ اور ان کے طرز عمل سے یہ معلوم کر کے کہ میں مرض متعدی مہلک میں گرفتار ہوں مایوس بھی ہو جاویگا۔ تو کتنی کلفتیں اس پر جمع ہوئیں اور ان محتاط صاحب کی ایک وہمی احتیاط ہوئی تو ایسی احتیاط خاک ڈالنے کے قابل ہے۔ اور افسوس تو یہ ہے کہ جو طبقہ ادعاء ہمدردی کے نعرے لگاتا ہے وہی اس لغو احتیاط میں زیادہ حصہ لیتا ہے۔

یہ تو ان کی شکایت تھی جو کہ مریض کے لئے نہ خواہ پاس رہ کر یا اس کو تنہا چھوڑ کر اس کے متوجہ الی اللہ کرنے کا اہتمام نہیں کرتے۔

بعض لوگ ان کے مقابلہ میں دوسری طرف غلو کرتے ہیں یعنی بزعم خود اس کو متوجہ الی اللہ کرنے میں اس قدر متشددانہ برتاؤ کرتے ہیں کہ اس کے پیچھے ہی پڑ جاتے ہیں کہ وہ ذرا غافل ہوا اور اس پر تقاضا

شروع ہوا کہ کلمہ پڑھنا استغفار پڑھنا اور اگر اس کو ہوش نہ ہو تو برابر اس کے سر رہتے ہیں۔ جب تک کہ وہ ان کا حکم نہ مانے۔ اور اگر ہوش آگیا اور اس نے پڑھ بھی لیا تو اس پر کفایت نہیں کرتے، پھر پڑھواتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ اموختہ کی طرح پڑھتا ہی رہے۔ دم نہ لے۔ اللہ بچاوے۔ اس جاہلانہ زہد خشک سے۔

اس بات میں علماء کا ارشاد یہ ہے کہ اگر وہ ہوش میں ہو تو اس کو بسہولت کلمہ واستغفار کی طرف متوجہ کریں۔ اور جب وہ ایک بار پڑھ لے توبہ کرلے پھر چھوڑ دیں۔ پھر جب تک وہ کوئی دنیا کا کلام نہ کرے دوبارہ پڑھنے کو نہ کہیں وہ مرض میں اور نزع میں پریشان ہوتا ہے اگر اس کے قلب میں تنگی پیدا ہو کر کلمہ واستغفار سے (نعوذ باللہ) کراہت و ناگواری ہوئی یا خدانخواستہ منہ سے انکار نکل گیا تو کس درجہ امر منکر ہے گو اس وقت کا ایسا فعل بھی قواعد شرع سے قابل اعتراض نہیں کیوں کہ وہ وقت پورے شعور اور پورے اختیار کا نہیں ہے لیکن تاہم عام دیکھنے سننے والوں کی نظر میں اس میت کی کتنی رسوائی ہے جس کا سبب یہ زاہد خشک بنا ہے۔ اور اگر وہ بالکل بے ہوش ہے تو اس کو کچھ پڑھنے وڑھنے کے لئے نہ کہیں۔ اس کے قریب پکار پکار کر سورہ یٰسین شریف اور کلمہ کلام وغیرہ پڑھتے رہیں تاکہ اگر قدرے ادراک ہو یا ہو جاوے تو قلب سے تو ادھر متوجہ رہے اور اسی توجہ میں خاتمہ ہو۔

بعضے آدمی اس سے بڑھ کر یہ کرتے ہیں کہ اخیر وقت تک اس سے باتیں کرانا چاہتے ہیں۔ اور بڑھ کر اس لئے کہا کہ ان زاہدان خشک نے تو اس سے کلمہ ہی پڑھوانا چاہا تھا جو کہ دین کا کام ہے انہوں نے دنیا کی باتیں کرانا چاہا یعنی جہاں وہ ذرا بے ہوش ہوا اس کو پکارتے ہیں کہ میاں فلانے ذرا آنکھ تو کھولو مجھ کو تو دیکھو میں کون ہوں تم کیسے ہو کچھ کہو گے کسی بات کو دل چاہتا ہے اور اسی طرح خرافات لغویات میں اس کو دق کرتے ہیں ان عقل کے پتلوں سے کوئی پوچھے کہ یہ ان باتوں کا وقت ہے اگر اس کا مرض مرض موت نہیں ہے اور اچھا ہو جاوے گا تو اچھا ہونے کے بعد جتنی چاہے باتیں کرلیجیو۔ اس وقت اس کو کیوں تکلیف دیتے ہو مرض میں ایسا تعجب ہوتا ہے کہ بات کرنا تو بڑی بات ہے بات سننا بلکہ کسی طرف دیکھنا خیال کرنا گراں گذرتا ہے اور یہ بزرگ اس سے مجلس آرائی کی توقع رکھتے ہیں اور اگر اس کا مرض مرض موت ہے تو ایسی باتیں کرنا اور بھی برا ہے۔

کیوں کہ قطع نظر تکلیف سے یہ سمجھنا چاہئیے کہ اب اس کو دنیا میں بہت تھوڑا وقت ملے گا سو اس کو تو اچھے مصرف میں صرف کرنا چاہیئے۔

البتہ اگر کوئی ایسی بات ہو جو شرعًا ضروری ہے مثلاً کسی امانت کو پوچھا جاوے کہ تم نے کہاں رکھدی ہے یا قرضہ اور لین دین کے بارہ میں پوچھا جاوے جس کا حال بدون اس کے دوسرے ذریعہ سے معلوم نہیں ہو سکتا یا کافی نہیں ہو سکتا یا اور اسی قسم کا کوئی حق واجب ہو اس کے متعلق پوچھ پاچھ کرنے کا مضائقہ نہیں بلکہ ضروری ہے بشرطیکہ اس کو زیادہ تنگی اور تکلیف نہ ہو جو تحمل سے زائد ہو سو ایسی بات درحقیقت دنیا کی بات نہیں ادائے واجب ہے جو طاعت کی فرد اعظم ہے اور چونکہ صورتًا دنیا ہی کی بات ہے اس لئے بہتر ہے کہ ایسی بات کا جواب لینے کے بعد پھر تہلیل و استغفار وغیرہ پڑھوا دیں۔ بشرائط مذکور سابقاً بعض لوگ قریب مرگ کو رو بقبلہ کرنے کا مسئلہ سن کر یہ کرتے ہیں کہ اس کا تمام بدن اور منہ پکڑ کر بیٹھ جاتے ہیں اور اگر وہ نزع روح میں بدن یا گردن کو حرکت دے جو حرکت اضطراریہ ہوتی ہے تو پھر مروڑ تروڑ کر رخ بدل دیتے ہیں۔

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے اس مسئلے کا یہ مطلب نہیں بلکہ مطلب یہ ہے کہ جب اس پر شاق نہ ہو یا وہ بالکل بے حس و حرکت ہو جاوے اس وقت رو بقبلہ کر دیں نہ یہ کہ اس سے کشاکشی کر کے اس کو تکلیف پہنچا دیں (درمختار)

نامحرم مرد کو مرنے کے بعد بھی دیکھنا جائز نہیں

ایک بے احتیاطی ہوتی ہے کہ اس وقت اکثر نامحرم عورتیں بھی اس کے سامنے آ کھڑی ہوتی ہیں گویا پردہ ضروری نہیں رہتا سو اگر اس کو اتنا ہوش ہے کہ وہ دیکھتا سمجھتا ہے تب تو اس کے سامنے آنا ایسا ہے جیسا تندرست کے سامنے آنا۔ مرض سے احکام معاف نہیں ہو گئے اور اگر اس کو اتنا ہوش نہیں ہے تو بہت سے بہت اس نے نہ دیکھا مگر ان عورتوں نے اس نامحرم مرد کو بلاضرورت دیکھا جس کی ممانعت حدیث افعمیاوان انتما الستما تبصرانہ، کیا تم دونوں بھی اندھی ہو کیا تم دونوں اسے نہیں دیکھ رہی۔

مصرح ہے اور اگر کہا جاوے کہ اس وقت تو کسی مفسدہ کا احتمال نہیں ہے سو جواب یہ

ہے کہ اول تو حکم عام ہے مفسدہ کی قید نہیں ہے دوسرے ہم نے مفسدہ بھی دیکھا بعض عورتیں اس وقت دیکھ کر عاشق ہو گئی ہیں اور عمر بھر خیالات بخس میں مبتلا رہی ہیں گو ان کے ایقاع کی گنجائش نہیں رہی۔ لو العینان تزنیان، (آنکھیں بھی زنا کرتی ہیں) اور والقلب یزنی تو صادق آ گیا۔

اگر عورت مرتے وقت شوہر کو مہر معاف کر دے تو اس کا اعتبار نہیں ہوتا

ایک کوتاہی جو نہایت عام ہے کہ جب کوئی عورت مرنے لگتی ہے کہتے ہیں کہ شوہر کو معاف کر دے اور وہ معاف کر دیتی ہے اور شوہر اس معافی کو کافی سمجھ کر اپنے کو دین مہر سے سبکدوش سمجھتا ہے اور اگر کوئی وارث مانگے بھی تو نہیں دیتا اور نہ اس کا دینا ضروری سمجھتا ہے۔

سو خوب سمجھ لیا جاوے کہ اس وقت کی معافی وصیت ہے اور وصیت وارث کے حق میں نافذ نہیں ہوتی جب تک کہ سب ورثہ بلوغ بشرط بلوغ اس کو منظور نہ کریں۔

اور اگر بعض جائز رکھیں بعض نہ رکھیں تو صرف جائز رکھنے والوں کے حصہ کے قدر نافذ ہوگی۔ باقی باطل ہوگی اور نابالغ تو اگر جائز بھی رکھیں تو صحیح نہیں، پس اس صورت میں جو وارث نابالغ ہیں ان کے حصہ کا مہر اور اسی طرح جو بالغ وارث جائز نہ رکھیں ان کے حصے کا مہر بھی واجب الادا ہوگا۔ اور وہ معافی ان کے حق میں محض باطل ہے مثلاً اس عورت کے وارث علاوہ شوہر کے تین بھائی ہیں ایک نابالغ اور دو بالغ جن میں سے ایک نے اس معافی کو منظور کیا اور دوسرے نے نامنظور کیا اور مہر چھ سو روپے تھا تو اس صورت میں یہ حکم ہوگا کہ تین سو تو حصہ شوہری میں اگر معاف ہو گئے اور سو روپے بالغ منظور کرنے والے کے حصے میں آ کر معاف ہو گئے۔ آگے دو سو روپے رہے سو تو نامنظور کرنے والے کا حق اس شوہر کے ذمہ ہے اور سو اس نابالغ کا حق اس کے ذمہ ہے یہ دو سو روپے ادا کرنا ہوں گے۔ یہ مختصر تذکرہ ہوا حالت موت کے وقت کی بعض کوتاہیوں کا اب حالت بعد الموت کے متعلق لکھا جاتا ہے۔

حالت بعد الموت

اس میں اس قدر امور غیر مشروعہ شائع ہیں جن کا احصار مشکل ہے ان میں سے اکثر کو میں نے اصلاح الرسوم فصل چہارم میں مفصل و مدلل لکھا ہے یہاں صرف ان کی فہرست لکھنے پر اکتفا کرتا ہوں۔

(۱) دفن میں اعزا وغیرہ کے انتظار میں دیر کرنا۔

(۲) قبر پر اناج لے جانا۔

(۳) جانماز اور اوپر کی چادر ترکہ میں سے خریدنا۔

(۴) میت کے کپڑے بلاتقسیم ورثا کے مساکین کو دے دینا۔

(۵) تیجہ دسواں وغیرہ کرنا۔

(۶) برادری کو یا مساکین کو تفاخراً کھانا دینا۔

(۷) کئی بار عورتوں کا جمع ہونا جس میں ایک اجتماع انقضاء عدت کے دن ہوتا ہے۔

(۸) بلاضرورت دور دور سے مدتوں تک مہمانوں کا آنا اور میت والوں پر بار ڈالنا۔

(۹) خاص قواعد کے ساتھ میت کے گھر اوّل روز کسی عزیز کے یہاں سے کھانا آنا۔

(۱۰) حفاظ وغیرہ کو کچھ دیکر قرآن پڑھوانا۔

(۱۱) مدت تک سوگ کرنا یہ تو عام اموات کے ساتھ معاملہ ہوتا ہے اور بعض معاملہ خاص بزرگوں کے ساتھ ہوتے ہیں جس کو رسالہ مذکور کے باب مذکور کی فصل دوم وسوم میں ذکر کیا گیا ہے۔ جیسے

(۱۲) عرس وفاتحہ مروّجہ کے منکرات اور

(۱۳) شب برات کا حلوہ اور عاشورہ کا کھچڑا اور شربت کہ ان کی بحث بھی بہت مبسوط لکھدی ہے اگر شوق ہو اس میں ملاحظہ فرمالیا جاوے۔ اب بعض وہ معاملات اس تیسری حالت کے متعلق مختصراً لکھتا ہوں جو اس میں نہیں لکھے گئے۔

میت اگر وصیت نہ کرے تو اس کی نماز روزہ کا فدیہ ترکہ مشترکہ سے نہ دیں

پس ان میں سے ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے تقویٰ کے جوش میں آکر ترکہ مشترکہ میں بلاوصیت میت نماز روزہ کا فدیہ دلواتے ہیں سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر وہ وصیت کرے تو ثلث میں سے دینا حق ورثاء پر مقدم ہے اور اگر وہ وصیت نہ کرے جس کو دینا ہو خاص اپنے حصے ترکہ یا اپنے پہلے مال سے دے۔

حیلہ اسقاط مروجہ کی تردید

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے بجائے فدیہ کے ایک حیلہ اختراع کیا ہے کہ ایک قرآن مجید لاتے ہیں اور تمام عمر کی نماز وروزہ بلکہ کہیں کہیں کے معاصی کا حساب لگا کر اس قرآن کی اتنی بڑی قیمت تجویز کر کے کسی مسکین کو دیدیتے ہیں اور اس کا نام اسقاط رکھا ہے چونکہ وہ رسم کسی قاعدہ فقیہہ پر منطبق نہیں اس لئے محض باطل ہے۔

مُردہ دفن کر کے اذان دینے کا ثبوت نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ مردہ دفن کر کے قبر پر اذان کہتے ہیں۔ چونکہ شریعت میں کہیں وارد نہیں اس لئے واجب الترک ہے۔

اگر کہیں کوئی نماز جنازہ جاننے والا نہ ہو تو کیا کرے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض دیہات میں جہاں کوئی نماز پڑھنے والا میسر نہیں میت کو بدون نماز جنازہ کے دفن کر دیتے ہیں۔ میں نے ایک خطبہ میں جبکہ بہت دیہاتی جمع تھے اس کی تدبیر بتلادی تھی کہ اگر ایک آدمی بھی وضو کر کے جنازہ سامنے رکھ کر کھڑا ہو کر صرف چار بار اللہ اکبر کہدے تو نماز فرض جنازہ کی ادا ہو جائے گی۔ کیونکہ رکن اس نماز کا یہی چار تکبیریں ہیں۔ باقی دعائیں وغیرہ سنت ہیں۔ سو جہاں ایسا موقع ہو اتنا ہی کر لیں۔ ترک فرض کی معصیت سے تو محفوظ رہیں گے۔

قبر میں رکھ کر میت کے بدن کو روبقبلہ اچھی طرح کروٹ دیدینا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ مردہ کو قبر میں رکھ کر صرف منہ تو قبلہ کی طرف متوجہ کر دیتے ہیں۔ باقی سارے بدن کو کروٹ نہیں دیتے۔ سو کتب فقہ میں مصرح ہے کہ تمام بدن کو اچھی طرح کروٹ دے دینا چاہیئے۔

میت کا منہ کھول کر قبر کو دکھانے کی کوئی اصل نہیں

ایک کوتاہی یہ کرتے ہیں کہ قبر میں رکھنے کے بعد اس کا منہ کھول کر قبر کو دکھانا ضروری سمجھتے ہیں۔ سو شریعت میں اس کی کچھ اصل نہیں۔

قبر میں عہد نامہ یا شجرہ وغیرہ نہ رکھنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ قبر میں عہد نامہ یا شجرہ وغیرہ رکھتے ہیں اور میت کے گلنے سڑنے سے اس کی بے ادبی ہوتی ہے سو اس کو بھی ترک کرنا چاہیئے۔ البتہ جس چیز کا ادب شریعت میں اس درجہ کا نہیں اس کا قبر میں رکھدینا درست ہے جیسے کسی بزرگ کا کپڑا وغیرہ۔

قبر پختہ کرنا ممنوع ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے قبر پختہ بناتے ہیں جس کی نصًا حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

لڑکیوں کو میراث نہ دینا ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ لڑکیوں کو میراث نہیں دیتے جو نص قرآن حرام اور ظلم ہے۔

بیوہ کو تمام منقولات کا مالک سمجھنا بھی ظلم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے بیوہ عورتیں اپنے کو تمام منقولات کا مالک سمجھتی ہیں۔ یہ بھی ظلم ہے جو چیز شوہر نے اس کو ہبہ کردی ہو وہ بیشک اس کی ہے۔ ورنہ اور سب ترکہ مشترکہ ہے۔ حسب فرائض سب کو دینا چاہیئے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جو چیز جس وارث کے قبضہ میں آجاتی ہے وہ اس کو چھپا ڈالتا ہے مگر یاد رہے کہ قیامت کو سب اگلنا پڑے گا۔

اگر دلہن میکے میں یا سسرال میں مرجاوے تو اس کا مال سب ورثہ کو ملے گا

ایک کوتاہی یہی کا شعبہ یہ ہے کہ اگر دلہن اپنے میکے میں مرجاوے تو اس کے تمام سامان پر وہ لوگ قبضہ کرلیتے ہیں اور اگر سسرال میں مرجاوے تو وہ قابض ہو جاتے ہیں ہم نے کہیں تقسیم شرعی ہوتے سنا ہی نہیں اس میں بھی اوپر کی وعید کو یاد رکھنا چاہیئے۔

میت پر کسی قسم کا قرض اگر دلیل سے ثابت ہو تو انکار نہ کرنا چاہیئے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بجز قرضۂ تمسک کے دست گردان قرض جو میت کے ذمہ ہو اور دلیل شرعی سے ثابت ہو اس کو کوئی شاذ و نادر ترکہ سے ادا کرتا ہے۔ صاف انکار کر دیتے ہیں۔ جیسا کہ میت کا جو ایسا ہی قرضہ اوروں کے ذمہ ہے اور لوگ اس کو بھی مکر جاتے ہیں۔ دونوں امر صریح ظلم ہیں۔ خصوصاً میت پر اگر قرضہ ہو تو ورثہ کو یہ سمجھنا چاہیئے کہ بروئے حدیث اس کی روح جنت میں جانے سے معلق رہے گی جب تک قرض نہ ادا ہو تو کیا اپنے عزیز کے لئے اتنا بڑا حرمان گوارا ہو گا۔

اگر میت کا کوئی وارث بطن مادر میں ہو تو اس کے تولد تک میراث تقسیم نہیں ہو گی

ایک کوتاہی یہ ہے کہ کبھی میت کے وارثوں میں وہ بچہ بھی ہوتا ہے جو ابھی بطن مادر میں ہے۔ ہم کو یاد نہیں کہ کسی مستفتی نے سوال میں کبھی اس کو ظاہر کیا ہو۔ اور ہم جواب دینے والے لوگوں کی بھی کوتاہی ہے اس کا احتمال ہی نہیں ہوتا اور سائل سے اس کی تحقیق ہی نہیں کرتے۔ مذہب کا ضروری مسئلہ ہے۔ بہت زیادہ قابل اعتناء کے ہے۔ بدون اس کے تولد کے تقسیم ترکہ کی صورت معلق رہے گی۔ بعد تولد کے صحیح سوال قائم ہو گا۔

کفن میں میت کی لنگی باندھ دینا بدعت ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ کفن میں میت کی لنگی باندھی جاتی ہے۔ جو بالکل بدعت ہے۔ بعض اردو خوانوں کو ازار یا اس کا ترجمہ لنگی دیکھ کر دھوکہ ہوا ہے سو سمجھ لینا چاہیئے کہ وہ بھی پورا چادر ہوتا ہے۔

چونکہ لنگی کے حصہ کا وہ چادر امشروع ہوا ہے اس لئے اس کا نام یہی ہو گیا۔

شوہر اپنی مُردہ بیوی کا منہ دیکھ سکتا ہے اور اس کے جنازہ کا پایہ بھی پکڑ سکتا ہے۔

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ شوہر کو اس کی مردہ بیوی کا منہ نہیں دیکھنے دیتے نہ اس کے جنازہ کا پایہ پکڑنے دیتے ہیں یہ محض لغو ہے۔ میت کو ہاتھ لگانا تو بلا ضرورت جائز نہیں لیکن منہ دیکھنا درست ہے اور پایہ پکڑنا مستحب ہے۔ بلکہ اگر کوئی محرم قبر میں اتارنے والا نہ ہو تو اور اجنبیوں سے شوہر احق ہے اور عورت کے لئے تو مردہ شوہر کو دیکھنا اور ہاتھ لگانا بھی درست ہے۔

کثرت آدمی کیلئے جنازہ کو دیر کرنا جائز نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ نماز جمعہ کے انتظار میں جنازہ کو رکھے رکھتے ہیں کہ زیادہ نمازی نماز پڑھیں گے۔ سو یہ بالکل جائز نہیں۔ جس قدر جلد ممکن ہو نماز اور دفن سے فراغت کرنا واجب ہے

اگر میت نے کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص جگہ دفن کرنیکی وصیت کی تو شرعاً ایسی وصیتیں لازم نہیں ہوتیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض اموات کسی خاص شخص سے نماز پڑھوانے یا کسی خاص مقام پر دفن ہونے کی وصیت کر جاتے ہیں تو احیاء اس کا اس قدر اہتمام کرتے ہیں کہ بعض اوقات بعضے واجبات شرعیہ بھی ضائع ہو جاتے ہیں۔ سو جان لینا چاہیئے کہ ایسی وصیتیں شرعاً لازم نہیں ہوتیں اگر کوئی امر خلاف شرع لازم آوے تو اس پر عمل جائز بھی نہیں۔

الحمد للہ قسم سوم سے بھی فراغت ہوئی اس وقت ذہن میں یہی امور ظاہر ہوئے جو انشاء اللہ تعالیٰ قریب قریب کافی ہیں باقی اگر کوئی اور بات قابل تحقیق خیال میں آوے تو علماء سے رجوع کر لیا جاوے۔ جیسا حالت قبل موت کے بیان کے ختم پر بھی عرض کیا ہے۔

سفر کے معاملے میں کوتاہیاں

(اصلاح معاملہ بسفر)

منجملہ ان امور کے جن میں انقلاب واجب الاصلاح واقع ہوا ہے۔ سفر بھی ہے جو ایک معمولی روزانہ کی حالت ہے۔ جس کی وجہ سے اس کے انقلاب کی طرف ذہن بھی نہیں جاتا مگر ہماری بے علمی اور بدعملی سے اتنا بڑا خفیف امر بھی اس انقلاب سے محفوظ نہیں رہا۔ چنانچہ مختصر اس کو بھی لکھا جاتا ہے۔

بلا ضرورت سفر نہیں کرنا چاہیئے

سو منجملہ ان کوتاہیوں کے جو سفر کے متعلق ہیں۔ ایک یہ ہے کہ بکثرت سفر بلا ضرورت کیا جاتا ہے جس کو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس ارشاد میں ناپسند فرمایا ہے کہ جب سفر میں تمہاری حاجت پوری ہو جاوے تو اپنے گھر جلدی لوٹ آؤ۔ اس واسطے کہ سفر سے کھانے پینے سونے میں خلل پڑتا ہے۔

اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ جب بلا ضرورت البقاء سفر پسند نہیں تو اس کا احداث تو بدرجۂ اولیٰ ناپسند ہوگا۔ کیونکہ احداث سے البقاء اہون اور اسہل ہے اور واقعی جیسا حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے۔ سفر میں تمام سامان ضروری آسائش کا مختل ہو جاتا ہے۔

اور جس طرح طبعی آسائش میں خلل پڑتا ہے۔ اسی طرح شرعی زندگی میں یعنی دینی معمولات میں بھی اختلال واقع ہوتا ہے۔ جو مبتدی کے لئے خصوصیت کے ساتھ اور منتہی کے لئے بھی ایک درجہ میں مضر ہے۔

ایک شبہ کا ازالہ

اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ ایک حدیث میں نص ہے کہ اگر مرض یا سفر کے سبب معمولات میں خلل پڑتا ہے تو حق تعالیٰ فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ میرے بندے کے لئے اتنا ہی ثواب لکھنا جتنا حالت صحت وحضر میں لکھتے تھے۔ اس سے معلوم ہوا کہ یہ اختلال معمولات اوراد کا مضر نہیں۔

جواب یہ ہے کہ یہ اس سفر کیلئے ہے جو بضرورت ہو۔ اس لئے کہ اوپر غیر ضروری سفر کا ناپسندیدہ ہونا ثابت ہو چکا ہے تو اس کو اجر کے باب میں عذر کیسے کیا جاوے گا۔ اور اجر کی قید اس لئے لگائی کہ ایسے سفر میں قصر صلوٰۃ کی مشروعیت پر شبہ نہ ہو۔ حتیٰ کہ حضرت امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک تو سفر معصیت میں بھی قصر مشروع ہے تو اس قید سے یہ شبہ جاتا رہا ــ حاصل یہ ہے کہ قصر تو احکام دنیویہ سے ہے۔ اس کے سفر کا مرضی یا نامرضی ہونا منع نہیں بخلاف اجر کے کہ احکام اخرویہ میں سے ہے۔ اس کا مدار رضا پر ہے جیسے ایک شخص کسی دنیوی غرض سے قتال کرکے شہید ہوجاوے تو اس کے متعلق جو احکام دنیویہ ہیں مثلاً غسل نہ دینا وغیرہ۔ وہ تو اس صورت میں بھی مرتب ہوجاویں گے باقی جو احکام اخرویہ ہیں مثلاً اجر وثواب ودرجات وہ مرتب نہ ہوں گے جب تک وہ قتال عند اللہ مرضی وپسندیدہ نہ ہو کہ نیت خالص اعلاء کلمۃ اللہ کی ہو۔

ایک اور شبہ کا ازالہ

اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ کھانے سونے میں خلل پڑنا تو مجاہدہ ہے۔ اور مجاہدہ بھی اصل طریق ہے تو اس کا سبب کہ سفر ہے کسی حال میں ناپسندیدہ نہ ہونا چاہئے کیونکہ اول تو ہر اختلال فی الطعام والمنام مجاہدہ نہیں۔ مجاہدہ وہی ہے جو بغرض اصلاح نفس کیا جاوے تو اگر ایسا ہے تو اس میں کلام نہیں چنانچہ عنقریب اس کے جواز کی تحقیق آتی ہے کلام تو اس سفر میں ہے جو محض بلا مصلحت معتد بہا کیا جاوے مثلاً صرف تعطیل پوری کرنے کو، یا محض شہروں کی سیر کرنے کو، یا نمائش دیکھنے کو، ونحو ذلک یا اس سے بڑھ کر کسی معصیت کی تحصیل وتکمیل کو اس میں

کون سی اصلاح نفس ہے پس اس میں جو اختلال ہوگا وہ مجاہدہ کس طرح ہوگا۔

ایک تیسرے شبہ کا ازالہ

اور یہ بھی شبہ نہ کیا جاوے کہ بہت سے بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے اپنی تمام عمر ہی سیر سیاحت میں گذار دی۔ ایک جگہ قرار ہی نہیں لیا۔ اور ظاہر ہے کہ تمام عمر کسی کو حاجت نہیں رہتی تو انہوں نے کیا حدیث کے خلاف کیا؟

جواب یہ ہے کہ حاجت منحصر دنیوی اور نفسانی ہی حاجت میں نہیں ہے۔ اس سے زیادہ اپنی اصلاح اور حفظ دین کی حاجت ہے۔ سو بعضے بزرگوں کو اپنے تجربے سے یا کسی شیخ کامل کی تشخیص سے قیام میں مضرتیں محسوس ہوئیں مثلاً مخلوق سے زیادہ تعلق ہو جانا، لوگوں کا معتقد ہو جانا۔ جبکہ اس سے عجب وغیرہ کا اندیشہ ہو یا بداندیشوں سے اندیشہ ضرر لاحق ہونا ومثل ذالک۔ اور سفر میں ان آفات سے نجات دیکھی اور غوائل سفر سے محفوظ رہنے کی امید دیکھی۔ اس لئے سفر اختیار کرلیا سو وہ سفر بلا ضرورت نہ ہوا۔ جیسا کہ سیر میں مذکور ہے کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اکثر سفر میں رہتے تھے سو اختلاف مذاق سے مصلحتیں بدل جاتی ہیں مگر اس کا تشخیص کرنا کہ ہمارے لئے سفر نافع ہے یا مضر موقوف ہے۔ بڑی بصیرت پر ہر شخص کو اپنی رائے پر وثوق نہ کرلینا چاہیئے۔ کسی شیخ کامل سے ضرور مشورہ کرلے کہ اس کی اور اس کے متعلقین اہل حقوق کے مصالح پر عمیق نظر کرلے۔ اور جس طرح دینی مصلحت مبیح سفر ہے۔ اسی طرح دنیاوی مصلحت بھی جو حسب قواعد شرع بھی مصلحت ہو مجیز سفر ہے۔ جیسا تلاش معاش حلال کے لئے سفر کرنا، یا تعدیل مزاج کے لئے سفر کرنا جبکہ طبیب نے تجویز کیا ہو یا کسی دوست یا قریب سے از دیاد محبت و سرور کے لئے سفر کرنا، یا کسی نافع تحقیق کے لئے سفر کرنا بشرطیکہ اس میں غلو نہ ہو جیسا کہ بعض شائقان تحقیقات جدیدہ کو غلو ہو گیا ہے۔ کہ ان کی مساعی شاقہ اس مثل کا مصداق ہو جاتی ہیں۔ کوہ کندن و کاہ برآوردن جن کی مذمت اس آیت میں بھی ہے وکم اھلکنا قبلھم من قرن ھم اشد منھم بطشا فنقبوا فی البلاد آلایۃ

اور جب بلا ضرورت سفر مذموم ہے تو معصیت کے لئے سفر کرنا تو بہت ہی قبیح ہوگا۔ پھر بعض امور تو صورۃً بھی معصیت ہیں۔ جیسے کسی نامحرم عورت سے نفسانی خواہش پورا کرنے کو سفر کرنا، یا ناچ رنگ دیکھنے کے لئے سفر کرنا، یا نامشروع رسم شادی میں شریک ہونے کے لئے سفر کرنا۔ و مثل ذالک۔

اور بعض امور عوام کے نزدیک طاعات وقربت ہے مگر اہل علم کے نزدیک معصیت ہے۔ جیسے آج کل کے اعراس میں جانا مزارات پر نذر ونیاز کے لئے حاضر ہونا۔ یا عوام کے نزدیک مباح ہے اور اہل علم کے نزدیک قبیح ہے۔ جیسے ان شادیوں میں یا براتوں میں شریک ہونا جن میں ناچ رنگ وغیرہ نہ ہو۔ لیکن تفاخر ونا موری کے سارے کام ہوں عوام تو یہ سمجھکر تسلی کر لیتے ہیں کہ اس میں ڈومنی نہیں، ناچ نہیں گناہ کی کیا بات ہے۔ لیکن اہل علم کے نزدیک جس طرح یہ امور معصیت ہیں اسی طرح کبر وفخر وریا وجاہ کا سامان سب معصیت ہے۔ ان دونوں میں فرق کرنا اہل علم کی نظر میں محل تعجب ہے۔ ولنعم ما قیل ؎

ریا حلال شمارند وجام بادہ حرام
زہے شریعت وملت زہے طریقت وکیش

اور بعض امور ایسے دقیق ہیں کہ بعض اہل علم بھی ان کو مباح یا قربت سمجھتے ہیں۔ مگر محققین راسخین فی العلم ہی اس کی تہ تک پہنچ کر اس کو روکتے ہیں مثلاً شیخ کامل کی زیارت کے لئے سفر کرنا، جبکہ والدین مانع ہوں۔ ظاہر بین اہل علم بھی اس خیال میں مبتلا ہیں کہ پیر کا حق والدین سے زیادہ ہے کیونکہ وہ مربی روح ہے اور والدین مربی جسم ہے۔

سو حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ مقدمہ علی الاطلاق بھی ہو تو دوسرا مقدمہ ہنوز محتاج اثبات ہے۔ یعنی ہر مربی روح کا حق ہر مربی جسم سے زیادہ ہے۔ بات یہ ہے کہ تربیت روح کے مراتب مختلف ہیں ایک مرتبہ تو تربیت فی الفرائض والواجبات کا ہے اس میں تو واقعی شیخ کا حکم مقدم ہے حکم والدین پر۔ اور وہ بھی نہ اس وجہ سے کہ وہ شیخ ہے۔

بلکہ اس وجہ سے کہ وہ واجبات شرعیہ کی طرف رہبری کر رہا ہے اور اگر والدین اس سے روکتے ہیں تو معصیت کی طرف بلا رہے ہیں اور لا طاعۃ لمخلوق فی معصیۃ الخالق (ترجمہ) (اللہ تعالیٰ کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت جائز نہیں) قانون شرعی ہے پس واقع میں یہاں خالق کی اطاعت مقدم ہوئی مخلوق کی اطاعت پر نہ کہ شیخ کی اطاعت مقدم ہوئی اطاعت والدین پر۔

اور ایک مرتبہ تربیت فی التطوعات کا ہے سو اس میں والدین کا حکم مقدم ہے تطوعات پر نہ اس وجہ سے کہ یہاں والدین کی اطاعت مقدم ہو گئی ہے خالق کی اطاعت پر بلکہ اس وجہ سے کہ یہاں خالق کا امر ہی نہیں۔ ان تطوعات کے لئے بلکہ خالق نے مخلوق کی احتیاج کی رعایت

فرماکر خود یہ حکم فرمادیا کہ اسی کی مصلحت کی رعایت کرو سوفی الواقع یہاں بھی خالق ہی کی اطاعت ہوئی۔

دوسری مثال جن کی قعر تک راسخین فی العلم ہی پہنچتے ہیں۔ سفر کرنا طلب علم دین کے لئے جبکہ والدین مانع ہوں کہ یہاں بھی ظاہراً تحصیل علم دین مقدم ہے۔ مگر غور طلب بات یہ ہے کہ آیا ہر درجہ تحصیل علم کا واجب و فرض ہے کہ وہ اطاعت والدین پر مقدم ہو۔ سو اس میں مثل بھی امر بالا وہی تفصیل ہے۔ کہ ایک درجہ واجب کا ہے وہ مقدم ہے حقوق والدین پر مگر وہ اردو میں بھی حاصل ہوسکتا ہے اور وہ عربی کے ملخص نصاب سے بھی حاصل ہوسکتا ہے۔ اس کے لئے تبحر فی العلوم النقلیۃ کی کون سی ضرورت ہے۔ کہ خواہ والدین کو کیسی ہی جسمانی یا روحانی کلفت ہو مگر یہ بدون زواہد ثلثہ کے ایک ایک حرف کے دھوئے ہوئے ادہر رخ نہ کریں گے۔ اور ایسے مضیعین حقوق تو عاصی ہوتے ہی ہیں۔ میرے نزدیک تو جو لوگ ان کے طبق و سبق کا انتظام کرتے ہیں وہ بھی ملامت سے نہ بچیں گے کہ اعانت کرتے ہیں امر غیر مشروع پر۔

اور ایک مضمون اس باب میں اس سے زیادہ نازک ہے وہ یہ کہ بعض ظاہر بین یہاں تک تو پہنچ جاتے ہیں کہ صورت مذکورہ میں شیخ کی یا استاد کی خدمت و صحبت میں رہنا نہ چاہیئے بلکہ والدین کی خدمت واطاعت کرے مگر ان کو اس میں اس قدر غلو ہو جاتا ہے کہ اس سے نیچے کی تہ کو نہیں دیکھتے صرف یہ دیکھتے ہیں کہ یہ طالب جس کام میں مشغول ہے وہ مندوب ہے اور اطاعت والدین کی واجب ہے اور واجب مقدم ہے مندوب پر پس اس شخص کو مجبور کرتے ہیں کہ اپنے شغل کو چھوڑ کر والدین کے پاس جاوے۔ سو اس نے اتنا تو صحیح سمجھا کہ واجب مقدم ہے۔ مندوب پر۔ مگر غلطی یہ ہوئی کہ اس کو مندوب سمجھ لیا اور غلطی کی وجہ یہ ہوئی کہ اس کے جزو حالی کو دیکھا جزو مالی کو نہیں دیکھا بعض امر ایسا ہوتا ہے کہ باعتبار حال کے وہ غیر ضروری نظر آتا ہے لیکن باعتبار مآل کے مقدمہ ہوتا ہے کسی امر واجب کا اور ظاہر ہے کہ مقدمہ واجب کا واجب ہے۔

پس اس بنا پر وہ واقع میں واجب ہی ہوتا ہے اور واجب کا تقدم حق والدین پر ہوتا ہے اس لئے ان ظاہر بینوں کا حکم اس میں غلط ہو جاوے گا۔ اور یہ امر اس قدر دقیق ہے کہ بعض دفعہ اہل ظاہر اس کو قبول کرنے میں بھی تامل کرتے ہیں۔ محققین نے یہاں تک کہا ہے کہ اگر خلوت و ریاضت سے طبیعت ملول ہو جاوے اور قرائن سے معلوم ہو کہ اگر اس حالت کو امتداد ہو گا تو طبیعت

بے کار ہو جاوے گی تو اس شخص پر واجب ہے کہ خلوت چھوڑ کر تفریح مباح میں مشغول ہو۔ باہر نکلے، دوستوں سے ہنسے بولے۔ جب طبیعت میں تازگی و نشاط پیدا ہو جاوے۔ تب پھر خلوت میں بیٹھ جاوے۔

ان محققین پر بڑی ملامت کی گئی ہے۔ کہ اوراد کو جو طاعات ہیں منہی عنہ اور مزاح کو جو کہ دین کا کام بھی نہیں واجب کہتے ہیں مگر جو شخص علوم شرعیہ میں اتقان و امعان کا درجہ رکھتا ہے اس کو اس حکم میں کچھ بھی تعجب نہ ہوگا۔ حدیث تو اس سے زیادہ کی تصریح کر رہی ہے وہ حدیث یہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پیشاب و پاخانہ کے دباؤ کے وقت نماز پڑھنے کو منع فرمایا ہے۔ سو دیکھیے کہ پیشاب و پاخانہ تو مزاح سے بھی ادون ہے۔ اور فرض نماز اوراد سے بھی اعلیٰ ہے۔ جب اس شخص پر خاص حالت میں نماز کو تو حرام اور تغوط کو تو واجب فرمایا۔ تو ان بعض محققین پر ملازمت کی کیا گنجائش ہے تو اس مزح کے وجوب کا سبب یہی ہے کہ تعطل و لطالت و کسل کا علاج واجب ہے تاکہ اس کا اثر فرائض و واجبات تک نہ پہنچ جاوے۔ اور اس واجب کا طریق عادۃً اس شخص کے لیے یہی مزاح ہو گیا تھا اس لئے یہ مزاح بھی واجب ہو جاوے گا۔

اسی طرح بعض حالات میں مبصر کو کسی خاص شخص کی استعداد دیکھ کر ادراک ہوتا ہے کہ اگر اس کو تبحر فی العلوم و احاطہ نقلیات و عقلیات کا نہ ہوا یا یہ شخص کسی شیخ کامل کے پاس چندے نہ رہا تو آئندہ کسی وقت اس کے کسی ضروری جزو دین میں خلل واقع ہونا غالب ہے اور اس کی حفاظت ہے واجب۔ اور اس کا طریقہ یہی تبحر و تفرغ للعبادۃ الیٰ مدۃ معدودۃ ہے اس لئے یہ مبصر اس شخص کے لئے اس مندوب ظاہری کو واجب کہے گا اور اس ظاہر بین کے حکم و تجویز کو غلط سمجھے گا۔ چنانچہ محققین کے کلام میں ایسی تصریحات موجود ہیں۔ پس اس ظاہر بین کو چاہیئے کہ وہ حدیث الشاهد يرى ما لا يراه الغائب پر عمل کر کے اپنی رائے پر وثوق نہ کرے اور اس طالب کو تقدیم حق والدین کی رائے نہ دے۔

حضر علیہ السلام کے تصرفات کا مبنی یہی مآل بینی تھی گو وہ کمال موسوی سے اس لئے بڑھا ہوا نہ تھا کہ منشا اس مال بینی کا کشف تھا اور ان واقعات کو فراست اور بصیرت سے کوئی تعلق نہ تھا اور موسیٰ علیہ السلام کا کلام یہی تھا۔ اس لئے ان کی نظر سے یہ امور غائب رہے اور ادراک بصیرت

ادراک کشف سے افضل واکمل ہے اس لئے افضل موسیٰؑ ہی تھے۔

بعض جگہ اس مبصر کے نزدیک خود اس طالب پر اندیشہ اس کا نہیں ہوتا کہ بدون تبحر فی العلوم کے اس کا کوئی ضروری دینی جزو مختل ہو جاوے گا۔

مگر یہ طالب ہے ایسے مقام کا رہنے والا جہاں جہل وفساد غالب ہے اور اس کے ساتھ ہی کسی کو تحصیل علم دین کی طرف توجہ نہیں جس سے ان کی اصلاح ہو پس گو اس نواح والوں پر بطریق فرض کفایہ ہی تبحر واجب ہے مگر کوئی اس میں مشغول نہیں تو سب ہی گنہگار ہوں گے اور ان سب میں یہ طالب بھی گنہگار ہوگا اور گناہ سے بچنا واجب ہے اس لئے اس واجب پر نظر کرکے یہ مبصر اس طالب کو رائے دے گا کہ تم والدین کے امر کو چھوڑ کر تبحر علوم میں حاصل کرو۔ اور اپنی قوم کی اصلاح کرو۔ اس لئے ایسے مشتبہ مواقع میں اپنی یا محض ظاہر پرست کی رائے پر وثوق نہ کرے کسی محقق حکیم مبصر جامع ظاہر و باطن سے فتویٰ لے کر اس کا اتباع کرے۔

تیسری مثال ایسے امور دقیقہ کی جن کو بعض اہل علم بھی مباح یا قربت سمجھتے ہیں مگر محققین راسخین اس کو روکتے ہیں۔ سفر کرنا حج نفل کے لئے ظاہراً قربت معلوم ہوتا ہے مگر بعض اشخاص کے خاص حالات سے محقق کو اس کا اندازہ ہوتا ہے کہ اس کا حج کرنا اس لئے مضر ہوگا کہ یا تو اس سے فرض نماز کی پابندی نہ ہوگی یا اہل وعیال کے حقوق واجبہ ضائع ہوں گے۔ یا قلت زادراہ کے سبب تکلیفیں اٹھاوے گا اور اس کے قلب میں بیت اللہ یا صاحب البیت سے تنگی وشکوہ پیدا ہوگا جیسا بعض لوگوں کو دیکھا جاتا ہے یا یہ کہ سوال حرام میں مبتلا ہوگا ونحو ذلک۔ اور یہ سب معاصی ہیں اور معصیت کا سبب بھی معصیت ہے اس لئے وہ محقق اس شخص کو حج سے منع کرتا ہے اس لئے کہ جس طرح مقدمۃ الواجب واجب قاعدہ ہے۔ اسی طرح مقدمۃ الحرام حرام بھی ایک قاعدہ ہے جس میں بعض اوقات مثل قاعدہ بالا ظاہر بینوں سے غلطی بھی اور ان کو اہل بصیرت کے بعض احکام پر استعجاب بھی ہونے لگتا ہے۔ چنانچہ ایک محقق کا یہاں تک قول ہے کہ اگر کسی شخص کو شریعت سفر حج کی اجازت نہ دے اور قرائن قویہ سے یہ معلوم ہو کہ اگر وہاں کے حالات اس شخص کے سامنے بیان کئے جائیں گے تو اس کو اس قدر شوق ہوگا کہ بہ اضطراراً سفر میں چل کھڑا ہوگا۔ تو ایسے شخص کے سامنے ایسے شوق انگیز حالات بیان کرنا تک جائز نہیں۔ ان محقق پر اس حکم میں بے حد ملامت ہوئی

کر توبہ توبہ وہاں کے حالات بیان کرنے کو منع کر دیا۔ مگر ان بزرگ معترضوں نے یہ نہ دیکھا کہ جس دلیل سے یہ منع کر رہے ہیں آیا اس کے کسی مقدمہ میں کوئی خدشہ ہے اگر ہے تو اس کو صاف کرنا چاہیئے اگر نہیں ہے تو ماننا چاہیئے مقدمات کو تسلیم کر کے نتیجہ میں کلام کرنا محض تحکم و اعتساف و کج روی و بے راہی ہے۔ یہی ہے وہ قاعدہ جس کی بنا پر محققین اکثر بدعات کو منع کرتے ہیں اور عامی نظر کے لوگ، یا اہل تعنت ان سے الجھتے ہیں اسی کو کہا ہے:

وکم من عائب قولا صحیحا
وآفته من الفهم السقیم

سفر شروع کرنے کے بعد کی کوتاہیاں

یہاں تک ذکر تھا اس کوتاہی کا جو سفر شروع کرنے سے متعلق واقع ہوتی ہے۔ بعض کوتاہیاں بعد سفر شروع کرنے کے ہوتی ہیں مثلاً بعضے آدمی رفیقان سفر سے ذرا ذرا بات پر الجھتے ہیں کہیں اس پر کہ تم اپنی باری میں جاگے کیوں نہیں؟ کہیں اس پر کہ اسباب ہم اٹھاتے ہیں تم کیوں نہیں اٹھاتے اس پر کہ تم نے گاڑی کا کرایہ زیادہ دیا کہیں اور زیادہ خرچ کر دیا خصوص سفر حج میں کہ گنوار بھی نوابی مزاج کا ہو جاتا ہے سو یہ بات سخت بد خلقی میں داخل ہے اول تو یہ امور قابل خیال و مطالبہ کے نہیں دوسرے اگر ان کا مطالبہ ہی رفیق سے مطلوب ہے تو اس کا یہ طریق نہیں کہ یہ اس کے عیب چھانٹے اور وہ اس کے عیب نکالے۔ بلکہ طریقہ سہل اور مجرب النفع یہ ہے کہ تم اس سے کچھ مت کہو خود برابر کام کیئے جاؤ اس سے خود وہ شرماوے گا۔ اور خود بھی کام کرے گا۔ اور اگر وہ اس سے بھی متاثر نہ ہوا اور تم میں صبر و تحمل نہ ہو تو بہتر ہے کہ اس سے عقد رفاقت قطع کر دو اور جواب دے دو کہ اب سے ہم تم رفیق نہیں بس مثل دیگر مسافروں کے اس سے معاملہ رکھو کہ نہ دوستی و شرکت اور نہ دشمنی و مزاحمت۔

بعض لوگ رفیقوں سے تو اچھا معاملہ رکھتے ہیں لیکن دوسرے مسافروں سے بد خلقی کرتے ہیں کبھی اپنے نفس کے لیئے اور کبھی اپنے رفیق کے لیئے۔ خصوص ریل میں کہ اکیلا آدمی یا دو آدمی کئی کئی آدمیوں کی جگہ گھیر کر کچھ خود پھیل کر کچھ اسباب و بستر پھیلا کر بیٹھتے ہیں اور نئے آنے والوں کو تو اکثر آنے ہی نہیں دیتے۔ طرح طرح کے حیلے کرتے ہیں کبھی زور و ظلم سے بھی کام لیتے ہیں اور اگر وہ چلنے

ہی آئے تو ان کو بیٹھنے کی جگہ نہیں دیتے کسی کسی اسٹیشن وہ لوگ کھڑے ہو کر قطع کرتے ہیں اور ان کو ذرا مروت وترحم نہیں آتا۔ یہ نہیں سوچتے کہ اگر ہم ان کی جگہ ہوتے اور یہ ہماری جگہ تو ہم اس وقت ان سے کس معاملہ کے متمنی ہوتے۔ پس وہی معاملہ ہم کو ان سے کرنا چاہیئے اور نہ یہ سوچتے ہیں کہ یہ شرعًا بھی جائز نہیں۔ جیسے کہ اور بھی بعض ناجائز امور کا ریل میں ارتکاب کیا جاتا ہے جس کی جزئیات کو بقدر ضرورت ہمارے محب ومکرم مولانا سید اصغر حسین صاحب دیوبندی نے ایک رسالے کی شکل میں جمع فرمایا ہے جس کا نام رفیق سفر یا زاد المسافرین ہے اور انشاء اللہ عنقریب طبع ہو جائے گا۔ اس لئے ہم ایسے جزئیات کے ذکر کا اس جگہ اہتمام نہیں کرتے اور یوں بلا قصد کوئی جزئیہ قلم میں آجاوے وہ اور بات ہے۔

بعضے آدمی مشترک سواری میں (جیسے گھوڑا گاڑی یا اونٹ گاڑی یا موٹر ریل) ایسی حرکتیں کرتے ہیں کہ جس سے دوسروں کو اذیت ہوتی ہے۔ خاص کر ایسے غربا کو اذیت جو ان کی وجاہت کے سبب ان کے سامنے ...... دم بھی نہ مار سکیں۔ مثلاً سگریٹ پینا اور دھواں باہر چھوڑنے کا کوئی خاص اہتمام نہ کرنا۔ یا شب کے وقت غل مچا کر باتیں کرنا یا گانا بجانا اور کوئی بیہودہ ہنسی مذاق کرنا یا قول یا فعل فحش اختیار کرنا اور اس کو مشغلہ سفر سمجھنا چاہیئے۔ تو یہ کہ دوسروں کو راحت پہنچاوے اور اگر اس کی توفیق نہ ہو تو کم از کم اس پر تو عمل رکھیں۔ مصرعہ

مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان

بعضے آدمی مالک سواری سے بدعہدی کرتے ہیں مثلاً معاہدہ ہوا ہے چار آدمی کے بٹھلانے کا اور بٹھا دیئے پانچ چھ۔ اگر وہ نزاع بھی نہ کریں۔ تب بھی اس کو جائز نہ سمجھنا چاہیئے اور یہ خیال نہ کرنا چاہیئے کہ جب خاموش ہو گیا تو راضی ہی ہے۔ کیونکہ بعض اوقات خاموشی بوجہ مروت ولحاظ کے ہوتی ہے مگر دل سے رضا نہیں ہوتی۔ تو ایسی خاموشی کافی نہیں۔ اور بعض دفعہ وہ نزاع بھی کرتا ہے مگر خواہ مخواہ اس کو دباتے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں میاں ایسی کیا بے مروتی ہے؟ کبھی کہتے ہیں کہ میاں سواریاں ہی کیا ہیں دو تو بچے ہی ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ ارے بھائی دو پیسے زیادہ لے لینا۔ کبھی کہتے ہیں کہ کسی دوسرے وقت سمجھ لینا اور واہی تباہی عذروں سے کام لیتے ہیں۔ اور اس سے بحث نہیں کہ یہ جائز ہے یا ناجائز ہے۔ سیدھی بات تو یہ ہے کہ جب معاہدہ بدلے تو مالک سے صاف اطلاع کرے اور اس کے متعلق مستقل گفتگو کر کے جس طرح باہم طے ہو جائے اس کے موافق عمل کرے محض اپنے جی کو سمجھا لینا کافی نہیں۔

مزدوری کے متعلق کوتاہی

بعضے آدمی مزدور کی مزدوری نہیں ٹھہراتے، پھر بعضے تو بلا کسی ضابطہ کے جو جی میں آیا دے دیا۔ خواہ دوسرا راضی ہو یا نہ ہو اس کا ظلم ہونا تو ظاہر ہی ہے اور بعضے اپنے زعم میں بے راہی سے بچتے ہیں اور ضابطہ کی پابندی کرتے ہیں یعنی اس محکمہ کے قواعد کے موافق کہ فی عدد اس قدر دیا جاوے کہ دیدیتے ہیں اسی طرح گاڑی وغیرہ کا کرایہ گھنٹوں کے حساب سے دینے کو کافی سمجھتے ہیں ہم نے خود دیکھا ہے کہ بعض اوقات دوسرا آدمی یعنی مزدور اور گاڑی والا اپنی ناراضامندی تصریحاً ظاہر کرتا ہے کہ صاحب ایک پیسہ تو فلانا ہی لے لیگا۔ دیکھئے! کیا وزنی اسباب ہے ؟ اس کا تو زیادہ دینا چاہیئے۔ فی عدد کا حساب تو مختلف مقدار کی گٹھریوں میں ہے۔ دیکھئے! چاروں گٹھریاں بڑی ہی بڑی ہیں۔ مشکل سے اٹھائی ہیں ایک ایک عدد دو آدمیوں کے اٹھانے کا ہے۔ آپ اس کا بھی اسی حساب سے دیتے ہیں ؟

غرض اس طرح سے وہ اپنی ناراضامندی کا اظہار کرتا ہے۔ مگر یہ حضرات ان سب معروضات کو یہ کہہ کر ٹال دیتے ہیں کہ صاحب ان لوگوں کی یہ عادت ہی ہوتی ہے۔ غرض التفات ہی نہیں کرتے اگر وہ زیادہ بولا دھمکاتے ہیں۔ حملہ بھی کرتے ہیں وہ غریب خاموش ہو کر رہ جاتا ہے۔

عقد اجارہ میں مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے

سو خوب سمجھ لینا چاہیئے کہ عقد اجارہ میں مزدور یا مالک کی رضامندی شرط ہے کوئی ضابطہ مقرر ہو جانا شرعًا کافی نہیں یہ مسئلہ تسعیر کا ہے جس کو فقہاء نے ناکافی لکھا ہے۔ البتہ اس سے منتفع ہونے کی ایک صورت ہے جو شرع کے موافق ہے وہ یہ کہ پہلے سے یہی کہہ دیا جاوے کہ دیکھو! ہم اس ضابطہ کے موافق دیں گے اس کے بعد جب اس نے کام شروع کر دیا یا سواری میں بٹھلا لیا اب وہ اس کے حق میں حجۃ اور لازم ہو گیا۔ خوب سمجھ لینا چاہیئے۔

بعضے آدمی اسباب شرط سے زیادہ لادلیتے ہیں بلکہ بعضے کچھ شرط ہی نہیں کرتے اور سواری والا یہ سمجھ کر خاموش ہو جاتا ہے کہ معمول کے موافق ہوگا۔ مگر عین وقت پر اس کے زعم میں ثابت ہوتا ہے زیادہ تو وہ تکرار کرتا ہے۔ اور باہم اختلاف اور نزاع ہوتا ہے پھر جو بھی غالب آ گیا سو اس میں شرعی حکم یہ ہے کہ جہاں سواری کا مالک خود کہدے کہ اس سے زیادہ اسباب نہ رکھا

جاوے اور پھر اس سواری کو یہ کرایہ کرے تو اس شرط کو اس نے منظور کر لیا پھر اس سے زیادہ لے جانا کسی طرح جائز نہیں جب تک وہی راضی نہ ہو۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیئے کہ مالک کا راضی ہونا شرط ہے جس نے شرط ٹھہرائی ہے کسی دوسرے ملازم وغیرہ کا راضی ہونا کافی نہیں۔ البتہ اگر ملازم کو اختیارات شرط ٹھہرانے کے بھی دیئے گئے ہوں تو پھر اس کی رضا بھی کافی ہے۔

ریل وغیرہ میں قانون سے زائد اسباب لے جانا جائز نہیں

یہاں سے ریل میں قانون سے زائد اسباب لے جانے کا حکم اور یہ بھی کہ اگر ریلوے سے ملازم چھوٹے بڑے زیادہ کی اجازت دیدیں تو اس کا ناجائز ہونا بھی معلوم ہو جاوے گا خواہ وہ کچھ لے کر اجازت دیں یا ویسے ہی رعایت کریں۔ کیونکہ وہ ریل کے مالک نہیں اور اگر مالک کی طرف سے کوئی شرط و قانون وغیرہ نہیں ہے تو پھر اس سے کرایہ کرتے وقت دکھلاوے کہ یہ اسباب ہے یا وزن بتلادے کہ اتنا ہوگا اس سے زیادہ ناجائز ہوگا۔

میں نے اپنے بعض اساتذۂ کتب ابتدائیہ سے رئیس الاتقیاء حضرت مولانا مظفر حسین صاحب قدس سرہ کی حکایت سنی ہے کہ اسباب دکھلانے کے بعد اگر کوئی شخص ایک خط بھی دیتا تھا کہ فلاں شخص کو دیدیجئے تو فرماتے تھے یہ گھوڑے والے سے اجازت لے لو کیونکہ یہ مشروط سے زیادہ ہے۔
میرا اس حکایت کے نقل کرنے سے یہ مقصود نہیں کہ یہاں تک رعایت واجب ہے بلکہ مقصود یہ ہے کہ دیکھئے! احتیاط والے امر غیر واجب تک کی رعایت و اہتمام کرتے ہیں۔ جس سے غرض یہی ہوتی ہے کہ دوسرے دیکھنے والے واجب کا تو خیال کریں گے تو مطمح نظران کا تعلیم ہی ہے۔ اب اس کے بعد شبہ غلو یا تقشف کا بھی زائل ہوگیا سو اس حالت میں ہم کو امور واجبہ کی تو رعایت و اہتمام کرنا چاہیے یہ غلطیاں تو معاملات کے متعلق تھیں جو سفر میں ہوتی ہیں۔

سفر میں نماز چھوڑنا دیانات کے خلاف ہے

بعض غلطیاں دیانات کے متعلق ہوتی ہیں۔ مثلاً بعض آدمی سفر میں نماز چھوڑ دیتے ہیں۔ اور جی کو سمجھا لیتے ہیں کہ وضو اور نماز میں بڑی مشکلیں پڑتی ہیں اس لئے قضاء کرلیں گے مگر کوئی ان سے پوچھے کہ وہ مشکلیں قابل برداشت ہیں یا ناقابل برداشت ہیں۔ اگر قابل برداشت ہیں تو فرض کے لئے برداشت کرو اور ناقابل برداشت ہیں تو جو لوگ سفر میں نماز کے پابند ہیں وہ کیسے برداشت

کرتے ہیں ؟ واللہ اگر کسی خفیف سی دنیوی غرض کی تکمیل میں اس سے بدرجہا زائد اہتمام کرنا پڑے تو خوشی خوشی سب گوارا کریں مگر وہ تو دین ہی کے نام سے زدح قبض ہوتی ہے۔ بعض نماز تو پڑھتے ہیں لیکن اس کے شرائط وارکان کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔ کوئی تیمم ہی کر رہا ہے اور پانی اسٹیشن پر یا نل کے اندر موجود مگر طبیعت قبول نہیں کرتی کہ وہ پانی پاخانہ کا ہے گو اس میں پاخانہ ملا ہوا نہیں مگر منسوب پاخانہ کی طرف ہے۔

غضب کی بات ہے کہ شریعت کے ہوتے ہوئے دینیات میں طبیعت کو ترجیح دی جاوے۔ پھر تیمم بھی کپڑے پر جس پر غبار بھی ندارد جو اجازت تیمم کی صورت میں بھی جائز نہیں۔ اور تختہ پر گرد موجود ہے مگر اس کو یہ کہہ کر اڑا دیا کہ اس کا کیا اعتبار۔ کاش اگر مسائل شرعیہ کی تحقیق کرتے تو یہ مسئلہ بھی ان کو معلوم ہوتا کہ ایسی صورت میں ان کے اس وہم ہی کا کچھ اعتبار نہیں۔ اصل اشیاء میں طہارت ہے جب تک تختہ کا نجس ہونا یقینی نہ ہو اس وقت تک طاہر ہی ہے۔

بعضے استقبال قبلہ ہی کی ضرورت نہیں سمجھتے محض اس لئے کہ رخ سیدھا کرنے میں قدرے تکلیف کرنا پڑتا ہے۔ سو اگر دیکھا جاتا کہ یہ لوگ دنیا کے کسی کام کے لئے خفیف مشقت بھی گوارا نہیں کرتے تو ان کے اس عذر کو سنا جاتا۔ گو سننے کے بعد اس کا غلط ہونا سمجھا دیا جاتا کہ دینی احکام کو دنیاوی مصالح پر قیاس نہیں کر سکتے کہ یہ تمہارے اختیاری امور ہیں اور وہ بوجہ ایجاب الٰہی کے غیر اختیاری تو ایک کا قیاس دوسرے پر چہ معنی ؟ لیکن جب دنیوی مقاصد کے لئے بڑی بڑی مصیبتیں جھیلی جاتی ہیں اس حالت میں تو نماز کے باب میں ان کا یہ عذر قابل سماعت بھی نہیں تا بقبول چہ رسد

بعضے آدمی کھڑے ہو کر نہیں پڑھتے باوجودیکہ کھڑے ہو سکتے ہیں۔ سو ان کی نماز بھی نہیں ہوتی۔ البتہ اگر قیام پر قدرت نہ ہو یعنی کسی سہارے سے بھی کھڑے نہ ہو سکیں۔ تب البتہ بیٹھ کر پڑھنا درست ہے اس مسئلہ میں لوگ بحالت مرض بھی سخت غلطی کرتے ہیں یعنی ذرا مشقت ہو گئی اور بیٹھ کر نماز پڑھنے لگے درمختار وردالمحتار میں تصریح ہے کہ اگر کسی سہارے سے کھڑا ہو سکے تب بھی کھڑا ہونا فرض ہے۔ اسی طرح اگر آدھی قرأۃ میں کھڑا ہو سکتا ہے یا بقدر تکبیر تحریمہ کھڑا ہو سکتا ہے تو اتنا ہی کھڑا ہونا فرض ہے۔

بعضے آدمی باوجودیکہ جماعت کر سکتے ہیں مگر پھر تنہا تنہا پڑھ لیتے ہیں بعضے آدمی سمجھتے ہیں کہ جماعت کے لئے اتحاد مکان شرط ہے اور ہر درجہ جدا مکان ہے ایک درجہ میں اتنی جگہ نہیں اس لئے جماعت

نہیں کرتے۔ سو ہمارے نزدیک تو دوسری گاڑی تو بیشک دوسرا مکان ہے لیکن ایک گاڑی کے متعدد درجے سب ایک ہی مکان ہیں۔ ان میں جماعت ہوسکتی ہے اور اگر کسی صاحب علم کی یہی تحقیق ہو یا کسی عالم کی اس تحقیق میں کوئی تقلید کرتا ہو کہ ہر درجہ جدا مکان ہے خیر لیں کریں کہ ایک ایک درجے میں دو دو آدمی جماعت کرلیں اگر اصوات کا تزاحم نہ ہو تو ایک ہی وقت میں ورنہ آگے پیچھے اور چونکہ یہ مسجد محلہ نہیں اس لئے اس میں تکرار جماعت کا اختلاف بھی نہ ہوگا۔

حد سے زیادہ تشدد بھی نہیں کرنا چاہیئے

بعضے آدمی ان بے احتیاطیوں کے مقابلہ میں اس قدر محتاط بنتے ہیں کہ ان کی احتیاط درجۂ تشدد تک پہنچ جاتی ہے مثلاً ریل کے اندر ہرگز نماز نہ پڑھیں گے۔ اسٹیشن ہی پر اترنا فرض سمجھیں گے جس میں بعض اوقات طرح طرح کی پریشانیوں کا سامنا ہوتا ہے مثلاً اسباب ریل ہی میں رکھا ہے اور کچھ جاتا رہا یا کم از کم طبیعت ادھر مشغول رہی یا دوسرے مسافروں نے ان کی جگہ پر قبضہ کرلیا یا نہیں کیا لیکن ان کو اس احتمال پر پریشانی رہی اور مثلاً گاڑی نے سیٹی دیدی اور ان کو نیت توڑنا پڑی یا ایسا نہیں کیا لیکن مضطرب ہوگئے اور بعض اوقات گاڑی چھوٹ گئی۔ اور ان کے اسباب کا نقصان یا سفر کا حرج ہوا اس وقت خود نماز سے قلب میں خدانخواستہ تنگی پیدا ہوگئی یا خود ان کو تنگی نہیں ہوئی لیکن جو لوگ ہمیشہ دین کو مخل دنیا کہا کرتے ہیں اور اس وجہ سے ان کو دین سے توحش ہے ان کا تنفر اور توحش اور بڑھ گیا۔ اور ان کی فہرست میں ایک عدد اور بڑھ گیا کہ دیکھئے دین پر عمل کرنے سے یہ پریشانی اور مضرت ہوتی ہے اور اس جاہل کو کون سمجھائے کہ اس کی پریشانی کا سبب خود اس کا تشدد ہے نہ کہ دین سو حدیث "یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا" ترجمہ (تم دونوں کو چاہیئے کہ آسان طریقہ اختیار کرو اور لوگوں کو تنگی میں نہ ڈالو اور لوگوں کو بشارت سناؤ ان کو نفرت نہ دلاؤ) ظاہراً قول اور فعل دونوں کو عام ہے۔

اور اس پر بعض اوقات ایک طرہ اور ہوتا ہے کہ اسٹیشن پر اتر کر جماعت کرانے کے لئے امام صاحب ایسے تجویز ہوتے ہیں کہ وہ فرصت کا وقت پاکر قرأت میں تطویل اور رکوع اور سجود میں اطمینان سے تعدیل شروع کر دیتے ہیں اگر گاڑی نہ بھی نکلے تب بھی مقتدیوں کو خصوص اس لئے کہ مجمع میں مختلف طبائع کے لوگ ہوتے ہیں کیسی بیتابی ہوتی ہے۔ گویا ان بزرگ کو عمر بھر میں آج ہی موقع امامت

کا ملا ہے۔ نہ تو اس سے پہلے کبھی میسر ہوا اور نہ آئندہ کو امید ہے اس لئے اس وقت کو غنیمت سمجھا اور عمر بھر کا ارمان آج ہی نکالنا ضروری ہو گیا۔

دو جاہل صوفیوں کی حکایت

اسی طرح دو بزرگواروں کی حکایت ہے کہ بہلی میں اپنے رفقاء کے ساتھ سوار تھے ایک صاحب نے تو یہ کیا کہ نماز ظہر کے لئے اترے اور پڑھکر مصلے ہی پر وظیفہ شروع کر دیا کہ میں تو عصر پڑھ کر اٹھوں گا۔ بے چارے رفیق مصیبت میں آگئے کہ منزل دور اور عصر تک کا حبس۔ اور ایک صاحب مغرب کے وقت اترے اور نماز کے بعد صلوٰۃ الاوابین شروع کر دی اور تاریکی بڑھنا شروع ہوئی۔ اور منزل کسی قدر فاصلے پر اور مقام خطرناک سو شریعت ایسے تشددات کو پسند نہیں کرتی۔ جس سے خود کو یا اس سے بڑھ کر دوسروں کو کلفت وضیق ہو۔ یہاں راز معلوم ہوا ہو گا اس ارشاد کا۔ ان اللہ یحب ان یوتی رخصہ کما یحب ان یوتی عزائمہ" یعنی رخصت پر عمل کرنے میں بہت سی مصلحتیں ہیں کہ وہ سبب ہو جاتا ہے دین کے ساتھ انس اور بشاشت اور انشراح اور انبساط اور دلچسپی کا اور یہ مقصد عظیم ہے۔ مقاصد نوامیس الیہ سے یہ کوتاہیاں قطع مسافت کے متعلق تھیں۔

عارضی قیام کے متعلق کوتاہیاں

بعض کوتاہیاں عارضی قیام کے متعلق ہیں، یعنی کسی مقام پر ایک دو شب مثلاً قیام کیا خواہ سرائے میں یا کسی خاص میزبان کے پاس اگر سرائے میں قیام کیا ہے تو وہاں بھی ان امور کا لحاظ ضروری ہے کہ دوسرے مسافروں کو اس سے کلفت نہ ہو اور سرائے کے ٹھیکہ دار کو بھی تکلیف نہ دی جاوے مثلاً بعضے لوگ بلا ضرورت شور و غل مچاتے ہیں بلا ضرورت جاگتے ہیں اور رفقہ کے ساتھ قصہ کہانیاں ہانکتے ہیں۔ بعضے آدمی گاتے بجاتے ہیں جس سے دوسرے مسافروں کے آرام و نوم میں خلل پڑتا ہے۔ بعضے ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے مسافر کے کمرہ میں سے جبکہ وہ کہیں چلا گیا ہو چارپائی اٹھا لاتے ہیں وہ غریب آکر پریشان ہوتا ہے اتنی ہمت نہیں ہوتی کہ بھٹیارہ سے مانگ لیں اور اگر نہ ملے مجبوری ہے۔ ان کو کیا حق ہے کہ دوسرے کی سابق قبضہ کی ہوئی لے لیں کہ شریعت کے بھی خلاف ہے اور مروت سے بھی بعید ہے اگر یہی معاملہ ان کے ساتھ ہو تو کیسی دل پر گذرے تو انصاف کا مقتضا یہ ہے کہ "آنچہ بخود نہ پسندی بر دیگراں مپسند" اور مثلاً بعضے لوگ باوجودیکہ پیشاب پاخانہ کے لئے خاص مواقع ہیں مگر کوٹھری ہی میں موت لیتے ہیں۔ یا کہیں گذرگاہ مسافران پر ایسا کرتے

ہیں جس سے بعض اوقات ٹھیکہ دار کو صاف کرانا پڑتا ہے اور بعض اوقات دوسرے مسافر کو تکلیف ہوتی ہے مثلاً بعض لوگ چلتے وقت ٹھیکہ دار کا حساب صاف کرکے نہیں جاتے یا تو چپکے نکل گئے یا نزاع واختلاف کرکے گئے۔ اس میں علاوہ گناہ کے جس میں حق اللہ وحق العبد دونوں ضائع کئے جاتے ہیں۔ ایک خرابی یہ ہوتی ہے کہ دوسرے مسافروں کا بھی اعتبار جاتا ہے اور ان کے لئے ضوابط سخت تجویز کئے جاتے ہیں اور اس کے سبب یہ شخص بنتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت حدیث میں "مفتاح الشر مغلاق الخیر" آیا ہے۔

اگر کسی کے پاس جانا ہو تو اسے پہلے سے اطلاع دینی چاہیئے

اور اگر کسی میزبان کے پاس ٹھہرے ہیں۔ تو اس میں بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ بدون اس کے کہ اس کو اپنی آمد نی کی اطلاع دیں اس کے پاس بدون کھانا کھائے بے وقت جا پہنچتے ہیں کہ اس وقت اس کو کھانا تیار کرانے میں کلفت ہوتی ہے۔ اگر حساب سے پہنچنے کا وقت ناوقت ہو تو چاہیئے کہ کھانے کا انتظام پہنچنے کے وقت بطور خود کر لیں۔ اور فارغ ہو کر وہاں جاویں اور جاتے ہی اطلاع کر دیں۔

بعضے یہ کوتاہی کرتے ہیں کہ اول اس کو اپنی آمد کے وقت سے اطلاع تو دیدی ہے مگر اس وقت پہنچتے نہیں وہ بے چارہ اسٹیشن پر آیا سواری کا کرایہ دیا وقت صرف کیا کھانا پکوایا اور یہ نواب صاحب ذرا رائے بدلنے سے یا کسی دوسرے میزبان کے اصرار کرنے سے پھسک گئے۔ بعض اوقات وہ کئی کئی وقت اسی طرح تکلیف اٹھاتا ہے اور ان کو یہ توفیق بھی نہیں ہوتی کہ وقت موعود آنے کے قبل اس کو مکرر اس ارادہ کے فسخ یا تبدیل کی اطلاع کر دیں۔

خوب یاد رکھو کہ یہ سب اسلام کے خلاف ہے گو لوگ اس کو سرسری سمجھتے ہیں۔ حدیث میں نص ہے "المسلم من سلم المسلمون من لسانہ ویدہ" ترجمہ: مسلمان وہ ہے کہ جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں)

پھر جب اس کے ہاتھ اور زبان سے دوسرا سالم نہ رہا تو مسلم بدرجۂ مقصودہ فی الحدیث کہاں رہ گیا۔ مشکل یہ ہے کہ آج کل بزرگی تسبیح پڑھنے کا نام رہ گیا کسی کی راحت وکلفت کی پرواہ ہی نہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اس خاص کوتاہی میں بہت سے ثقات ومنسوبین الی العلم والدین بھی مبتلا ہیں۔ اور اس

کا قبح ذرا ان کے قلب میں نہیں۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ کھانا کھا کر پہنچے مگر جاتے ہی اس کو یہ اطلاع نہیں کی کہ میں کھانا کھا چکا ہوں اس وقت اہتمام نہ کیا جاوے۔ وہ بے چارہ نہ تو علم غیب پڑھا ہوا ہے اور نہ لحاظ سے یہ پوچھ سکتا ہے کہ آپ کھانا تو نہیں کھا چکے۔ غرض اس نے احتمال پر کھانا تیار کیا جب ان کے سامنے کھانا آیا۔ تو آپ نے نہایت بیرحمی سے ایک جملہ میں اس کے تمام انتظام کا خون کر دیا کہ میں تو کھا چکا تھا۔ بندۂ خدا پہلے کس نے منہ بند کر لیا تھا۔ کہہ دینا تھا۔

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ کھانا کھانے بیٹھے اس وقت فرماتے ہیں کہ میں تو گوشت نہیں کھاتا میں تو مرچیں نہیں کھاتا۔ ظالم اگر پہلے ہی اس کو اطلاع دے دی جاتی تو کیا مشکل تھا۔ اب وہ مظلوم فکر میں پڑ گیا۔ کہیں پڑوس سے بھیک مانگتا پھرتا ہے۔ کہیں گھر میں گھی شکر تلاش کرتا ہے۔ غرض "زر دادن و درد سر خریدن کا مصداق بن گیا"

بعضے ایسا کرتے ہیں کہ بے اطلاع میزبان کے کہیں چلدیئے۔ اب وہ تلاش کرتا پھرتا ہے اور گھر بھر بھوکا بیٹھا ہے یا تو وقت گذر کر آئے۔ تب سب کا روزہ کھولا، یا آکر کہہ دیا کہ مجھ کو فلاں شخص نے اصرار کر کے کھلا دیا تھا۔ میں نے انکار بھی کیا مگر اس نے مانا ہی نہیں۔ اس بیڈھنگے کو یہ خبر نہیں کہ کسی کی ایسی دلجوئی کب جائز ہے کہ دوسرے کی دل شکنی ہو۔ اور وہ بھی ایسے شخص کی جس کا حق مقدم اور سابق ہو۔

بعض آدمی ایسا کرتے ہیں کہ دوسرے کی دعوت قبول کر لی اور میزبان سے اجازت لینا تو کجا اس کو اطلاع بھی نہیں کی۔ بعض ایسا کرتے ہیں کہ رخصت ہونے کا قصد دل میں کر لیا۔ مگر میزبان کو نہیں بتلایا۔ اب عین وقت پر آرڈر سنا دیا کہ میں اس گاڑی میں جاؤں گا۔ سواری کا انتظام کر دو۔ اس کا سامان ضیافت بھی ضائع گیا اور بعض اوقات خصوص قصبات عین وقت پر سواری کے انتظام میں دشواری ہوتی ہے۔ غرض یہ سب پریشان کرنے کی باتیں ہیں۔ جن سے احتیاط و احتراز واجب ہے۔

مسافر کی گھر کے متعلق کوتاہیاں

اب بعض کوتاہیاں اپنے گھر والوں کے متعلق رہ گئیں۔ ان کے ذکر پر مضمون کو ختم کرتا ہوں مثلاً سفر میں جا کر گھر والوں کو ایسے

بھولے کہ ان کو اپنی خیریت تک کی اطلاع نہیں دی۔ ان سے اپنا اطمینان کر لیا کہ سب کو بعافیت چھوڑ کر آیا
تھا۔ اب بھی بعافیت ہوں گے۔ مگر وہ تو پریشان ہیں کہ سفر میں ہزاروں حوادث محتمل ہوتے ہیں۔ ان کو بھی
مطمئن کرنا چاہیئے تھا۔ اور مثلاً ان کو اپنی واپسی کے وقت کی اطلاع دی۔ مگر اس وقت نہیں پہنچے وہ
بے چارے اس اجنبی میزبان سے بھی زیادہ پریشان ہوتے ہیں۔ اس کو صرف اپنی تکلیف سے پریشانی ہوئی
اور گھر والوں کو تو تعلق محبت کے سبب یہ بھی پریشانی ہوتی ہے کہ خدا جانے خیریت بھی ہوگی اور مثلاً باوجود
اطلاع کر سکنے کے بلا کسی مصلحت کے دفعتہً گھر آجانا احادیث میں اس کی بھی ممانعت ہے جس کی حکمتوں
میں سے ایک حکمت یہ بھی ہے کہ شریف عورتیں شوہر کے گھر پر نہ ہونے کی وجہ سے زیب و زینت
چھوڑ دیتی ہیں۔ سو ایسا نہ ہو کہ اس مبتذل حالت میں دیکھ کر اس کو نفرت ہو جاوے جو بنیاد ہو جاوے
مصالح خانہ داری کے انہدام کی اگر پہلے سے اطلاع ہو تو وہ آراستہ اور پیراستہ تو ہو جاوے۔
ممکن ہے کہ سفر کی کوتاہیاں کی فہرست اور بھی طویل ہو سکے مگر فی البدیہہ جو خیال میں آئیں۔ وہ
لکھ دیں فہیم آدمی ان ہی کے اصول سے دوسری کوتاہیوں کی بھی اصلاح کر سکتا ہے فقط

واللہ الموفق لسبیل لا وکس فیہ ولا شطط

تعلیم نسواں کے متعلق کوتاہیاں

اصلاح معاملہ بہ تعلیم نسواں

ہرچند کہ بعد ورود حدیث " طلب العلم فریضۃ علی کل مسلم ومسلمۃ " ترجمہ (علم طلب کرنا ہر مسلمان مرد اور عورت پر فرض ہے) وغیرذالک من النصوص الموجبۃ لتحصیل العلم علی الرجال والنساء " اس مبحث پر مستقل کلام کرنے کی کوئی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ خصوص جبکہ اس کے بہت قبل اس میں مجملاً اس سے تعارض بھی ہو چکا ہے لیکن بعض واقعات وخصوصیات کے (کہ زیادہ ان میں ہندوستانی مستورات کے حالات ہیں جن کا مشاہدہ اکثر ہوتا رہتا ہے) اس باب میں مستقل اور کسی قدر مفصل گفتگو کئے جانے کو مقتضی ہونے کے سبب اس کا بقدر ضرورت مکرر ذکر کیا جاتا ہے

تعلیم نسواں کے متعلق لوگوں کی تین قسمیں

سو جاننا چاہیئے کہ اس مقدمہ میں جہاں تک تتبع کیا گیا۔ تین خیال کے لوگ ہیں۔ ایک وہ کہ تعلیم نسواں کے نہ مخالف ہیں۔ نہ حامی مگر تعلیم کا اہتمام نہیں۔

دوسرے وہ کہ اس کے مخالف ہیں۔

تیسرے وہ کہ اس کے حامی ہیں اور ان سب سے مختلف کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں۔

پہلی قسم کے لوگوں کی غلطی اور ان کے شبہات کا جواب

چنانچہ اوّل طبقہ کی کوتاہی جو سب کوتاہیوں سے اشد و اعظم ہے یہ ہے کہ سرے سے مستورات کو تعلیم دینے ہی کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ نہ مردوں کے نزدیک اور نہ خود ان مستورات کے نزدیک اور دلیل ان لوگوں کی جو ان کے اشتباہ کا منشار ہو گیا ہے یہ ہے کہ کیا عورتوں کو کوئی نوکری کرنا رہ گیا ہے جو ان کے پڑھانے کا اہتمام کیا جاوے۔

معلوم ہوتا ہے کہ ان لوگوں نے نہ تعلیم کی غرض سمجھی اور نہ ان نصوص و روایات میں غور کیا۔ جو مردوں اور عورتوں دونوں کے لئے ایک درجہ میں تحصیل علم کو فرض و واجب قرار دے رہے ہیں اور نہ اس تعلیم کو سمجھا جو کہ فرض ہے۔

علوم سے غرض نوکری نہیں ہے

سو سمجھ لینا چاہیئے کہ علوم سے غرض نوکری نہیں ہے کیونکہ جو علم علی العین واجب التحصیل ہے وہ علم معاش نہیں ہے بلکہ وہ علم دین ہے جس سے انسان کے عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق درست ہوں۔ جس کا ثمرہ دنیا میں اولٰئك علی ھدی من ربھم، ترجمہ (یہ لوگ ہدایت پر ہیں اپنے رب کی طرف سے) کی دولت اور آخرت میں۔ اولئک ھم المفلحون (یہی لوگ ہی کامیاب ہیں) کی بشارت ہے۔ سو اس کا وجوب ظاہر ہے۔ سمعاً بھی عقلاً بھی۔

دلائل سمعیہ یہ ہیں۔

(۱) طلب العلم واجب علی کل مسلم (ھب عن انس)

(۲) طلب العلم فریضۃ علیٰ کل مسلم (الدیلمی عن علی)

(۳) طلب الفقہ حتم واجب علیٰ کل مسلم (ک فی تاریخہ عن انس)

(۴) تعلموا العلم وعلموہ الناس (قط عن ابی سعید وھب عن ابی بکر)

(۵) تعلموا العلم قبل ان یرفع (الدیلمی عن ابن مسعود وعن ابی ھریرۃ)

(۶) یا ایھا الناس علیکم بالعلم قبل ان یقبض (طب والخطیب عن ابی امامۃ)

(۷) یا ایھا الناس خذوا من العلم قبل ان یقبض العلم (حم والدارمی طب وابو الشیخ

فی تفسیرہ وابن مردویہ عن ابی امامۃ)

(۸) ویل لمن لا یعلم (حل عن حذیفۃ) کذا فی کنز العمال وغیر ذلک من النصوص العامۃ للرجل والمرأۃ۔

دلیل عقلی اور دلیل عقلی یہ ہے کہ اصلاح عقائد واعمال کی فرض ہے اور وہ موقوف ہے۔ ان کی تحصیل پر، چنانچہ ظاہر ہے۔ اور فرض کا موقوف علیہ فرض ہے۔ پس تحصیل علم فرض ہوا۔ اور ہر چند کہ موقوف ہونا عمل کا علم پر بالکل بدیہی ہے۔ مگر اس سے ترقی کر کے کہا جاتا ہے کہ حسی بھی ہے۔ چنانچہ بے علم عورتیں جس حالت میں ہیں سب دیکھتے ہیں کہ نہ ان کو شرک کفر کی کچھ تمیز ہے؟ نہ ایمان اور اسلام کی کچھ محبت ہے۔ جو چاہیں خدا تعالیٰ کی شان میں بک دیتی ہیں۔ جو چاہیں احکام شرعیہ کے مقابلہ میں زبان درازی کر بیٹھتی ہیں۔ اولاد کے لئے یا شوہر کو مسخر کرنے کے لئے ٹونے ٹوٹکے، جادو منتر، جو کچھ کوئی بتلا دیتا ہے بلا امتیاز مشروع نامشروع کے سب ہی کچھ کر گذرتی ہیں۔

جب عقائد ہی میں یہ حالت ہے تو نماز روزہ کا کیا ذکر ہے۔ حتیٰ کے بعض کی نوبت ترک سے گذر کر استخفاف بلکہ تشاؤم وتطیر (بدفالی) تک پہونچ جاتی ہے یعنی بعض تو باوجود فرض سمجھنے کے اس کو ترک ہی کر دیتی ہیں۔ اور بعض اس کی وقعت بھی نہیں کرتیں۔ کوئی ضروری امر نہیں سمجھتیں اور بعض اس کو منحوس وموجب مضرت اعتقاد کرتی ہیں۔ اور یہ دو درجہ کفر صریح ہیں۔ اور اوّل فسق وکبیرہ ہے۔

جب نماز روزہ میں یہ کیفیت ہے جس میں ایک پیسہ بھی خرچ نہیں ہوتا تو زکوٰۃ وحج، جس میں پیسہ کا بھی خرچ ہے اس کو تو پوچھو ہی مت .....! اور جب عقاید واعمال دیانت کا یہ حال ہے۔ تو معاملات کا درستی کا تو احتمال ہی نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ نماز روزہ کی صورت تو دین کی ہے۔ اور معاملات تو عوام کی نظر میں بالکل دنیا ہی کی شکل رکھتے ہیں۔ اس لئے ان کی درستی کا اہتمام تو خاص لوگ کرتے ہیں۔ جاہل مستورات کیا درستی کریں گی۔

پھر جب معاملات کے ساتھ یہ طرز عمل ہے تو معاشرت کی اصلاح تک تو کہاں ذہن جائے گا کیوں کہ معاملات کو حقوق العباد تو سمجھا جاتا ہے۔ بخلاف معاشرت کے کہ اس میں یہ پہلو بھی ظاہر نہیں ہے اس لئے اس کا بالکل ہی اہتمام کم ہے۔ پھر جب معاملات ومعاشرت سے اتنی بے پروائی

ہے تو اخلاق باطنی مثل تواضع و اخلاص و خوف و محبت و صبر و شکر و نحو ذلک، کی طرف تو کیا توجہ ہوگی۔ کیوں کہ معاملات کا زیادہ اور معاشرت کا اس سے کم دوسروں تک تو اثر پہنچنا معلوم ہے۔ نیز ان پر بعض اوقات نیک نامی و بدنامی کا ترتب بھی ہوجاتا ہے۔ بخلاف اخلاق باطنی کے کہ اس کا غالب اثر بھی اپنی ہی ذات تک محدود ہے۔ اور بوجہ خفا کے دوسروں کو ان کا علم بھی کم ہوتا ہے جس سے نیک نام یا بدنام کرسکیں۔ اس لئے اس کا اہتمام تو بالکل ہی ندارد ہے حتیٰ کہ بہت سے خواص میں بھی تا بہ عوام چہ رسد (

بہرحال ان سب امور دینیہ میں قلت مبالات کا اصل منشار، و سبب قلت علم دین ہے۔ پھر جہاں بالکل ہی علم نہ ہو (اور اس سے بڑھ کر یہ فطرۃً عقل بھی کم ہو۔ کیوں کہ طبقۂ اناث قدرتی طور پر ناقص العقل ہیں۔ غرض جہاں نہ عقل ہو نہ علم ہو) تو وہاں امور مذکورہ میں کوتاہی کی کیا حد ہوگی؟

غرض عقل اور مشاہدہ دونوں شاہد کہ بدون علم کے عمل کی تصحیح ممکن نہیں اور عمل کی تصحیح واجب اور فرض .... پس تحصیل علم دین کا فرض ہونا جیسا اوپر دعویٰ کیا گیا ہے۔ عقلاً بھی ثابت ہوگیا اور سمعاً فرض ہونا اس سے اوپر بیان کیا گیا ہے تو دونوں طرح تحصیل علم دین فرض ہوا۔

پس ان لوگوں کا یہ خیال کہ جب عورتوں کو نوکری کرنا نہیں ہے۔ تو ان کی تعلیم کیا ضرور ہے؟ - محض غلط ٹھہرا۔ یہ جواب ہوا۔ ان کی مذکورہ کوتاہی کا۔

تعلیم نسواں کی فرضیت پر ایک شبہ اور اس کا جواب

البتہ اس پر یہ شبہ ہوسکتا ہے کہ علم دین کی فرضیت سے تعلیم بطرلق متعارف کا واجب ہونا لازم نہیں آتا کہ مستورات کو کتابیں بھی پڑھائی جائیں۔ بلکہ یہ فرض اہل علم سے پوچھ پاچھ رکھنے سے ادا ہوسکتا ہے۔

سو اس کی تحقیق یہ ہے کہ واقعی یہ بات صحیح اور ہم تعلیم متعارف کو فی نفسہٖ واجب بھی نہیں کہتے۔ لیکن یہاں تین مقدمے قابل غور ہیں۔

اوّل یہ کہ مقدمہ واجب کا واجب ہوتا ہے گو بالغیر سہی۔ جیسے جو شخص پیادہ سفر حج قطع کرنے پر قادر نہ ہو۔ اور اس شخص کے زمانہ میں ریل اور آگبوٹ (اسٹیمر) ہی ذریعہ قطع سفر کا متعین ہو۔ اور اس کے پاس اس قدر وسعت و استطاعت بھی ہو۔ تو اس شخص پر واجب ہوگا کہ سفر کا عزم کرے

اور ریل اور آگبوٹ کا ٹکٹ خرید کر اس میں سوار ہو۔ سو ریل اور آگبوٹ کا ٹکٹ خریدنا اور اس پر سوار ہونا فی نفسہٖ شرعاً فرض نہیں۔ لیکن چونکہ ایک فرض کا ذریعہ ہے اس لئے یہ بھی فرض ہوگا۔ گویا لغیرہٖ یہ مقدمہ تو ثابت ہو چکا۔

دوسرا مقدمہ یہ ہے کہ تجربہ سے معلوم ہو گیا ہے کہ علم کا اذہان میں قابل اطمینان درجہ میں محفوظ رہنا موقوف ہے۔ کتب کے پڑھنے پر جو کہ تعلیم کا متعارف طریق ہے اور محفوظ رکھنا علم دین کا واجب ہے۔ پس بناء بر مقدمہ اولیٰ بطریق متعارف تعلیم کا جاری رکھنا بھی واجب ہے۔ البتہ یہ واجب علی الکفایہ ہے۔ یعنی ہر مقام پر اتنے آدمی دینیات پڑھے ہوئے ہونے چاہئیں کہ اہل حاجت کے سوالوں کا جواب دے سکیں۔

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ یہ بھی تجربے سے ثابت ہوا ہے کہ مردوں میں علماء کا پایا جانا مستورات کی ضروریات دینیہ کے لئے کافی وافی نہیں۔ دو وجہ سے اولاً پردہ کے سبب (کہ وہ بھی اہم الواجبات ہے) سب عورتوں کا علماء کے پاس جانا قریباً ناممکن ہے اور گھر کے مردوں کو اگر واسطہ بنایا جاوے تو بعض مستورات کو تو گھر کے ایسے مرد بھی میسر نہیں ہوتے اور بعض جگہ خود مردوں ہی کو اپنے دین کا بھی اہتمام نہیں ہوتا تو وہ دوسروں کے لئے سوال کرنے کا کیا اہتمام کریں گے۔

پس ایسی عورتوں کو دین کی تحقیق از بس دشوار ہے اور اگر اتفاق سے کسی کی رسائی بھی ہو گئی یا کسی کے گھر میں باپ بیٹا، بھائی وغیرہ عالم ہیں تب بھی بعض مسائل عورتیں ان مردوں سے نہیں پوچھ سکتیں۔ ایسی بے تکلفی شوہر سے ہوتی ہے تو سب شوہروں کا ایسا ہونا خود عادتاً ناممکن ہے۔ تو ان کی عام احتیاج رفع ہونے کی بجز اس کے کوئی صورت نہیں کہ کچھ عورتیں پڑھی ہوئی ہوں۔ اور عام مستورات ان سے اپنے دین کی ہر قسم کی تحقیقات کیا کریں پس کچھ عورتوں کو بطریق متعارف تعلیم دین دینا واجب ہوا۔

پس اس شبہ کا بھی جواب ہو گیا اور ثابت ہو گیا کہ لکھے پڑھے مردوں کی طرح عورتوں میں ایسی تعلیم ہونا ضروری ہے اور اس غلط خیال عدم ضرورۃ تعلیم نسواں کا بالکلیہ استیصال ہو گیا۔

دوسرے طبقہ والوں کے شبہات اور ان کا جواب

اب دوسرے طبقہ کے متعلق کچھ لکھا جاتا ہے جو تعلیم نسواں کے مخالف

ہیں اور اس کو سخت ضرر رساں سمجھتے ہیں۔ دعویٰ ان کا یہ ہے کہ ہم نے لکھی پڑھی عورتوں کو اکثر آزاد اور بے باک اور قلیل الحیا اور مکار اور عفت سوز دیکھا ہے۔ خاص کر اگر لکھنا بھی جانتی ہوں تو اور بھی شوخ چشم ہو جاتی ہیں جس کو چاہا خط لکھ بھیجا۔ جس کو چاہا پیام و سلام پہنچا دیا۔ اسی طرح دوسروں بھی طمع ہوتی ہے کہ اپنے نفسانی جذبات کو ان تک بذریعہ تحریر پہنچا دیتے ہیں۔ اور ان کے پاس پہنچتی ہیں کبھی تو وہ بھی متاثر ہو کر نرم جواب دیتی ہیں اور سلسلہ بڑھتا ہے یہاں تک کہ جو کچھ واقع ہونا ہے. واقع ہوتا ہے۔ اور کبھی جواب نہیں دیتیں اور سکوت کرتی ہیں تو مریض القلب لوگ اس سے بھی استدلال کرتے ہیں۔ ان کے نیم راضی ہونے پر۔ پھر وہ لوگ آئندہ کے پیام و سلام و تحریر سے اس کمی کو پورا کرنا چاہتے ہیں۔ چونکہ گوش زدہ اثرے دارد، قاعدہ اکثریہ ہے پھر بعض کا طرز بیان جادو نشان ہوتا ہے پھر نسوانی طبائع معمولی طور پر نرم بھی ہوتی ہیں تو شیطان کا جال پھیل جانا زیادہ عجیب نہیں ہوتا اور اگر کسی مکتوب الیہا نے ناراضی بھی ظاہر کی اور اس ناراضی کا جواب کاتب تک بھی پہنچا دیا ہے مگر اپنے شوہر یا خاندان کے خوف سے کہ خدا جانے کیا گمان کریں گے۔ اور کیا معاملہ کریں گے اپنے گھر والوں سے اس کا اخفاء کرتی ہیں اور اسطور پر وہ کاتبین ہر طرح کی مضرت سے محفوظ رہتے ہیں اس لئے ان کی جسارت بڑھتی ہے۔ اور پھر دوسرے موقع پر اس کی سلسلہ جنبانی کرتے ہیں۔

اور ان سب واقعات کا مبنی ان مستورات کا تعلیم یافتہ ہونا ہے اگر وہ ناخواندہ ہوں تو ان کے پاس مضمون بھیجنے سے اندیشہ ہوگا۔ دوسرے کہ مطلع ہونے کا یہ سبب ہو جاوے گا اس باب کے مسدود ہو جانے کا۔

اور یہ مفسدہ اس صورت میں زیادہ متحمل ہے جبکہ کسی عورت کے مضامین اخباروں میں بھی چھپنے لگیں اور ان مضامین کو دیکھ کر سخن شناس شیاطین انداز کرتے ہیں۔ کاتبہ کے رنگ طبیعت اور جذبات اور خیالات کا تو اس شرارت کے شرارے وہاں زیادہ پھیلتے ہیں بالخصوص اگر وہ کلام نظم بھی ہو تو اور بھی آفت اور اس زمانے میں تو ایک اور غضب ہے کہ افتخار کے لئے صاحب مضامین کا نام اور پتہ تک صاف لکھدیا جاتا ہے کہ فلانے کی بیوی فلانے کی بیٹی، فلاں جگہ کی رہنے والی اور یہ تمام ترخرابیاں ان کے لکھے پڑھے ہونے سے پیدا ہوتی ہیں اور اگر ان خفیہ ریشہ دوانیوں کی کسی طور پر شوہر یا اہل خاندان کو اطلاع ہی ہو گئی تو چونکہ لکھا پڑھا آدمی ہوشیار اور سخن سازی پر زیادہ قادر ہوتا ہے وہ ایسی تاویلیں کرینگی

کہ کبھی ان پر حرف ہی نہ آوے گا اور الٹا منہ ناک بنا دیں گی۔ مکاری سے رو دیں گی کہ ہم کو یوں کہا کہیں خودکشی اور کنوئیں میں ڈوبنے کی دھمکی دیں گی۔ حتیٰ کہ اس غریب بازپرس کرنے والی کو خوشامد کرنا پڑیگی اور ڈر کے مارے پھر کبھی زبان تک نہ ہلاوے گا۔

ایک خرابی اس تعلیم یافتہ طبقہ اناث میں یہ ہوتی ہے کہ ہر طرح کی کتابیں منگا کر پڑھتی ہیں۔ عشق بازی کے قصے سازش اور لگاوٹ کے ناول شوق انگیز غزلیں پھر ان سے طبیعت بگڑتی ہے۔ کبھی ایسی غزلیں ذرا کھل کر پڑھتی ہیں کہ دروازہ میں یا پڑوس اور محلہ میں یا سڑک پر آواز جاتی ہے۔ اور آواز پر کوئی فریفتہ ہو کر درپے ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ ناکام بھی رہا تاہم رسوائی اور پریشانی کا سبب تو بن ہی جاتا ہے۔

یہ خلاصہ ہے ان صاحبوں کے خیالات کا اور میں ان واقعات کی تکذیب نہیں کرتا لیکن یہ ضرور کہوں گا کہ ان صاحبوں نے کوتاہ نظری سے کام لیا۔ واقعات کے حقائق میں غور نہیں کیا اصل یہ ہے کہ ان سب خرابیوں کا ذمہ دار تعلیم نہیں ہے بلکہ طرز تعلیم ہے یا نصاب تعلیم ہے یا طرز عمل ہے یا سوء تدبیر ہے یعنی یا تو یہ ہوا کہ ایسی کتابیں نہیں پڑھائی گئیں جن سے احکام حرام وحلال اور تفصیل ثواب وعقاب اور طریقہ تہذیب اخلاق معلوم ہو اور جس سے خوف وخشیت ومعرفت وعظمت حق حاصل ہو ان کو صرف حرف شناس بنا کر چھوڑ دیا ہے انہوں نے اپنی رائے سے اردو کے مختلف رسالوں کا مطالعہ کر کے لکھنے پڑھنے کی مہارت بڑھائی ہے اور تعلیم یافتہ کا لقب پا کر اس طرح تعلیم کو بدنام کیا ہے۔

تو ظاہر ہے کہ محض حرف شناس کو نہ تعلیم کہہ سکتے ہیں اور نہ حرف شناسی اصلاح اعمال واحوال کی کفالت کر سکتی ہے۔

اور یا یہ ہوا ہے کہ باوجود نصاب تعلیم کے مفید وکافی ہونے کے اس نصاب کے مضامین کو قلب میں جمانے کی کوشش نہیں کی گئی اور عمل کی نگرانی نہیں کی گئی۔ مثلاً اس کی ضرورت ہے کہ جس روز کسی لڑکی نے یہ مسئلہ پڑھا کہ غیبت گناہ ہے اس کے بعد اگر وہ غیبت کرے تو فوراً اس کو یاد دلاوے کہ دیکھو تم نے کیا پڑھا تھا۔ اس کے خلاف کرتی ہو اور مثلاً ان کو پردہ کی ضرورت یا پست آواز بولنے کی تاکید پڑھائی گئی اور پھر اس میں کوتاہی یا غفلت کا مشاہدہ ہوا۔ فوراً اس کو روکنا چاہیئے یا ان کو حرص مال وزیور کی مذمت پڑھائی تھی۔ پھر انہوں نے کسی تکلف کے کپڑے یا غیر ضروری زیور کی ہوس کی تو فوراً ان کو متنبہ کیا جاوے۔ اسی طرح امید ہے کہ اخلاق فاضلہ واعمال صالحہ کا ملکہ ان میں پیدا ہو جاوے گا۔

اور یا یہ ہوا ہے کہ ان کی خود طبیعت اور طینت ہی میں صلاحیت اور قابلیت نہیں ہے تو اس صورت میں تربیت نا اہل را چوں گردگان بر گنبد ست کا اور شعر ہے ؎

شمشیر نیک ز آہن بد چون کند کسے
ناکس بہ تربیت نشود اے حکیم کس

کا مضمون ہے۔

یہ گفتگو تو خود ان کے احوال و اعمال کے متعلق تھی اور جو افعال دوسرے شریر لوگوں کے شمار کرائے ہیں ان کا امتداد سو، تدبیر سے ہوتا ہے اس کے انسداد کی اچھی تدبیر یہ ہے کہ واسطہ کے ساتھ نہایت سختی کی جاوے اور اپنے مردوں کو بالکل صاف اطلاع دیدی جاوے۔

غرض مفاسد کے اسباب یہ ہیں جب یہ ہے تو اس میں عورتوں کی کیا تخصیص ہے۔ یہی اسباب فساد اگر مردوں کو پیش آویں۔ وہ بھی ایسے ہی ہوں گے۔ پھر کیا وجہ کہ عورتوں کو تعلیم سے روکا جاوے۔ اور مردوں کو تعلیم میں ہر طرح کی آزادی دی جاوے بلکہ اہتمام کیا جاوے۔

اس فرق کی وجہ بعد تأمل بجز اس کے کچھ نہیں معلوم ہوئی کہ عورت سے صدور قبائح یا اس کی طرف نسبت قبائح عرفاً موجب ذلت اور رسوائی ہے اور وہی امور اگر مرد سے صادر ہوں، یا اس کی طرف منسوب ہوں تو وہ عرفاً موجب ذلت اور رسوائی نہیں ہے اس لئے عورت کے لئے ان مفاسد کے احتمال کو موانع تعلیم سے قرار دیا ہے۔ اور مردوں کے لئے نہیں۔ باقی شرعاً ظاہر ہے کہ اس باب میں مرد و عورت یکساں ہیں۔ اگر عورت کے لئے معصیت مذموم و قابل لوم ہے تو اسی درجہ میں مرد کے لئے بھی۔ اور اگر مرد کے لئے موجب طہارت و نزاہت ہے تو اسی درجہ میں عورت کے لئے بھی۔ پس جب شرعاً دونوں برابر ہیں اور عرفاً متفاوت۔ پس اس تفاوت سے عملاً متاثر ہونا یعنی ایک کے لئے ان احتمالات کا اعتبار کرنا دوسرے کے لئے نہ کرنا صاف عرف کو شرع پر ترجیح دینا ہے۔ جو بہت بڑا شعبہ ہے جاہلیت کا جس کا منشا کبر اور ترفع ہے۔ و بس اور یہ صرف میرا ہی دعویٰ نہیں بلکہ مدعا علیہم کا اقرار بھی ہے چنانچہ بکثرت ان لوگوں کی زبان سے سنا گیا ہے کہ میاں مرد کا کیا ہے۔ اس کی مثال تو برتن کی سی ہے کہ دس دفعہ سَن گیا اور جب دھویا صاف ہوگیا اور عورت کی مثال موتی کی آب کی سی ہے کہ اگر ایک دفعہ اتر گئی تو پھر چڑھ نہیں سکتی۔ اس کے معنے دوسرے لفظوں میں صاف یہ بھی ہیں کہ مردوں کے لئے معصیت کو خفیف سمجھتے ہیں۔ اور عورتوں کے لئے شدید

تو علاوہ کبر کے اس میں تو فتویٰ استخفاف کے جاری ہونے کا بھی اندیشہ اور سخت اندیشہ ہے۔

تیسرے طبقہ والوں کی غلطیوں کی نشاندہی

اب صرف تیسرے طبقہ کے متعلق کلام باقی رہ گیا جو تعلیم کے حامی تو ہیں لیکن اس تعلیم کے تعین میں یا اس کے طریقہ کی تجویز میں ان سے غلطی ہوئی چنانچہ ان میں سے بعض کا بیان بضمن اصلاح خیال طبقہ ثانیہ کے اوپر ہو چکا ہے مثلاً ان کو صرف حرف شناس بنا کر چھوڑ دینا۔ پھر ان کا اپنی رائے سے مختلف رسالوں کا مطالعہ کرنا۔ اور مثلاً بعد تعلیم کے عمل کی نگرانی نہ کرنا جس کی متعدد مثالیں بھی ساتھ ساتھ مذکور ہوئی ہیں۔

عورتوں کو دنیوی علوم بغیر ضرورت کے نہیں پڑھانے چاہئیں

اور بعض کا بیان اب کیا جاتا ہے مثلاً بعض مستورات کو بجائے علوم دینیہ پڑھانے کے ان کو تاریخ و جغرافیہ یا اس سے بڑھ کر انگریزی پڑھاتے ہیں اور سب سے بڑھ کر یہ کہ انجیل پڑھاتے ہیں جس کی وجہ صرف تقلید اہل یورپ کی ہے یعنی ان کے نصاب تعلیم میں شائستگی کو منحصر سمجھنا اس کی بناء ہے مگر یہ خیال نہیں کرتے کہ ہم میں اور ان میں اگر رسوم و عادات و طبائع و خواص کا بھی فرق نہ ہوتا، تاہم سب سے بڑا فرق مذہب ہی کا ہے کہ ہم مذہب اسلام کا التزام کئے ہوئے ہیں اور وہ یا تو کوئی مذہب نہیں رکھتے اور زیادہ ان میں ایسے ہی ہیں اور یا ہمارے مذہب کے مغائر دوسرا مذہب رکھتے ہیں۔

اس لئے ان کے یہاں یا تعلیم مذہبی بالکل نہ ہوگی صرف زبان کی تعلیم ہوگی یا دنیوی معلومات کی تعلیم ہوگی اور یا دوسرے مذہب کی تعلیم ہوگی۔

بہرحال ان لوگوں کی اس تعلیم کا تو ایک خاص مبنی ہے۔ لیکن ہم لوگ اگر ان کی تعلیم کو اختیار کریں تو اس کا کیا مبنی ہے جب غرض تعلیم سے ان کی اور ہے جس کا ابھی ذکر ہوا۔ اور ہماری غرض اور ہے جس کا مختصر بیان طبقہ اولیٰ کی اصلاح خیال کے ذکر میں ہوا ہے، یعنی اصلاح عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق اور یہ غرض منحصر ہے علم دین میں تو ظاہر ہے کہ ہم ان کی تعلیم کا اختیار کرنا ہر طرح بے ربط ہے البتہ اگر کسی کو تحصیل معاش کی بھی حاجت واقع ہونے والی ہو تو بعد علوم دینیہ کے اس کو ان علوم کا حاصل کر لینا بھی مضائقہ نہیں۔ جو اس زمانہ میں معاش کا موقوف علیہ ہو۔ جیسے اس وقت انگریزی و تاریخ جغرافیہ وغیرہ باقی انجیل کی اس شخص کو بھی ضرورت نہ ہوگی اور ظاہر ہے کہ

کسب معاش کی حاجت صرف مردوں کو ہوتی ہے اور عورتیں اول اس وجہ سے کہ ان کا نان و نفقہ مردوں کے ذمہ ہے۔ دوسرے اس وجہ سے کہ اسلام میں پردہ کی تاکید ہے اور وہ ابواب خاصہ معاش کے جو خاص علوم پر موقوف ہیں۔ پردہ کے ساتھ حاصل نہیں کئے جا سکتے اس لئے عورتوں کے لئے یہ تعلیم بالکل فضول اور ان کے وقت کی اضاعت ہوگی بلکہ فضول سے متجاوز ہو کر ہر طرح مضر ہوگی جیسا کہ عنقریب ان مضار کا بیان بھی آوے گا۔

بہر حال یہ علوم جن کا لقب تعلیم جدید ہے عورتوں کے لئے ہرگز زیبا نہیں۔ البتہ فنون دنیا میں سے بقدر ضرورت لکھنا اور حساب اور کسی قسم کی دستکاری کہ اگر کبھی وقت کوئی سرپرست نہ رہے تو عفت کے ساتھ چار پیسے کما سکے یہ مناسب ہے۔ رہا قصہ شائستگی کا جس کا دل چاہے تجربہ کر کے دیکھ لے۔ کہ علم دین کی برابر دنیا بھر میں کوئی دستور العمل اور کوئی تعلیم شائستگی اور تہذیب نہیں سکھلاتا۔ چنانچہ ایک وہ شخص لیجئے جس پر علم دین نے پورا اثر کیا اور ایک وہ شخص لیجئے جس پر تہذیب جدید نے پورا اثر کیا ہے۔ پھر دونوں کے اخلاق اور معاشرت و معاملہ کا موازنہ کیجئے تو آسمان و زمین کا تفاوت پائیے گا البتہ اگر تصنع و تکلف کا نام کسی نے تہذیب رکھ لیا ہو تو اس کی یہی غلطی ہوگی کہ ایک مفہوم کا مصداق اس نے غلط ٹھہرا لیا اور اگر کسی کے ذہن میں اس وقت کوئی دین دار ایسا آیا جس میں تہذیب حقیقی کی کمی ہو اس کی وجہ یہ ہوگی کہ اس نے علوم دینیہ کا پورا اثر نہیں لیا۔

دین صرف نماز روزہ ہی کا نام نہیں ہے یعنی دین کے اجزاء متعدد ہیں۔ عقائد و اعمال و معاملات و معاشرت و اخلاق باطنہ بعضے لوگ صرف نماز و روزہ کے احکام کے جاننے کو علم دین اور احکام کی پابندی کرنے والے کو دین دار لقب دیتے ہیں سو خود یہی غلط ہے سب اجزاء مذکورہ کے احکام ضروریہ کا اچھی طرح جاننا علم دین اور سب کی پابندی دینداری ہے۔ سو جس کو دین دار لقب دے کر قلیل التہذیب قرار دیا گیا ہے وہ واقع میں سب اجزاء دین کا متوجب نہیں اور کلام اس میں ہے جس نے سب اجزائے کا اثر لیا ہو پس وہ شبہ رفع ہو گیا بندہ نے اس قسم کے شبہات کے جواب کے لئے رسالہ حقوق العلم لکھا ہے (جو قابل ملاحظہ ہے)

غرض تہذیب علم دین کے برابر کسی علم سے حاصل نہیں ہو سکتی۔ یہی علم دین تو تھا جس نے سلف میں اپنے اثر سے وہ اخلاق و شائستگی پیدا کی کہ خود یورپ کو بھی اس کا اعتراف بلکہ اس سے اغتراف بھی ہے مگر ہم اپنے گھر کی دولت سے بے خبر ہو کر دوسروں سے اس کی دریوزہ گری کر رہے ہیں۔ و للہ

دد العارف الرومی حیث قال ؎

یک سبد پر نان ترا بر فرق سر ۔ تو ہمیں جوئی لبِ نان در بدر

تا بزانوئی میاں قعر آب ۔ وز عطش وز جوع گشتی خراب

لڑکیوں کے لئے آزاد اور بیباک اُستانی مقرر نہیں کرنی چاہیئے

بعضے آدمی اپنی لڑکیوں کو آزاد بیباک عورتوں سے تعلیم دلاتے ہیں یہ تجربہ ہے کہ ہم صحبت کے اخلاق و جذبات کا آدمی میں ضرور اثر ہوتا ہے خاص کر جب وہ شخص ہم صحبت ایسا ہو کہ متبوع اور معظم بھی ہو اور ظاہر ہے کہ استاد سے زیادہ ان خصوصیات کا کون جامع ہوگا تو اس صورت میں وہ آزادی و بیباکی ان لڑکیوں میں بھی آوے گی۔ اور میری رائے میں سب سے بڑھ کر جو عورت کا حیا اور انقباض طبعی ہے اور یہی مفتاح ہے تمام خیر کی۔ جب یہ نہ رہا تو اس سے پھر نہ کوئی خیر متوقع ہے نہ کوئی شر مستبعد ہے ہر چند کہ " اذا فاتک الحیاء فافعل ماشئت " حکم عام ہے لیکن میرے نزدیک ماشئت کا عموم النساء کے لئے بہ نسبت رجال کے زیادہ ہے اس لئے کہ مردوں میں پھر بھی عقل کسی قدر مانع ہے اور عورتوں میں اس کی بھی کمی ہوتی ہے ۔ اس لئے کوئی مانع ہی نہ رہے گا۔

اسی طرح اگر استانی ایسی نہ ہو لیکن ہم سبق اور ہم مکتب لڑکیاں ایسی ہوں تب بھی اسی کے قریب مضرتیں واقع ہوں گی۔

اس تقریر سے دو جزئیوں کا حال بھی معلوم ہوگیا ہوگا جن کا اس وقت بے تکلف شیوع ہے ایک لڑکیوں کا عام زنانہ اسکول بنانا اور مدارس عامہ کی طرح اس میں مختلف اقوام اور مختلف طبقات اور مختلف خیالات لڑکیوں کا روزانہ جمع ہونا۔ گو معلّمہ مسلمان ہی ہو اور یہ آنا ڈولیوں ہی میں ہو اور گو یہاں آکر بھی پردہ ہی کے مکان میں رہنا ہو لیکن تاہم واقعات نے دکھلا دیا ہے اور تجربہ کرا دیا ہے کہ یہاں ایسے اسباب جمع ہو جاتے ہیں جن کا ان کے اخلاق پر برا اثر پڑتا ہے اور یہ صحبت اکثر عفت سوز ثابت ہوئی ہے اور اگر استانی بھی کوئی آزاد یا مکار مل گئی تو کریلہ اور نیم چڑھا کی مثال صادق آجاتی ہے۔

اور دوسری جزئی یہ کہ اگر کہیں مشن کی میم سے بھی روزانہ یا ہفتہ وار انگریزی تعلیم یا صنعت سکھلانے

کے بہانہ سے اختلاط ہونے تب تو نہ آبرو کی خیر ہے اور نہ ایمان کی۔ مگر افسوس صد افسوس ہے کہ بعضے لوگ ان آفات کو مایۂ افتخار سمجھکر خود اپنے گھروں میں بلاتے ہیں میرے نزدیک تو ان آفات مجسمہ سے بچی تو بچی اور تابع ہوکر تو کیا ذکر کسی بڑی بڈھی مسلمان عورت کا متبوع ہوکر بھی عمر بھر میں ایک بار ہمکلام ہونا بھی خطرناک ہے جن مضرتوں کے ذکر کا اوپر وعدہ تھا ان میں سے بعض یہی ہیں اور بعض کا ذکر اوپر دوسرے طبقہ کے منشار خیال کے ضمن میں ہو چکا ہے۔

لڑکیوں کی تعلیم کا اسلم طریقہ اسلم طریق لڑکیوں کے لئے یہی ہے جو زمانۂ دراز سے چلا آتا ہے کہ دو دو چار چار لڑکیاں اپنے اپنے تعلقات کے مواقع میں آویں اور پڑھیں اور حتی الامکان اگر ایسی استانی مل جاوے جو تنخواہ نہ لے تو تجربہ سے یہ تعلیم زیادہ بابرکت اور باثر ثابت ہوئی ہے اور بدرجہ مجبوری اس کا بھی مضائقہ نہیں اور جہاں کوئی ایسی استانی نہ ملے۔ اپنے گھر کے مرد پڑھا دیا کریں پڑھانے کا تو یہ طرز ہوا۔

نصابِ تعلیم اور نصاب تعلیم یہ ہو کہ اول قرآن مجید حتی الامکان صحیح پڑھایا جاوے۔ پھر کتب دینیہ سہل زبان کی جن میں تمام اجزائے دین کی مکمل تعلیم ہو (میرے نزدیک بہشتی زیور کے دسوں حصے ضرورت کے لئے کافی ہیں) اور اگر گھر کا مرد تعلیم دے تو جو مسائل، شرمناک ہوں ان کو چھوڑ دے اپنی بی بی کے ذریعہ سمجھوا دے اور اگر یہ انتظام بھی نہ ہو سکے تو ان پر نشان کر دے تاکہ ان کو یہ مقامات محفوظ رہیں پھر وہ سیانی ہوکر خود سمجھ لیں گی یا اگر عالم شوہر میسر ہو اس سے پوچھ لیں گی یا شوہر کے ذریعہ سے کسی عالم سے تحقیق کرالیں گی۔ (چنانچہ بندہ نے بہشتی زیور کے دستور العمل میں جو ٹائیٹل پر مطبوع ہوا ہے۔ اس کا خلاصہ لکھدیا ہے مگر بعضے لوگ اس کو دیکھتے ہی نہیں اور اعتراض کر بیٹھتے ہیں کہ اگر کوئی مرد پڑھانے لگے تو ایسے مسائل کس طرح پڑھاوے۔ اس لئے ان کا لکھنا ہی کتاب میں مناسب نہ تھا کیسی کچی سمجھ ہے) بہشتی زیور کے اخیر میں مفید رسالوں کا نام بھی لکھدیا گیا ہے جن کا پڑھنا اور مطالعہ عورتوں کو مفید ہے اگر سب نہ پڑھے ضروری مقدار پڑھکر باقیوں کو مطالعہ میں ہمیشہ رکھیں۔ اور تعلیم کے ساتھ ان کے عمل کی بھی نگرانی رکھیں اور اس کا بھی انتظام کریں کہ ان کو تدریس کا شوق ہو، تاکہ عمر بھر علمی شغل رہے تو اس سے علم و عمل کی تجدید و تحریز ہوتی رہتی ہے اور اس کی بھی ترغیب دیں کہ مطالعہ کتب مفیدہ سے کبھی

غافل نہ رہیں اور ضروری نصاب کے بعد اگر طبیعت میں قابلیت دیکھیں عربی کی طرف متوجہ کریں۔ تاکہ قرآن وحدیث وفقہ اصلی زبان میں سمجھنے کے قابل ہو جاویں اور قرآن کا خالی ترجمہ جو بعض لڑکیاں پڑھتی ہیں۔ میرے خیال میں سمجھنے میں زیادہ غلطی کرتی ہیں اس لئے اکثر کے لئے مناسب نہیں یہ تو سب پڑھنے کے متعلق بحث تھی۔

عورتوں کو لکھنا سکھلانے کے متعلق حکم

رہا لکھنا تو اگر قرآن سے طبیعت میں بے باکی معلوم نہ ہو تو کچھ مضائقہ نہیں۔ ضروریات خانگی کے لئے اس کی بھی حاجت ہو جاتی ہے اور اگر اندیشہ خرابی کا ہو تو مفاسد سے بچنا جلب مصالح غیر واجبہ سے اہم ہے۔ ایسی حالت میں لکھنا نہ سکھلاویں اور نہ خود لکھنے دیں اور یہی فیصلہ ہے عقلاء کے اس اختلاف کا کہ لکھنا عورت کے لئے کیسا ہے اب مضمون کو ختم کرتا ہوں۔

"استاذ شاگرد اور ہم جماعت ساتھیوں کے حقوق کے متعلق کوتاہیاں"

(اصلاح معاملہ بہ ادائے حقوق معلم ومتعلم وشریک تعلم)

علوم دینیہ کا جس طرح تعلیم وتعلم ضروری ہے اسی طرح اس تعلیم وتعلم کے سبب جن لوگوں کے ساتھ تعلقات ہوتے ہیں۔ ان تعلقات کے حقوق کا ادا کرنا بھی ضروری ہے اور یہ حقوق جس طرح فی نفسہا دلائل سے ضروری ہیں۔ اسی طرح تجربہ سے ثابت ہوا کہ برکات علمیہ کے موقوف علیہ ہونے کے اعتبار سے بھی ضروری ہے یہیں اور جن سے یہ تعلقات ہوتے ہیں وہ تین جماعتیں ہیں اول معلمین یعنی اساتذہ دوسرے متعلمین، یعنی تلامذہ۔ تیسرے شرکا فی التعلم یعنی ہمدرس وہم سبق، پس تینوں جماعتوں کے کچھ حقوق وآداب ہیں اور مثل دیگر اعمال کے ان میں بھی کم وبیش کوتاہیاں کی جاتی ہیں۔

متعلمین کی کوتاہیوں کی تفصیل

چنانچہ مشاہدہ ہے کہ بعضے تو استاد کے حقوق وآداب بھی ادا نہیں کرتے۔ پھر ان میں بھی دو قسم کے ہیں بعض تو زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں اور بعض اس زمانہ میں تو کسی قدر رعایت کرتے ہیں مگر بعد

مفارقت پھر مطلق اس کا اہتمام نہیں کرتے اور جو زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں یہ دو قسم کے ہیں۔ بعضے تو ظاہر ظاہر حقوق میں بھی کوتاہی کرتے ہیں اور بعضے ایسا تو نہیں کرتے مگر جن حقوق وآداب کے سمجھنے میں کسی قدر سلیقہ کی حاجت ہے۔ ان میں کوتاہی کرتے ہیں اور ان سب میں اکثر عددہ ہیں جو بعد مفارقت پھر استاد کو یاد نہیں رکھتے اور سب میں بدتر وہ بدنصیب ہیں جو کسی نفسانی مقتضیٰ سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ یہ سب اقسام ان لوگوں کے ہیں جو استادوں کا حق ادا نہیں کرتے۔ اور ان مضیعین حقوق اساتذہ سے زیادہ عدد میں وہ حضرات ہیں کہ اپنی استادی کے زمانہ میں شاگردوں کا کوئی حق اپنے اوپر نہیں سمجھتے اور اپنے حقوق واجبہ سے گذر کر غیر واجب بلکہ غیر جائز کے ادا کے بھی متوقع و منتظر رہتے ہیں اور قالاً یا حالاً ان کا مطالبہ ان سے کرتے ہیں اور ان سے بھی زیادہ وہ لوگ ہیں بلکہ غالباً قریب قریب کل کے ایسے ہی ہیں کہ ہم سبقوں کے حقوق کا تو ان کے دل میں خطرہ بھی نہ گذرتا ہوگا۔

گو کہیں دوسرے اسباب سے باہم دوستی بھی ہو جاتی ہو لیکن یہ بات کہ محض اس علاقہ سے باہم دوسرے کے کچھ حقوق اپنے ذمہ سمجھتے ہوں یہ بات بہت نادر بلکہ قریب قریب معدوم ہے اور جب سمجھتے ہی نہیں تو سمجھ کر ادا کرنے کے اہتمام کا تو کیا ذکر ہے بلکہ بعض جگہ تو نہایت افسوس کی بات ہے کہ بجائے باہم اخوت و وفاق و رعایت حقوق کے ایک طرف سے یا کہیں دونوں طرف سے بغض وحسد وخلاف وعقوق دیکھا جاتا ہے اس لئے ضرورت محسوس ہوئی کہ ان سب حقوق کی کچھ کچھ جزئیات بطور نمونہ لکھدی جاویں۔ خود ان جزئیات کے بیان میں انشاء اللہ تعالیٰ ایسے اصول ہاتھ آجاویں گے کہ ان اصول سے دوسری غیر مذکور جزئیات کا سمجھنا اور رعایت کرنا سہل ہو جائے گا۔ اور ہرچند کہ یہ تینوں قسم کے حقوق اور آداب میرے نزدیک فطری ہیں اور ذرا بھی فطرت میں سلامتی ہو تو ان کے معلوم کرنے اور نیز عمل پر تقاضا کرنے کے لئے صرف وجدان کافی ہے لیکن اس خیال سے شاید کسی احتمال پرست کو گمان ہو کہ مثل دیگر حقوق کے یہ حقوق شریعت میں منقول نہیں۔ قرین مصلحت معلوم ہوا کہ

اولاً نصوص کو نقل کر کے ساتھ ساتھ ان حقوق کی تقریر کرتا جاؤں اور حتی الامکان ترتیب کا بھی لحاظ رکھوں اس طرح کہ اول حقوق استاد کے پھر شاگرد کے، پھر ہمدرس کے۔ بیان کروں اور

حتی الامکان اس لئے کہا کہ ممکن ہے کہ کسی نص سے دو یا تین جماعتوں کے حقوق مفہوم ہوتے ہوں تو خاص اس میں وہ ترتیب ملحوظ نہ رہے گی۔ گو ایسا قلیل ہوگا۔

اور جاننا چاہیئے کہ استاد عام ہے۔ سبق پڑھانے والے اور پوچھنے پر مسئلہ بتلانے والے اور ابتداءً امر بالمعروف ونہی عن المنکر کرنے والے اور اصلاح نفس کے طریقے بتلانے والے یعنی پیر کو، اسی طرح شاگرد عام ہے، تلمیذ متعارف اور سائل عن الدین اور مرید کو، اسی طرح ہمدرس عام ہے متعارف ہم سبق اور کسی عالم کی مجلس میں شرکت کرنے والوں اور پیر بھائیوں کو،

اور ثانیاً بعد سوق نصوص کے بطور تفریع یا توضیح یا تفصیل یا تتمیم کے کچھ جزئیات کی بھی تقریر کر دوں کہ وہ بھی گویا اصل ہی کے ساتھ ملحق ہوگا۔

حقوق وآداب معلّم

آیتؐ۔ لقد من اللہ علی المومنین (الیٰ قولہ تعالیٰ) یعلمھم الکتاب والحکمۃ الآیۃ

(البتہ احسان کیا اللہ تعالیٰ نے مومنوں پر (الیٰ قولہ) سکھلاتا ہے ان کو کتاب اور حکمت)

اس آیۃ کریمہ میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نعمت بعثت پر منت ہونے کی علّت میں تعلیم کتاب وحکمت کو ذکر فرمانا صاف دلیل ہے کہ جو شخص کسی کو دین کی تعلیم کرے وہ اس شخص کے حق میں نعمت الٰہی ہے اور اس کی قدر وتعظیم اس پر لازم ہے اور اس تعلیم میں سبق پڑھانا اور مسئلہ بتلانا وغیرہ سب داخل ہیں کہ یہ سب تعلیم کے طریقے ہیں حتیٰ کہ کسی کی تصنیف سے منتفع ہوجانا اس قاعدہ سے اس کے شاگردوں میں داخل ہوجانا ہے اس کے حقوق بھی مثل استادوں کے ثابت ہوجاویں گے۔

آیتؑ۔ قال لہ موسیٰ ھل اتبعک الیٰ آخر القصہ

(حضرت موسیٰؑ نے حضرت خضرؑ سے کہا کہ کیا میں تمہاری پیروی کروں)

ان آیتوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کا قصّہ ہے اس سے چند حقوق وآداب ثابت ہوتے ہیں اول استاد کی خدمت میں خود شاگرد جایا کرے ان کو تکلیف نہ دے

کرآکر پڑھادیا کریں اگر استاد کسی اعتبار سے شاگرد سے رتبے میں کم بھی ہو تب بھی اس کا اتباع کرے۔

سوم:۔ جس بات کے پوچھنے کو وہ منع کریں نہ پوچھا کرے۔ اس کی مخالفت یا اس کو تنگ نہ کرے۔

چہارم:۔ اگر کبھی غلطی سے اس کے مزاج کے خلاف کوئی بات ہوجاوے تو معذرت کرلے۔ پنجم اس کے تنگ ہونے یا مرض وغیرہ سے کسل مند ہونے کے وقت سبق بند کردے

استاد کے ساتھ گفتگو کے آداب ملحوظ رکھنا

آیتہ:۔ یاایھاالذین آمنوا لاتقولوا راعنا وقولوا انظرنا واسمعوا۔ الایتہ

(ترجمہ) اے لوگو جو ایمان لائے ہو مت کہو راعنا اور کہو انتظار کرو ہمارا اور سنو۔ اس آیت سے ثابت ہوتا ہے کہ استاد کے ساتھ گفتگو میں بھی ادب ملحوظ رکھے۔ تا بمعاملات چہ رسد۔

آیتہ ۔ انما المؤمنون الذین آمنوا باللہ ورسولہٖ واذا کانوا معہٗ علیٰ امرٍ جامعٍ لم یذھبوا حتی یستاذنوہ ط

(ترجمہ) جزاین نیست کہ مؤمن وہ لوگ ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول پر ایمان لائے۔ اور جب ہوتے ہیں ساتھ رسول کے کسی اجتماعی بات پر تو نہیں جاتے جب تک اجازت نہ لے لیں۔

استاد کی خدمت میں بلا اجازت نہ جاوے

اس آیت سے استاد کا یہ حق ثابت ہوا کہ اس کی خدمت سے بلا اذن نہ جاوے خواہ اذن صراحۃً ہو یا دلالۃً

تعلیم دین بھی احسان ہے

حدیث:۔ عن ابن عمر رضی اللہ عنہ من صنع الیکم معروفاً فکافئوہ فان لم تجدوا ما تکافئونہ فادعوا لہ حتی تروا انکم قد کافاتموہ (رواہ احمد وابوداؤد والنسائی وابن حبان فی صحیحہ والحاکم فی مستدرکہ کذا فی العزیزی)

(ترجمہ) جو شخص تم پر احسان کرے اگر تم اس کی مکافات کرسکتے ہو تو کردو ورنہ اس کے لئے دعا کرو۔ یہاں تک کہ تم سمجھ لو کہ تم نے اس کی مکافات کردی۔

کیا کوئی شخص تعلیم دین کے معروف یعنی احسان ہونے سے انکار کرسکتا ہے۔ جب اس کا احسان ہونا مسلّم ہوگیا تو اس کے مکافات میں اس کی ہر قسم کی خدمت مال سے جان سے داخل ہوگئی جو

حدیث ہذا میں مامور بہ ہے۔

اور جب کسی قسم کی استطاعت نہ رہے تو اس وقت اقل درجہ دعا ہی سے یاد رکھنا ضروری ہے

حدیث:۔ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من لم یشکر الناس لم یشکر اللہ رواہ احمد والترمذی۔

ترجمہ:۔ جس نے آدمیوں کا شکر ادا نہ کیا، اس نے اللہ تعالیٰ کا شکر نہ ادا کیا۔

اس حدیث کے عموم میں استاد بدرجہ اولیٰ داخل ہے کہ بہت بڑی نعمت یعنی علم دین کا واسطہ ہے اس کی حق شناسی میں کوتاہی کرنا بنص حدیث حق تعالیٰ کی ناشکری ہے جس کا محل وعید ہونا نص قطعی سے ثابت ہے۔

قال تعالیٰ لئن شکرتم لازیدنکم ولئن کفرتم (متابل شکرتم) ان عذابی لشدید ہ الآیۃ۔

ترجمہ:۔ اگر تم شکر کرو گے تو ہم اور زیادہ دیں گے اگر تم کفرانِ نعمت کرو گے تو یاد رکھو ہمارا عذاب شدید ہے۔

یہ حدیثیں تو بعموم مدعا پر دال ہیں۔ آگے خصوص کے ساتھ دلالت کرنے والی احادیث منقول ہیں۔

اُستاد اور شاگرد ایک دوسرے کو مغالطہ میں نہ ڈالے

حدیث: عن معاویۃ رضی اللہ عنہ قال ان النبی صلے اللہ علیہ وسلم نھی عن الاغلوطات رواہ ابوداؤد

ترجمہ:۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے (علوم میں) مغالطہ دینے سے منع فرمایا ہے۔

اس سے ایک ادب استاد کا ثابت ہوا وہ یہ کہ بعض طلبار کی عادت ہے کہ خواہ مخواہ کتاب میں احتمالات نکال کر استاد کے سامنے بطور اعتراض پیش کیا کرتے ہیں اور خود بھی سمجھتے ہیں کہ مہمل اعتراض ہیں مگر اپنی ذہانت جتلانے اور استاد کا امتحان کرنے کے لئے ایسی نامعقول حرکت کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ یہ مغالطہ ہوا کہ ظاہر کیا جاتا ہے کہ یہ مقام مشتبہ ہے حالانکہ خود اپنے نزدیک بھی مشتبہ نہیں اور اسی سے شاگرد کا بھی ایک حق ثابت ہوگیا وہ یہ کہ بعض مدرسین کی عادت ہے

کہ کسی مقام پر خود بھی شبہ ہے مگر شاگرد پر ظاہر نہیں کرنا چاہتے کچھ گڑھ مڑھ کر تقریر کر دیتے ہیں۔ گویا اس کو دھوکا دیتے ہیں کہ اس مقام کی یہی تقریر ہے حالانکہ خود بھی یہ اطمینان نہیں۔

علم دین پڑھانے والا سب سے زیادہ سخی ہے۔

حدیث :۔ عن انس بن مالک رضی اللہ عنہ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ھل تدرون من اجود جوداً قالوا اللہ ورسولہ اعلم قال اللہ اجود جوداً ثم انا اجود بنی آدم واجودھم من بعدی رجل علم علماً فنشرہ یاتی یوم القیامۃ امیراً وحدہٗ رواہ البیہقی۔

ترجمہ :۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم جانتے ہو کہ سب سے زیادہ سخی کون ہے ؟۔ انہوں نے (ازراہِ ادب) عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کا نبی دانائے حال ہے تو آپ نے فرمایا ہے کہ سب سے زیادہ سخی اللہ تعالیٰ ہے پھر تمام بنی آدم میں سب سے زیادہ میں سخی ہوں اور پھر سب سے زیادہ سخی وہ شخص ہے کہ جس نے علم دین سیکھا اور اس کو پھیلایا یہ شخص قیامت میں تنہا بمنزلہ ایک امیر کے آوے گا (بیہقی)

اس حدیث میں بعد اللہ ورسول کے سب سے زیادہ صاحب جود اس عالم کو فرمایا ہے جو علم کو شائع کرے جس طریق سے بھی ہو خواہ تدریس سے یا وعظ وتلقین سے خواہ تصنیف سے، اور ظاہر ہے کہ جو شخص کسی پر جود کرے اس کا کتنا حق ہوتا ہے پس یہ مشیعین للعلم جن لوگوں پر جود خاص کر رہے ہیں اور وہ متعلمین ہیں باقسامہم ان پر ان کا کیسا کچھ حق ہو جاوے گا۔

اگر استاد کسی کتاب پڑھنے سے منع کرے تو شاگرد کو اس پر عمل کرنا چاہیئے

حدیث :۔ ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم کتب لامیر السریۃ کتاباً وقال لا تقراہ حتی تبلغ مکان کذا وکذا فلما بلغ ذلک المکان قراہ علی الناس واخبرھم بامر النبی صلی اللہ علیہ وسلم (رواہ البخاری)

ترجمہ : یعنی پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک امیر لشکر کو حکم نامہ لکھ کر دیا اور (ایک مصلحت کے سبب) یہ فرمایا کہ جب تک فلاں مقام پر نہ پہنچ جاؤ اس کو مت پڑھنا۔ چنانچہ اسی کے موافق عمل کیا۔ (بخاری)

اس حدیث سے ایک ادب ثابت ہوا جو طالب علموں پر لازم ہے وہ یہ کہ استاد اگر کسی کتاب

پڑھنے سے کسی خاص وقت میں منع کرے مثلاً اس کے نزدیک شاگرد کی استعداد سے زیادہ ہے اس مصلحت سے اس وقت پڑھنے سے منع کرتا ہے تو طالب علم کو چاہیئے اس پر عمل کرے۔ جس طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہر طرح مبارک ہی تھا اور اس کا پڑھنا اور جاننا ہر وقت عبادت تھا مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مصلحت سے ایک وقت معین کے قبل تک اس کے مطالعہ سے منع فرمایا اور ان صحابی نے ویسا ہی کیا۔

شاگرد کے بے ڈھنگے سوال پر اگر استاد غصہ کرے تو صبر کرنا چاہیئے

حدیث:۔ عن زید بن خالد الجہنی ان النبی صلی اللہ علیہ وسلم سألہ رجل عن اللقطۃ فقال اعرف وکاءھا او قال وعاءھا وعفاصہا ثم عرفہا سنۃ ثم استمتع بہا (ای ان کنت فقیراً والا تصدق بہا) فان جاء ربہا فادہا الیہ قال فضالۃ الابل فغضب حتی احمرت وجنتاہ او قال احمر وجہہ فقال مالک ولہا معہا سقاءھا وحذاءھا ترد الماء وترعی الشجر فذرہا حتی یلقہا ربہا الحدیث رواہ البخاری۔

ترجمہ: جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایک شخص نے لقطہ (گری ہوئی چیز کے پانے کا) مسئلہ دریافت کیا۔ تو آپ نے فرمایا۔ اس کا سر بند اور ظرف پہچان لے۔ اور سال بھر تک اس کی تعریف کرا اگر کوئی مالک نہ ملے (اور تو محتاج ہو تو اس سے نفع اٹھا ورنہ صدقہ کردے) پھر اگر اس کا مالک آوے تو اس کو دیدے۔ اس سائل نے کہا کہ گمشدہ اونٹ کا کیا حکم ہے۔ اس سوال سے آپ پر آثار غصہ نمودار ہوئے حتی کہ رخسار ہائے مبارک سرخ ہوگئے۔ آپ نے فرمایا۔ تجھے اس سے کیا کام ہے اس کے ساتھ اس کی مشک ہے اور اس کے موزے۔ پانی پر جاکر پانی پیتا ہے اور درختوں سے چارہ کھاتا ہے (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی بیڈھنگے سوال پر استاد غصہ کرے تو شاگرد کو چاہیئے کہ اس کو گوارا کرے مکدر نہ ہو۔ جس طرح یہاں اس صحابی نے برا نہیں مانا۔

جہاں تک ہوسکے استاد کے ساتھ رہنے کی کوشش کریں

حدیث:۔ عن ابی ہریرۃ رضی اللہ عنہ فی حدیث طویل

وان ابا هریرة رض کان یلزم رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بشبع لبطنہ ویحضر مالا یحضرون ویحفظ مالا یحفظون (البخاری)

ترجمہ:۔ ایک طویل حدیث میں حضرت ابوھریرۃ رضی اللّٰہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ اپنے پیٹ بھر غذا ملنے پر رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں ہمیشہ رہتے تھے۔ اس قدر اور لوگ حاضر نہ رہ سکتے تھے اور احادیث اس قدر یاد کرتے تھے کہ اور لوگ نہ یاد کر سکتے تھے۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر پیٹ بھرائی کھانا مل جاوے تو حتی الامکان استاد سے جدا نہ ہو کہ اس کی عنایت بھی بڑھ جاتی ہے اور فوائد علمیہ بھی حاصل ہوتے ہیں اور اس کی خدمت کا بھی موقع ملتا ہے۔ چنانچہ حضرت ابوھریرہ رض سے موقع پر خدمتیں لینا بھی احادیث میں وارد ہے۔

استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش رہنا چاہیئے

حدیث:۔ عن جریر رضی اللّٰہ ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لہٗ فی حجۃ الوداع استنصت الناس (رواہ البخاری)

ترجمہ:۔ جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع میں خطبہ کے وقت حضرت جریر رضی اللّٰہ عنہ سے فرمایا کہ لوگوں کو چپ کرو۔

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ استاد کی تقریر کے وقت بالکل خاموش اور متوجہ رہنا چاہیئے کسی سے بات نہ کرے کسی کی طرف التفات نہ کرے۔

اگر استاد کسی بات پر ناراض ہو تو ان کو خوش کرنا چاہیئے

حدیث:۔ عن جابر رضی اللّٰہ عنہ ان عمر بن الخطاب رضی اللّٰہ تعالیٰ عنہ اتی رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم بنسخۃ من التوراۃ فقال یارسول اللّٰہ ھٰذہ نسخۃ من التوراۃ فسکت فجعل یقرء و وجہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم یتغیر فقال ابوبکر رضی اللّٰہ عنہ ثکلتک الثواکل ما تری ما بوجہ رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم فقال اعوذ باللّٰہ من غضب اللّٰہ ورسولہ (الحدیث) (رواہ الدارمی)

ترجمہ:۔ حضرت جابر رضی اللّٰہ عنہ سے روایت ہے کہ حضرت عمر رضی اللّٰہ عنہ ایک نسخہ توراۃ کا جناب رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم کی خدمت میں لائے اور عرض کیا کہ یا رسول اللّٰہ یہ نسخہ توراۃ

کا ہے۔ آپ سن کر خاموش ہو رہے۔ حضرت عمر نے اس کو پڑھنا شروع کیا اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا چہرہ متغیر ہوا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اے عمر رووین تجھ کو رونے والیاں۔ رسول اللہ صلی اللہ کے روئے انور کو تو دیکھ کہ خوشی کے آثار پائے جاتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے دیکھتے ہی فرمایا۔ پناہ مانگتا ہوں اللہ تعالیٰ کے غصے سے اور اللہ تعالیٰ کے رسول کے غصہ سے (دارمی)

اس حدیث سے ایک حق استاد کا ثابت ہوا کہ اگر وہ کسی بات پر غصہ کرے تو شاگرد کو معذرت کرنا اور اس کو خوش کرنا ضروری ہے۔ دوسرا حق شاگرد کا ثابت ہوا کہ اگر اس سے کوئی امر نامناسب صادر ہو تو اس کو تنبیہ کرنا ضرور ہے اور اس سے اس کی اصلاح ہوتی ہے تیسرا حق شریک علم کا ثابت ہوا کہ اس کی غلطی پر جس پر وہ خود مطلع نہ ہوا۔ خیر خواہی سے مطلع کر دے کہ وہ اس کا تدارک کرے اور وہ بھی اس کو قبول کرے۔ جیسا حضرات شیخین سے واقع ہوا۔

اہل علم اور استاد کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آنا چاہیے

(حدیث) فی الترغیب والترہیب للمنذری عن ابی ھریرۃ رض

قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تعلموا العلم وتعلموا للعلم السکینۃ والوقار وتواضعوا لمن تعلمون منہ۔ رواہ الطبرانی فی الاوسط

ترجمہ:۔ حضرت ابوہریرہ رض سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ علم سیکھو اور علم کے لئے سکینہ اور وقار اختیار کرو اور جس سے علم سیکھتے ہو اس کے ساتھ تواضع اور ادب سے پیش آؤ (ترغیب و ترہیب)

اس حدیث میں ترغیب علم و اختیار وضع اہل علم کے ساتھ استاد کے ساتھ ادب و تواضع سے پیش آنے کا صریح امر ہے۔

استاد کے حقوق کے متعلق مختلف کوتاہیاں

اب بعد سوق نصوص کے واقعات پر نظر کر کے کچھ کوتاہیاں اس باب کے متعلق عرض کرنا مناسب معلوم ہوتا ہے۔

سو جاننا چاہیئے کہ جو لوگ استاد کے حقوق ضائع کرتے ہیں جیسا کہ تمہید مضمون میں بیان کیا گیا

مختلف اقسام ہیں بعض تو خود زمانہ تحصیل علوم میں بھی کوتاہیاں کرتے ہیں۔ پھر ان میں بعضے تو ظاہر حقوق میں بھی کوتاہی کرتے ہیں جیسے ان کا ادب کرنا مثلاً آنے جانے کے وقت سلام نہ کرنا اس کی طرف پشت کرکے بیٹھنا، یا ادھر پاؤں پھیلا دینا، اور جیسے اطاعت کم کرنا، مثلاً کوئی بات مان لی کسی بات کو ٹال دیا اور جیسے خلوص میں کمی کرنا، مثلاً اس سے فریب کرنا، جھوٹ بولنا، اپنی خطا کی تاویل کرنا اور جیسے خدمت میں کمی کرنا، خواہ بدنی ہو، مثلاً اس کو پنکھا جھلنا، اس کا بدن دابنا۔ ومثل ذالک۔ اورخواہ مالی ہو مثلاً حق تعالیٰ نے اپنے کو وسعت دی ہے اور استاد نادار ہے۔ اس وقت اس کی خدمت میں کچھ نقد یا متاع یا طعام بطور ہدیہ کے پیش کرنا۔ اس میں ایسے منکر ہیں کہ وہ بدنی خدمت کو عار اور ذلت سمجھتے ہیں۔ اور بعض مال سے دریغ کرتے ہیں۔ خصوصاً اگر استاد ان کا تنخواہ دار ہو تو تنخواہ دے کر سب حقوق سے اپنے کو سبکدوش سمجھ بیٹھتے ہیں۔ واقعی پھر کوئی حق واجب تو نہیں رہتا لیکن کیا واجب کے بعد تطوع کا کوئی درجہ نہیں خصوص جبکہ اس میں اپنا ہی نفع ہو۔ تجربہ سے یہ معلوم ہوا کہ استاد کا دل جس قدر خوش رکھا جاوے گا۔ اس قدر علم میں برکت ہوگی۔

استاد کا حق پورا نہ کرنے کے متعلق ایک عجیب حکایت

میں نے ایک جگہ کسی بہت بڑے عالم کی حکایت لکھی دیکھی ہے کہ ان کے استاد ان کے وطن کی طرف اتفاق سے آئے تھے۔ سو سب شاگرد ان کی خدمت میں سلام کے لئے حاضر ہوئے اور یہ عالم بوجہ اس عذر کے کہ وہ اپنی والدہ کی خدمت میں مشغول تھے حاضر نہ ہو سکے۔ چونکہ ایسی مشغولی نہ تھی کہ حاضر ہونے سے ضروری خدمت میں کوئی حرج واقع ہوتا۔ کسی قدر سستی سے بھی کام لیا۔ استاد کو یہ کم توجہی ناگوار ہوئی اور یہ فرمایا کہ بہ برکت خدمت والدہ کے ان کی عمر تو طویل ہوگی مگر ہمارے حقوق میں کمی کرنے کے سبب ان کے علم میں برکت نہ ہوگی۔ چنانچہ عمر تو بہت ہوئی لیکن تمام عمر گذر گئی نشر علم کے اسباب ان کے لئے جمع نہ ہوئے۔ کچھ ایسے اتفاقات وقتاً فوقتاً پیش آتے رہے کہ کبھی شہر میں رہنا ہی نصیب نہ ہوا۔ ہمیشہ گاؤں میں رہتے رہے۔ جہاں نہ درس وتدریس کا موقع ملا نہ دوسرے طرق اشاعت علم کا۔

غرض کہ استاد کے تکدر سے علم کی برکت جاتی رہتی ہے اور اس کی خوشی سے برکت ہوتی ہے۔

پس جو حقوق واجب نہیں ہیں۔ ان کی رعایت کرنے سے اپنا یہ نفع ہے۔

اور کہ غور کرنے کے قابل بات ہے کہ اگر استاد بھی اسی قاعدہ پر عمل کرے کہ تعلیم واجب سے زیادہ ایک حرف نہ بتلاوے ایک منٹ زیادہ نہ دے۔ تقریر ایک بار سے زیادہ ہرگز نہ کرے تو کیا اس طرح سے اس کو علم حاصل ہو سکتا ہے وہ بے چارہ اس کی تعلیم و تفہیم میں واقعی خون جگر کھاتا ہے تو اس کو کیا زیبا ہے کہ اس کے حقوق میں ضابطہ سے ایک انگل نہ بڑھے۔ یہ تو نری بے حسی و قساوت ہے۔

کتابوں کا مطالعہ کرنا بھی استاد کے حقوق میں داخل ہے۔

اور بعضے ایسے موٹے موٹے حقوق کی تو رعایت کرتے ہیں لیکن ایسے حقوق میں کوتاہی کرتے ہیں جن کے سمجھنے میں سلیقہ کی ضرورت ہے۔ مثلاً مطالعہ کم دیکھنا جس سے یا عبارت پڑھنے میں غلطیاں ہونے سے یا مقام کے کم سمجھنے کے سبب استاد کو کئی بار تقریر کرنے کی ضرورت واقع ہونے سے یا اسی کم سمجھنے کے سبب فضول سوال کرنے سے استاد کو تنگی و انقباض و پریشانی ہو تو کیا محسن کا یہی حق ہے کہ اس کو بلا ضرورت پریشان کیا جاوے اور یہاں بلا ضرورت ہی ہے کیونکہ مطالعہ کے اہتمام سے یہ سب خلجانات رفع ہو سکتے تھے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ مطالعہ دیکھنے سے پھر عبارت میں غلطی یا فہم مطالب میں کمی نہیں ہوتی۔ ضرور پھر بھی ہوتی ہے مگر اللہ تعالیٰ نے استادوں کو ایسی بصیرت عطا فرمائی ہے کہ وہ سمجھ جاتے ہیں کہ اس نے اپنی کوشش صرف کی ہے یا نہیں۔ پس باوجود بذل جہد کے جو کمی رہ جاتی ہے وہ چونکہ اس کی وسعت سے خارج ہے اس سے طبعاً تنگدلی نہیں ہوتی اس میں اس شاگرد کو معذور سمجھا جاتا ہے۔ اور بے پروائی اور سستی معلوم ہونے سے بے حد ناگواری ہوتی ہے۔

استاد کی تقریر کے وقت ادھر ادھر نہیں دیکھنا چاہیئے

اور مثلاً استاد کی تقریر کے وقت دوسری طرف التفات کرنا کہ استاد تو اس کی طرف متوجہ اور یہ دوسری طرف متوجہ اس سے استاد کو بہت کوفت ہوتی ہے خصوص ایسی حالت میں جب کہ کوئی سوال بھی کرے۔ ایسا کہ اگر توجہ سے تقریر سنتا تو پھر یہ سوال ہی نہ کرتا۔ اس وقت استاد کو سخت شکایت ہوتی ہے کہ ناحق ہی مجھ کو پریشان کر رہا ہے۔

مہمل اور لغو اور اپنی ذہانت دکھلانے کیلئے سوال نہیں کرنا چاہیئے

اور مثلاً ایسا سوال کرنا جس کا جواب

یا جس کی لغویت خود بھی معلوم ہے۔ جس طرح بعض طلباء کی عادت ہے کہ محض اپنی ذہانت دکھلانے یا استاد کا امتحان لینے یا محض مشغلہ و تفریح کی غرض سے دور از کار ڈھیل ڈھل سوالات کیا کرتے ہیں۔

ایک حکایت جیسے ایک طالب علم کی حکایت سنی ہے کہ انہوں نے حدیث میں پڑھا کہ طلوع شمس کے وقت نماز نہ پڑھو۔ تو آپ کیا فرماتے ہیں کہ لاتصلوا بھی عام اور طلوع شمس بھی عام خواہ کسی مقام کا طلوع شمس ہوا ور یہ مشاہدہ سے ثابت ہے کہ ہر وقت کہیں نہ کہیں طلوع ہوتا ہی رہتا ہے۔ تو اس سے لازم آتا ہے کہ کسی شخص کو کسی وقت بھی نماز پڑھنا جائز نہ ہو۔ ہر چند کہ اس کو سمجھایا گیا کہ بھائی جہاں کا طلوع شمس ہو وہیں کے لوگوں کو اس وقت کے اعتبار سے لاتصلوا کا حکم ہے۔ مگر ان بزرگوار نے مانا ہی نہیں۔ یہی فرماتے رہے کہ نہیں صاحب دونوں ہی میں عموم ہے۔ ان سے کہا گیا کہ بھائی اس سے تو نماز کی فرضیت ہی لغو ہوئی جاتی ہے۔ کہتے ہیں۔ کہ خواہ کچھ ہو جائے انصاف ہے۔ کیا یہ سوال قابل پیش کرنے کے ہے؟ اور کیا سچ مچ اس پاگل کو یہ شبہ تھا۔ محض فضول دق کرنے کے لئے اس نے یہ حرکت کی اور بجائے اس کے کہ اس کے زعم کے موافق اس کی ذہانت ظاہر ہوتی۔ اور الٹا اس کا کوڑھ مغز ہونا ثابت ہو گیا۔ ایسے طالب علموں کو کبھی علم نصیب نہیں ہوتا۔

غرض استاد کو کبھی پریشان نہ کرے۔ بلکہ ادب کی بات تو یہ ہے کہ اگر اور کسی سبب سے یا اور کسی کے سبب سے وہ پریشان ہو تو اس وقت یا تو سبق ملتوی کر دے یا بجز بہت ہی ضروری بات کے زائد باتیں نہ پوچھے۔

اور مثلاً تعیین سبق یا مقدار سبق میں استاد کی رائے نہ ماننا جیسے بعض طلباء کی عادت ہے کہ باوجود استاد کی رائے معلوم ہونے کے پھر اپنی رائے پر اصرار کرتے ہیں کہ ہم تو فلاں ہی کتاب شروع کریں گے۔ یا اتنا ہی سبق پڑھیں گے یا فلاں ہی شخص سے پڑھیں گے۔ ان امور میں تو طالب علم کو یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ "هل يستوى الذين يعلمون والذين لا يعلمون"۔

ترجمہ: یعنی کہاں تجربہ کار اور کہاں ناتجربہ کار، اس کو تو اس پر عمل کرنا چاہیئے۔

بمے سجادہ رنگین کن گرت پیر مغاں گوید
کہ سالک بے خبر نبود ز راہ و رسم منزلہا

کنایہ است از خلاف نفس کردن نہ کہ خلاف حق کردن یہ وہ حقوق ہیں کہ جن کے سمجھنے کے لئے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ یہاں تک یہ سب جزئیات ہوتیں ان اضاعات حقوق کی جو زمانہ تحصیل علوم میں سرزد ہوتی ہیں۔

فراغت کے بعد کی کوتاہی ایک قسم وہ ہے جو بعد مفارقت استاذ کا کوئی حق اپنے اوپر نہیں سمجھتے یا سمجھتے ہوں مگر عمل کا اہتمام نہیں کرتے۔ اور اس بلا میں بہت زیادہ ابتلاء ہے اور تو کیا کرتے کبھی خط بھیجنے کی اور استاد کی خیریت پوچھنے کی توفیق نہیں رہتی۔ سمجھتے ہیں کہ اب کیا علاقہ رہا۔ کیا صاحب محسن کا حق صدور احسان ہی کے زمانہ تک ہوتا ہے۔ پھر نہیں رہتا؟ اگر یہ بات ہے۔ پس بعد بالغ ہو جانے کے والدین کے حقوق بھی رخصت ہو جاویں گے۔ ولا قائل بہ۔

پھر یہ ہے کہ گو صدور احسان کا اس وقت استاد سے نہیں ہو رہا ہے لیکن اس احسان کے آثار کا ظہور و ترتب تو اس وقت بھی ہو رہا ہے بلکہ زیادہ اسی وقت ہو رہا ہے کیونکہ جتنا کمال علمی اس وقت تمہارا ظاہر ہو رہا ہے اس کا منشاء و مبداء وہی انعام تعلیمی استاد ہی کا تو ہے ونعم ما قیل فی نحو ھٰذا المعنیٰ

فعادوا فاثنوا بالذی کان اھلہ

ولو سکتوا اثنت علیہ الحقائب

غرض یہ ناسپاسی ہی ہے کہ اپنا کام نکالا اور الگ ہوئے یہ تو پوری خود غرضی ہے سپاس گذاری یہی ہے کہ ہمیشہ جب تک جان میں جان ہے وہ وقت یاد رکھے کہ جب یہ اس کے سامنے کتاب رکھکر بیٹھتا تھا اور یہی سمجھے کہ گویا ابھی اس کے پاس سے پڑھکر اٹھکر آیا ہوں اور پھر پڑھنے کے لئے جاتا ہے تو اس وقت جتنے حقوق کو ضروری سمجھتا تھا جن کی بقدر ضرورت تفصیل بھی ہو چکی ہے وہی حقوق اب بھی باقی ہیں ایسا کرنے سے انشاء اللہ تعالیٰ یوماً فیوماً علوم و برکات میں ترقی ہوگی۔ قال تعالیٰ لئن شکرتم لازیدنکم۔

بلکہ ان حقوق کو ایسا مستمر سمجھے کہ استاد کی وفات کے بعد بھی وہ حقوق ملحوظ رکھے جو اس وقت ادا کئے جا سکتے ہیں اور ان کا خلاصہ دو امر ہیں۔ ایک اس کے لئے ہمیشہ دعائے مغفرت کرنا دوسرا اس کے اہل و اقارب کی تعظیم و خدمت کرنا اسی طرح استاد کے دوستوں اور معاصرین کا احترام کرنا

اور اگر ان کو حاجت ہو تو ان کی خدمت کرنا۔

احادیث میں اس قسم کے حقوق والدین کے لئے آئے ہیں اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ان لوگوں کی فضیلت بیان فرمائی ہے جو بعد وفات نبویہ آپ کے اہل کی خدمت کریں گے اور آپ کی عزت سے محبت رکھیں گے اب صرف ان مضیعین حقوق استادیں سے وہ لوگ رہ گئے جن کو میں نے تمہید میں بدنصیب کہا ہے۔ یعنی جو نفسانی اغراض سے استاد کے مخالف ہو جاتے ہیں۔ ان کی شان میں تقریراً یا تحریراً گستاخی کرکے ان اشعار کا مصداق بنتے ہیں۔

از خدا جوئیم توفیق ادب	بے ادب محروم گشت از فضل رب
ہر کہ گستاخی کند اندر طریق	باشد او در لجۂ حیرت غریق
بذر گستاخی کسوف آفتاب	شد عزازیلے زجرأت رد باب

استاد تو وہ چیز ہے کہ اگر بضرورت دینیہ بھی اس کے خلاف کرنا پڑے تب بھی کافر باپ کی طرح دین کے باب میں تو اس کی موافقت نہ کرے لیکن ادب اور احترام اس کا ترک نہ کرے۔ کیونکہ وہ بھی ایک قسم کا یعنی روحانی باپ ہے۔ گو تعارض حقوق کے وقت باپ سے یہ مرجوح ہو مگر حقوق غیر متعارضہ میں تو اس کا بھی وہی حکم ہے۔ آخر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اسی تربیت روحانیت و تعلیم دینی ہی کے سبب تو یہ ارشاد ہوا ہے۔

النبی اولیٰ بالمؤمنین من انفسهم وازواجه امهاتهم وفی بعض القرآت وهو اب لهم۔

پس استاد بھی آپ کا وارث و نائب ہے گو اس درجہ میں نہ سہی۔ چنانچہ آپ کے حقوق، علی الاطلاق آبا نسبیہ پر مقدم ہیں۔ اس وجہ سے کہ آپ کے حقوق حقوق الٰہیہ ہیں جو سب پر مقدم ہیں۔ یہ مختصر بیان ہوا اقسام مضیعین حقوق و آداب اساتذہ کا۔

تنخواہ دینے سے استاد کے حقوق سے سبکدوش نہیں ہو جاتا

ان سب اقسام میں ایک ایک مشترک شکایت ہے وہ یہ کہ جو اساتذہ کسی مدرسہ سے تنخواہ پاتے ہیں۔ ان کے حقوق اور بھی ضعیف سمجھتے ہیں۔ افسوس یہ نہیں سمجھتے کہ جو بناء ہے ان حقوق کی وہ تنخواہ پانے سے منعدم نہیں ہو گئی تو

مبنیٰ کیسے منفقود ہو جاوے گا اول تو تنخواہ کیا اس احسان کا بدل ہو سکتی ہے دوسرے وہ تنخواہ انہوں نے بھی دی ہو اس سے زیادہ اس نے ان کو دیا۔

اور اگر کہا جاوے کہ جب نیت اس کی دنیا کی تھی تو احسان کم ہو گیا یہ بھی محض غلط ہے۔ ثواب خواہ کم ہو جاوے مگر احسان تو ویسا ہی ہے اور شاید اس مقام پر بعض کو یہ خیال ہو کہ ہم فلاں استاد کے بہت حقوق ادا کرتے ہیں تو تتبع سے یہ معلوم ہوا ہے کہ نرا استاد سمجھ کر حقوق ادا کم کرتے ہیں۔ جس استاد کے حقوق کچھ ادا ہوتے ہیں ان میں کوئی دوسرا احتمال بزرگی وغیرہ کا سمجھ کر ایسا کرتے ہیں دیکھنا یہ ہے کہ جہاں نری استادی ہو وہاں کیا ہوتا ہے۔ اگر وہاں بھی رعایت حقوق کی ہو تو قابل مدح وتحسین ہے اسی طرح بعض اساتذہ کو جاہ دینوی حاصل ہونے سے اس کی تعظیم وتکریم کی جاتی ہے وہ بھی کوئی دلیل شاگرد کی خوبی کی نہیں۔ وہ اس سے خود اپنی بڑائی کا سامان کرتا ہے۔ چنانچہ اگر استاد جاہ شہرت میں شاگرد سے کم ہوتا ہے۔ بعض ناخلف اپنے کو اس کی طرف منسوب کرتے ہوئے عار کرتے ہیں۔ اگر ایسے استاد کا بھی حق ادا کرے تو مبارک حالت اور قابل قدر ہے

شاگرد کے حقوق

اب بعد بیان حقوق وآداب معلم کے اسی طرز مذکور پر کچھ حقوق متعلم یعنی شاگرد وغیرہ کے بیان کرتا ہوں کہ اولاً بعض نصوص اور ثانیاً بعض جزئیات از قبیل واقعات مذکور ہونگے۔

آیتؐ: ادع الی سبیل ربك بالحکمة والموعظة الحسنة وجادلھم بالتی ھی احسن۔

ترجمہ: بلا خدا کے راستہ کی طرف حکمت اور اچھی نصیحت کے ساتھ اور مناظرہ کر اچھا اور نرم طریق سے۔

اس آیت سے نصاً معلوم ہوا **شاگرد کے ساتھ نرمی اور ان کی استعداد کی رعایت کرنی چاہیئے** کہ مستفیدین کے ساتھ اگرچہ وہ طالب نہ ہوں۔ کیونکہ آیت میں مدعوین ایسے ہی لوگ ہیں۔ رعایت ان کے مذاق واستعداد اور

رفق و ملاطفت کی رکھنا چاہیئے اور اگر طالب ہوں جیسے بالمعنی المتعارف طالب علم وغیرہم تو ان کے ساتھ تو رعایات مذکورہ نہایت درجہ ضروری ہیں ان کے ساتھ ابتدائی خطاب میں بھی مثلاً کتاب کی تقریر میں کما ادع میں بھی ابتدائی خطاب مراد ہے۔ اور ان کے سوالات کے جوابوں میں بھی خواہ تحقیقی جواب ہو یا الزامی کہ جادلہم سے یہی مقاولت مراد ہے۔

آیۃ ۱۲ کنتم خیر امتہ اخرجت للناس تأمرون بالمعروف وتنہون عن المنکر الاٰیتہ مع قولہ تعالیٰ السابق ولتکن منکم امۃ یدعون الی الخیر الاٰیتہ۔

ترجمہ تم بہترین امت ہو لوگوں کی ہدایت کے واسطے پیدا کیئے گئے ہو اچھی باتوں کا حکم کرتے ہو اور بری باتوں سے منع کرتے ہو۔ تم میں ایک گروہ ایسا ہونا چاہیئے کہ خیر کی طرف لوگوں کو بلائے۔

"لوگوں کو دینی نفع پہنچانا علماء پر واجب ہے" اس آیت سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے علماء کو لوگوں کے نفع دینی پہنچانے کے لیئے (کما یدل علی النفع الام وعلی تفسیرہ بالامر والنہی) پیدا کیا ہے اور یہ نفع پہنچانا ان پر واجب ہے (کما یدل علیہ صیغۃ الامر) پس اس صورت میں مستفیدین پر اپنا احسان سمجھ کر ان کو بے وقعت سمجھنا اور ان پر حکم چلانے میں حد سے تجاوز کرنا ان پر محض براہ کبر سختی کرنا نہایت نازیبا امر ہے وہ اگر اپنی خواہش سے استفادہ کرتے ہیں تو گویا ادائے واجب میں معلّم کے معین ہیں۔ پس ان کے ساتھ اقل درجہ ایسا معاملہ کرنا چاہیئے۔ جیسا اپنے معین فی الدنیا کے ساتھ معاملہ کیا جاتا ہے اور ان کے ساتھ ایسے طریقے سے پیش آنا چاہیئے جس سے ان کو نفع پہنچے (الذی ھو مقتضی الامر) اور ظاہر ہے کہ ایسی سختی یا بے وقعتی یا بے پروائی کی حالت میں ان کا نفع مفقود ہے۔ یا ناقص ہو جاتا ہے خصوص ان کے سوال کے جواب میں جب وہ سوال تعنت وعناد سے نہ ہو زجر میں شدت کرنا عموم ارشاد خداوندی (و اما السائل فلا تنہر) یعنی سائل کو مت جھڑکیئے کے بھی خلاف ہے یا بدون ان کے کسی مصلحت کے محض اپنی بڑائی اور اس کی برائی ظاہر کرنے کو ان پر اس طرح احسان رکھنا اور اپنے احسان کو جتلانا کہ جس سے ان کی تحقیر یا ان کو اذیت ہو۔ آئندہ ارشاد خداوندی کے خلاف ہے۔

آیت ۱۳ ثم لا یتبعون ما انفقوا منا ولا اذی الاٰیتہ بعد تعمیم تفسیر قولہ۔

ومما رزقناهم ينفقون كما نقله البيضاوى ومما رزقناهم من انوار المعرفة يفيضون۔

(ترجمہ) صدقہ دیکر احسان نہیں جتاتے اور نہ کسی قسم کی تکلیف دیتے ہیں اور جو ہم نے ان کو رزق دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں جیسا کہ نقل کیا اس کو بیضاوی نے یعنی جو ہم نے انوار معرفت ان کو عطا کئے ہیں لوگوں پر ان کا فیضان کرتے ہیں۔ ۱۲

طالب علم کے ساتھ بھلائی کرنے کے متعلق آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی وصیت

حدیث ۱۔ عن ابی سعید الخدری رضی قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان الناس لکم تبع وان رجالا یأتونکم من اقطار الارض یتفقہون فی الدین فاذا اتوکم فاستوصوا بہم خیرا (رواہ الترمذی)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اور لوگ تمہارے تابع ہیں تمہارے پاس دور دراز ملکوں سے لوگ علم دین سیکھنے اور سمجھنے کو آویں گے ان کے بارے میں میری وصیت کے موافق بھلائی سے پیش آنا۔ (ترمذی)

اس حدیث سے صاف معلوم ہوا کہ جو شخص علم دین طلب کرنے کے لئے آوے اس کے حق میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم خیر کی اور حسن معاملہ کی وصیت فرماتے ہیں گو ابھی تحصیل بھی شروع نہیں کی اور بعد تحصیل کے تو اور بھی تعلقات وخصوصیات جو کہ مقتضیات زیادت وتاکید حقوق ہیں زائد ہوں گے۔

پس حقوق اور بھی کما وکیفا کثیر اور قوی ہو جائیں گے اور چونکہ دوسرے نصوص سے صاحب افادہ کو تنگ کرنے کی ممانعت ثابت ہے۔ کما قال تعالیٰ ولا یضار کاتب ولا شہید آیۃ: یعنی لکھنے والے اور گواہ کو تکلیف نہ پہنچانا چاہیئے۔

اس سے یہ بھی مفہوم ہوگیا کہ طلباء کو بھی اپنی حوائج علمیہ وما یتعلق بہا کی درخواست معلمین اور مہتممین سے اسی درجہ تک کرنی چاہیئے کہ ان کو کلفت نہ ہو، یہ ان کے ذمہ واجب نہیں کہ جتنے طلباء آویں سب کے لئے طبق اور سبق کا انتظام ضرور ہی کر دیا کریں۔ البتہ بشرط سہولت اس کا انتظام اور پھر بعد کام شروع کر دینے کے ان کے مصالح علمیہ کی رعایت حسب حدیث ضروری ہے۔

کسی مقام کی غلط تقریر کرنا یا کسی سائل کو غلط مسئلہ بتلانا جائز نہیں

حدیث ۲ عن سمرۃ

بن رضؓ جندب و المغیرۃ بن رضؓ شعبۃ قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم من حدث عنی بحدیث یری انہ کذب فھو احد الکاذبین (رواہ مسلم)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری طرف سے کوئی بات بیان کرے اور وہ جانتا ہو کہ وہ تو جھوٹ ہے وہ جھوٹا ہے (مسلم)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ سبق کی تقریر میں غلط مطلب بتلا دینا یا مستفتی کو غلط مسئلہ بتلا دینا یہ حرام ہے۔ جیسا بعض مدرسین و مفتیین کی عادت ہے کہ طالب علم یا سائل سے اپنا جہل چھپانے کے لئے غلط سلط ہانک دیتے ہیں اور اگر طالب علم قبول نہیں کرتا اور کچھ خدشہ کرتا ہے۔ کبھی مغالطات و تلبیسات سے اور کبھی غضب اور سب و شتم سے اس کو خاموش کر دیتے ہیں۔ اتنا کہنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ یہ مقام ہماری سمجھ میں نہیں آیا پھر سوچیں گے۔ یا یہ کہ دوسرے مدرس سے خود پوچھ لیں یا اس طالب علم ہی کو پوچھنے کی اجازت دیدیں اس سے عار آتی ہے حالانکہ یہ کوئی عار کی بات نہیں۔ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ کون عالم ہوگا۔ آپ نے بہت سے سوالوں پر لا ادری فرما دیا اور جب وحی نازل ہوئی اس وقت بتلا دیا اور واقعی جب احاطہ کل علوم کا خاصہ حق تعالیٰ جل شانہ کا ہے تو بعض چیزوں کا نہ جاننا ممکن کے لوازم سے ہے۔ تو اس لازم کا اگر اقرار کر لیا تو کون سی نئی بات ہوئی بلکہ واقع میں تو غیر معلومات عدد میں معلومات سے زیادہ ہی ہیں۔ قال تعالیٰ وما اوتیتم من العلم الا قلیلا۔

اور تم کو تو بہت تھوڑا علم دیا گیا۔

ایک حکایت میرے ایک ابتدائی کتب کے استاد علیہ الرحمۃ نے اپنی ایک حکایت بیان فرمائی تھی کہ انہوں نے کسی معلم سے فارسی پڑھنے کی درخواست کی انہوں نے کہا کہ بھائی پڑھنے سے پہلے یہ سن لو کہ تم مجھ کو عالم الکل سمجھ کر پڑھنا چاہتے ہو یا عالم البعض اگر شق اول ہے تو بھائی مجھ کو معاف رکھو کیونکہ میں عالم الکل نہیں اور اگر ثانی ہے تو بے شک مجھ میں یہ صفت ہے لیکن اس کے مقتضا سے کبھی یہ بھی ہوگا کہ کسی مضمون کی نسبت یہ کہہ دوں گا کہ مجھ

کو معلوم نہیں تو مجھ کو پریشان مت کرنا اور دوسری جگہ حل کر لینا۔

سبحان اللہ کیسی پاکیزہ بات انہوں نے کہی۔ پس یہی سمجھنا ہر عالم پر ضروری ہے۔

اسی طرح اگر اولاً اپنی غلطی معلوم نہ ہوئی لیکن بعد تقریر کے از خود یا طالب متنبہ کرنے سے اطلاع ہو گئی تو چاہیے کہ معًا اسی تقریر سے اپنا رجوع ظاہر کر دے ورنہ غلط تقریر کرنے میں یا غلطی پر اڑے رہنے میں چند خرابیاں ہیں۔ ایک تو گناہ جیسے حدیث موصوف سے معلوم ہوا، اور یہ شبہ نہ کیا جاوے کہ یہ تو تصرف حدیث کے ساتھ خاص ہے۔ بات یہ ہے کہ جتنے علوم دینیہ ہیں۔ سب حکایت عن الرسول ہیں۔ خواہ لفظاً یا معناً (ومن ثم قیل ان القیاس مظہر لا مثبت)

اور جتنے علوم آلیہ ہیں وہ علوم دینیہ کے تابع ہیں۔ والتابع لہ حکم المتبوع

پس اس طرح سے اس حدیث کا مضمون تمام علوم مقصودہ ومبادی للمقصودہ کو عام ہے۔ پس غلط تقریر یا اس پر اصرار کرنے میں گناہ ہونا ان سب میں عام ہے۔ ایک خرابی یہ ہوئی۔

دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر طالب علم کو معلوم ہو گیا کہ یہ تقریر غلط ہے تب تو طبعًا استاد سے تنفر اور اس کی تحقیر قلب میں پیدا ہو گئی اور اس کے ہوتے ہوئے پھر حقوق استادی کا ادا کرنا سخت دشوار ہے۔ تو یہ فعل استاد کا اخلال بالواجب کا سبب ہوا اور اعانت معصیت معصیت ہے اور اگر طالب علم کو پتہ نہ لگا تو وہ بے چارہ عمر بھر کے لئے جہل میں مبتلا رہا۔ پھر یہی سلسلہ آگے معلوم نہیں کہاں تک چلے گا۔ پھر اس وبال کی کوئی حد ہے۔ ذرا سی عار پر نار کو اختیار کرنا۔ کون عقل یا دین کی بات ہے۔

تیسری بات یہ ہے کہ استاد کے اخلاق اکثر تلمیذ میں سرایت کرتے ہیں۔ یہی ہٹ دھرمی اور سخن پروری کی صفت ذمیمہ اس میں پیدا ہو جاوے گی۔ اور استاد صاحب اس حدیث کے مصداق بنیں گے۔ من سن سنۃ سیئۃ فعلیہ وزرھا ووزر من عمل بھا من بعدہ الحدیث رواہ مسلم، یعنی جو شخص کوئی برا کام جاری کرتا ہے اس کو اس پر بھی گناہ ہو گا اور اس کے بعد جو بھی یہ کام کرے گا اس کا بھی گناہ ہو گا۔

بہرحال گناہ بھی اور شاگرد کے حقوق کی اضاعت بھی۔ گناہ کی تقریر ہو چکی اور اضاعت حقوق ظاہر ہے کہ اس کی خیرخواہی کے خلاف اس کے واجب کا اتلاف اس کے اخلاق کا افساد اس کو جہل میں مبتلا کرنا کہ ایک قسم کا غش اور خیانت ہے چنانچہ ذیل میں خصوص کے ساتھ اس سے تعرض ہے،

بغیر علم کے مسئلہ بتانا جائز نہیں

حدیث ۳۱ عن ابی ھریرۃ رض قال قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم من افتی بغیر علم کان اثمہ علی من افتاہ ومن اشار علی اخیہ بامر یعلم ان الرشد فی غیرہ فقد خانہ (رواہ ابوداؤد)

کسی سائل کو کسی نے بلا علم کے مسئلہ بتلا دیا تو اس کا وبال اس بتانے والے پر ہے۔ اور جس شخص نے اپنے بھائی مسلمان کو مشورہ دیا اور جانتا ہے کہ وہ مشورہ ٹھیک نہیں ہے تو اس نے اس کی خیانت کی۔ (ابوداؤد)

اس حدیث میں غلط مسئلہ بتلانے کا گناہ ہونا اور غلط بات بتلا دینے کا (جس میں دین کی بات بھی آگئی) خیانت ہونا صاف منصوص ہے۔

اگر کوئی بات معلوم نہ ہو تو کہہ دے کہ معلوم نہیں اپنی طرف سے نہ کہے

حدیث ۳۲ عن عبد اللّٰہ رض قال یا ایھا الناس من علم شیئًا فلیقل بہ ومن لم یعلم فلیقل اللّٰہ اعلم فان من العلم ان یقول لما لا یعلم اللّٰہ اعلم قال اللّٰہ تعالیٰ قل ما اسئلکم علیہ من اجر وما انا من المتکلفین متفق علیہ۔

حضرت عبد اللہ بن مسعود رض نے فرمایا کہ اے لوگو جو شخص کسی بات کا علم رکھتا ہو تو اس کو چاہیئے کہ بتا دے اور جو نہ جانتا ہو اس کو چاہیئے کہ کہدے کہ اللہ جاننے والا ہے۔ کیونکہ یہ کہدینا بھی علم کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ اے نبی کہدو کہ میں تم سے کچھ مزدوری نہیں مانگتا اور نہ میں تکلیف کرنے والوں میں سے ہوں (کہ اپنی طرف سے کچھ نہ کچھ کہہ دوں)۔ رواہ البخاری ومسلم۔

اس حدیث میں صریح تاکید ہے کہ جو بات معلوم نہ ہو کہہ دے کہ معلوم نہیں۔ پس تقریر سبق میں بھی اس پر عمل کرنا عالم اور طالب علم دونوں کا حق ہے۔

شاگردوں کے نشاط و شوق باقی رکھنے کی بھی رعایت کرنی چاہیئے

حدیث ۵ عن شفیق قال کان عبد اللہ بن مسعود رض یذکر الناس فی کل خمیس فقال لہ رجل یا ابا عبد الرحمٰن لوددت انک ذکرتنا فی کل یوم قال اما انہ یمنعنی من ذالک انی اکرہ ان املکم وانی اتخولکم بالموعظۃ کما کان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یتخولنا بہا مخافۃ السامۃ علینا متفق علیہ۔

حضرت عبد اللہ ابن مسعود رض ہر جمعرات کو وعظ سنایا کرتے تھے کسی شخص نے عرض کیا کہ حضرت روز وعظ کیجئے۔ تو آپ نے فرمایا کہ مجھے روز وعظ کہنے سے یہ امر مانع ہے کہ میں تم کو ملول نہیں کرنا چاہتا اور تمہاری خبر گیری اور نگہداشت ایسی ہی کرتا ہوں جیسی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، ہماری خبر گیری فرمایا کرتے تھے کہ ہم ملول نہ ہوں (بخاری و مسلم)

اس حدیث سے مستفیدین للعلوم کا ایک حق یہ معلوم ہوا کہ ان کے نشاط و شوق کے باقی رکھنے کو بھی رعایت کرے پس اس میں یہ بھی داخل ہو گیا۔ سبق اتنا نہ پڑھاوے اسی طرح کتابیں اتنی نہ شروع کراوے کہ اکتا جاویں۔ اور اگر وہ اس مقدار کی متحمل بھی نہ ہوں یعنی اس کا مطالعہ اور تکرار و ضبط دشوار ہو تو بدرجہ اولیٰ محل منع ہوگا اسی طرح وقت میں اس کی رعایت کریں کہ ان کی طبیعت تازہ ہو، کھانے کا تقاضا کسل اور اسی طرح نیند کا غلبہ یا اور کسی سبب سے دماغ پریشان نہ ہو جیسے بعض مدرسین طلبہ کو ان امور کے اہمال سے اس قدر زچ کر دیتے ہیں کہ یا تو وہ بھاگ جاتے ہیں یا استعداد حاصل نہیں ہوتی اور وہ اسی میں مست ہیں کہ ہم طلبہ کے ساتھ خوب محنت کرتے ہیں حالانکہ وہ سب محنت اکارت جاتی ہے اسی کی نظیر ہے۔ ارشاد حق تعالیٰ کا یہ مضمون " الذین ضل سعیہم فی الحیٰوۃ الدنیا وہم یحسبون انہم یحسنون صنعا۔ الآیۃ

(ترجمہ) یہ وہ لوگ ہیں جن کی دنیا میں کی کرائی محنت سب گئی گذری ہوئی اور (وہ بوجہ جہل کے) اسی خیال میں ہیں کہ وہ اچھا کام کر رہے ہیں)

اسی طرح ہفتہ میں کم از کم ایک روز کی تعطیل ہونا ضرور ہے۔ بعضے تعطیل میں بھی طالب علموں کی جان مارتے ہیں اور اس کو اپنی بڑی کارگزاری سمجھتے ہیں۔

ع دوستی بے خرد چوں دشمنی است

نااہلوں کا دینی خدمات کا متولی بننا قیامت کی علامت ہے۔

حدیث ۶ ، عن ابی ہریرۃؓ فی حدیث طویل قال النبی صلی اللہ علیہ وسلم اذا وسد الامر الی غیر اھلہ فانتظر الساعۃ (بخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب دینی خدمات نالائقوں اور نااہلوں کے سپرد ہوجاویں تو قیامت کا انتظار کرنا چاہیئے۔ (بخاری)

اس حدیث کے عموم میں یہ بھی داخل ہوگیا کہ اگر کسی طالب علم کا کوئی سبق کسی دوسرے کے سپرد کرے تو اس کا لحاظ رکھے کہ وہ شخص اس کا اہل ہو اگر ناقابل و بد استعداد یا غیر شفیق کو سپرد کرے گا تو شرعاً مذموم ہوگا یہ بھی شاگرد کا ایک حق ہے۔

شاگرد کے تین حقوق

حدیث ۷ عن عبد اللہ ابن عمرؓ قال تخلف عنا النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی سفرۃ سافرناھا فادرکنا وقد ارھقتنا الصلوۃ ونحن نتوضأ فجعلنا نمسح علی ارجلنا فنادی باعلی صوتہ ویل للاعقاب من النار مرتین اوثلاثا (رواہ البخاری)

حضرت عبد اللہ ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کسی سفر میں ہم سے پیچھے رہ گئے آپ ہم سے ایسے وقت آکر ملے کہ نماز کا وقت آگیا تھا اور ہم وضو کر رہے تھے۔ جلدی کی وجہ سے ہم نے پاؤں دھونے میں بہت جلدی کی کہ کچھ سوکھا رہ گیا آپ نے دیکھ کر دو تین بار فرمایا خبردار ہو جاؤ عذاب دوزخ ان ایڑیوں کے لئے ہے جو سوکھی رہ جاویں (بخاری)

اس حدیث سے تین حق شاگردوں کے ثابت ہوتے ہیں ایک تو یہ کہ صرف ان کے تعلیم علوم ہی پر اکتفا نہ کرے بلکہ ان کے اعمال و اخلاق کی بھی حتی الامکان نگرانی رکھے جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بعض لوگوں کے پاؤں کے خشک رہ جانے پر متنبہ فرمایا۔ اور یہ باب بالکل ہی مسدود ہوگیا ہے۔ اساتذہ صرف سبق پڑھا دینے کو ضروری سمجھتے ہیں۔ تعلیم کے ساتھ تربیت کی طرف توجہ نہیں فرماتے اور عملی غلطی پر متنبہ نہ کرنا تو اور بھی غضب ہے کیونکہ اس کا تو انہوں نے بالتصریح التزام کیا ہے جیسا بعض معلمین قرآن کی عادت دیکھی گئی ہے کہ شاگرد پہلو میں بیٹھا ہوا غلط پڑھ رہا ہے اور یہ بہرے گونگے بنے بیٹھے ہیں۔ اور اس سے بدتر یہ ہے کہ بعضے اساتذہ شاگردوں سے ایسے کام لیتے

ہیں کہ ان کے اخلاق اور تباہ ہوتے ہیں تو اگر اصلاح نہ کرے تو فساد تو نہ کرے۔

دوسرے یہ کہ اگر کسی وجہ سے احتمال ہو کہ بدون آواز بلند کئے ہوئے آواز نہ پہنچے گی مثلاً حلقہ درس بڑا ہے یا اور کوئی عارض ہے تو بلند آواز سے تقریر کرنا حق ہے شاگرد کا۔ ورنہ تقریر ہی بیکار رہے دیکھئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کس طرح باآواز بلند فرمایا۔

تیسرے اگر احتمال ہو کہ ایک بار تقریر کرنے سے طلبا نہ سمجھا ہوگا تو دوسری تیسری بار بھی تقریر کردینا مناسب ہے۔ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے دوتین بار فرمایا۔

اور آئندہ حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بھی عادت مستمرہ ہونا معلوم ہوتا ہے۔ حدیث

۸ عن انس رض انہ کان اذا تکلم بکلمۃ اعادھا ثلاثۃ حتی تفھم عنہ (رواہ البخاری)

جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کوئی بات مہتم بالشان فرماتے تھے تو تین مرتبہ فرماتے تھے کہ لوگ خوب سمجھ لیں (بخاری)

یہ حدیث فائدہ ثالثہ مذکورہ حدیث سابق میں نص ہے۔

کبھی کبھی شاگرد سے امتحان بھی لینا چاہیئے

حدیث ۹ عن عبد اللہ ابن عمر رض قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان من الشجر شجرۃ لایسقط ورقھا وانھا مثل المسلم فحدثونی ماھی فوقع الناس فی شجر البوادی، قال عبد اللہ رض وقع فی نفسی انھا النخلۃ فاستحییت ثم قالوا حدثنا ماھی یارسول اللہ قال ھی النخلۃ (رواہ البخاری)

حضرت عبداللہ ابن عمر رض فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مرتبہ فرمایا کہ ایک ایسا درخت ہے کہ وہ پت جھڑ نہیں ہوتا اور مثل مسلم کے ہے۔ بتاؤ وہ کیا ہے۔ سب لوگ جنگل کے درختوں کو سوچنے لگے کہ کون سا درخت اس شان کا ہے۔ میرے دل میں آیا کہ یہ کھجور کا درخت ہے مگر چونکہ میں چھوٹا تھا اس لئے میں نے حیا کی اور چپ رہا پھر لوگوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ارشاد فرمایئے کہ کون سا درخت ہے تو آپ نے فرمایا کھجور کا درخت (بخاری)

اس حدیث سے طلبار کے امتحان لینے کی محمودیت نکلتی ہے جس کے فوائد مشاہد ہیں۔ پس ان فوائد کے اہتمام کے لئے امتحان لینا یہ بھی منجملہ حقوق تلامذہ ہے۔

تعلیم میں شاگرد کی استعداد کا لحاظ رکھنا چاہیئے

حدیث :۔ قال علی حدثوا الناس بما یعرفون اتحبون ان یکذب اللّٰہ ورسولہ (رواہ البخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ لوگوں سے ایسی بات کرو جو وہ سمجھیں کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے رسول کی تکذیب کریں (بخاری)

اس حدیث سے ایک یہ بات معلوم ہوئی کہ طالب علم کی تعلیم میں اس کے فہم و استعداد کا لحاظ رکھے اور اسی کے لحاظ سے ترتیب کتب و مقدار و عدد سبق تجویز کرے جیسا کہ ارشاد حق کونوا ربانیین کی ایک تفسیر امام بخاری نے یہ بھی نقل کی ہے۔ الذی یربی الناس بصغار العلم قبل کبارہ۔ حدیث آئندہ سے بھی مرفوعًا اس کی اصل نکلتی ہے۔

کوئی فن یا کوئی کتاب کسی خاص طالب علم کیلئے مضر ہو تو اس کو اس سے روکنا چاہیئے

حدیث :۔ عن انس رض قال ذکرلی ان النبی صلی اللّٰہ علیہ وسلم قال لمعاذ رض من لقی اللّٰہ لایشرک بہ شیئاً دخل الجنۃ قال الا ابشر بہ الناس قال لا انی اخاف ان یتکلوا (رواہ البخاری)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت معاذ رض سے فرمایا کہ جو شخص مرے اور خدا سے ملے۔ اور وہ خدا کے ساتھ کسی کو شریک نہ سمجھتا ہو تو وہ جنت میں داخل ہوگا۔ حضرت معاذ رض نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ کیا لوگوں کو یہ خوشخبری نہ سناؤں۔ فرمایا کہ مت سناؤ۔ کیونکہ میں خوف کرتا ہوں کہ اس پر تکیہ کرلیں گے۔ (بخاری)

یہ حدیث نص ہے اس میں کہ باوجود کہ یہ مضمون من لقی اللّٰہ الخ کا مقاصد عظیمہ شرعیہ سے تھا مگر بعض لوگوں تک اس کا پہنچنا اس لئے پسند نہیں کیا گیا کہ وہ اس سے متضرر ہوتے پس اسی طرح جو کتاب یا کوئی فن کسی خاص طالب علم کے لئے نامناسب ہو اس کو اس سے روکنا بذمہ معلم لازم ہے اور اس طالب علم کو بھی اس میں اطاعت ضروری ہے۔
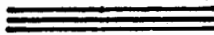
شاگردوں کے ساتھ نرمی اور آسانی کا معاملہ کرنا چاہیئے

حدیث ۱۲۰ عن انس رضہ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال یسروا ولا تعسروا وبشروا ولا تنفروا رواہ البخاری

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ دینی امور میں لوگوں سے آسانی کرو تکلیف میں مت ڈالو خوش خبری سناؤ۔ دین سے نفرت مت دلاؤ (بخاری)

اس حدیث کے عموم سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے ساتھ درس میں بھی تیسیر و عدم تنفیر کی رعایت رکھے۔ تقریر بھی ایسی صاف و سلیس کرے جو ذہن نشین ہو جاوے۔ و مقدار و اعداد سبق میں بھی اس پر زیادہ بار نہ ڈالے اسی طرح ایک حق یہ بھی معلوم ہوا کہ تنبیہ و تادیب میں اتنی سختی نہ کرے کہ شاگرد کو وحشت ہو جاوے اس میں میاں جی لوگ بکثرت مبتلا ہے۔

شاگرد کے لئے اللہ تعالیٰ سے علم نافع کی دعا بھی کرنی چاہیئے

حدیث ۱۲۱ عن ابن عباس رضہ قال ضمنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال اللھم علمہ الکتاب (رواہ البخاری)

حضرت ابن عباس رضہ فرماتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھ کو سینہ سے لگالیا اور یوں فرمایا کہ یا اللہ اس کو قرآن کا علم عطا فرمادے (بخاری)

اس حدیث سے شاگرد کا حق علاوہ تعلیم کے یہ بھی معلوم ہوا کہ اس کے لئے حق تعالیٰ ایک سے دعا بھی کیا کرے کہ اس کو علم نافع عطا ہو۔

شاگرد کی دلجوئی کے متعلق ایک مثال

حدیث ۱۲۲ عن ابن عمر رضہ قال سمعت رسول اللہ صلی اللہ یقول بینما انا نائم اتیت بقدح لبن فشربت حتی انی لاری الری یخرج فی اظفاری ثم اعطیت فضلی عمر بن الخطاب قالوا فما اولت یا رسول اللہ قال العلم (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمر رضہ فرماتے ہیں کہ میں نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا آپ فرماتے تھے کہ خواب میں مجھے ایک پیالہ دودھ کا دیا گیا میں نے خوب سیر ہو کر پیا کہ ناخن تک سیرابی کا اثر محسوس ہوا پھر میں نے بچا ہوا دودھ عمر رضہ کو دیدیا۔ لوگوں نے عرض کیا کہ حضور اس کی تعبیر کیا ہوئی

فرمایا دودھ سے مراد علم ہے (بخاری)

اس حدیث سے دو امر معلوم ہوئے ایک باعتبار صورت لبن کے ایک باعتبار معنی لبن کے
اول یہ کہ شاگرد کو گاہ گاہ اپنے کھانے پینے میں بھی شریک کرلیا کرے کہ اس کا دل بڑھتا ہے۔ اور محبت زائد ہوتی ہے جس قدر اس کو استاد سے محبت ہوگی اسی قدر علم میں برکت ہوگی۔
دوسرا یہ کہ اگر اللہ تعالیٰ کسی کو کوئی باطنی برکت عطا فرماوے تو شاگرد سے اس کو دریغ نہ کرے۔ غرض غذا ظاہری و باطنی کا کچھ حصہ اس کو بھی دیدے۔

اگر کوئی بات غصہ کی صورت میں کہنے سے شاگرد کیلئے بہتر ہو تو اس صورت میں کہے

حدیث ۱۵

عن ابی مسعود الانصاری رضؓ قال قال رجل یارسول اللہ لا اکاد ادرک الصلوٰۃ مما یطول بنا فلان فما رأیت النبی صلی اللہ علیہ وسلم فی موعظۃ اشد غضبا من یومئذ فقال یا ایھا الناس انکم منفرون فمن صلی بالناس فلیخفف فان فیھم المریض والضعیف وذا الحاجۃ (رواہ البخاری)

حضرت ابو مسعود انصاری رضؓ نے کہا کہ ایک شخص نے عرض کیا یارسول اللہ فلاں شخص نماز طول کرنے کی وجہ سے قریب ہے کہ میں نہ پا سکوں (یعنی بددل ہوکر جماعت چھوڑ دوں) تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اس قدر برافروختہ ہوئے کہ ایسے کبھی میں نے برافروختہ ہوتے آپ کو نہ دیکھا۔ پھر آپ نے فرمایا کہ تم لوگوں کو نفرت دلاتے ہو۔ جو آدمی نماز میں امامت کرے اس کو چاہئیے کہ (قرأت) تخفیف کرے کیونکہ مریض اور ضعیف اور حاجت مند سب قسم کے لوگ نماز میں ہوتے ہیں (بخاری)

اس حدیث سے دو امر متعلق طالب علموں کے ثابت ہوئے۔ ایک یہ کہ اگر کچھ اسباق کسی اپنے شاگرد یا ماتحت مدرس کے سپرد کئے جاویں اور وہ طالب علم اس کی شکایت کرے تو شکایت سننا چاہئیے اور تحقیق کے بعد اس کا انتظام کرنا چاہئیے یہ نہیں کہ محض اس کے طالب علم ہونے کے سبب اس کو اور اس کی بات کو محض لاشئے سمجھ کر نظرانداز کر دیا جاوے۔
دوسرے یہ کہ اگر کسی طالب علم سے کوئی امر نامناسب صادر ہو اور کسی طور سے معلوم ہوجاوے

یہ غضبناک ہو کر کہنے سے زیادہ نفع ہوگا۔ تو وہاں اس کی مصلحت کے واسطے غصہ ہی کرنا افضل ہے۔ جس سے اس کی اصلاح کامل ہو جاوے۔

اگر مصلحت ہو تو تقسیم اوقات اور جماعت بندی کی جا سکتی ہے

حدیث ۱۶۲ عن ابی سعید الخدری رض

قال قال النساء للنبی صلی اللہ علیہ وسلم غلبنا... الرجال فاجعل لنا یومًا من نفسک فوعدھن یومًا ولقیھن فیہ فوعظھن وامرھن الحدیث (رواہ البخاری)

حضرت ابوسعید خدری رض سے روایت ہے کہ عورتوں نے عرض کیا یا رسول اللہ ہم پر مرد غالب ہو گئے کہ آپ کا وعظ سننے کا موقع ہم کو نہیں ملتا۔ ہمارا بھی ایک دن مقرر کر دیجئے۔ آپ نے ان کے لئے وعظ و نصیحت اور احکام الٰہی سنانے کا ایک دن مقرر فرمایا (بخاری)

اس حدیث سے تعیین و تقسیم اوقات و جماعت بندی طلبا کا مصلحت ہونا معلوم ہوتا ہے۔ جن میں سے ایک عظیم مصلحت یہی ہے کہ ہر ایک کے لئے جدا سبق مناسب ہے۔ تو سب ایک میں کیسے مجتمع ہو سکتے ہیں۔ چنانچہ مورد حدیث میں ایک مصلحت یہ بھی تھی کہ بعض احکام خاص عورتوں ہی کے مناسب ہوتے ہیں۔ وہ مستقل خطاب میں اچھی طرح مفہوم اور اوقع فی النفس ہوتے ہیں

اگر استاد کو کسی ایک بات پر غصہ آجائے تو دوسری بات پر اس کا اثر نہ رہنا چاہئے۔

حدیث ۱۶۳۔ عن زید بن خالد الجہنی رض فی حدیث طویل بعد السوال عن لقطۃ الابل وغضبہ صلی اللہ علیہ وسلم قال فضالۃ الغنم قال (صلی اللہ علیہ وسلم) لک ولاخیک او للذئب۔ (رواہ البخاری)

حضرت زید بن خالد جہنی رض سے ایک طویل حدیث میں اونٹ کے لقطہ کے سوال پر آپ غصہ ہونے کے بعد یہ الفاظ بھی مذکور ہیں کہ سائل نے عرض کیا کہ کھوئی ہوئی بکری کا کیا حکم ہے تو نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ وہ بکری تیرے لئے ہے یا تیرے بھائی کے لئے یا بھیڑیا کے لئے (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر کسی طالب علم پر کسی بیڈھنگے سوال پر غصہ کیا جاوے اور اس

کے بعد پھر وہ کوئی معقول سوال کرے تو اس کے جواب میں پہلے غصے کا اثر نہ آنا چاہیئے اور اس سے زیادہ اثر نہ رکھنے کا محل وہ ہے کہ جب دوسرا طالب علم کوئی بات پوچھنے لگے۔ وہاں تو بدرجہ اولیٰ پہلا اثر نہ آنے پاوے۔ بعض جھلے مزاج کے استاد ایک پر خفا ہوئے تو بس اب ختم درس تک سب ہی پر برستے رہیں گے۔

حدیث ۳۱، ان عائشہ رض زوج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کانت لاتسمع شیئاً لاتعرفہ الا راجعت فیہ حتی تعرفہ وان النبی صلی اللہ علیہ وسلم قال من حوسب عذب قالت عائشہؓ فقلت اولیس یقول اللہ عزوجل فسوف یحاسب حسابا یسیراً قالت فقال انما ذالک العرض ولکن من نوقش الحساب یھلک (رواہ البخاری)

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا جب جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ایسی باتیں سنتی تھیں کہ جو ان کو معلوم نہ ہو تو برابر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھ گچھ کرتی تھیں یہاں تک کہ سمجھ لیتی تھیں۔ ایک مرتبہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص حساب میں گرفتار رہا وہ عذاب میں مبتلا ہوا۔ تو حضرت عائشہ رض نے عرض کیا کہ کیا اللہ تعالیٰ نے یوں نہیں فرمایا کہ حساب آسان کیا جائے گا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ پیشی ہے ورنہ جس سے مناقشہ کیا گیا حساب میں وہ ہلاک ہوگیا (بخاری)

اس حدیث سے ثابت ہوا کہ اگر استاد کی تقریر میں کوئی شبہ رہے اور طالب علم اس کو پوچھنے لگے تو نازک مزاج سے ناخوش نہ ہو البتہ اگر فضول سوال ہو تو ناخوشی کا اظہار بھی جائز ہے۔ جیسا کہ اوپر حدیث میں لفظ ابل کے سوال پر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا برہم ہونا مذکور ہے۔

اگر طالب علم کے فہم یا حفظ کی کوئی تدبیر معلوم ہو تو کرنی چاہیئے

حدیث ۱۱ عن ابی ھریرۃ رض قال قلت یارسول اللہ انی اسمع منک حدیثاً کثیراً انساہ قال ابسط ردائک فبسطتہ فغرف بیدیہ ثم قال ضم فضممتہ فما نسیت شیئاً بعد (رواہ البخاری)

(ترجمہ) حضرت ابوہریرہ نے عرض کیا کہ یارسول اللہ میں آپ سے بہت سی حدیثیں سنتا ہوں مگر بھول جاتا ہوں آپ نے فرمایا کہ اپنی چادر پھیلا۔ میں نے چادر پھیلا دی تو آپ نے اپنے دونوں ہاتھ

اس پر لگا دیئے اور فرمایا کہ اس چادر کو اپنے سینہ سے لگالے میں نے اس کو اپنے سینہ سے لگا لیا تو اس کی برکت سے پھر کچھ نہ بھولا (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ طالب علم کے فہم یا حفظ کی کوئی تدبیر اگر اپنے علم وقدرت میں ہو تو مقتضائے شفقت یہ ہے کہ اس کے مشورہ اور سعی کا اہتمام فرماوے۔

حدیث ۲۰ — شاگرد کے سوال کے جواب میں اگر ضروری اور مفید باتوں کا اضافہ ہو سکے تو کرے

عن ابن عمرؓ عن النبی صلی اللہ علیہ وسلم ان رجلاً سأله ما یلبس المحرم فقال لا یلبس القمیص والعمامة ولا السراویل ولا البرنس ولا ثوباً مسه الورس او الزعفران فان لم یجد النعلین فلیلبس الخفین ولیقطعهما حتی یکونا تحت الکعبین (رواہ البخاری)

حضرت ابن عمرؓ سے روایت ہے کہ ایک شخص نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ محرم میں کیا کپڑا پہنے، فرمایا کہ کرتہ اور عمامہ اور پاجامہ اور باران کوٹ اور ورس وزعفران کا رنگا ہوا نہ پہنے جوتہ نہ ہو تو موزے پہنے اور ان کو جوتہ کی طرح کاٹ لے کہ ٹخنہ سے نیچے رہیں (بخاری فی باب من اجاب السائل باکثر مما سالہ)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اگر طالب علم کوئی بات پوچھے مگر کوئی اور ضروری بات پوچھنے سے رہ جاوے تو شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ صرف اس کے سوال کے جواب پر اکتفا نہ کرے بلکہ وہ دوسری بات از خود بتلادے۔

یہاں تک یہ بیس حدیثیں اس باب میں ہوئیں اور اتفاق سے ان حدیثوں کا عدد حقوق معلم متعلقہ حدیثوں سے مضاعف بلا قصد ہو گیا۔ جس میں ایک قدرتی نکتہ خیال میں آیا کہ بندہ نے تمہید میں عرض کیا تھا کہ اضاعت حقوق تلامذہ میں زیادہ ابتلاء ہے تو قدرتی انتظام اس کی اصلاح کا یہ ہوا کہ اس کے دلائل کا عدد بھی مضاعف ہو گیا۔ کیونکہ تکثیر دلائل سے تنبیہ کا زیادہ ہونا امر طبعی ہے اور یہ محض نکتہ ہے پس اس پر شبہ نہ کیا جاوے کہ پھر حقوق شرکاء تعلم کے دلائل میں اس سے بھی تضاعف ہونا چاہیئے۔ سو اول تو یہ نکتہ ہے اس کا اطراد ضروری نہیں دوسرے جتنے تعلقات استاد وشاگرد کے قوی ہیں اتنی قوت اس حق اخیر کو ہے بھی نہیں۔ تو حق اقوی

زیادہ احق ہے زیادت تنبیہ کا اور ہرچند کہ بعد سوق احادیث مثل باب اول یعنی بیان حقوق معلم یہاں بھی واقعات جزئیہ کے طرز پر کچھ مضمون ہونا چاہیے تھا چنانچہ اس باب ثانی کے اول میں اس کا وعدہ بھی ہے اور اس وقت ارادہ بھی تھا لیکن اتفاق سے جو جو کچھ اس کے ضمن میں لکھتا وہ بذیل احادیث مذکورہ مذکور ہو چکا اس لئے اس باب ثانی کو ختم کر کے اب باب ثالث یعنی حقوق شرکاء فی التعلیم کے متعلق بقدر ضرورت عرض کرتا ہوں اور عجب نہیں کہ اس میں بھی سوق دلائل اور اس کے ضمن میں واقعات کا آجانا کافی ہو جاوے۔ (والدلائل ھذا)

"ساتھیوں کے حقوق"

آیت ۱۔ قال اللہ تعالیٰ واعبدوا اللہ (الیٰ قولہ) والصاحب بالجنب الآیۃ
عبادت کرو اللہ کی اور اس کے ساتھ کسی کو شریک نہ کرو اور ماں باپ کے ساتھ احسان کرو اور اپنے قرابتیوں اور یتیموں اور فقیروں اور قرابتی ہمسایہ اور راجنبی ہمسایہ اور جو تمہارا ہم صحبت پاس بیٹھنے والا ہو ان سب کے ساتھ احسان کرو۔

اس آیت سے شرکاء تعلّم کا حق دو طرح ثابت ہوتا ہے۔ ایک اس لفظ سے والجار الجنب اور دوسرا اس لفظ سے والصاحب بالجنب، کیونکہ اس کا جار ہونا بھی ظاہر ہے اور صاحب بالجنب ہونا بھی ظاہر ہے۔ چنانچہ مفسرین نے شریک فی التعلّم کے ساتھ اس کی تفسیر بھی کی ہے

ہمسایہ دینی بھائی ہے لہٰذا اس سے بھائیوں جیسا معاملہ کرنا چاہیئے

آیت ۲۔ واعتصموا بحبل اللہ جمیعًا ولا تفرقوا واذکروا نعمت اللہ علیکم اذ کنتم اعداءً فالف بین قلوبکم فاصبحتم بنعمتہ اخوانا الآیۃ۔

اللہ تعالیٰ کی رسی کو اکٹھے ہو کر مضبوط پکڑ لو اور متفرق مت ہوا ور یاد کرو اللہ تعالیٰ کی نعمت کو جو تم پر ہے جب تم آپس میں دشمن تھے پھر اللہ تعالیٰ نے تمہارے دلوں میں الفت ڈال دی اور تم اس کی نعمت سے بھائی ہو گئے اور تم دوزخ کے کنارے پر تھے تم کو اللہ تعالیٰ

نے اس سے بچایا۔ الخ

ظاہر ہے کہ تعلّم علوم دینیہ اعتصام بحبل اللہ ہے۔ اور یہاں ایسی جماعت صحابہ کو اخوان فرمارہے ہیں کہ وہ معتصم بحبل اللہ اور تعلیم دین میں شریک تھے جب یہ اعتصام اور شرکت مقتضی ہوگئی اخوۃ کو پس جو حقوق اخوان کے ہوں گے وہ اس تعلق میں بھی قابل رعایت ہوں گے۔

ساتھیوں کے ساتھ رعایت کرنے کا حکم

آیت ۲۰ یاایھا الذین آمنوا اذا قیل لکم تفسحوا فی المجالس فافسحوا یفسح اللہ لکم واذا قیل انشزوا۔ الآیۃ

(ترجمہ) جب کہا جاوے تم کو کشادگی کردو مجلس میں تو فوراً کشادگی کردو اللہ تعالیٰ تمہارے لئے کشادگی کردے گا۔ (یعنی دنیا و آخرت میں) اور جب کہا جاوے تم کو اٹھ کھڑے ہو تو اٹھ کھڑے ہو درجے بلند کردے گا۔ اللہ تعالیٰ ان لوگوں کے جو تم میں سے ایمان لائے اور ان لوگوں کے جن کو علم دیا گیا اور اللہ تعالیٰ تمہارے کاموں سے خبردار ہے۔

اس آیت سے معلوم ہوا کہ شرکار تعلم کو بیٹھنے کی جگہ دینے کے لئے اہتمام کرنا چاہئے جو امکان میں ہو۔

اگر کسی عذر کی بناء پر کوئی ساتھی سبق میں نہ آسکے تو دوسرے کو چاہیئے کہ ناغہ شدہ سبق اس کو تکرار کردے

حدیث ۱۰۔ عن عمر رضہ قال کنت انا وجارلی من الانصار فی بنی امیۃ بن زید وھی من عوالی المدینۃ وکنا نتناوب النزول علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ینزل یوما وانزل یوما فاذا نزلت جئت بخبر ذالک الیوم من الوحی وغیرہ واذا نزل فعل مثل ذالک (رواہ البخاری)

حضرت عمر رضہ فرماتے ہیں کہ میں اور ایک شخص میرا پڑوسی انصاری عوالی مدینہ میں کچھ فاصلہ پر رہا کرتے تھے اور باری باری جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا کرتے تھے ایک دن میں اور ایک دن وہ جس دن میں جاتا تو جو سن کر آتا اس سے بیان کردیتا۔ اور

جس دن وہ جاتا تو جو سن کر آتا مجھ سے بیان کر دیتا (بخاری)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اپنا شریک فی التعلم اگر کسی سبق میں حاضر نہ ہو تو ناغہ شدہ سبق کا اس کو تکرار کر دیا جاوے اور یہ اس کا حق ہے اور یہاں سے مدارس میں باری باری پڑھنے کی بھی اصل نکلتی ہے۔

حدیث ۲۷ - عن ابی شریح فی حدیث طویل قال قال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ولیبلغ الشاھد الغائب (رواہ البخاری)

حضرت ابو شریح رض سے ایک طویل حدیث میں روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کچھ احکام بیان فرمائے اور بعد میں فرمایا کہ جو لوگ حاضر ہیں اور وعظ سنا ہے وہ غائبوں کو پہنچا دیں (بخاری)

اس حدیث سے بھی مثل حدیث سابق حق بالا ثابت ہوتا ہے۔

مجلس میں بعد میں آنے والوں کے متعلق نصیحت

حدیث ۲۸ عن ابی واقد اللیثی رض ان رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بینما ھو جالس فی المسجد والناس معہ اذ اقبل ثلثۃ نفر فاقبل اثنان الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وذھب واحد قال فوقفا علی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فاما احدھما فرای فرجۃ فی الحلقۃ فجلس فیھا واما الآخر فجلس خلفھم واما الثالث فادبر ذاھبا فلما فرغ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم قال الا اخبرکم عن النفر الثلاثۃ اما احدھما فاوی الی اللہ واما الآخر فاستحی فاستحی اللہ منہ واما الآخر فاعرض فاعرض اللہ عنہ (رواہ البخاری)

حضرت ابو واقد لیثی رض سے روایت ہے کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مع کچھ آدمیوں کے مسجد میں تشریف فرما تھے کہ ناگاہ تین آدمی آئے دو تو مجلس میں بیٹھ گئے۔ ایک کنارہ پر سب کے پیچھے اور ایک مجلس میں کشادگی پا کر اندر بیٹھ گیا اور تیسرا چلا گیا جب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم فارغ ہوئے تو فرمایا کہ کیا ان تین شخصوں کے حال کی اطلاع نہ دوں ایک شخص نے تو اللہ کی طرف ٹھکانہ ڈھونڈا اللہ تعالیٰ نے اس کو ٹھکانہ دیدیا۔ ایک نے شرم کی اور کنارہ پر بیٹھ گیا۔ اللہ نے اس سے شرم کی اور تیسرے نے اللہ سے اعراض کیا تو اللہ نے بھی اس سے اعراض کیا (رواہ البخاری)

اس حدیث سے شرکاء مجلس علم کا یہ حق معلوم ہوا کہ بعد میں آنے والے کو چاہیئے کہ دیکھ لے کہ حلقہ میں گنجائش ہے یا نہیں اگر گنجائش ہو تو برابر میں بیٹھ جانا مضائقہ نہیں ورنہ لوگوں کو پریشان نہ کرے ان کے پیچھے بیٹھ جاوے اور یہ بھی معلوم ہوا کہ پیچھے بیٹھنے سے عار کرنا سبب ہے اعراض حق تعالیٰ کا۔ (بخاری)

اگر کوئی ساتھی دیر سے آوے تو اس کو جگہ دینا چاہیئے

حدیث ۸۷۔ عن واثلة بن الخطاب قال دخل رجل الی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وھو فی المسجد قاعد فتزحزح له رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم ان فقال الرجل یا رسول اللہ ان فی المکان لسعة وقال النبی صلی اللہ علیہ وسلم للمسلم لحقا اذا راہ اخوہ ان یتزحزح له (رواہ البیہقی فی شعب الایمان)

حضرت واثلہ بن خطاب سے روایت ہے کہ ایک شخص جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا آپ مسجد میں تشریف فرما تھے آپ اس کے لئے ذرا سرکے کہ جگہ فراغ ہو جائے تو اس نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ جگہ وسیع ہے تو آپ نے فرمایا کہ مسلمان کا مسلمان پر حق ہے کہ جب اس کو دیکھے تو اس کے لئے کچھ ہلے اور جنبش کرے (شعب الایمان للبیہقی)

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ شریک فی التعلم کا بدرجہ اولیٰ یہ حق ہے کہ اس کے آنے کے وقت فوراً اس کو بیٹھنے کی جگہ دے بعض طلباء اس میں بہت مروتی کرتے ہیں۔

حدیث ۸۸۔ عن علی رضؓ بن ابی طالب قال کنت رجلاً مذاءً فامرت المقداد ان یسال النبی صلی اللہ علیہ وسلم فسئاله فقال فیه الوضوء (رواہ البخاری)

حضرت علی کرم اللہ وجہہ فرماتے ہیں کہ مجھ کو مذی بہت آتی تھی (اس کا مسئلہ پوچھنا تھا خود) تو (یہ بسبب شرم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا نہیں) حضرت مقداد رضؓ سے کہا کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھو۔ حضرت مقداد رضؓ نے پوچھا تو جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مذی نکلنے سے وضوء آتا ہے (یعنی غسل نہیں آتا) بخاری)

اس حدیث سے یہ حق معلوم ہوا کہ اگر کوئی اپنا ہم سبق استاد سے کوئی بات پوچھتا ہوا شرماوے اور اس سے پوچھنے کی درخواست کرے تو خود غرضی کو چھوڑ کر پوچھ لے البتہ اگر نامعقول سوال ہو تو عذر کر دے یا استاد کسی مصلحت سے کہے کہ جس کا سوال ہے وہ خود کرے تو اس وقت اسی

پر عمل کرے یہ تو چند نصوص قناعت اجمالیہ طالب کے لئے اس باب میں نقل کر دیئے گئے ہیں باقی اس کی تفصیل و تکمیل کے لئے حضرات صحابہ رض کا طرز عمل باب معاشرت میں دیکھ لینا کافی ہے۔ اب تو ادائے حقوق تو در کنار بعضے سلسلوں میں تو مصرع ۔

مرا بخیر تو امید نیست بد مرسان

پر بھی عمل نہیں رہا بلکہ استاد بھائیوں اور پیر بھائیوں میں باہم تحاسد و تباغض اور تنافر و تزاحم اغراض میں اور استاد یا پیر سے ایک دوسرے کی چغلی اور غیبت اور دوسروں کے سامنے تحقیر و تنقیص کرتے ہیں الحمد للہ کہ حق تعالیٰ نے ہمارے سلسلہ کو ہمارے بزرگوں کی برکت سے اس بلا سے تو بہت کچھ محفوظ رکھا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیشہ کے لئے محفوظ رکھے۔

اب ان ابواب ثلاثہ کو ختم کرتا ہوں جس میں بفضل اللہ تعالیٰ دس آیتیں اور پینتیس ۳۵ حدیثیں یعنی سب پینتالیس ۴۵ نصوص ہیں۔ اگرچہ اس سے زیادہ نصوص ذکر نہیں کی گئیں محض نمونہ بتلانا مقصود تھا جو کہ ایک بڑے عدد سے معدود ہونے کے سبب اس غرض کے لئے کافی ہو گیا کہ یہ حقوق بھی منصوص ہیں یہاں ان ابواب کے مناسب ایک باب رابع اور بھی تھا یعنی خود علم کے حقوق جو بذمہ اہل علم ہیں یا بذمہ غیر اہل علم ہیں اور گویہ مناسبت بدرجہ جزئیت تو نہیں کیونکہ ان ابواب کے مقسم میں خاص معلم و متعلم و شرکا تعلم مضاف الیہ حقوق کے واقع ہوتے ہیں لیکن بدرجۂ تعلق ضرور ہے اور یہ تعلق مقتضی ہو سکتا تھا کہ اس کا بھی یہاں ذکر ہوتا گو تبعاً سہی۔ لیکن اتفاق سے اس کے قبل احقر اس مبحث خاص میں نہایت مفصل مضمون بشکل ایک رسالہ جس کا نام حقوق العلم ہے۔ لکھ چکا ہے۔ اور وہ چھپ بھی گیا ہے اس لئے وہ مستغنی عنہ ہو گیا۔ اب آخر میں بطور تذنیب کے بعض جزئیات متعلقہ مقام کی تنبیہ میں لکھ کر فارغ ہوتا ہوں۔

تذنیب = (تنبیہ اول) ہر چند کہ مفہوم معلم کا استاد بالمعنی متعارف اور پیر اور واعظ اور مصنف یعنی ہر صاحب افادہ دینیہ کو جب کہ کسی کو استفادہ ہو سب کو عام ہے لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ سب حقوق میں متساوی نہیں ہیں۔ ان سب میں استاد بالمعنی المعروف کا حق زیادہ ہے۔ دو وجہ سے۔ ایک تو یہ کہ استاد جس قدر مشقت افادہ تلامذہ کے لئے برداشت کرتا ہے۔ اس قدر دوسرا اہل افادہ نہیں کرتے۔ بعض طرق افادہ میں تو چنداں مشقت بھی

نہیں۔ اور بعض میں گو مشقت ہے مگر وہ اس مستفید کے لئے برداشت نہیں کرتا۔ اور نص قطعی ووصینا الانسان بوالدیہ حملتہ امہ کرھا ووضعتہ کرھا سے مشقت سے حق کا عظیم ہونا ثابت ہوتا ہے۔ یہ وجہ تو تمام مفضل علیہم یعنی پیر و واعظ و مصنف کو عام ہے۔

اور دوسری وجہ جو صرف بعد میں متحقق ہے یہ ہے کہ شاگرد نے استاد کی تابعیت کا التزام کیا ہے اور التزام ایک وعدہ ہے اور وفاء عہد لازم ہے۔ عام لوگوں کو اس میں یہ غلطی واقع ہو رہی ہے کہ پیر کی تعظیم و خدمت و اطاعت میں حدود شرعیہ سے بھی تجاوز کر جاتے ہیں اور استاد کے حقوق ادا کرنے میں حد شرعی کے قریب بھی نہیں پہنچتے۔ وھذا ھذا الا تغییر للمشروع۔

(تنبیہ ثانی) آیا استاد و پیر کا حق زیادہ ہے یا باپ کا، اس میں بھی عام طور پر لوگ اشتباہ والتباس میں مبتلا ہو کر یہ سمجھتے ہیں کہ پیر اور استاد روحانی مربی ہے اور باپ جسمانی مربی ہے۔ اور روحانی مربی بڑھا ہوا ہے جسمانی مربی سے۔ اس دعوے کی غلطی اجمالاً تو اسی سے سمجھ لینا کافی ہے کہ نصوص میں جس شد و مد سے باپ کے حقوق بتلائے گئے ہیں استاد و پیر کے نہیں بتلائے گئے۔ اور تفصیل یہ ہے کہ اگر ان لوگوں کے اوامر میں کچھ تعارض نہ ہو تب تو تحقیق تقدیم حق کی ضرورت ہی نہیں اور اگر تعارض ہو تو دیکھنا چاہیئے کہ ان میں سے کوئی امر شرعاً واجب ہے یا نہیں اگر واجب ہے تو وہ مقدم ہے خواہ اس کا باپ آمر ہو یا استاد یا پیر ہو اور اگر واجب نہیں دونوں طرف مباح ہے بس یہ محل بحث ہے اور اس میں نصوص سے باپ کا حق مقدم معلوم ہوتا ہے۔ کما ھو ظاھر

رہا جواب اس دلیل کا سو اگر صغریٰ مان بھی لیا جاوے اس طرح سے کہ کوئی باپ ایسا ہو جس نے روحانی تربیت بالکل نہ کی ہو صرف کھلایا ہی پلایا ہو تب بھی کبریٰ باعتبار اس کے مراد کے محتاج دلیل ہے اور اس کی کوئی دلیل نہیں۔ پس اگرچہ مربی روحانی درجہ میں افضل ہو مربی جسمانی سے، لیکن جو اس سے مقصود ہے کہ مربی روحانی کا حق اور اطاعت زیادہ ہے مربی جسمانی سے اس کے لئے دلیل کا مطالبہ کیا جاوے گا۔ اور اگر اس کو مان بھی لیا جاوے تب بھی مقصود مستدل کا حاصل نہیں، کیونکہ استاد اور پیر سے زیادہ مربی روحانی رسول اللہ صلی اللہ

علیہ وسلم ہیں اور حق تعالیٰ تو جسم اور روح دونوں کے مربی ہیں اور خدا اور رسول نے باپ کا حق زائد کیا ہے۔ پس اس کی اطاعت میں بھی ایک بڑے مربی روحانی کی تقدیم حق ہے۔ ایک چھوٹے مربی روحانی پر خوب سمجھ لو۔

(تنبیہ ثالث) آیا معقول اور فارسی اور حساب کے استاد بھی ان حقوق مذکورہ میں شریک ہیں یا نہیں۔ اور اسی طرح کافر استاد بھی۔ اس میں قواعد سے یہ تفصیل معلوم ہوتی ہے کہ ان میں جو چیزیں مضر ہیں ان کا استاد تو خود مضل اور مضر ہے۔ اور استاد کا حق تھا بوجہ مفید اور محسن ہونے کے، اور جو چیزیں مضر نہیں ان میں یہ تفصیل ہے کہ اگر علوم دینیہ میں نافع و معین ہیں تب تو چونکہ مقدمہ بحکم مقصود ہوتا ہے اس لئے ایسے اساتذہ حقوق مذکورہ کے مستحق ہوں گے۔ گو درجہ استاد المقاصد میں نہ سہی جس طرح اقارب کے حقوق میں قوت قرابت کے تفاوت سے حقوق میں تفاوت ہو جاتا ہے۔ اور اگر نہ مضر ہیں اور نہ مفید تب بھی ایک دنیوی احسان ہے اور خود دنیوی احسان پر بھی شکر گذاری نصوص عامہ سے ثابت ہے اس لئے اس کا بھی حق ثابت ہوگا۔ گو دینی احسان کی برابر نہ سہی۔

اب یہ دعا کر کے قلم کو راحت دیتا ہوں کہ حق تعالیٰ ہم طالب علموں کو ان حقوق کے ادا کی توفیق دے اور بوجہ اس کے کہ مضمون بعنوان سہل لکھا ہے۔ تسہیل جدید کی احتیاج نہیں سمجھی گئی۔ البتہ احادیث کا ترجمہ جہاں رہ گیا ہے اگر حضرات مہتممین اشاعت حاشیہ میں ثبت فرمادیں ناظرین کی قناعت اور میری منت کا سبب ہوگا۔ الحمد للہ حصہ اول ختم ہوا۔

مسلمانوں کی زندگی کے ہر شعبے میں پھیلی ہوئی کوتاہیوں کی نشان دہی نیز
عبادات، نکاح وطلاق، حقوق العباد اور دیگر معاشرتی معاملات سے متعلق
معاشرے میں پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کا شریعت کی روشنی میں حکیمانہ علاج

حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ

تسہیل وتزیین

صوفی محمد اقبال قریشی
ناظم ادارہ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد

مولانا حسین احمد نجیب
رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

حرفِ آغاز

اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفٰى وَسَلَامٌ عَلٰى عِبَادِهِ الَّذِيْنَ اصْطَفٰى ،

حکیم الامت مجدد الملت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کو اللہ تعالیٰ نے اس صدی میں اپنے دین کی نشر و اشاعت کے لئے منتخب فرمایا تھا، آپ نے مختلف موضوعات پر تقریباً ایک ہزار تصانیف کا دہ بیش بہا ذخیرہ چھوڑا ہے جو انشاء اللہ رہتی دنیا تک مسلمانوں کی رہنمائی کرے گا، ان تصانیف میں حضرتؒ نے اپنے زمانہ کی بیشتر ضروریات سے متعلق بڑی نادر تحقیقات و ہدایات جمع فرمادی ہیں، اور شاید ہی عہدِ حاضر کی ضرورت کا کوئی موضوع ایسا ہو جس پر آپ کی تصانیف یا مواعظ و ملفوظات میں کم از کم اصولی ہدایات موجود نہ ہوں،

حضرتؒ کے مجددانہ کارناموں میں سے ایک اہم کارنامہ زیرِ نظر کتاب یعنی "اُصلاحِ انقلابِ امت" ہے، اس کتاب میں حضرتؒ نے اُن تمام خرابیوں اور بیماریوں کا انتہائی باریک بینی کے ساتھ جائزہ لیا ہے جو ہماری زندگی کے ہر شعبہ میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت کے سبب سرایت کر گئی ہیں اور پھر اُن کا علاج بھی تجویز فرمایا ہے، دراصل یہ ایک سلسلۂ مضامین ہے جو حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ماہنامہ القاسم دیوبند کے لئے تحریر فرمایا تھا، اور اس میں کئی سال تک قسط وار چھپتا رہا، بعد میں اسے کتابی صورت بھی دیدی گئی،

عرصہ سے احقر کی خواہش تھی کہ یہ کتاب دوبارہ شائع ہو کر افادۂ عام کا سبب بنے، لیکن چونکہ اس کتاب سے استفادہ کو آسان بنانے کے لئے اس پر کچھ کام کی ضرورت تھی، اس لئے اشاعت ٹلتی رہی، بالآخر کتاب کے پہلے حصہ پر برادر عزیز مولوی محمد علی صاحب سلمہٗ نے عنوانات وغیرہ لگا کر اسے مکمل کر دیا، چنانچہ "ادارۃ المعارف" سے یہ پہلا حصہ جو عبادات سے متعلق تھا عرصہ ہوا شائع ہو چکا ہے؛

دوسرا حصّہ احقر کی نظر میں بیحد اہم تھا، اس لئے کہ وہ زیادہ تر اُن احکام پر مشتمل ہے جو نکاح وطلاق اور گھریلو زندگی کے دوسرے اہم مسائل سے متعلق ہیں، اور جن کو ہمارے معاشرے نے دین سے بالکل خارج تصوّر کر رکھا ہے، لیکن مولوی محمد علی صاحب اس دوسرے حصّہ پر کام کرنے سے معذور ہوگئے اس لئے اس کی اشاعت میں پھر تاخیر ہوگئی، بالآخر ہمارے محبِّ محترم جناب صوفی محمد اقبال قریشی صاحب نے یہ کام اپنے ذمّہ لیا، اس پر عنوانات لگائے، اور مشکل الفاظ کی تشریح فرمائی، اس کے بعد برادرِ عزیز مولانا حسین احمد صاحب نجیبؔ رفیق دار التصنیف دار العلوم کراچی نے اس پر محنت سے نظرِ ثانی کی، اور اس کی تسہیل وتزیین میں مفید اضافے فرمائے، اب یہ کتاب آپ کے سامنے ہے،

اس کتاب میں حضرت تھانوی قدس سرہٗ نے ان خرابیوں کا انتہائی بالغ نظری کے ساتھ حکیمانہ جائزہ لیا ہے جو ہماری گھریلو زندگی میں بُری طرح پھیل گئی ہیں، اور جن کی بنا پر ہمارا معاشرہ گوناگوں آفتوں کا شکار ہو رہا ہے، اس میں نکاح، مہر، نفقہ، عدل، رضاعت، طلاق، لقطہ اور دوسرے حقوق العباد سے متعلق شرعی احکام کی تشریح بھی ہے، اور اس بات کی مؤثر نشان دہی بھی کہ ہمارے معاشرہ میں کس کس طرح غلط فہمیاں یا بے عملیاں پھیلی ہوئی ہیں، اور اُن کے نتائج کتنے تباہ کُن ثابت ہو رہے ہیں،

امراض کی یہ تشخیص اور ان کا یہ علاج اُس حکیم الامّتؒ کی طرف سے ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے گذشتہ صدی میں تجدیدِ دین کے لئے منتخب فرمایا تھا، اور جسے اُمّت کی نبض شناسی کی خاص توفیق مرحمت فرمائی تھی،

اللہ تبارک وتعالیٰ ہم سب کو ان احکام کے سمجھنے اور اُن پر عمل پیرا ہو کر اپنی دنیا وآخرت سنوارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین،

احقر
محمد تقی عثمانی
۴ر صفر ۱۳۹۹ھ

دار العلوم کراچی ۱۴

تعارف

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نَحْمَدُہٗ وَنُصَلِّیْ عَلٰی رَسُوْلِہِ الْکَرِیْمِ، وَعَلٰی اٰلِہٖ وَاَصْحَابِہٖ وَاَوْلِیَاءِہٖ وَبَارِکْ وَسَلِّمْ تَسْلِیْمًا کَثِیْرًا کَثِیْرًا ط

اما بعد! "اصلاحِ انقلابِ امت" حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی قدس سرہٗ کی تصنیف ہے، جو حقیقی معنی میں حکیم الامت، مصلحِ ملت اور مسیحِ وقت تھے، ان کی تابندہ و درخشندہ حیاتِ مبارکہ بالکل اس آیۂ مبارکہ کے مصداق تھی اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ ط وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ ط عَلَیْہِ تَوَکَّلْتُ وَاِلَیْہِ اُنِیْبُ ۝ اور وہ صحیح معنوں میں اِس شعر کی عملی تصویر تھے ؎

خنجر چلے کسی پہ تڑپتے ہیں ہم امیرؔ
سارے جہاں کا درد ہمارے جگر میں ہے

مورخِ اسلام حضرت علامہ سید سلیمان ندویؒ اپنے مقالہ "حکیم الامت کے آثارِ علمیہ" کے باب "اصلاحیات"، میں حضرت والاؒ کی اصلاحی تصانیف کتاب ہٰذا (اور حیٰوۃ المسلمین اور اصلاح الرسوم، صفائی معاملات، اصلاحِ امت وغیرہ) میں بطور تعارف تحریر فرماتے ہیں:

"ان کتابوں میں ہر ایک کا منشاء یہ ہے کہ مسلمانوں کی اخلاقی، اجتماعی، معاشرتی زندگی خالص اسلامی طریق اور شرعی نہج پر ہو، اور اُن کے سامنے وہ صراطِ مستقیم کھل جائے جو ہدایت کی منزلِ مقصود کی طرف جاتی ہے"۔

(ماہنامہ معارف، صفر ۱۳۶۳ھ بحوالہ حیاتِ اشرف، ص ۱۵۵)

پاکستان میں پہلی بار اس نادر کتاب کی جلد اوّل اِدارۃُ المعارف کراچی ۱۴ نے شائع کی تھی، دورانِ خط و کتابت احقر نے برادرِ محترم محب مکرم مولانا محمد تقی صاحب عثمانی مدظلہم سے اس کتاب کی جلد دوم کی اشاعت کے بارے میں استفسار کیا، اور یہ بھی عرض کیا کہ اگر اشاعت میں تاخیر دورِ حاضر کے مذاق کے مطابق ذیلی سرخیاں وغیرہ لگنے کے سبب ہو رہی ہے تو بندہ اس کیلئے

حاضر ہے، مولانا عثمانی صاحب مدظلہم نے اسے منظور فرمالیا، اور کتاب روانہ فرمادی، درحقیقت بندہ اس کام کا بالکل اہل نہ تھا، "صلاحِ کار کجا و من خراب کجا"

تاہم حضرت حکیم الامت تھانوی قدس سرہٗ کی ایک نادر اصلاحی تصنیف کی خدمت کو سعادت جان کر توکلاً علی اللہ اس کام کو شروع کیا، اور ان باتوں کا اہتمام کیا۔

(۱) ہر باب میں ذیلی سرخیاں قائم کرکے شروع میں ایک مکمل فہرست مضامین لگادی ہے، اس فہرست پر ایک اجمالی نظر ڈالنے سے ہی کتاب کی اہمیت کا اندازہ ہوسکتا ہے،

(۲) کتاب کی زبان چونکہ علمی ہونے کی وجہ سے خاصی مشکل ہے، اس لئے قارئین کی سہولت کے مدِ نظر بعض مقامات میں مشکل الفاظ کا مفہوم قوسین میں لکھ دیا ہے،

(۳) اس کے علاوہ قرآنی آیات واحادیث، فقہی عبارات اور فارسی اشعار کا ترجمہ بھی قوسین میں کردیا ہے، فقہی عبارات کے ترجمہ کے سلسلہ میں برادرم علامہ اختر علی صاحب سینیر اورنٹیل ٹیچر گورنمنٹ ہائی اسکول ہارون آباد نے بڑا تعاون فرمایا، بلکہ بعض عبارات کی تصحیح اور حل کے لئے اصل فتاویٰ سے مراجعت فرمائی، حق تعالیٰ انھیں جزائے خیر عطا فرمائے، آمین،

(۴) فقہی اصطلاحات (مثلاً طلاق بائن، خلع وغیرہ) کی تشریح حواشی میں کردی گئی ہے،

(۵) جدید اردو میں بعض مقامات پر واؤ کا استعمال متروک ہوچکا ہے مثلاً "جاوے" "کھاوے" وغیرہ میں واؤ کو حذف کرکے "جائے" "کھائے" وغیرہ کردیا گیا ہے،

غرض کہ کتاب کو حتی المقدور عام فہم بنانے کی کوشش کی گئی ہے، جو صاحب اس کتاب کا مطالعہ فرمائیں وہ احقر سراپا گناہ خاکپائے اہل اللہ کے لئے بطورِ خاص دُعاء فرمائیں، کہ حق تعالیٰ شانہٗ زندگی کی بقیہ ساعات میں اپنی مرضیات پر چلنے، نامرضیات سے بچنے کی توفیق بخشتے ہوئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کے افادات زیادہ سے زیادہ عام کرنے کی توفیق بخشیں، اور ان کاموں کو بھی اُن پر عمل کی توفیق عنایت فرمائیں ؎

انہی کے طرزِ عمل پر ہوائے خدا جینا
ویرحم اللہ عبداً قال آمینا

آخر میں دوبارہ عرض ہے کہ اس کتاب کا مطالعہ اس پر عمل کی نیت سے کیا جانا چاہئے،

اَللّٰھُمَّ وَفِّقْنَا لِمَا تُحِبُّ وَتَرْضٰی، آمین،

دعاؤں کا محتاج
بندہ محمد اقبال قریشی غفرلہٗ
شب جمعہ ۲۹ جمادی الاولیٰ ۱۳۹۷ھ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

فہرست مضامین

اِصلاحِ انقلابِ امت

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِصلاحِ انقلابِ امّت! (حصہ دوم)

اِصلاح متعلق بنکاح

مثل عبادات مقصودہ (ایسی عبادتیں جو اصل مقصود ہیں جن کا بیان حصہ اوّل میں ہو چکا ہے، مثلاً عقائد[۱]، دیانات[۲] مثل نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ، قربانی، معاملات[۳] بیع وشراء، معاشرت[۴] مثل طعام، لباس وکلام وغیرہ، اخلاق باطنہ مثل ریاء وغیرہ) کے امر نکاح میں بھی مختلف کوتاہیوں کا وقوع شائع ہے (یعنی مختلف کوتاہیاں پھیلی ہوئی ہیں) اس لئے مختصراً ان پر بھی متنبہ کرنا ضروری ہے وَھِیَ ھٰذا:۔

ناکارہ ہونے کے باوجود بلاضرورت محض عرفی رسم سمجھ کر نکاح کرنا؛

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ بالکل ضرورت نہ ہونے، بلکہ باوجود از کار رفتہ (نکاح کے لئے بیکار ہونے کے) محض خاندانی یا عُرفی (رواجی) رسم سمجھ کر اپنی خدمت کی مصلحت سے جوان عورت یا لڑکی سے نکاح کرتے ہیں، اور اپنے ناکارہ ہونے کو منکوحہ و اولیاءِ منکوحہ (جس سے نکاح کرنا ہو اور نکاح کرنے والے کے ولی) سے چھپاتے ہیں، تو یہ لوگ اپنی وہمی مصلحت کے سبب دوسرے آدمی کو یقینی مفسدہ (خرابی) میں مبتلا کرتے ہیں، نتیجۃً اس کے ۲ امر ہوتے ہیں؛

(۱) اگر وہ عورت عفیفہ (پارسا) یا متعففہ (خود کو پارسا رکھنے والی) ہوئی، تب تو وہ تمام عمر کے لئے قیدِ شدید میں مبتلا ہوئی، اور اگر اس صفت سے معترا (خالی) ہوئی تو بدکاری میں مبتلا ہوئی، اور دونوں حالتوں میں زوجین (میاں بیوی) میں ناگوار رنجش و نااتفاقی امر مشترک ہے۔

(۲) دوسری صورت میں دونوں کی بے آبروئی بلکہ دونوں کے خاندان کی بھی ساتھ رسوائی ہے،

مال و زر کی طمع و حرص سے اپنی لڑکی کی زندگی برباد کرنا | بعضے لوگ یہ اندھیر کرتے ہیں کہ باوجود شہرت اس امر کے پھر بھی اپنی لڑکی ایسے شخص سے بیاہ دیتے ہیں جس کا سبب اکثر مال و زر کی طمع و حرص ہوتی ہے، جس کی اُن کو اپنے لئے توقع ہے، یا پہلے ہی لے لیتے ہیں،

بعض سادہ لوح نکاح کی غایت کھانا پینا سمجھتے ہیں | اور ان سے بھی زیادہ عقل کے دشمن وہ ہیں جو خود بھی منتفع نہیں ہوتے صرف اولاد کی احمقانہ خیرخواہی ہی اس کا باعث ہوتی ہے، یعنی یہ سمجھتے ہیں کہ خیر فراغت سے کھائے پہنے گی، تو ان سادہ لوحوں (بیوقوفوں) کو یہ خبر نہیں کہ نکاح کی غایت (و مقصد) آیا کھانا پینا ہے یا مصالحِ زوجیت؟ اگر امرِ اول غایت ہوتی تو چاہئے تھا کہ جو لوگ کھلانے پینے کی وسعت رکھتے ہیں یا خود وہ منکوحہ صاحبِ وسعت (مالدار) ہے تو ایسی جگہ نکاح ہی نہ کیا جایا کرتا حالانکہ مشاہد (دیکھا جاتا) ہے کہ بناتِ سلاطین (بادشاہوں کی بیٹیاں) تک اس سے مستغنی (بے نیاز) نہیں، اس سے معلوم ہوا کہ نکاح سے مقصود دوسرے ہی مصالح ہیں،

بدونِ موافقتِ تام کے نکاح کے مصالح پورے نہیں ہوسکتے، | اور وہ بدون موافقت تام (پورے) نہیں ہوسکتے، اور موافقت حالتِ مذکورہ میں ہو نہیں سکتی، پس وہ مصالح بھی اس حالت میں تام نہ ہوں گے، بلکہ بعض مصالح جو کہ مقتضاء ہیں طبیعت بشریہ کے وہ تام کیا، حاصل بھی نہیں ہوتے، اس لئے نکاح میں اس امر کی رعایت سخت ضروری ہے، تاکہ زندگی تلخ نہ ہو پھر مرد کو اگر عورت سے ناگواری پیش آئے تو وہ طلاق دے کر استخلاص (آزاد ہونے) پر قادر ہے، یا بدون طلاق دوسری عورت سے نکاح کرکے اس ناگواری کی تلافی (کمی پوری) کرسکتا ہے، مگر عورت بیچاری کیا کرے کہ عمر بھر سوختہ و افروختہ (جلی بھُنی) رہا کرے، اور تفریقِ قاضی (حاکم کے عورت کو شوہر سے الگ کردینے) کا سامان ہر جگہ میسّر نہیں ہوسکتا، اور بعض عورتیں اس اظہار کو خلافِ غیرت سمجھتی ہیں، بعض جگہ ایسے مواقع ہیں کہ عورت کو تپِ دق لگ گئی ہے اور گھُل گھُل کر خاتمہ ہوگیا، کیا یہ ظلم نہیں، خواہ عورت ایسا کرے یا اولیاء منکوحہ ایسا کریں،

عمر کے تناسب کا خیال نہ رکھنے سے بھی بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں، | اور اسی کے قریب ہے عمر کے تناسب کا خیال نہ کرنا جبکہ لڑکی بے زبان یعنی کنواری یا مثل کنواری (کنواری جیسی) کے غیر ذی رائے (یعنی اپنی رائے نہ رکھنے والی) ہو، جیسا بعضے لوگ ساٹھ ساٹھ برس کے بوڑھوں سے تیرہ تیرہ ۱۳ برس کی لڑکیوں کو بیاہ دیتے ہیں، یہاں بھی وہی مفاسد مرتب ہوتے ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، اور اس سے ایک مفسدہ زیادہ وہ یہ کہ اکثر بوڑھا پہلے مرجاتا ہے، اور وہ مظلومہ اکثر بوجہ

عرفاً (رسم درواج میں) عار ہونے کے جیسا بہت قوموں میں اب تک یہ جہالت موجود ہے، بیوہ بیٹھی رہتی ہے، علاوہ مفاسدِ مذکورہ کے بعض اوقات یہ غریب کھانے پینے سے محتاج ہوجاتی ہو اگر شرافتِ عرفیہ (رسمی شرافت) لئے ہوئے ہے کسی کی مزدوری نہیں کرسکتی، اور اگر مزدوری گوارا کی دوسرے گھر بلکہ بعض اوقات رہنا پڑتا ہے، چونکہ اس کا کوئی سرپرست نہیں ہوتا، بدنفس (برُے خیالات کے) لوگ اس بیچاری کے درپے ہوتے ہیں، اور کبھی ترغیب سے اور کبھی ترہیب (ڈرا دھمکا کر) کبھی کسی حیلہ (بہانہ) سے خاص کر جب اُس میں بھی کوئی نفسانی تقاضا (نفسانی خواہش) ہو اس کی آبرو اور دین خراب کردیتے ہیں، رہی مصلحتِ خدمت تو وہ دوسرے طریقہ سے بھی حاصل ہوسکتی ہے،

بغرضِ خدمت نکاح مقصود ہو تو کیسی عورت سے نکاح کرنا چاہئے؟

اور اگر نکاح ہی پر موقوف ہو تو ایسی عورت سے نکاح کرے جو خود مختار ہو اور وہ اپنے لئے پورے طور سے رائے قائم کرسکے، اور اس سے اس کی حالت دمصلحت پوشیدہ (چھپی ہوئی) بھی نہ ہو، اور بہتر یہ ہے کہ اس کی حالت سے بوجہ زیادتِ سِن (عمر زیادہ ہونے کے سبب) یہ بھی گمان غالب ہو کہ اس میں تقاضائے نفسانی (نفسانی خواہش) نہیں رہا تو اس طرح سے کوئی مفسدہ مظنون (خرابی کا گمان) نہ ہوگا ہاں یہ ممکن بلکہ غالب ہو کہ ایسی عورت ہم کفو (ہم مرتبہ) کم ملے گی، تو خدمت کے لئے کفوہی کی کیا ضرورت ہے، اس کا زیادہ لحاظ توالد وتناسل (اولاد کے ہونے اور نسل کے بڑھنے) میں کیا جاتا ہے، کہ اگر اولاد غیر کفو سے ہوئی اہلِ برادری عرفاً اس کو اپنے برابر نہیں سمجھیں گے اور ان کے ازدواج (شادی کرنے) وغیرہ میں تنگی ہوگی، تو جب یہ مرد از کار رفتہ فرض کیا گیا ہے تو توالد وتناسل کی نوبت ہی کہاں آئے گی جس کے لئے غیر کفو ہونا نامناسب ہے،

مرد کو دھوکہ دے کر نکاح کردینے کے مفاسد،

ایک کوتاہی اس کا مقابل ایک امر ہے وہ یہ کہ منکوحہ کسی وجہ سے ایسی ہو کہ غالب ظن (گمان غالب) میں مرد اس کو پسند نہ کرے گا، اور اولیاء منکوحہ نے دھوکہ دے کر کسی سے نکاح کردیا، مثلاً اس کو کوئی ایسا مرض ہے جو ہمبستری سے مانع ہے، کہیں کہیں ایسا مشاہدہ ہوا ہے کہ عورت رتقاء (جس کی تنگی فرج کے سبب جماع کرنا محال ہو)، یا قرناء (فرج میں ایک زائد گوشت کا پیدا ہونا جو لذتِ جماع میں حارج ہوتا) ہے، ایک جگہ مجنونہ (پاگل) کا نکاح ایک اندھے سے کردیا تھا، اس نے شوہر کے کاٹ لیا وہ بھاگا، اور بیحد رسوائی ہوئی، آخر طلاق ہوئی، مہر کا جھگڑا پڑا، ایک جگہ عورت بالکل بھوری تھی، یعنی جلد

ایسی سفیدی جیسے برص کے مرض میں ہوجاتی ہے، سو مرد تو کہیں صابر شاکر بے نفس ہوتا ہے اور اس کو سر دھیلتا ہے، مگر تمام زندگی اس کی بے حلاوت (بے مزہ) ہوتی ہے، اور گو استخلاص بعض کو ممکن ہے مگر طبائع (طبیعتیں) مختلف ہیں، بعض اس کو بے مروّتی سمجھتے ہیں، بعضے وسعت کم رکھتے ہیں، اس لئے وہ اس کا اہتمام نہیں کرتے تو جن لوگوں نے اس کو دھوکہ دیا ہے اُن پر تو اس تلبیس (دھوکہ دہی) وایذاء رسانی (تکلیف پہنچانے) کا وبال ضرور ہی ہوگا،

بعض جگہ دیکھا گیا ہے کہ آسیب زدہ لڑکی کو کسی کے سر مڑھ دیا اور جب وہ متوجہ ہوا تو جنّ صاحب اُس کی طرف متوجہ ہوئے، غرض یوں ہی صبر کرکے رہ گیا، اور خدمت اس کی جدا اس کے ذمہ رہی، زر دادن و درد سر خریدن (رقم دے کر سر کا درد خریدنے) کی مثل صادق آگئی، تو یہ لوگ لڑکی کے لئے شوہر تجویز نہیں کرتے، بلکہ اس کے لئے ایک مزدور تلاش کرلیتے ہیں، اور خاصکر ان عوارض (پیش آنے والی چیزوں) کے ساتھ بی بی صاحبہ بدزبان و بدمزاج بھی ہوں تب تو اچھی خاصی شوہر کے لئے دوزخ ہے،

اسی طرح اگر وہ اندھی ہو، کانی ہو، مبروص (برص کے مرض میں مبتلا) ہو، مجذوم (جذام کے مرض میں مبتلا) ہو، ان سب کا نتیجہ بُرا ہے، اگر مرد بے نفس ہوا تو اس کی زندگی ان عنایت فرماؤں کی بدولت برباد ہوئی، اور اس سے صبر نہ ہوسکا تو اس نے اس عورت کو تکلیف پہنچانا شروع کیا جس سے اس پر ایک مصیبت مرض وغیرہ کی تو پہلے ہی سے تھی ہی، دوسری اور بڑھ گئی اور ان دونوں سے یہ ناچاقی (نااتفاقی) متجاوز (حد سے آگے) ہوکر دونوں کے خاندانوں تک مؤثر ہوتی ہے

مرد اور عورت کے مزاج ناموافق ہونے کے مختلف عوارض،

ان میں باہم عداوت (دشمنی) ہوجاتی ہے، مقدمہ بازی ہوتی ہے، کبھی تفریق (علیحدگی) کی کوشش کی جاتی ہے، اور مرد انکار کرتا ہے، کبھی مہر کی نالش (دعویٰ) ہوتی ہے، کبھی جھوٹے گواہ معافی کے بنائے جاتے ہیں، اور کبھی باوجود معاف کردینے کے جھوٹا حلف معاف نہ کرنے کا گوارہ کرلیا جاتا ہے، غرض ہزاروں خلجان (الجھاؤ) کھڑے ہوجاتے ہیں، اُن سب کی جڑ مرد و عورت کا ناموافق ہونا ہے، جس کے اسباب کہیں مرد کے عوارض ہیں کہیں عورت کے،

نکاح کے معاملہ میں زوجین اور اولیاء زوجین کو نہایت دیانت اور صفائی سے کام لینا چاہئیے

چونکہ نکاح بھی ایک معاملہ ہے، جس کا تعلق دو ۲ نئے آدمیوں سے ہے اس لئے زوجین و اولیاء زوجین کو اس میں نہایت دیانت و صفائی سے کام لینا واجب ہے، کہ کسی قسم کا خلجان محتمل (الجھاؤ کا احتمال)

نہ رہے، جہاں تک اپنا ذہن رسائی کرے ہر بات کو صاف کردے،

باوجود ضرورت نہ ہونے کے براہِ ہوسناکی کئی کئی بیویاں کرنے کے مفاسد

ایک کوتاہی یہ ہے کہ باوجود ضرورت نہ ہونے کے بعض لوگ براہِ ہوسناکی کئی کئی بیبیاں نکاح میں جمع کرلیتے ہیں، اور یا تو بوجہ اس کے کہ مرد میں دین یا وسعت کم ہے اُن میں عدل نہیں ہوسکتا، یا بوجہ اس کے عورتوں میں دین یا عقل کم ہے باوجود شوہر کے عدل رکھنے کے پھر بھی وہ باہم لڑتی جھگڑتی ہیں، یا شوہر سے بگڑتی ہیں، اور عدل نہ رکھنے کی صورت میں مرد پر مخالفتِ شرع (شریعت کی مخالفت) کا الزام ظاہر ہی ہے، جس سے احتراز (بچنا) واجب ہے، اور جہاں غالب گمان اس عدل کا ہو اس عدم کے سبب سے بھی کہ تعدّدِ ازواج (بیویوں کے ایک سے زائد ہونے) سے بناء بر اس کے کہ مقدمہ ناجائز کا ناجائز ہے احتراز واجب ہوگا، اور عدل رکھنے کی صورت میں مرد پر یہ الزام تو نہیں، لیکن پریشانی میں تو پڑ گیا، جس کے بڑھ جانے سے بعض اوقات دین میں خلل پڑنے لگتا ہے اور بعض اوقات صحت و عافیت میں، اور اس کے واسطہ سے احیاناً دین میں بھی خرابی آجاتی ہے،

پریشانی کے بڑھ جانے سے دین میں خلل آنے کا ظنِ غالب ہو تو اس پریشانی اور اس کے اسباب سے بچنا واجب ہے،

جہاں اس کا ظنِ غالب ہو ایسی پریشانی سے بچنا ضروری ہے، اور اس کے ساتھ ہی پریشانی کے اسباب سے بھی کہ اس .... موقع پر تعدّدِ ازواج ہے، بچنا لازم ہوگا، اگر یہ لزوم بدرجۂ وجوبِ شرعی بھی نہ ہوتا تاہم عقل کا اقتضاء (تقاضا) تو ضرور ہے، اور شرعاً بھی مرضی و مستحسن (پسندیدہ اور اچھا) اور اس کا خلاف ناپسندیدہ و غیر مستحسن ہوگا، اور اس کے معنی یہ نہ سمجھے جائیں کہ تعدّدِ ازواج میں فی نفسہٖ کوئی کراہت ہے، نعوذ باللہ، کیونکہ اسکی اباحت بلاکراہت منصوص قطعی (قرآن سے ثابت) ہے، اور سلف میں بلانکیر شائع (رائج) تھا،

تعدّدِ ازواج کا انکار تقلیدِ ملاحدۂ یورپ کا سبب ہے،

اس میں کراہت یا حرمت کا اعتقاد یا دعویٰ اور اس کی بناء پر آیاتِ قرآنیہ میں تحریف کرنا جیسا کہ اس وقت تقلید ملاحدۂ یورپ بعض مسلمانوں کے لئے اس کا سبب ہوگئی ہے سراسر الحاد و بددینی ہے، اصل عمل میں شائبہ (شک) بھی کراہت یا ناپسندیدگی کا نہیں، اور نہ اُس کا جواز (جائز ہونا) بمعنی صحت و نفاذ متیقن، عدل کے ساتھ مقید (یعنی نکاح کا صحیح اور نافذ ہونا عدل کرسکنے کی شرط کے ساتھ پابند ہے)، بلکہ اگر عدمِ عدل (انصاف نہ ہوسکنے) کا تیقن (یقین) بھی ہو تب بھی

صحت و نفاذ اس کا یقینی،

بعض عوارض کے سبب تعددِ ازدواج گناہ ہو سکتا ہے

البتہ بعض عوارض کے سبب اس کا جواز بمعنی عدم الاثم (گناہ نہ ہونے) مرتفع ہو جاتا ہے، یعنی جب احتمال غالب عدمِ عدل کا ہو تو اس وقت باوجود استحسان فی نفسہ (بنفسہ اچھا ہونے) کے اس عارضِ خاص کی وجہ سے اس تعدد سے منع کیا جائے گا، لقولہ تعالیٰ:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً، (النساء، آیت ۳)

(پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو)

لیکن خود عورتوں کی بے اعتدالیوں کا اندیشہ ہو تو اس وقت تعدد سے نہی شرعی (شرعی ممانعت) تو نہیں، لیکن قواعدِ شرعیہ (شریعت کے اصولوں) کی رو سے مشورۃً ایک پر کفایت کرنے کے لئے کہا جائے گا، اور یہ مشورہ بھی اس معنی کو شرعی ہوگا جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جابر رضی اللہ عنہ کو یہ مشورہ دیا تھا:۔

هَلَّا بِكْرًا تُلَاعِبُهَا وَتُلَاعِبُكَ (　　)

"کیا کوئی کنواری نہیں تھی کہ تم اس سے جی بہلاتے اور وہ تم سے دل بہلاتی"

بالغ ہونے کے بعد کنواری لڑکیوں کی جلد شادی نہ کرنے میں بہت سے مفاسد ہیں

اور اس کے مقابل ایک کوتاہی عورتوں کے متعلق ہے، یعنی کوتاہی مذکور کا حاصل تو مردوں کے لئے توسع (وسعت کرنا) تھا کہ کئی کئی عورتوں سے شادی کرتے ہیں، اور اس آئندہ کوتاہی کا حاصل عورتوں کے حق میں تنگی کرنا ہے، وہ یہ کہ بعض احوال میں ان غریبوں کے لئے خود شادی ہی کو مہتم بالشان نہیں سمجھتے، کہیں صرف عملاً کہیں اعتقاداً بھی، صرف عملاً ایسا کہ بعضے ناعاقبت اندیش کنواری لڑکیوں کو بالغ ہو جانے پر بھی کئی کئی سال بٹھلائے رکھتے ہیں، اور محض ناموری کے سامان کے انتظار میں ان کی شادی نہیں کرتے، حتیٰ کہ بعض بعض جگہ تیس[۵] تیس اور کہیں چالیس چالیس برس

---

[۵] بہتر اور مناسب تو یہی ہے کہ بچیوں کا جوان ہونے کے بعد فوراً نکاح کر دیا جائے، اور محض خیالی توہمات کی بنا پر زیادہ تاخیر نہ کی جائے، چنانچہ ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ "اگر تمہارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کر دو، ورنہ زمین میں بڑا فتنہ و فساد ہوگا"، اسی طرح جمع الفوائد میں بحوالہ رزین

کی عمر کو پہونچ جاتی ہیں، اور اندھے سرپرستوں کو کچھ نظر نہیں آتا کہ اس کا کیا انجام ہے، حدیثوں میں جو اس پر وعید آئی ہے کہ اگر اس صورت میں عورت سے کوئی لغزش ہوگئی تو وہ گناہ باپ پر بھی یا جو ذی اختیار اس پر بھی لکھا جاتا ہے،

بالغ ہونے کے بعد کنواری لڑکیوں کی جلد شادی نہ کرنے کے دنیوی مفاسد

اگر کسی کو اس وعید کا خوف نہ ہو تو دنیا کی آبرو کو تو دنیا دار بھی ضروری سمجھتے ہیں، سو اس میں تو اس کا بھی اندیشہ ہے، چنانچہ کہیں حمل گرائے گئے ہیں، کہیں لڑکیاں کسی کے ساتھ بھاگ گئی ہیں، اگر کسی شریف خاندان میں ایسا بھی نہ ہو تب بھی وہ لڑکیاں ان سرپرستوں کو تو دل ہی دل میں کوستی ہیں، اور چونکہ وہ مظلوم[1] ہیں اُن کا کوسنا خالی نہیں جاتا، ان لوگوں کو یہ بھی شرم نہیں آتی کہ خود تو باوجود بوڑھے ہو جانے کے ایک بُڑھیا کو کہ وہ اس لڑکی کی ماں ہے خلوت میں لے جا کر اس کے ساتھ عیش و عشرت کرتے ہیں، اور جس غریب مظلوم کی عیش کا موسم ہے وہ پہرہ داروں کی طرح ماما (نوکرانی) کے ساتھ اُن کے گھر کی چوکسی کرتی ہیں، کیسا بے ربط خبط (بے جوڑ دیوانگی) ہے،

جہیز کے انتظار میں نکاح میں تاخیر نہ کرنی چاہئے،

اور اکثر یہ دیکھا گیا ہے کہ جس انتظار میں یہ ٹال مٹول کی ہے وہ بھی نصیب نہیں ہوتا، یعنی سامان اور زیور اور فخر کے لئے وہ سرمایہ بھی میسّر نہیں ہوتا، اور مجبوری کو جھک مار کر خشک نکاح ہی کرنا پڑتا ہے، پھر اُن سے کوئی پوچھے کہ دیر کرنے سے بجز خسارۂ دنیا و آخرت کے کیا حاصل ہوا، بلکہ اس دیر میں تو اور بھی

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) حضرت ابن نجیح رضی سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد یوں منقول ہے مِسْكِيْنَةٌ مِسْكِيْنَةٌ لَيْسَ لَهَا زَوْجٌ، قَالُوْا وَاِنْ كَانَ كَثِيْرَةَ الْمَالِ قَالَ وَاِنْ كَانَ كَثِيْرَةَ الْمَالِ، یعنی محتاج ہی محتاج ہے وہ عورت جس کا شاوند نہ ہو، لوگوں نے عرض کیا اگر وہ بہت مالدار ہو (تب بھی محتاج ہے) آپ (صلی اللہ علیہ وسلم) نے فرمایا ہاں اگرچہ وہ بہت مالدار ہو، (بندہ احقر قریشی غفرلہ)

[1] جیسا کہ حدیث پاک میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اِتَّقُوْا دَعْوَةَ الْمَظْلُوْمِ فَاِنَّهٗ لَيْسَ بَيْنَهٗ وَبَيْنَ اللّٰهِ حِجَابٌ "یعنی مظلوم کی بد دُعا سے ڈرو کیونکہ اس کے اور حق شانہٗ کے درمیان کوئی حجاب نہیں ہے"، حضرت شیخ سعدی رح نے گویا اس شعر کا ترجمہ کیا ہے ؎

بترس از آہِ مظلوماں کہ ہنگامِ دُعا کردن　٭　اجابت از درِ حق بہر استقبال می آید

بندہ احقر قریشی غفرلہ

خلائق کے نزدیک بدنامی ہی کہ میاں اتنے دن بھی لگائے اور پھر خاک نہ ہوسکا، لڑکی کو اگر ایسا ہی دینے کا شوق ہو تو بعد نکاح کے دینے کو کس نے منع کیا ہے، اگر دعوتِ عامّہ ہی کا شوق ہو تو دعوت کے ہزا ہیلنے ہر وقت نکل سکتے ہیں، یہ کیا فرض ہے کہ سارے ارمانوں کی اسی مظلومہ پر مشق کی جائے، یہ بالکل ظلم صریح اور عملِ قبیح (بُرا کام) ہے،

موقع کا رشتہ نہ ملنے کا عذر بالکل صحیح نہیں، اور بعضے لوگ دیر میں یہ عذر کرتے ہیں کہ کیا کریں کہیں سے موقع کا رشتہ ہی نہیں آتا، تو کیا کسی کے ہاتھ... پکڑا دیں؟ یہ عذر اگر واقعی ہوتا توصحیح تھا، یعنی سچ مچ اگر موقع کا رشتہ نہ آتا تو واقعی یہ شخص معذور تھا، لیکن خود اسی میں کلام ہے کہ جو رشتے آتے ہیں آیا وہ سب ہی بے موقع ہیں، بات یہ ہے کہ بے موقع کا مفہوم خود انھوں نے اپنے ذہن میں تصنیف کر رکھا ہے جس کے اجزاء یہ ہیں:-

لائق داماد کی ذہنی تراشیدہ صفات (۱) حسب نسب حضرات حسنین رضی اللہ عنہما جیسا ہو، (۲) اور اخلاق میں جنیدؒ جیسا ہو، (۳) اور علم میں اگر وہ دینی ہے تو ابوحنیفہؒ کے برابر ہو اگر دنیوی ہی تو بوعلی سینا کا مثل ہو، (۴) حسن میں یوسف علیہ السلام کا ثانی ہو (۵) اور ثروت و ریاست میں قارون و فرعون کے ہم پلّہ ہو،

بس اس کا لقب کہیں لائق داماد ہوگا، ان صفات کے لحاظ کا مضائقہ نہیں، بلکہ منجملہ حقوقِ اولاد کے ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی دو امر اور بھی لحاظ کے قابل ہیں،

غلو ہر امر میں مذموم ہے ایک یہ کہ ہر امر میں استدلال مدِّ نظر رکھنا چاہیئے، غلو ہر امر میں مذموم ہے، دوسرے یہ کہ ایک شخص میں تمام صفات کا مجتمع ہونا بھی شاذ و نادر ہے، پس اگر صفات مذکورہ بقدر ضرورت کسی میں مجتمع ہوں مگر ان میں جو اہم ہیں وہ موجود ہیں، اور وہ تین امر ہیں،

نکاح کرتے وقت لڑکے میں تین امر کا دیکھنا ضروری ہے ایک قوتِ اکتساب (کمانے کی قوّت) دوسرے کفاءت (برابری) میں زیادہ تفاوت نہیں، تیسرے دینداری، ان دونوں صورتوں میں زیادہ کاوش (کھوج) چھوڑ دے، ورنہ وہی بات پیش آئے گی جس کا ذکر حدیث میں[1] ہے کہ جب خُلق و دین میں

---

[1] وہ حدیث یہ ہے اِذَا خَطَبَ اِلَیْکُمْ مَّنْ تَرْضَوْنَ دِیْنَهٗ وَخُلُقَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِلَّا اَنْ تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ عَرِیْضٌ (رواہ الترمذی عن ابی ھریرۃ رضؓ کذا فی المشکوٰۃ)
(بندہ احقر قریشی غفرلہٗ)

کفاءت ہو تو نکاح کردیا کرو ورنہ زمین میں فسادِ کبیر ہوگا، یہ تو تحقیقی جواب ہے اُن لوگوں کی غلط فہمی کا، موقع کا رشتہ نہ ملنے کے عذر کے تین الزامی جوابات

اور تین[۳] جواب الزامی میں بھی اُن کے جواب میں قابلِ احتجاج ہیں؛ ایک[۱] یہ کہ جن صفات کو جس درجہ میں تم دوسروں میں ڈھونڈھتے ہو تم کو جس شخص نے لڑکی دی تھی جس کی بدولت آج اپنی لڑکی کے باپ بن کر یہ جولانیاں دکھارہے ہو کیا اس شخص نے بھی تمھارے لئے ایسی ہی تفتیش وکاوش (تحقیق اور جستجو) کی تھی، اگر وہ ایسا کرتا تو تم کو عورت ہی میسر نہ ہوتی، اور ان باتوں کے بنانے کا موقع ہی نہ ملتا، غرض اس نے ایسا نہیں کیا، تو اس نے جب ایسا نہ کیا تو تم نے یا تمھارے باپ نے دوسرے بھائی مسلمانوں کی بدخواہی کیوں کی، کہ باوجود تمھارے اندر ان اوصاف کے علی سبیل الکمال (مکمل طور پہ) مجتمع نہ ہونے کے اس کی لڑکی پر نکاحی قبضہ کرلیا، آنچہ برخود نہ پسندی بردیگراں میسند (جو چیز تم اپنے لئے پسند نہیں کرتے وہ دوسروں کے لئے کیوں پسند کرتے ہو) پر عمل کیوں نہیں کیا؟

دوسرا[۲] الزامی جواب یہ ہے کہ جب تم اپنی دختر کے لئے ان صفات کا شوہر تلاش کرتے ہو، انصاف کرو تم جب اپنے فرزند کے لئے کسی کی لڑکی کی درخواست کی تھی، یا کرنے کا خیال ہی کیا۔ اپنے صاحبزادہ میں بھی یہ صفات اسی درجہ کی دیکھ لی ہیں یا دیکھنے کا ارادہ ہے، افسوس! آنچہ برخود نہ پسندی بردیگراں میسند کے مقولہ کا یہاں بھی خون کیا،

تیسرا[۳] جواب یہ ہے کہ جس طرح لڑکوں میں بے شمار خوبیاں ڈھونڈھی جاتی ہیں اگر دوسرا شخص تمھاری لڑکیوں میں اُس سے عُشر (دسواں حصہ) خوبیاں اور ہنر بھی دیکھنے لگے تو میں یقین کرتا ہوں کہ تمام عمر ایک لڑکی بھی بیاہی نہ جائے، یہاں بھی وہی آنچہ برخود نہ پسندی بردیگراں میسند کا اہمال (چھوڑ دینا) لازم آتا ہے،

غرض یہ عذر کہ رشتہ موقع کا نہیں آتا اکثر احوال میں بے موقع ہے، یہ تو بیان تھا عورتوں کے حق میں شادی کے باب میں عملاً تنگی کرنے کا،

اعتقاداً بیوہ کے نکاحِ ثانی کو معیوب سمجھنا جہالت ہے

اور اعتقاداً تنگی کرنا اور اہتمام نہ کرنا ایسا کہ جیسے اکثر لوگ بوجہ افراطِ جہل (بسبب کثرتِ جہالت) کے بیوہ کے نکاحِ ثانی کو معیوب سمجھتے ہیں، بعض جگہ تو یہاں تک غضب سنا ہے کہ منگنی ہونے کے بعد اگر لڑکا مرگیا تو پھر لڑکی کو تمام عمر بٹھلائے رکھا، اور یہ تو بکثرت ہو کہ بعد شادی کے بچپن میں یا جوانی میں بیوہ ہوگئی، بس اب

اس کی شادی کرنا گویا بڑا گناہ سمجھا جاتا ہے، بعض لوگ اگرچہ بوجہ جا بجا علم دین اور وعظ کے چرچوں کے اب اس درجہ کا عیب نہیں سمجھتے مگر تاہم جس طرح اس لڑکی کی پہلی شادی کی فکر تھی دوسری شادی کی فکر اس سے آدھی بھی نہیں، یعنی اہتمام نہیں،

بیوہ کا نکاح ثانی نہ کرنے سے اس کی صحت، آبرو اور دین برباد ہونے کا اندیشہ ہے!!!

اگر اس میں اور اُس میں فرق کیا ہے بلکہ اگر غور صحیح سے کام لیا جائے تو بہ نسبت نکاح اوّل کے نکاح ثانی اس بیوہ کا اہم ہے، کیونکہ پہلے تو وہ خالی الذہن تھی، مصالحِ زوجیت کا یا تو علم ہی نہ تھا یا تھا تو علم الیقین تھا، اور اب اس کو عین الیقین ہوگیا ہے، اس حالت میں اس پر وساوس و حسرات کا ہجوم زیادہ ہوتا ہے، جس سے کبھی صحت، کبھی آبرو، کبھی دین، کبھی سب برباد ہو جاتے ہیں،

بیوہ کو شفقت اور محبت سے نکاحِ ثانی کی ترغیب دینی چاہئے

بعض لوگ کہتے ہیں ہم نے پوچھا تھا وہ راضی نہیں ہوتی، صاحبو! مجھ کو اس میں بھی کلام ہے کہ جو طریقہ پوچھنے کا ہوتا ہے اسی طرح پوچھا تھا؟ یا چلتی ہوئی بات کہہ کر الزام اُتار دیا؟ پوچھنے پر جو بیوہ انکار کرتی ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ وہ جانتی ہے کہ اگر میں ایک دم سے راضی ہوجاؤں گی تو خاندان کے لوگ یوں کہیں گے کہ یہ تو منتظر ہی بیٹھی تھی خاوند کو ترس رہی تھی اس میں بدنامی ہوگی، اس خوف سے وہ ظاہرًا انکار کردیتی ہے، چاہئے یہ کہ اس کو اچھی طرح مصلحتیں بتلاؤ، اس کے وسوسے رفع کرو، شفقت اور اہتمام سے گفتگو کرو، اگر اس پر بھی وہ راضی نہ ہو تو تم معذور رہو،

بچوں والی عمر رسیدہ، صاحب وسعت بیوہ کو نکاح ثانی کرنا ضروری نہیں،

غرض حتی الامکان بیوہ کا نکاح ہی کردینا مناسب ہے، البتہ اگر کوئی بیوہ بچّہ والی ہو اور عمر بھی ڈھل گئی ہو، اور کھانے پینے کی بھی گنجائش ہو اور وہ انکار کرتی ہو، اور قرائن سے استغناء (بے نیاز ہونا) اس کا زوج (شوہر) سے معلوم ہو تو اس کے لئے اہتمام ضروری نہیں،

زوجین کی مرضی کے خلاف نکاح کردینے سے بہت سی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اکثر بلکہ قریب قریب کُل ہی مواقع میں متناکحین (نکاح کرنے والے جوڑے) کی مرضی حاصل نہیں کی جاتی، تعجب ہے کہ نکاح جو کہ عمر بھر کے لئے دو شخصوں کا تعلق ہے، جس کے ساتھ ہزاروں معاملات وابستہ ہیں، وہ تو کسی کا اور رائے ہو دوسرے کی، گو ان دو شخصوں کے مصالح کے یقیناً خلاف ہی ہو، اور گو وہ اپنی ناخوشی بھی ظاہر کرتے ہوں مگر ان کو ذرا نہ پوچھا جائے اور زبردستی نکاح کردیا جائے، بعض دفعہ عین وقت تک متناکحین یا ان میں سے ایک برابر

انکار کرتا ہے مگر اس کو گھونٹ اور جبر کر کے خاموش اور لب بند کر دیا جاتا ہے، اور عمر بھر کی مصیبت میں اس کو جوت دیا جاتا ہے، کیا یہ عقل اور نقل کے خلاف نہیں ہے، اور کیا اس میں ہزاروں خرابیوں کا مشاہدہ نہیں کیا جاتا اور پھر کیا ان خرابیوں کا کوئی انتظام یا انسداد (روک تھام) کیا جاتا ہے۔ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ ہر جگہ لڑکے لڑکی سے کہلوانا ضروری ہے،

صغیر یا صغیرہ پر ولایتِ جبریہ حاصل ہے

یا صغیر وصغیرہ پر ولایتِ جبریہ کوئی چیز نہیں، یا بالغہ پر ولایتِ استیذانیہ سکوتیہ (ایسی ولایت جس میں ولی نکاح کی اجازت مانگنے پر صرف خاموشی کافی ہے) کا انکار ہے، یا اولیاء کو مصالح مشخص کرنے کا حق نہیں، سو یہ مطلب نہیں، کیونکہ یقیناً بعض جگہ لڑکا اور لڑکی ذی رائے اکثر جگہ ذی رائے نہیں ہوتے، تو ان نادانوں کی رائے کیا، اور اس پر اعتماد ہی کیا، نابالغ ہونے کی حالت میں اگر شاذ و نادر ذی رائے بھی ہوں تو شاذ و نادر کا کیا اعتبار، یا بالغ اور ذی رائے ہونے کے باوجود حیاء جو خاصۂ فطریہ ہی انوثت وبکارت (عورت اور دوشیزگی) کا وہ طبعاً مانع ہوتی ہے تکلم (بات کرنے) اور اظہار رائے سے، بعض جگہ بلوغ وعقل کے انتظار میں موقع صالح ہاتھ سے نکل جاتا ہے، جو ظاہراً عاقد (عقدِ نکاح کرنے والے) کی سعی سے عمر بھر بھی نصیب نہ ہوگا،

نیز اکثر جگہ اولیاء... اپنے تجربہ اور شفقت سے جو تجویز کریں گے وہ مصلحت ہی ہوگی، اسی واسطے شریعتِ مقدسہ نے اپنے احکام وقواعد میں ان سب واقعات کا لحاظ کر کے مکمل قانون بنا دیا، اس لئے میرا یہ مطلب ہرگز نہیں اور نہ کوئی عاقل یہ بات تجویز کر سکتا ہے کہ بالکل متناکحین کی رائے پر رکھ دو، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اولیاء اپنے تجربہ وشفقت سے مصالح پر پوری نظر کر کے اس کے بعد بھی احتیاطاً ونظراً الی العواقب (احتیاط کے ساتھ نتائج پر غور کرتے ہوئے) اگر لڑکا لڑکی بالغ ہوں جو (بوجہ اس کے کہ اکثر بلوغ سبب ہوتا ہے ذی رائے ہونے کا) شرعاً ذی رائے قرار دیا گیا ہے،

نکاح سے قبل زوجین سے ان کی مرضی اور رائے معلوم کرنے کا احسن طریقہ

اس صورت میں قبل اس کے کہ باضابطہ اُن کی رضاء واذن (رضامندی واجازت) حاصل کی جائے، یعنی باکرہ بالغہ (بالغ کنواری) کو سنا کر اس کے سکوت (خاموشی) کو معیارِ رضا قرار دیا جائے، اور ناکح بالغ سے مجلس میں قاضی کہلوا دے کہ میں نے قبول کی، سو اس کے قبل بھی خاص طور پر اُن کی رائے دریافت کر جائے، جس کا اچھا طریقہ یہ ہے کہ جن سے وہ بے تکلف ہیں، جیسے ہم عمر دوست

اور سہیلیاں ان کے ذریعہ سے اس طور پر کہ ان کو یہ معلوم ہو کہ ہمارے بزرگ ہم سے یہ دریافت کررہے ہیں، ان کا مافی الضمیر معلوم کرلیا جائے، اور تجربہ کی بات ہے کہ اس طریقہ سے ضرور ان کے خیالات معلوم ہوجاتے ہیں، اور بعض دفعہ تو بے دریافت کئے وہ خود ہی ایسے بے تکلف دوستوں سے اپنی پسندیدگی یا ناپسندیدگی ظاہر کردیتے ہیں، اور اولیاء تک وہ خبریں پہنچ جاتی ہیں،

موجودہ زمانہ میں نکاح سے قبل متناکحین کی رائے معلوم کرلینا بہت ضروری ہے

مگر ظلم و ستم ہے کہ پھر بھی بعض مہمل موہوم مصلحتوں (فضول خیالی مصلحتوں) کو پیشِ نظر رکھ کر ان کے اس خیال کی پرواہ نہیں کی جاتی، اور ان کو گھونٹ داب کر اس بلا میں پھنسا دیا جاتا ہے، خصوص اس زمانہ میں کہ بیحد ہوشیاری کا وقت ہے اس کی بہت ضرورت ہے، بہت مقامات ایسے ہوئے ہیں کہ ناپسندیدگی کی حالت میں نکاح کردیا گیا ہے، پھر ناکح صاحب نے عمر بھر اس منکوحہ کی خبر نہیں لی اور فہمائش (سمجھانے) پر صاف جواب دیدیا کہ میں نے تو اپنی رائے ظاہر کردی تھی جنھوں نے اس پر بھی یہ عقد کیا ہے نفقات (اخراجات) کے وہ ذمہ دار ہیں،

خلاف مرضی نکاح کردینے کے مفاسد

اب بتلایئے اس مصیبت کا کیا علاج ؟ ان بوسیدہ عقل بزرگوں کی تو مصلحت ہوئی اور غریب مظلوم تمام عمر کے لئے قیدِ غیر میعادی (غیر معینہ) میں گرفتار ہوئی، کہاں ہیں یہ فرسودہ عقل ؟ اب آئیں اور اس مظلومہ کی کچھ مدد کریں، مگر مدد کیا کرتے، اول تو اس وقت تک مر کھپ بھی گئے، اور زندہ بھی رہ گئے تو ڈھیٹ تو دیکھئے یہ کہہ کر صاف الگ ہوگئے کہ صاحب کوئی کسی کی قسمت میں تو گھس ہی نہیں نکلا، ہم کیا کریں اس کی قسمت، ہائے غضب، کیا غضب کا جواب ہے، جس سے وہ مظلومہ تو درکنار غیر آدمی کے تن بدن میں بشرطیکہ تھوڑا منصف ہو آگ لگ جاتی ہے، بھلے مانسو کو قسمت کی خبر نہیں تھی، اس کی تو خبر تھی کہ خود صاحبِ معاملہ کانوں پر ہاتھ دھر رہا ہے جو ظاہراً وعادتاً اس کی علامت ہے کہ تقدیر میں بھی یوں ہی ہوگا کہ انجام اس کا پریشانی ہوگی،

غلطی کرکے تمسک بہ تقدیر کا عذر غلط ہے،

اور اگر ایسا ہی تمسک بتقدیر (تقدیر کو تھامنا) ہے تو بس کل کسی کو قتل کردیجیو، جب سزائے موت کے لئے پکڑے جاؤ تو کہدینا کہ ہم نے تو صرف ایک گولی ماری تھی، تقدیر کی کیا خبر تھی کہ ایک گولی سے مر ہی جائے گا، دیکھیں تو سہی اس عذر سے تم کو کون چھوڑدے گا، خدا نکردہ (خدا نہ کرے) اگر وہ مقتول تمھارا ہی کوئی لگتا ہو تو دیکھیں گے کہ تم قاتل کا یہ عذر قبول کرلوگے، یہ سب بیہودہ باتیں ہیں، کاش! اگر بجائے اس کے

اس وقت اپنی غلطی کا اعتراف ہی کر لیتے تو مظلوم کی کچھ تو تسلی ہو جاتی، ان بیہودہ جوابوں سے تو دُگنا اس کے زخم پر نمک چھڑکا جاتا ہے کہ ایک تو مجھ کو پھنسایا پھر کیسی صفائی سے بَری ہوتے ہیں،

پسندیدہ زمانۂ نکاح بعد بلوغ کے ہی ہے، اگر ناکح و منکوحہ نابالغ ہوں اور اچھا موقع فوت ہوتا ہو تو دوسری بات ہے اور اگر ایسی کوئی ضروری مصلحت نہیں ہے محض رسم ہی کا اتباع ہے تو خود یہ رسم مٹانے کے قابل ہے، گو نکاح صحیح ہو جاتا ہے، انکار نہیں ہے، حق تعالیٰ کا ارشاد ہے :۔

وَابْتَلُوا الْيَتَامَىٰ حَتَّىٰ إِذَا بَلَغُوا النِّكَاحَ (النساء، آیت ٦)	(اور تم یتیموں کو آزما لیا کرو یہاں تک کہ وہ نکاح کی عمر کو پہونچ جائیں ")

صاف مشیر ہے کہ پسندیدہ زمانہ نکاح کا بعد بلوغ کے ہے،

قانونِ شرعیہ سے زیادہ جامع اور مراعیِ مصالح کوئی نہیں ہوسکتا، اور اس کوتاہی کے مقابل ایک غلو ہے، جو اس وقت اکثر نو تعلیمیافتوں میں بڑھتا جاتا ہے، وہ یہ کہ خلافِ مرضی نکاح کے بعض واقعات مضرۃ (نقصان دہ) انھوں نے احکامِ شرعیہ پر طعن اور ان احکام کے مقابلہ میں یورپ کے رسم و رواج کو ترجیح دینا شروع کیا مجھ کو ان صاحبوں سے تعجب ہے کہ یہ حضرات اتباعِ فطرت و تحقیقِ واقعات (انسانی فطرت کی تقلید اور واقعات کی چھان بین) کے ازحد مدعی ہیں، اور پھر اُن کی نظر سے یہ واقعہ کیسے مخفی رہا کہ ہر قسم کے مواقع پیش آتے ہیں جن کے لئے کوئی ایک کلیہ کافی نہیں ہوسکتا اس کے لئے پورے قانون کی ضرورت ہے، جو قانونِ شرعیہ سے زیادہ جامع اور مراعیِ مصالح (مصلحتوں کی رعایت کرنے والا) کوئی نہیں ہوسکتا، چنانچہ خود جن کی یہ لوگ تقلید کر رہے ہیں یعنی اہلِ یورپ وہ خود روزانہ اس قانونِ شرعی کے استحسان کا اعتراف کرتے جاتے ہیں، پھر اُن کی نظر سے یہ فطرت کیسے مخفی رہی جس کو اللہ تعالیٰ نے سلیم المزاج طبقۂ اُناث (صحیح مزاج والی عورتوں کے طبقہ) میں ودیعت کر رکھا ہے، کہ حیاء اُن کے لب پر مُہرِ سکوت لگائے ہوتے ہے،

عورتوں میں فطری طور پر ایک حیاء کی شان پائی جاتی ہے افسوس! ان صاحبوں نے اس امر فطری کی ذرا رعایت نہیں کی اور اگر ان کی نظر میں کوئی ایسی جماعت ہو جس میں یہ امر فطری نہیں پایا جاتا اور اس وجہ سے اس کے فطری ہونے میں شبہ ہو جائے، تو جواب یہ ہے کہ علامت فطری ہونے کی یہ ہوتی ہے کہ عوارض مرتفع ہوں وہاں اس کا ظہور ہو، سو اس معیار پر اگر تحقیق کیا جاتا تو اُناث میں اس سکوت کا فطری ہونا ثابت ہوگا،

ایسا خاص طرزِ تعلیم جس سے عورتوں میں حیاء کا نام و نشان باقی نہ رہے ان کے واسطے سخت مضر ہے،

سبب اس کا خاص طرزِ تعلیم کا جو خود ہی اُناث کے لئے نامناسب ہے، ورنہ ادنیٰ درجہ کے لوگوں تک میں کہ جس میں نہ علم ہو نہ پردہ ہو ایک شانِ حیاء کی پائی جاتی ہے،

شریعتِ مقدسہ نے تمام روئے زمین کے انسانوں کے جذبات کی رعایت فرمائی ہے،

قربان جائیے شریعتِ مقدسہ کے کہ تمام روئے زمین کے اصلی جذبات تک کی رعایت احکام میں فرمائی ہے، ان اہلِ غلو میں سے بعض کی میں نے یہ حکایت سُنی ہے کہ انھوں نے اپنی ناکتخدا (کنواری) لڑکی کے نکاح کے وقت علیٰ رؤس الاشہاد (گواہوں کی موجودگی میں) اس سے پوچھا کہ فلاں شخص سے تمہارا نکاح کیا جاتا ہے، تمھاری کیا رائے ہے؟ وہ خاموش رہی، اس پر جبر کیا، کہ مار ڈالوں گا ورنہ رائے ظاہر کرو، مجبوراً بیچاری کو کہنا پڑا کہ ہاں میری مرضی ہے، سبحان اللہ، کیا خوب[1] صورتی سے رائے لی ہے، ان سے کوئی پوچھے کہ کیوں صاحب کیا سچ مچ تمھارے نزدیک اس طریقہ سے اس کا اصلی مافی الضمیر معلوم ہو گیا؟ بس اسی عقل و دانش پر شریعت پر اعتراض کئے جاتے ہیں، اگر شریعت آپ سے قانون بنوائے تو بس ایسا ہی بناؤ،

زوجین میں نکاح کے وقت سب سے زیادہ قابلِ التفات چیز دین اور سب سے کم قابلِ التفات مال و جمال ہے،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ اس زمانہ میں منکوحہ میں زیادہ تر جمال کو ناکح (نکاح کرنے والے) میں زیادہ تر مال کو دیکھتے ہیں اور سب سے کم دین کو دیکھتے ہیں اور باقی اوصاف میں آراء مختلف ہیں، حالانکہ سب سے کم قابلِ التفات یہی مال و جمال اور سب سے زیادہ قابلِ التفات دین ہی ہے، اسی واسطے حدیث میں عورت کے باب میں:

تُنْكَحُ الْمَرْأَةُ لِأَرْبَعٍ لِحَسَبِهَا وَلِمَالِهَا وَلِجَمَالِهَا وَلِدِيْنِهَا فَاظْفَرْ بِذَاتِ الدِّيْنِ تَرِبَتْ يَدَاكَ،

یعنی عورت سے چار وجہ سے نکاح کیا جاتا ہے، شرافت کی وجہ سے، مال کی وجہ سے خوبصورتی کی وجہ سے اور دینداری کی وجہ سے، اے مخاطب تجھ کو (دیندار عورت سے) نکاح کرنا چاہئے (۱۲ من المصنفؒ)۔

---

[1] اس کے برعکس شریعت نے کنواری منکوحہ کی خاموشی ہی کو رضامندی کے لئے کافی سمجھا ہے، زبان سے کہنے پر زور نہیں دیا، (احقر قریشی عفی عنہ)

اور مرد کے باب میں:

اِذَا جَآءَ کُمْ مَّنْ تَرْضَوْنَ خُلُقَهٗ وَدِيْنَهٗ فَزَوِّجُوْهُ اِنْ لَّا تَفْعَلُوْهُ تَكُنْ فِتْنَةٌ فِی الْاَرْضِ وَفَسَادٌ كَبِيْرٌ ؕ	’’یعنی اگر تمھارے پاس ایسا شخص آئے جس کے اخلاق اور دینداری کو تم پسند کرتے ہو تو تم اپنی لڑکی کا نکاح اس سے کردو، ورنہ زمین میں فتنہ اور بڑا فساد پھیلے گا،،

وارد ہے، جس میں مال و جمال پر نظر نہ کرنے کا اور دین پر نظر کرنے کا امر فرمایا ہے۔

نکاح کا مقصدِ اعظم زوجین میں باہم محبّت و مودّت اور توافق ہے،

اور وجہ بھی اس کی ظاہر ہے کیونکہ نکاح جن مصالح کے لئے موضوع اور مشروع ہے، وہ زیادہ تر سب موقوف ہیں توافق زباہمی موافقت، دوستی اور توادُد (آپس میں محبّت) پر، وَالیہ الاشارۃ فی قولہ علیہ السلام

تَزَوَّجُوا الْوَدُوْدَ الْوَلُوْدَ فَاِنِّیْ اُبَاهِیْ بِكُمُ الْاُمَمَ ،	(یعنی ایسی عورت سے نکاح کرو جو زیادہ بچے جننے والی اور زیادہ محبّت کرنیوالی ہو

کیونکہ میں قیامت کے دن تمھاری کثرت کی وجہ سے دوسری امتوں پر فخر کروں گا،،)

حتّٰی کہ توالد جو کہ غرض اعظم ہے نکاح سے، جہاں اس کے لئے صحتِ بدن و سلامتِ مزاج وغیرہ احوالِ طبیعیہ شرط ہیں وہاں بھی یہ، توادُد (محبت) ہے کہ بمنزلہ جزو اخیر علتِ تامہ کے ہے توالد کیلئے، کیونکہ وہ موقوف ہے احبال (حمل ہونے) پر اور احبال طبّاً (حکمت کی رُو سے) موقوف ہے توافق انزالین (دونوں کے ایک ساتھ انزال ہونے) پر، اور ظاہر ہے کہ وہ محبّت و مودّت پر موقوف ہے، غرض بڑا مدار مصالح کا نکاح میں توادُد ٹھیرا،

محبّت و مودّت میں بڑا دخل دین کو ہے

اور یہ یقینی بات ہے کہ توادُد میں جس قدر دخل دین کو ہے اتنا کسی چیز کو نہیں، سب علائق (تعلّقات) قطع ہوجاتے ہیں بجز دین کے، حتّٰی کہ قیامت میں جو کہ وقت ہے تمام تعلقات کے قطع ہوجانے کا،

فَلَاۤ اَنْسَابَ بَيْنَهُمْ ، (المؤمنون، آیت ۱۰۱)	(اور ان میں جو رشتے ناتے تھے اس روز نہ رہیں گے،،)
وقال تعالیٰ : وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْاَسْبَابُ ۔	
وقال تعالیٰ مَوَدَّةَ بَيْنِكُمْ فِی الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا ثُمَّ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُ بَعْضُكُمْ	(بس یہ تمھارے باہمی دنیا کے تعلقات کی وجہ سے ہے، پھر قیامت میں تمھارا یہ

بِبَعْضٍ وَّيَلْعَنُ بَعْضُكُمْ بَعْضًا ط (العنکبوت، آیت ۲۶)

حال ہوگا کہ تم میں ایک دوسرے کا مخالف ہوگا اور ایک دوسرے پر لعنت کرے گا")

یہ علاقۂ دنیویہ اس وقت بھی ختم نہ ہوگا، قال اللہ تعالیٰ:

اَلْاَخِلَّآءُ يَوْمَئِذٍۭ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ اِلَّا الْمُتَّقِيْنَ ٥ (الزخرف، آیت ٦٧)

("تمام دنیوی دوست اس روز ایک دوسرے کے دشمن ہوجائیں گے سوائے متقی لوگوں کے")

بغیر دین کے صرف مال وجمال بقاءِ محبّت کے لئے کافی نہیں

خصوص مال وجمال کہ ان کی عمر تو بہت ہی کم ہے، مال تو ایک شب میں بے وفائی کرجاتا ہے، اور جمال ایک بیماری میں ختم ہوجاتا ہے، اور بعض امراض میں پھر عُود (دوبارہ آنا) ہی نہیں کرتا، جیسے آنکھ پھوٹ جائے یا چیچک نکل آئے اور داغ نہ جائیں یا سر کے بال گرجائیں ونحو ذٰلک (اور اسی طرح دوسری بیماریاں)

پھر جب مقصود مال وجمال تھا اور وہ رخصت بلا عوض ہوگیا، تو تمام تر محبّت والفت بھی جو اس پر مبنی (قائم) تھی وہ بھی ختم ہوئی، اور پھر زوجین میں ایک دوسرے کی نظر میں مبغوض (ناپسندیدہ) ہوگیا اور نباہ ہمیشہ کے لئے مشکل ہوگیا، اور چندے (بعض اوقات) اس کو بقاء ہی رہا تب بھی جہاں دین نہیں وہاں دیکھا ہے کہ مال وجمال بقائے محبت کے لئے کافی نہیں، کیونکہ جب دین نہیں اور ظاہر ہے کہ بد دین آدمی کے نہ اخلاق درست ہوتے ہیں نہ اعمال و معاملات اور بداخلاقی و بدمعاملگی و بداعمالی کی جس میں مضاعتِ حقوق (حقوق ضائع کرنا) وخود پرستی وخود غرضی بھی آگئی، جو خاصہ ہے مبغوضیت پورا کردینے کا، پس جب شب وروز ایسے اسباب برابر واقع ہوتے رہیں گے، تو کہاں تک اُن میں محبت رہ سکتی ہے، پس باہم کدورت (رنجش) ونااتفاقی وغیظ وطیش پیدا ہونا شروع ہوگا حتیٰ کہ تمام مصالحِ زوجیت ضائع ہوجائیں گے، ہم نے خود دیکھا ہے بی بی حسن وجمال میں حور کا بچہ اور شوہر مال ومنال میں قارون کے فرزند، مگر میاں کی بد دینی سے تو اکثر اور کہیں بی بی کی بدخلقی وبدمزاجی یا بدچلنی کے سبب میاں بیوی میں بول چال تک نہیں، وہ اس کو دیکھ کر منہ پھیرلے یہ اس کو دیکھ کر ناک بھویں چڑھائے، یہ دوسری جگہ روٹی پھولتے پھریں وہ باوجود مال ہونے کے الگ ایک ایک پیسہ کو ترسے، بعض جگہ تو ہم نے دیکھا ہے کہ بی بی غایت نفرت کے سبب میاں سے پردہ کرتی ہے، یہ ثمرات ہیں بد دینی کے باوجود مال وجمال ہونے کے، پس اس کا مقصود سمجھنا ہی حماقت ہے،

دین کے ساتھ اگر مال و جمال بھی جمع ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے ، | ہاں اگر دین کے ساتھ یہ بھی ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے ، چنانچہ حدیث میں ہے اَمَّا مُعَاوِیَۃُ فَصَعْلُوْکٌ (یعنی جہاں تک معاویہ کا تعلق ہے وہ مسکین ہیں)

اور اِنِ اسْتَطَعْتَ اَنْ تَنْظُرَ اِلَیْھَا فَانْظُرْ، اوکما قال، | (اگر ہو سکے تو نکاح سے پہلے اس عورت کو دیکھ لینا)

مشیر بھی ہے ، اور ایک درجہ میں مال و جمال کی رعایت کی طرف ، لیکن غلو اس میں بھی بیشک مذموم ہے ، جیسا اوپر حدیث ہی سے ثابت ہے ،

نکاح سے قبل داماد کے مسلمان ہونے کی تحقیق ضرور کرنی چاہئے | اسی مضمون پر تفریع کے طور پر ایک یہ امر بھی قابلِ تنبیہ ہے کہ آجکل نو تعلیم یافتہ طبقہ میں بعضے لوگ ایسے آزاد اور بیباک پائے جاتے ہیں جو بلا تکلف بدولتِ تقلیدِ ملاحدہ یا بطفیل ہوا پرستی و خود رائی قطعیات (یقینی عقائد و احکام) میں مخالفانہ کلام کرتے ہیں ، کسی کو رسالت میں کلام ہے ، کسی کو نماز و روزہ کے احکام پر نکتہ چینی ہے ، کسی کو واقعاتِ یقینیہ معاد (قیامت کے یقینی واقعات) پر شبہات ہیں ، سو خوب سمجھ لو کہ :-

مِثْلُ ذٰلِکَ الرَّجُلِ کَافِرٌ وَاِنْ زَعَمَ اَنَّہٗ مُسْلِمٌ ، | (ایسا آدمی کافر ہے خواہ وہ اپنے آپ کو مسلمان ہی سمجھتا ہو)

اور مسلمہ کا نکاح کافر مرد سے نہیں ہوتا ، یا اگر مسلمان ہونے کے بعد کوئی ان امور سے کسی کا مرتکب ہوا تو کافر ہو جاتا ہے ، اور نکاح ٹوٹ جاتا ہے ، اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے ، پس بیحد ضرورت ہے کہ نکاح کے قبل داماد صاحب کے داڑھی اور فیشن کو اگر نہ دیکھو تو اس کے مسلمان ہونے کی تو تحقیق کر لیا کرو ، اور بعد نکاح ایسا امر پیش آئے تو توبہ کرا کر تجدیدِ نکاح کرا دیا کرو ، بہت مہتم بالشان (انتہائی اہمیت والا) امر ہے ،

ضرورت اور وسعت ہونے پر نکاح ثانی کرنا واجب ہے | ایک کوتاہی اس باب میں جو کہ سبب اوّل کوتاہی کے مقابل ہے یہ ہے کہ بعضے لوگ باوجود ضرورت کے اور باوجود وسعت کے نکاح..... نہیں کرتے ، بعضے تو اوّل ہی سے نہیں کرتے اور بعضے ایک بیوی کے مرنے یا طلاق دیدینے کے بعد پھر نہیں کرتے ، سو خوب جان رکھو کہ جب ضرورت یعنی نفس میں تقاضا ہو اور وسعت بھی ہو گو اس قدر ہو کہ روز کے روز کماؤں گا اور کھلاؤں گا تو نکاح کرنا اس صورت میں واجب ہے ، اور اس کے ترک سے گناہگار ہوگا ،

نکاح کس صورت میں فرض ہے | اور اگر وسعت کے ساتھ بہت زیادہ تقاضا ہے کہ بدون (بغیر) نکاح

کئے ہوئے فعل حرام میں مبتلا ہوجانے کا اندیشہ ہے تو نکاح کرنا فرض ہوگا،

وَمِنَ الْفِعْلِ الْحَرَامِ النَّظرالمحرم والاستمناء بالکف، | (فعل حرام میں نظرِ حرام اور جلق بازی بھی شامل ہے،،)

نکاح کس صورت میں سنت ہے اور کونسی صورت میں ممنوع؟ اور اگر ضرورت کا درجہ نہیں لیکن قدرت ہے ادائے حقِ زوجہ پر تب بھی سنت ہے، البتہ اگر اندیشہ ہو بی بی کے حق ادا نہ کرسکنے کا خواہ حقِ نفس خواہ حقِ مال تو ایسے شخص کے لئے البتہ نکاح کرنا ممنوع ہے،

صرف ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو تب بھی نکاح واجب ہے اور اگر ضرورت ہو اور وسعت نہ ہو اس میں اقوال مختلف ہیں، احقر قولِ وجوب کو راجح (افضل) سمجھتا ہے، اور وسعت کا تدارک محنت، مزدوری یا قرض سے کرلے، جس کے ادا کی نیت مصمم (پکی) رکھے، اور ادا کی کوشش بھی کرے، اور اگر اس پر بھی ادا نہ کرسکا تو امید ہے حق تعالیٰ اس کے مخاصم (قرضخواہ) کو راضی فرمادیں گے کیونکہ اس نے دین کی حفاظت کے لئے نکاح کیا تھا، اس میں مقروض ہوگیا تھا، مگر فضولیات کے لئے یہ قرض جائز نہیں، بلکہ صرف نان نفقہ کے لئے یا مہر کے لئے جہاں کہیں مہر کُلاًّ یا بعض (پورا یا اس کا کچھ حصہ) فوراً لیا جاتا ہو، بہرحال اس مقام پر کلام اس میں ہے کہ جب ضرورت اور وسعت دونوں ہوں تو نکاح واجب یا فرض ہوگا، پھر بھی بعض لوگ نہیں کرتے، جس کے اسباب مختلف ہیں،

نکاح کا ترک فی نفسہٖ عبادت نہیں، بعض تو نکاح نہ کرنے کو قربت و عبادت سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ اعتقاد رہبانیت اور بدعت فی الدین (دین میں نئی بات گھڑنا) ہے، اصل عمل مامور بہ شرعاً (جس عمل کا شریعت نے حکم دیا ہے) نکاح ہی ہے، تو اس کا ترک فی نفسہٖ عبادت نہیں ہوسکتا، جیسا کہ ظاہر ہے، اور بعضے بیوی کے مرنے سے..... بددل ہوکر بزعم خود تارکِ دنیا بنتے ہیں، بہرحال یہ دونوں ترکِ دنیا کا قصد کرتے ہیں، ایک ابتداء ہی سے، اور ایک بی بی کی وفات کے بعد سے،

حالتِ ضرورت میں عدمِ نکاح سے فتنِ کثیرہ میں مبتلا ہوگا حالانکہ جب حالت ضرورت کی ہے تو ترکِ نکاح سبب ہوجائیگا فتنِ کثیرہ (بہت سے فتنوں) کا، چنانچہ وساوس وخطرات کا ہجوم جو عبادات میں حلاوت وطمانیت (لذت اور اطمینان) کو بالکل ہی برباد کردے گا، یہ تو ایک حالتِ مشترکہ ہے، اور بعضے ان وساوس وخطرات سے متأثر ہوکر اُن کے مقتضا پر عمل بھی

صادر ہو جاتا ہے، چنانچہ بعض تو عورتوں سے مبتلا ہو جاتے ہیں، اور بعضے اپنے ظاہری تقدس کی حفاظت کے لئے عورتوں سے بچتے ہیں کہ اس میں آدمی جلد بدنام ہو جاتا ہے نوعمر لڑکوں سے مبتلا ہو جاتے ہیں،

نوعمر لڑکوں میں مبتلا ہونا فتنۂ عظیم ہے

اور یہ اس سے بڑھ کر فتنہ ہے، کیونکہ وہ کسی حالت میں تو محل ہے حلت کا (حلال ہونے کا مقام ہے) بخلاف اس کے محرّم محض (قطعی حرام) ہے پھر ان میں سے بعض تو اصل فعل سے بچے رہتے ہیں، مگر اس کے مقدمات میں مثل قبلہ ولمس (بوسہ اور چھیڑ چھاڑ) وغیرہ میں مبتلا ہو جاتے ہیں، جس میں دوسرے بدگمان نہ ہوں، حتیٰ کہ خود متمتع (جس سے لذت اندوز ہوا) کہ وہ اس کو بزرگانہ شفقت پر محمول کرے گا، نَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الْفِتَنِ مَا ظَهَرَ مِنْهَا وَمَا بَطَنَ (ہم اللہ سے تمام ظاہری و باطنی فتنوں سے پناہ چاہتے ہیں)۔

ترکِ دنیا سے ترکِ معصیت زیادہ ضروری ہے

تو ترکِ دنیا اتنا ضروری نہ تھا جتنا ترکِ معصیت، پس ان لوگوں کی وہی مثل ہوئی کہ گڑ کھائیں اور گلگلوں سے پرہیز، یہ اسباب تو مردوں کے ترکِ نکاح کے ہیں، خواہ نکاح اول ہو یا نکاحِ ثانی،

عورتیں باختیارِ خود بے نکاح رہنے کو ترجیح نہیں دیتیں

اور عورتیں ایسی بہت کم ہیں یا نہیں ہیں کہ باختیارِ خود دل سے بے نکاح بیٹھنے کو ترجیح دیں، اور کسی عارض (معذوری) کے سبب نکاح کی صورت نہ بن پڑے تو اور بات ہے، جیسے اس کو کوئی مرض ہے، کوئی قبول نہیں کرتا، یا دھوم دھام کے سامان کا ان کو انتظار ہے، گو یہ انتظار مذموم ہے، مگر تاہم ان لوگوں نے ترکِ نکاح کو فی نفسہٖ نکاح پر ترجیح نہیں دی، لیکن

بعضی عورتوں کا نکاحِ ثانی کو عیب یا ذلت کا موجب سمجھنا سخت قابلِ گرفت غلطی ہے

ایسی عورتیں بکثرت ہیں جو نکاحِ ثانی کے ترک کو اس کے فعل پر ترجیح دیتی ہیں، جس کا سبب بکثرت تو یہی ہے کہ وہ نکاحِ ثانی کو عیب سمجھتی ہیں، اور بعضی زبان سے بھی ایسی باتیں کہہ ڈالتی ہیں جن میں بعض باتیں تو حدِ کفر تک پہنچ جاتی ہیں، اور بعضی عیب بھی نہیں سمجھتیں لیکن اس میں کچھ شک نہیں کہ یہ عورتیں بھی بے نکاح بیٹھے رہنے کو زیادہ عزت کا سبب سمجھتی ہیں، اور یہ بھی درحقیقت ایک چھپا چور ہے، جس کا وطن اس سرحدِ کفر میں داخل نہیں، مگر اس کے جوار (قرب) میں تو ضرور ہے، ورنہ کامل مسلمان کیا درجہ کہ خلافِ سنت کو زیادہ اعزاز کا سبب سمجھے، اور بعض غریب ایسی بھی ہیں جو نکاح کو ہر طرح مستحسن سمجھتی ہیں، اس سے ذرا بھی انقباض (ناپسندیدگی) نہیں، مگر جانتی ہیں

کہ بچے ضائع ہو جائیں گے، یا یہ کہ کوئی اس کو قبول نہیں کرتا، یہ دونوں معذور ہیں، بلکہ پہلی تو ماجور (ثواب پانے والی) ہے، جیسا کہ ایک حدیث میں بھی آیا ہے،

منکوحہ کے مال پر نظر رکھنا بڑی بے غیرتی ہے،

ایک کوتاہی ناکحین (نکاح کرنے والوں) میں یہ ہے کہ منکوحہ (جس سے نکاح کرنا مطلوب ہو) کے مال کو دیکھتے ہیں، اور درحقیقت یہ اس سے بھی بدتر ہے کہ منکوحہ یا اس کے اولیاء مرد کے مال کو دیکھیں، کیونکہ یہ تو کسی درجہ میں اگر اس میں غلو نہ ہو امر معقول ہے، کیونکہ مرد پر نفقہ و مہر عورت کا واجب ہوتا ہے، تو اس پر استطاعت رکھنے کو دیکھنا مضائقہ نہیں، بلکہ ایک قسم کی ضروری مصلحت ہے، البتہ اس میں ایک قسم کا غلو ہو جانا کہ اس کو اور ضروری اوصاف پر ترجیح دی جائے یہ مذموم ہے، لیکن عورت کے مالدار ہونے پر نظر کرنا محض اس غرض سے کہ ہم اس سے منتفع (فائدہ اٹھانے والے) ہوں گے، یا ہم پر نفقات وغیرہ کا بار کم پڑے گا بڑی بے غیرتی اور بے حمیتی ہے ؎

چو باز باش کہ صیدی کنی و لقمہ دہی
طفیل خورہ مشو چوں کلاغِ بے پر و بال

اس کے علاوہ تجربہ سے معلوم ہوا ہے کہ مالدار عورت نادار مرد کو کبھی خاطر میں نہیں لاتی، اس کو حقیر اور خادم سمجھتی ہے، اور ناکح کے والدین کا اس پر نظر کرنا کہ ایسی بہو کو بیاہ کر لائیں کہ جہیز بہت سا لائے اور بھی احمق ہیں، ان کی بھی وہی مثل ہے کہ ع

چو موش بر سرِ دکانِ روستا خورسند

اوّل تو وہ جہیز مِلک بہو کا، کسی کو اس سے کیا، لیکن اگر یہ بھی سمجھا جائے کہ گھر میں رہی گا تو ہمارے بھی کام آئے گا (اس سے) اوّل تو وہی بے حمیتی (بے غیرتی) دوسرا اگر اس کو گوارہ بھی کر لیا جائے تو اس خیال کے ناکح کو تو کسی درجہ میں گنجائش ہے مگر ساس سسر کو کیا واسطہ، آج صاحبزادہ صاحب اپنی رائے سے یا بیوی کے کہنے سے جدا ہو جائیں بس ساری امیدوں پر پانی پھر جائے،

اپنے برابر والوں سے تعلق نکاح قائم کرنے سے ہر قسم کے مصالح محفوظ رہتے ہیں،

البتہ اگر منکوحہ کے زیادہ مفلس نہ ہونے پر ایک مصلحت کی تحصیل کیلئے اور ایک مضرت کے دفع کے لئے نظر کی جائے تو وہ نازیبا نہیں، بلکہ مناسب ہی، وہ منفعت تو یہی ہے کہ اکثر دیکھا گیا ہے کہ مفلس محض میں دو امر کی کمی ہوتی ہے، ایک سلیقہ کی دوسری سیر چشمی کی، پس سلیقہ کی کمی سے اس میں خدمت کی لیاقت نہیں ہوتی، اور اس سے کلفت ہوتی ہے، اور سیر چشمی کی کمی سے بعض اوقات ضروری خرچ

میں تنگی کرتی ہے جس سے بعض اہلِ حقوق کے حقوق بھی ضائع ہوتے ہیں، اور بعض مقامات پر شرمندگی بھی ہوتی ہے، کسی مہمان کو روٹی کم دیدی، کسی سائل حاجتمند کو محروم کر دیا، اور اگر وہ بچپن سے کھانے پینے، دینے دلانے، کھلانے پکانے میں رہی ہوگی تو راحت اور انتظام کی زیادہ امید ہے، اور وہ مضرت (نقصان) یہ ہو کہ بعض کو دیکھا گیا ہے کہ دفعتاً مال و دولت کو دیکھکر آنکھیں پھٹ جاتی ہیں اور اُچھلنے لگتی ہیں، اور سلیقہ ہوتا نہیں، پس بے تمیزی سے اس کو اُڑانا شروع کر دیتی ہیں، چنانچہ اکثر نو دولتوں کو یا بخل کی بلا میں مبتلا پایا یا اسراف کی، ان میں اعتدال کم ہوتا ہے، کیونکہ عادت نہیں تھی اموال سے منتفع ہونے کی جو اعتدال سیکھتی، اور اکثر دیکھا گیا ہے کہ خاوند کے گھر سے اس کو محبت نہیں ہوتی، نقد الگ، جنس الگ کبھی ظاہر میں کبھی خفیہ (چھپا کر) جس طرح بن پڑتا ہے اپنے میکے والوں کو بھرنا شروع کر دیتی ہے، اور عمر بھر یہی نزلہ بہتا رہتا ہے، اور اس سے گھر میں بے حد بے برکتی ہوتی ہے، مرد کماتا کماتا تھک جاتے مگر وہ اُڑانے سے نہیں تھکتی، اس لئے مناسب یہ ہے کہ جہاں تک ہو سکے اپنی برابر والوں میں تعلق نکاح کا کرے، تاکہ سب مصالح محفوظ رہیں، اور یوں کسی کی طبیعت ہی خاص رنگ کی ہو اس کا ذکر نہیں،

چھوٹی عمر میں نکاح کر دینے کی خرابیاں اور ایک کوتاہی بعض قوموں میں یا بعض لوگوں میں یہ ہے کہ اکثر بہت تھوڑی عمر میں شادی کر دیتے ہیں، کہ جس وقت اُن متناکحین کو کچھ بھی تمیز نہیں ہوتی، کہ نکاح کیا چیز ہے، اور اس کے کیا حقوق ہوتے ہیں، اس میں بہت سی خرابیاں نکلتی ہیں، بعض اوقات لڑکا نالائق نکلتا ہے، جس کو منکوحہ سیانی ہو کر یا اولیاء منکوحہ پسند نہیں کرتے، اب فکر ہوتی ہے تفریق کی، کوئی مسئلہ پوچھتا پھرتا ہے، کوئی بے مسئلہ پوچھے ہی دوسری جگہ نکاح کر دیتا ہے، کوئی تفریق یا خُلع کی دیوانی میں درخواست کرتا ہے، کوئی منکوحہ کو اختیارات فسخ حاصل ہونے کی تحقیق بلکہ کوشش کرتا پھرتا ہے، لڑکا ہے کہ براہِ سرکشی نہ اس کے حقوق ادا کرتا ہے نہ اس کو طلاق دیتا ہے، غرض ایک بلائے بے درماں (لاعلاج مصیبت)

۱ؐ خلع: اگر میاں بی بی میں کسی طرح نباہ نہ ہو سکے تو عورت قاضی شرع کی عدالت میں کچھ مال دے کر یا اپنا مہر معاف کر کے شوہر سے درخواست کرے کہ میری جان چھوڑ دے اور شوہر اس پر راضی ہو کر اس کے جواب میں کہو کہ میں نے تیری جان چھوڑ دی ہو، اس سے عورت پر ایک طلاق بائن پڑتی ہو، جس کے بعد مرد کو اس عورت کو روک رکھنے کا اختیار نہیں ہوتا، عورت کے اس طرح اپنی جان چھڑانے کو شرع میں خُلع کہتے ہیں، البتہ خلع کیلئے قاضی کی شرط ایک لازمی امر ہے، (احقر قریشی غفرلہٗ)

ہوگئی، بعض اوقات دونوں بچپن میں ایک جگہ کھیلتے اور لڑتے ہیں، جس کا اثر بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ ابتداء ہی سے شوہر کی وقعت (قدر و عزت) عورت کے دل میں نہیں ہوتی، اور اس کی جو خرابیاں ہیں ظاہر ہیں، اور بعض جگہ یہ ہوتا ہے کہ باہم تنافر و تباغض (آپس میں نفرت اور بغض) پیدا ہو جاتا ہے، اور چونکہ ابتداء سے دونوں ساتھ رہے تو شوہر کو کوئی خاص میلان، کیفیتِ شوقیہ کے ساتھ نہیں ہوتا، جیسا کہ بلوغ کے بعد نئی منکوحہ کے ملنے سے ہونا متوقع و مظنون ہے، اور اس قلتِ میلان کا ثمرہ بھی ہر طرح بُرا ہی بُرا ہے،

بڑی عمر کی لڑکی سے چھوٹے عمر کے لڑکے کا نکاح کردینے کے مفاسد اور خرابیاں

اور اس سے اقبح و اشنع (بہت زیادہ بُرا) یہ ہے کہ جس کا ارتکاب بعض حمقاء (محض اپنی خاندانی مصلحتوں سے، قطعِ نظر زوجین کے مصالح سے) کرتے ہیں کہ لڑکا چھوٹا اور لڑکی بہت بڑی، اب لڑکی تو پہلے... جوان ہوگئی، اور لڑکا ابھی چُوں چُوں کا بچہ ہے، بلکہ کہیں اتنا تفاوت (فرق) ہے کہ لڑکا اس کی گود کے کھلانے کے لائق ہے، ان بے عقلوں نے یہ تو دیکھ لیا کہ آپس میں رشتہ ہو جائے آگے کو بھائی بہن کی اولاد میں تعلق و ارتباط رہے، مگر یہ نہ دیکھا کہ ان سب تعلقات و ارتباطات کی اصل بنیاد زوجین کا توافق ہے، اور اس صورت میں خود اسی کی امید نہیں، چنانچہ ایسے مواقع پر دیکھا گیا ہے کہ لڑکی میں جوانی کا تقاضا پیدا ہوگیا اور لڑکا کسی قابل ہی نہیں، پس یا تو وہ اور کسی سے خراب و خستہ ہوگئی، یا گھٹ گھٹ کر مدقوق (تپِ دق میں مبتلا) ہوگئی، اور پھر وہ اگر جوان بھی ہوا تو اس کے جوڑ کا نہیں، ابتدائی تنافر (باہمی نفرت) کا اثر موجود، اور اس سے بڑھ کر ناکح کی وقعت مفقود (شوہر کی عزت ختم)

بعض جگہ کم سنی میں تناکح (نکاح کرنے سے) یہ ہوا کہ بعد جوان ہونے کے وہ لڑکی اس لڑکے کو پسند نہیں، وہ اپنے لئے کہیں اور تلاش کر لیتا ہے، اور اس کی نہ خبر گیری کرتا ہے نہ طلاق دیتا ہے، خبر گیری کی نسبت تو عذر کر دیتا ہے کہ مجھ کو خبر ہی نہیں کہ میرا نکاح کب ہوا؟ جنہوں نے کیا وہ ذمہ دار ہیں، اور طلاق دینے کو عرفاً عار سمجھتا ہے، پس وہ عورت ازیں سو راندہ ازاں سو ماندہ[1] کی مصداق ہو جاتی ہے، کیا ان خرابیوں سے بچنے کی کوشش کرنا ضرور نہیں؟

بعد بلوغ اور درستیِ عقل کے نکاح میں سلامتی ہے،

جس کا سیدھا طریقہ یہ ہے کہ بعد بلوغ اور درستیِ عقل کے نکاح کیا جائے تاکہ جس کا معاملہ ہے وہ اس کو سمجھ لے،

---

[1] یعنی وہ عورت ایک طرف سے دھتکاری گئی اور دوسری طرف سے چوٹ کھا گئی، ۱۲

منکوحہ کے نو تعلیم یافتہ ہونے کو دیکھنا غلطی ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ جس طرح بعض لڑکے کے ایف اے۔ ایم اے ہونے کو دیکھتے ہیں افسوس ہے کہ بعضے نئے مذاق کے لوگ منکوحہ ایسی تلاش کرتے ہیں جس نے نئی تعلیم حاصل کی ہو، یا تعلیم کے ساتھ ڈاکٹری یا پروفیسری کا پاس بھی حاصل کر چکی ہو، کوئی ان عقلاء سے پوچھے کہ اس سے مقصود کیا ہے، ؟ اگر یہ ہے کہ ان کا بار ہم پر کم ہو، یہ خود بھی کمانے میں امداد دیں تب تو بے حد بے حمیتی ہے، کہ مرد ہو کر عورت کے ہاتھ کو تکا جائے، عورت کا ممنون ہونا تو بدون خلوص کامل کے خود خلافِ غیرت ہے،

مہر کو معاف کر دینے کے باوجود ادا کر دینا ہی مناسب ہے

وہ اگر مہر بھی معاف کر دے تو حتی الامکان اس معافی کو قبول نہ کرے اس کو ادا ہی کر دے، حق تعالیٰ نے ایک آیت میں اس طرف بھی اشارہ فرمایا ہے:-

فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ (فیسقط النصف)[1] اَوْ يَعْفُوَ الَّذِىْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (ای الزوج بان یؤدی تاماً) وَاَنْ تَعْفُوْٓا (ایہا الرجال) اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (والیق لشانکم لکونکم رجالاً)۔	(تو جتنا مہر تم نے مقرر کیا ہو اس کا نصف واجب ہے (پس آدھا مہر ساقط ہو جائیگا) یا کہ وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کا تعلق رکھنا اور توڑنا ہے (یعنی خاوند پورا مہر ادا کر دے) اور تمھارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنیکے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے (اور مرد ہونے کی شان کے لائق تمھارا درگذر کرنا زیادہ لائق ہے"))

شوہر کی خواہش وغیرہ کے بغیر عورت اگر خلوص کامل سے اسکی کوئی مالی خدمت کرے تو اس کا مضائقہ نہیں

البتہ اگر خلوصِ کامل سے شوہر کی کچھ خدمت کی جائے بدون اس کے کہ شوہر کو اس کی خواہش یا اس پر نظر یا اس کی نگرانی و انتظار ہو تو مضائقہ نہیں، وہو معنی قولہ تعالیٰ:-

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰى، (الضحیٰ، آیت ۸)	("اور اللہ تعالیٰ نے آپ کو نادار پایا، سو مالدار بنا دیا،")
واشتراط عدم التطلع والتشرف	("اور اطلاع و انتظار نہ ہونا شرط ہے جیسا کہ

---

[1] نصف مہر اس وقت ساقط ہوگا جبکہ عورت کو نکاح کے بعد قبل صحبت اور خلوت صحیحہ طلاق دیدے، (احقر قریشی)

بقولہ علیہ السلام مَا آتَاكَ مِنْ غَيْرِ إِشْرَافٍ فَخُذْهُ وَ مَا لَا فَلَا تُتْبِعْهُ نَفْسَكَ او کما قال

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، جو کچھ تمہارے پاس ہو بغیر اشراف نفس کے آجائے اسے لے لو، اور جو تمہارے پاس نہیں آتا نفس کو اس کے پیچھے مت لے جاؤ "،

عورت صرف سلیقہ سے اپنی شوہر کی خدمت نہیں کرسکتی بلکہ اس کے لئے اس میں خدمتگذاری وغیرہ کا مادّہ ہونا ضروری ہے،

اور اگر یہ مقصود ہو کہ ایسی عورت سلیقہ دار ہوگی ہم کو راحت زیادہ پہنچائے گی، سو خوب سمجھ لو، راحت رسانی کے لئے صرف سلیقہ کافی نہیں، بلکہ اطاعت وخلوص وخدمت گزاری کے مادّہ (جذبہ) کی اس سے زیادہ ضرورت ہے، اور سلیقہ میں کچھ کمی بھی ہو تو اس کو برداشت کرلیا جاتا ہے، اور گو کسی قدر وقتی کلفت ہوتی ہے لیکن وہ بہت جلد دفع ہوجاتی ہے اس کا اثر باقی نہیں رہتا، اور اگر نرا سلیقہ ہو اور وہ اوصاف نہ ہوں تو اوّل تو وہ خدمت ہی کیوں کرے گی؟

عورتوں کو انگریزی تعلیم دینے سے ان میں بہت سے اخلاقِ ذمیمہ پیدا ہوجاتے ہیں،

کیونکہ تجربہ سے اس تعلیم جدید کا اثر خاصکر اگر عورتوں کو یہ تعلیم دی جائے کہ وہ فطرۃً ہی ضعیف العقل وضعیف القلب (کم عقل اور کمزور دل) ہوتی ہے، جس کے لئے زیادہ زیادتِ تأثر (اثر قبول کرنا) لازم ہے، یہ ثابت ہوا ہے کہ اس سے تکبر وخود غرضی وخود رائی وبے باکی وآزادی وبیحیائی وچالاکی ونفاق وغیرہ اخلاقِ ذمیمہ (بُرے اخلاق) جو تمام اخلاقِ ذمیمہ کی جڑ ہیں، پیدا ہوتے ہیں، پس جب ان کا دماغ تکبّر ونخوت سے پُر ہے تو وہ تمہاری خدمت ہی کیوں کرے گی؟ جس سے تم کو راحت پہونچے،

نو تعلیم یافتہ عورت بجائے شوہر کی خدمت کرنے کے اس سے خدمت لینے کی طالب ہوگی،

بلکہ برعکس بوجہ خود غرضی کے وہ خود تم ہی سے اپنے حقوق کا اعلیٰ پیمانہ پر مطالبہ کرے گی، جس سے تمہاری عافیت (سلامتی) تنگ ہوجائے گی، غرض وہ خود تم ہی سے اپنی خدمت چاہے گی، اور اگر تم اُن سے وہ خدمتیں چاہوگے بھی جو ایک شریف سادہ طبیعت کی عورت اس کو اپنا فخر سمجھتی ہے تو وہ تم کو ضابطہ کا جواب دیں گی کہ یہ کام ہمارے ذمّہ نہیں، بلکہ جو ان کے ذمہ بھی قاعدہ سے ہوگا، اس میں بھی خلاف تہذیب ہونے کا یا مخلِ صحت (صحت خراب کرنے) کا عذر کرکے ٹکا سا جواب دیں گی، اور اپنے حقوق تم سے پورے وصول کرینگی

تنخواہ تم سے کُل رکھوالیں گی، اور تین پانچ (ٹال مٹول) کروگے تو عدالت پہنچیں گی، اور اگر کہو کہ یہ بہت کم ہوتا ہے تو جواب میں عرض کروں گا کہ پھر وہ تعلیم یافتہ نہیں ہے، اور اگر کہو کہ ہم ایسی تعلیمیافتہ نہیں چاہتے تو خیر وہ بے شک اس قدر خطرناک نہ ہوگی، لیکن آزادی، بے حیائی، مکر و فریب، چالاکی، اور نفاق تو تمغۂ مشترکہ (سب کا مشترک اعزازی نشان) ہے جو پوری اور ادھوری تعلیم سب میں ہے، تو اس کے خطرات بھی ایک شریف اور غیور آدمی کے لئے کچھ کم نہیں ہوں گے،

اگر عورت میں سب ہنر ہوں اور حیاء نہ ہو تو وہ صحیح معنوں میں عورت نہیں،

میں تو یہ کہتا ہوں کہ اگر عورت میں کوئی ہنر نہ ہو لیکن حیاء ہو تو وہ اور کچھ نہیں مگر عورت تو ہے، اور اگر سب ہنر ہوں لیکن حیاء نہ ہو تو وہ سب کچھ ہے مگر عورت نہیں، اور نکاح کے مصالح کے لئے چاہئے عورت، جب وہ حکماً عورت ہی نہیں تو پھر اس سے مصالح نکاح کیسے حاصل ہوں گے پھر نکاح سے کیا فائدہ؟ بالائی مصالح کے لئے چار مہذب نوکر رکھ لو، اور آب ریزی (شہوت کی ہوس پوری کرنے) کے لئے اہلِ فرانس نے بہت سے طریقے ایجاد کردیئے... اُن پر کفایت کرلو، رہی اولاد سو وہ اختیار ہی سے خارج ہے، اس کی فکر ہی کیا؟ پھر وہ ہر بدہنر عورت سے بھی حاصل ہوسکتی ہے، اس کے لئے اتنی کِنج دکاو (جستجو اور تلاش) بیکار ہے، اور اس کی کیا ضرورت ہے کہ سب مصالح ایک ہی شخص سے حاصل ہوں، غرض نکاح میں مصالحِ نکاح کی رعایت سب سے مقدم ہے، جو عورت کی بیحیائی کے ہوتے ہوئے سب گرد ہے،

عورتوں میں دینی تعلیم کا ڈھونڈھنا ضروری ہے،

البتہ اگر عورتوں میں دینی تعلیم ڈھونڈی جائے تو وہ علومِ دینیہ کی تعلیم ہی، جو انسان کو مہذب کامل بنادیتی ہے، جبکہ اس پر عمل کرے، اور غالب یہ ہی کہ جب علمِ دین حاصل ہوتا ہے تو کبھی نہ کبھی عمل کی بھی توفیق ہو ہی جاتی ہے، سو اگر بے عملی سے فرضاً (فرض کرو) کچھ کلفت بھی ہوئی تو وہ دائمی نہ ہوگی، عارضی ہوگی، جو ایک منٹ میں ختم ہوسکتی ہے، غرض اصل تعلیم قابلِ اہتمام تعلیمِ دینی ہے،

دینی تعلیم سب تہذیبوں کی جڑ ہے،

اور اس کے اساس التہذیب (تہذیبوں کی جڑ) ہونے کی وجہ یہ ہے کہ اس سے خدا تعالیٰ کا خوف پیدا ہوتا ہے، اور جس کے قلب میں خدا کا خوف ہوگا وہ اس قدر چھوٹی چھوٹی باتوں کا خیال رکھے گا کہ اس سے احتمال ہی نہیں ہوگا کہ وہ کسی کا ذرا حق ضائع کرے، یا کسی کو اس سے تکلیف پہونچے، یا وہ اپنی غرض کو دوسرے کے حق پر

مقدم کرے، یا کسی کی بدخواہی کرے، یا کسی کو دھوکا دے، اور اس سے بڑھکر کونسی تہذیب ہوگی؟

آجکل کی تہذیب تو تعذیب ہی؛ اور جس کا نام آجکل تہذیب رکھا گیا ہی جس کا حاصل تصنّع وتلبیس وخداع ونفاق (بناوٹ، اپنا عیب چھپانا، دھوکہ دینا اور منافقت) ہے، وہ سراسر تعذیب (عذاب دینا) ہے، جس کا پایا جانا عورت میں اس کو اس شعر کا مصداق بناتا ہے ؎

زنِ بد در سرائے مرد نکو ❊ ہم دریں عالم است دوزخ او

(بُری عورت نیک مرد کے گھر میں بعینہٖ اس عالم میں اس کے لئے دوزخ ہے)

اس تقریر سے بعض اجزائے تعلیم نسواں کے متعلق بھی حل ہوگئے، اور مکمل بحث اس کی ایک مستقل تقریر میں بندہ نے لکھی ہے، جو القاسم شوال ۱۳۳۱ھ کے پرچہ میں شائع بھی ہوچکی ہے،

عورتوں کو علم دین گھر پر ہی پڑھانا چاہیئے؛ جس کی روح دو امر ہیں، ایک یہ کہ اُن کو صرف علمِ دین پڑھایا جائے دوسرے یہ کہ یہ تعلیم خاص طرز سے متفرق طور پر گھروں میں ہونا چاہیئے، مدارس کے طرز پر مجتمع طور پر نہ ہونا چاہیئے، کہ شریعت نے بلاضرورتِ شدیدہ اُن کے اجتماع وخروج عن البیوت (گھروں سے نکلنے) کو پسند نہیں کیا، اور واقعات نے بھی اس کے مفاسد ایسے دکھلائے کہ بجز متعامی (خود اندھا بننے والے) کے اعمٰی (اندھے) نے بھی ان کو دیکھ لیا، اور راز اس میں یہ ہی کہ اس اجتماع کو جس درجہ کی نگرانی کی ضرورت ہے وہ عورتوں سے بن نہیں پڑتا کہ وہ خود مُستتر (پردے میں رہنے والی) ہیں، اور مردوں کے دخل میں وہ نگرانی پھر کہاں رہی، کہ اس نگرانی کا حاصل یہی عدمِ اختلاط بالرّجال (مردوں سے میل جول نہ رکھنا) تو تھا ہی، تو نگرانی تو کم اور خروج عن البیت کے بعد مواقع فساد میں وسعت ہوگئی، دوسرے معلّمہ اگر شریف ومتدین وشفیق وذی اثر وبادجاہت وبارعب ہو تو اس کا نوکر رکھنے کے لئے میسّر ہونا قریب بہ محال اور رجو نوکر رکھنے کے لئے مل سکتی ہے وہ ان اوصاف سے معرّٰی (خالی) جس کی صحبت مُردوں سے زیادہ خطرناک، خیر یہ جملۂ معترضہ استطراداً (بر سبیل تذکرہ) آگیا، اصل بحث یہ ہے کہ منکوحہ میں تعلیم پر نظر کرنا کیسا ہے؟

نو تعلیم یافتہ ہونے سے عورت کا بے علم ہونا اچھا ہے، اصل بات یہ ہے کہ اگر اس میں علم دین ہو تو نورٌ علیٰ نور ہے، اور اگر علم دین نہ ہو تو اس کا بے علم ہونا یقیناً اس کے نئے علوم کے عالم ہونے سے اسلم (محفوظ ترین) اور بے خطر ہے، کیونکہ بے علم میں اگر اخلاقِ حمیدہ نہ ہوں گے تو وہ اخلاقِ رذیلہ جو جڑ ہیں تمام اخلاقِ رذیلہ اور افعالِ ذلیلہ کی وہ بھی تو نہ ہوں گے، تو اس مصرعہ کا مضمون ہاتھ آئیگا،

۶ "مرا بخیر امید نیست و بد مرساں"

(یعنی مجھے آپ سے بھلائی کی توقع اور امید تو نہیں ہے، لیکن بدی بھی تو نہ پہونچاؤ)

نکاح کے لئے اخبارات میں ناکح و منکوح کی اشتہار بازی مذموم ہے،

آجکل تو یہ طوفان ہو گیا کہ اشتہاری دواؤں کی طرح ناکح و منکوح کے اشتہار بھی اخبار وں میں چھپنے لگے ... کبھی ناکح صاحب اعلان کرتے ہیں کہ ہمارے پاس یہ جائداد، یہ نوکری یہ کمالات ہیں، اور ہم کو ان اوصاف کی منکوحہ چاہیئے، جس کو منظور ہو ہم سے خط و کتابت کرے، پھر اس کے جواب میں کوئی بی بی صاحبہ اخبار میں یا خاص طور پر جواب لکھتی ہیں اور اپنا جامع اوصاف اور حسین ہونا اپنے بے شرم قلم سے لکھتی ہیں، اور کچھ شرطیں کرتی ہیں، بس اسی طرح خط و کتابت ہو کر کبھی سودا بن جاتا ہے کبھی نہیں بنتا، کبھی نکاح سے پہلے ہی دو چار ملاقاتیں ہو جاتی ہیں، تاکہ تجربہ و لصیرت کے بعد نکاح ہو، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن، ... کیسی آفتیں نازل ہو رہی ہیں اَللّٰھُمَّ اِنَّا نَعُوْذُ بِكَ مِنَ الْفِتَنِ مَاظَھَرَ مِنْھَا وَمَا بَطَنَ (اے اللہ ہم تجھ سے فتنوں سے پناہ مانگتے ہیں جو اُن میں سے ظاہر ہیں اور جو پوشیدہ ہیں)۔

عاقلہ بالغہ کا بلا ضرورت از خود نکاح کرنا مذموم ہے،

اس میں کلام نہیں کہ عاقلہ بالغہ خود اپنے نکاح کی بات چیت ٹھہرالے اور ایجاب و قبول کرلے تو نکاح منعقد ہو جائے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ آیا بلا ضرورت و بلا مصلحت معتد بہا ایسا کرنا کیسا ہے، سو یہ امر نہ شرعاً محمود (پسندیدہ) ہے نہ عقلاً، شرعاً تو اس لئے کہ تخریج زیلعی میں دار قطنی و بیہقی سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد روایت کیا ہے:

لَا تُنْكِحُوا النِّسَاءَ اِلَّا مِنَ الْاَكْفَاءِ وَلَا يُزَوِّجْهُنَّ اِلَّا الْاَوْلِيَاءُ وَلَا مَهْرَ اَقَلَّ مِنْ عَشَرَةِ دَرَاهِمَ

(دار قطنی و بیہقی)

"یعنی عورتوں کا نکاح نہ کرو مگر ان کے کفو میں اور ان کی شادی نہ کرو مگر ان کے ولی کی موجودگی میں، اور اُن کا مہر دس درہم سے کم مقرر نہ کرو"،

گو بوجہ دوسری حدیث کے:—

اَلْاَيِّمُ اَحَقُّ بِنَفْسِهَا مِنْ وَلِيِّهَا، (رواه مسلم وابوداؤد والترمذی والنسائی ومالك فی الموطا لَا يُزَوِّجْهُنَّ)۔

"یعنی بالغ عورت اپنے نکاح کے معاملہ میں، اپنے ولی سے زیادہ حقدار ہے"،

کو نہی کہیں گے نفی نہ کہیں گے جو کہ مستلزم ہو عدمِ صحت کو لیکن نہی بھی تو عمل ہی کے واسطے ہے، اور کوئی باطنی راز ہے، جس کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے توسط اولیاء کا تجویز فرمایا ہے، اگرچہ ہم کو اس کی لِم بھی معلوم نہ ہو،

بزرگوں کے تجویز کردہ نکاح میں آثارِ برکت ہوتے ہیں؛

مگر ہمارے پاس دلیل اِنّی ہے جس سے معلوم ہوتا ہے کہ کوئی بات اس میں ضرور ہے، اور وہ دلیل اِنّی یہ ہے کہ ہم نے جو آثارِ برکت کے بزرگوں کے تجویز کئے ہیں نکاح میں دیکھے ہیں وہ اُس نکاح میں نہیں دیکھے جو براہِ راست خود زوجین کر لیتے ہیں، باقی خاص خاص مواقع ضرورت مستثنیٰ ہوا ہی کرتے ہیں، اور عقلاً اس لئے محمود نہیں کہ ظاہر ہے کہ بلا ضرورت شدیدہ خود نکاح کی بات چیت یا خط و کتابت کرنا دلیل اس کی وقاحت (بیحیائی) کی ضرور ہے،

وَإِذَا فَاتَكَ الْحَيَاءُ فَافْعَلْ مَا شِئْتَ

(یعنی جب تم میں حیاء کا مادہ نہ رہا تو بس جو چاہے کرو ع بے حیا باش وہرچہ خواہی کن) کے موافق قلیل الحیاء آدمی سے جو رذیلہ بھی صادر ہو جائے بعید نہیں، عاقل آدمی کو ایسی عورت سے بچنے کے لئے یہی علامت کافی ہے کہ وہ بے حیاء ہے،

متدین آدمی کا بازاری عورت سے نکاح کرنا خلافِ احتیاط ہے

اس جگہ سے معلوم ہو گیا ہوگا کہ بعضے آدمی بازاری عورتوں سے نکاح کر لیتے ہیں، گو نکاح بھی ہو جاتا ہے، اور بلا وجہ اس پر بدگمانی بھی نہ چاہئے کہ یہ اب بھی بے قید و آوارہ ہے، لیکن اس میں بھی شک نہیں کہ متدین آدمی کے لئے خلافِ احتیاط ضرور ہے، اسی واسطے شریعتِ غرّا نے ایک درجہ اس کو نامناسب قرار دے کر قانون مقرر فرمایا ہے،

اَلزَّانِیْ لَا یَنْكِحُ اِلَّا زَانِیَةً اَوْ مُشْرِكَةً وَّالزَّانِیَةُ لَا یَنْكِحُهَاۤ اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِكٌ ۚ وَحُرِّمَ ذٰلِكَ عَلَى الْمُؤْمِنِیْنَ ۝ (النور، آیت ۳)

("یعنی زانی نکاح بھی کسی کے ساتھ نہ کرے بجز زانیہ اور مشرکہ کے اور اسی طرح زانیہ کے ساتھ اور بھی کوئی نکاح نہ کرے بجز زانی یا مشرک کے اور یہ (یعنی ایسا نکاح) مسلمانوں پر حرام اور (موجبِ گناہ) کیا گیا ہے")

گو عمومِ نصوص و اطلاقِ دلائل سے یہ تحریم نفی کے درجہ میں نہیں کہ نکاح منعقد ہی نہ ہو، بلکہ نہی کے درجہ میں ہے، اور نہی بھی بالذات نہیں کہ یہ نکاح معصیت ہو بلکہ لغیرہ بعارض لزوم

دیوثیت کے ہے، اور اسی لئے یہ تحریم اس صورت میں ہے۔ کہ اس نے توبہ نہ کی ہو، اور توبہ کی صورت میں یہ تحریم لغیرہ بھی نہیں، لیکن جب کہ اس کی ناپسندیدگی کا مدار اس کا زانیہ ہونا ہے، سو وہ جہاں متیقن ہوگا وہاں ناپسندیدگی اقویٰ درجہ میں حرمت ہوگی، اور جہاں محتمل ہوگا وہاں ناپسندیدگی خفیف درجہ خلاف اولیٰ میں ہوگی، اور حدیث:

تَخَيَّرُوْا لِنُطَفِكُمْ

میں اس کی صریح تائید ہے، کہ کسی نبی کے واسطے اللہ تعالیٰ نے ایسی عورت بھی پسند نہیں فرمائی جو اس میں کبھی بھی ملوث ہوئی ہو، گو توبہ ہی کرلی ہو، اور یہی معنی ہیں اس آیت شریفہ کے:

وَالطَّيِّبَاتُ لِلطَّيِّبِيْنَ .....، | ("پاکیزہ عورتیں پاکیزہ مردوں کے لئے ہیں")

البتہ اگر توبہ خالص کرے جس سے وہ احتمال نہ رہے اور اس کو کوئی قبول نہ کرے تو اس کی عفت کی حفاظت کے لئے یا جبکہ اس شخص کو اس سے تعشق (عشق ومحبت) ہو تو یہ محل اس سے مستثنیٰ ہے، لعموم قولہ علیہ السلام:

لَمْ يُرَ لِلْمُتَحَابِّيْنَ مِثْلُ النِّكَاحِ

نکاح سے متعلق بعض ایسی کوتاہیاں جن کا تعلق مسائل فقہیہ سے ہے

اب نکاح کے متعلق بعض وہ کوتاہیاں مذکور ہوتی ہیں جن سے زیادہ تر مسائل فقہیہ کا تعلق ہے۔

خفیہ نکاح خلافِ سنت ہے | ان میں سے ایک کوتاہی گو درجۂ ترکِ واجب میں نہیں یہ ہے کہ بعض لوگ بمصلحتِ نفسانیہ خفیہ نکاح کر لیتے ہیں، جس میں ایک خرابی تو یہ ہے کہ یہ سنت کے یقیناً خلاف ہے، حدیث میں مصرح ہے:

اِعْلِنُوْا هٰذَا النِّكَاحَ ... | "اس نکاح کا اعلان کرو......"

اور جن ائمہ کے نزدیک اعلان شرطِ نکاح ہے ان کے نزدیک ایسا نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، تو ان کے نزدیک واجب کا بھی ترک ہے، جو ترک سنت سے بھی اشد ہے، اور گو ہمارے نزدیک اس نکاح کا انعقاد ہو جاتا ہے جبکہ اس میں ضروری شہود (گواہ) ہوں، یعنی دو مرد یا ایک مرد اور دو عورت، مگر تاہم علماء کے اختلاف میں بلاوجہ پڑنا خود ناپسندیدہ ہے خصوص معاملہ بضع (شرمگاہ) میں، کہ اس میں (شرمگاہ میں) اصل حرمت ہے، تو یہ دوسری خرابی ہوگئی، اور تیسری خرابی یہ ہے کہ ایک مفسدۂ عظیمہ (بہت بڑی خرابی) کی طرف مفضی (پہنچانے والا) ہے، یعنی یہ طریقہ اگر معمول بہ

ہو جائے تو بہت سے مرد عورت زنا میں مبتلا ہونے کے بعد جب حمل رہ یا کسی کو اطلاع ہو جانے سے رسوائی ہوتے دیکھیں گے بہت آسانی سے خفیہ نکاح کے دعوے کی آڑ لے لیا کریں گے، اور اس کے قبائح و فضائح (برائیاں اور خرابیاں) ظاہر ہیں کہ کس قدر کبیر اور کثیر (بڑی اور زیادہ) ہیں، چوتھی خرابی یہ ہے کہ بعض عوام کو خود بھی معلوم نہیں کہ ادنیٰ درجہ شہادت کا صحتِ نکاح میں کیا ہے، جب وہ کسی خفیہ نکاح کو سنیں گے، اور خفیہ ہونے کے سبب اُن کو گواہوں کا عدد معلوم نہ ہوگا عجب نہیں کہ اس کے معنی نکاح بلا شہود دے کر شہادت کے شرط نہ ہونے کا اعتقاد کریں اور کسی موقع پر اس پر عامل بھی ہو جائیں، تو اس میں اعتقادی و عملی دونوں خرابیاں جمع ہو گئیں تو اس میں چوتھی کے ساتھ پانچویں خرابی بھی آگئی، خصوص اس زمانے میں جہل بسیط سے بڑھ کر جہل مرکب شائع ہے،

نکاح، معاملاتِ بیع و شراء میں سے نہیں،

چنانچہ خاص اس مسئلہ اشتراطِ شہود (گواہوں کے شرط ہونے) میں بھی افسوس ہی کہ بعض متجرّئین (جری قسم کے لوگ) کلام کرنے لگے، ایک شخص کا تو یہ مقولہ سنا گیا ہے کہ شہودِ نکاح میں شرط مقصود نہیں، اصل شرط تراضیِ جانبین ناکح اور منکوحہ کا راضی ہونا) ہی، کیونکہ بعد تراضی کے احیاناً (بسا اوقات) انکار تراضی کا بھی احتمال تھا، قطع نزاع (جھگڑا ختم کرنے) کے لئے شہود کا حکم کیا گیا تاکہ اختلاف رفع ہونے میں آسانی ہو، ورنہ نفسِ حِل وصحتِ نکاح شہود پر موقوف نہیں، انتہی کلام الشنیع،

اور ایک شخص کا یہ مقولہ معلوم ہوا کہ نکاح بھی مثل معاملاتِ بیع و شراء (معاملاتِ خرید و فروخت) کے ایک معاملہ ہے، پس جس طرح دوسری چیزوں کا لین دین باہم متعاقدین (معاملہ کرنے والوں) کی رضا سے ہوتا ہے، اسی طرح اس میں بھی اس کو کافی سمجھا جائے گا، پس عورت سے نکاح کرنا مثل گائے اور بکری کے خرید لینے کے ہے، انتہی مقولہ الفضیح،

اس شخص نے شرطِ شہود کو بالکل حذف کر دیا، پس پہلے شخص کا قول تو الحاد (بے دینی) تھا، اور یہ زندقہ (کفر) ہے، جو الحاد سے اشد ہی، اور ان دونوں قولوں کے ابطال (باطل ہونے) کے لئے اتنا کافی ہے کہ یہ رائے محض ہی، بمقابلہ نصِ صریح اور اجماع کے، جو احد الامرین یعنی شہادت یا اعلان کے اشتراط پر منعقد ہے، پس غیر مسموع (غیر معتبر) ہے

جہلِ مرکب کی ستیات سے ایک مثال

.... حسّیات (محسوس کی جانے والی چیزوں) میں اس کی ایسی مثال ہے جیسے کسی جاہل گنوار سے جس کی بغل میں دو من

پختہ کشمش کا بورہ تھا، ریل میں جب ڈپٹی کلکٹر نے بلٹی مانگی تو اس نے پھر اپنا ہی ٹکٹ پیش کر دیا اس نے کہا اس کا ٹکٹ الگ لاؤ، اس نے جواب دیا یہی اس کا ٹکٹ بھی ہے، بابو نے کہا اس ٹکٹ میں پندرہ سیر سے زیادہ لے جانے کی اجازت نہیں ہے، اس نے جواب دیا کہ نہیں جتنا جو شخص آسانی سے اٹھالے وہی اس کا پندرہ سیر ہے، تم لوگ ضعیف ہو پندرہ سیر سے زیادہ نہیں اٹھا سکتے ہم قوی ہیں ہم زیادہ اُٹھا سکتے ہیں، پس اس گنوار کے قول کے اگر یہ معنی ہیں کہ پندرہ سیر کا قانون تو ٹھیک ہے مگر معلّل ہے علتِ مذکورہ سے تو اس کا جواب مشابہ ہے قائلِ اوّل کے قول کے، اور اگر یہ معنی ہیں کہ قانون ہی لغو ہے تو مشابہ ہے قائل ثانی کے قول کے، اور دونوں حال میں کیا قانون کے مقابلہ میں اس کا قول مانا جا سکتا ہے؟ یہی حال سمجھ لیجئے ان دونوں قولوں کا۔

بہرحال یہ کیفیت ہے اس زمانہ میں جہلِ مرکّب کے شیوع (عام ہونے) کی، پس خفیہ نکاح کرنے میں چونکہ شہود کی اطلاع عام نہ ہوگی بہت قریب ہے کہ اس کو نکاح بلا شہود سمجھا جائے اور ان دونوں اقوالِ باطلہ کے قائلین اس سے اپنی رائے کی تائید کا کام لیں، اور ظاہر ہے کہ الحاد و زندقہ کا مؤیّد بننا گو بالتسبّب (سبب بننے کے ساتھ) ہی ہو بالمباشرت (عملاً) نہ ہو کیسا امرِ قبیح ہوگا، یہ چھٹی خرابی ہوگئی،

خط و کتابت کے ذریعہ ایجاب و قبول کرنے سے نکاح صحیح نہیں ہوتا

بعضے لوگ اس مسئلۂ شہود کے متعلق ایک جہلِ بسیط میں مبتلا ہیں، اور اس جہل پر عمل بھی کرنے لگے، وہ یہ کہ بعضے مرد و عورت دونوں محض خط و کتابت سے ایجاب و قبول کر لیتے ہیں، اور اس کو کافی سمجھتے ہیں، پھر بعضے تو صرف اپنے ہی خطوط پر اکتفاء کر لیتے ہیں، اور بعضے اپنے مضمون پر دو گواہوں کے بھی دستخط کرا دیتے ہیں، اور نکاح کو صحیح سمجھ لیتے ہیں، حالانکہ دونوں صورتوں میں نکاح صحیح نہیں ہوتا، صورتِ اوّل میں تو بوجہ عدمِ شہود (گواہ نہ ہونے) کے اور صورتِ ثانیہ میں اس لئے کہ شہود میں حسبِ تصریحِ فقہاء یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایجاب و قبول کے الفاظ کو ایک ہی مجلس میں سُن بھی لیں، غرض دونوں صورتوں میں نکاح صحیح نہیں ہوگا، پس خفیہ نکاح میں ان دونوں غلطیوں کی بھی تقریب ہے، یہ ساتویں خرابی ہوگئی،

خفیہ نکاح کی ایک نئی ایجاد جو سراسر معصیت اور ضلالت ہے

بعضے لوگوں نے خفیہ نکاح میں ایک اور ایجاد کی ہے اور بزعم خود سب گناہوں سے بچنے کی پوری تدبیر کر لی ہے، اور یہ خبر نہیں کہ: فَرَّ مِنَ الْمَطَرِ وَقَفَ تَحْتَ الْمِيزَابِ (یعنی بارش سے بھاگے اور پرنالے کے نیچے آکر کھڑے ہوگئے)۔

کے مصداق بنے ہیں، اور وہ ایجاد یہ ہے کہ نکاح بلا شہود تنہائی میں اس شرط پر کر لیتے ہیں کہ صحبت وغیرہ کچھ نہ ہوگی، خالی نکاح کئے لیتے ہیں، تاکہ تنہائی میں بیٹھنا، ایک دوسرے کو دیکھنا، باہم ہنسنا بولنا یہ امور جائز ہو جائیں، اور صحبت سے مجتنب (بچے) رہیں، تو ان لوگوں کے اعتقاد میں گویا نکاح کے دو درجے ہیں، ایک وہ جس سے صحبت حلال ہو جاوے، اس درجہ کے تحقق (وجود) کے لئے تو شہود شرط ہیں، اور دوسرا درجہ وہ جس سے صحبت حلال نہ ہو لیکن خلوت ومس ونظر (تنہائی، چھونا، اور دیکھنا) وغیرہ حلال ہو جائیں، اس درجہ کے تحقق کے لئے شہود شرط نہیں، صرف مرد وعورت کا ایجاب و قبول اور تراضی (باہم رضامندی) کافی ہے، اس جہل میں ایک بدعت، ضلالت (گمراہی) کی بھی آمیزش ہے، کہ تصرف فی الحکم الشرعی (شریعت کے حکم میں دخل اندازی) ہے، نیز بدون ایسے نکاح کے معاصی (گناہ) کو معاصی بھی سمجھتے تھے، اور اس نکاح کے بعد خلوت وغیرہ کو حلال سمجھنے لگے، معصیت کو حلال سمجھنا کتنی بڑی سخت بات ہے، سو خفیہ نکاح میں اس ایجاد کے لئے بھی استناد (دلیل پکڑنا) ہے، یہ آٹھویں بات ہے، اور یہ سب احتمالات مرضی واختراعی (بناوٹی) نہیں ہیں، مجھکو یہ سب واقعات معلوم ہوئے ہیں،

خفیہ نکاح کے دعوے سے عورت پر صریح ظلم ہو سکتا ہے،

نویں خرابی یہ ہے کہ اس دعوے کے ذریعہ سے کسی ایسی عورت پر ظلم ہو سکتا ہے، جس سے یہ شخص نکاح کی خواہش رکھتا ہو، اور وہ قبول نہ کرتی ہو، پس کسی وقت اگر اس کو شیطان اغواء (گمراہ) کرے تو دو مُردہ شخصوں کا نام لے کر دعویٰ کر سکتا ہے کہ اُن کے سامنے اس سے خفیہ نکاح ہو گیا تھا، اور اس دعوے کے بعد دوچار مددگاروں کی اعانت (مدد) سے اس پر جبر (زیادتی) کرے اور عام لوگ اس شبہ میں خاموش رہیں کہ نکاحی عورت پر قبضہ کرنے کا حق ہی ہم کیوں تعرض کریں۔

خفیہ نکاح کی دسویں خرابی

دسویں خرابی یہ کہ کسی منکوحہ عورت کی نسبت یہی دعویٰ اس طرح ہو سکتا ہے کہ دوسرے شخص کے علانیہ نکاح کے قبل کی تاریخ میں ہمارے عزیز سے خفیہ نکاح ہو چکا تھا، چنانچہ ان ایام میں ایک ایسا ہی حادثۂ خونبار ایک شہر میں واقع ہو رہا ہے، جس کے واقعات سن کر رونگٹا کھڑا ہوتا ہے،

خفیہ نکاح کے انسداد کے لئے شریعت نے اعلانِ نکاح کا حکم فرمایا ہے،

اور عجب نہیں کہ انہی مفاسد کے انسداد کے لئے شریعت نے اعلان کا حکم فرمایا ہو، اور بعض ائمہ نے اس حکم کو انہی وجوہ سے وجوب (واجب ہونے) پر محمول کیا ہو، مگر اکثر علماء نے سنیت (سنت ہونے)

پر اس لئے محمول کیا ہے کہ:

بعض اوقات بوجہ عذر شرعی خفیہ نکاح جائز ہوگا،	بعض اوقات عذر شرعی سے بھی اس کی ضرورت واقع ہوتی ہے مثلاً ایک بیوہ عورت ... نکاح ثانی کسی سے کرنا چاہتی ہے، مگر اعلان میں

اپنے جاہل ورثہ سے اس کو اندیشۂ عضل یا ہلاک ہے، اور دوسری جگہ جاکر نکاح کرنے میں سفر میں کوئی محرم[۵۱] نہیں ہے، اس لئے اس نے خفیہ نکاح کرلیا، پھر اسی کے ساتھ امن میں دوسری جگہ چلی گئی، اسی لئے میں نے شروع مضمون میں بمصلحتِ نفسانیہ کی قید لگائی تھی،

نکاح خواں کو ایجاب کے وقت منکوحہ کا بلند آواز سے نام لینا ضروری ہے،	ایک کوتاہی وہ بھی خفیہ نکاح کے ساتھ ملحق (ملی ہوئی) ہے یہ ہے کہ اکثر جاہل نکاح خواں ایجاب کے وقت منکوحہ کا نام بہت ہی آہستہ آواز سے لیتے ہیں، صرف ناکح تو سُن لیتا ہے، لیکن آس پاس والے بالکل

نہیں سنتے، تو ایسا نکاح بھی بلا شہود ہوگا، کیونکہ شہود کا صرف مجلسِ نکاح میں حاضر ہونا کافی نہیں، بلکہ صحتِ نکاح کے لئے یہ بھی شرط ہے کہ وہ ایجاب وقبول کے الفاظ کو بھی صاف صاف سُنیں، سو جب انھوں نے منکوحہ کا نام ہی نہ سُنا تو یہ شرط صحت کی نہیں پائی گئی، اس واسطے نکاح صحیح نہیں ہوگا، نکاح خوانوں کو اس کا بہت لحاظ رکھنا چاہئے، اور اگر وہ ناواقفی سے ایسا کریں تو اہلِ مجلس کو خصوصاً ناکح ومنکوحہ کے سرپرستوں کو چاہئے کہ نکاح خواں سے دوبارہ ایجاب (وقبول) کرائیں، اور تاکید کریں کہ بلند آواز سے منکوحہ کا نام لے،

بضرورتِ شرعیہ عورت کا نام مردوں کی مجلس میں لینا شرم وحیا کے خلاف نہیں،	اپنے نزدیک اس میں بڑا حق شرم کا ادا کرتے ہیں، اور یہ نہیں سمجھتے کہ اوّل تو بضرورتِ شرعیہ عورت کا نام مردوں کی مجلس میں ظاہر کرنا کچھ شرم کے خلاف نہیں، پھر مجلس کے اکثر حاضرین اہلِ تعلق ہوتے

ہیں، جن کو منکوحہ کا نام بھی معلوم ہوتا ہے، البتہ اس معلوم ہونے سے نکاح منعقد نہیں ہوسکتا، تاوقتیکہ صیغۂ ایجاب میں اس کا نام نہ سنیں، سو جب معلوم ہے تو نکاح خواں کی زبان سے سننے میں کونسی نئی بات ہوگی، جو موجبِ شرم ہے، علاوہ اس کے اگر نام سنانا بے حیائی ہے تو نکاح صحیح نہ ہونے کی صورت میں جو عمر بھر بلا نکاح استعمال میں رہی گی کیا اس سے بڑھ کر بے حیائی نہیں ہے؟ دیکھا تو یہی جاتا ہے کہ شرع کو چھوڑ دینے سے عقل بھی چھوٹ جاتی ہے ؛

---

[۵۱] عورت کا قریبی رشتہ دار جس سے نکاح ناجائز ہو، ۱۲

اِصلاحِ بعض اغلاط
متعلّق بہ تحلیلِ حرام و تحریمِ حلال

اب بعض کوتاہیاں تحلیل بعض محرّمات (بعض حرام چیزوں کو حلال کرنے) اور تحریم بعض محلّلات (بعض حلال چیزوں کو حرام کرنے) کی مذکور ہوتی ہیں؛

یعنی احکامِ شرعیہ کی ناواقفی یا تجاہل سے بعضی ایسی عورتوں سے جو کہ حرام ہیں نکاح کرلیا جاتا ہے، اور بعضی ایسی عورتوں سے جو کہ حلال ہیں نکاح کرنے کو ناجائز سمجھا جاتا ہے، چنانچہ ایک جگہ کا واقعہ خبرِ متواتر سے سنا گیا ہے کہ ایک مدّعی تحقیق نے اپنی علّاتی (سوتیلی) بہن سے نکاح کیا، لوگوں نے جو ملامت کی کہ یہ تو بنصِ قرآنی حرام ہے، کما قال اللہ تعالیٰ:۔

حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ وَبَنَاتُكُمْ وَأَخَوَاتُكُمْ، (النساء، آیت ۲۳)

("تم پر حرام کی گئیں تمھاری مائیں، اور تمھاری بیٹیاں اور تمھاری بہنیں")

تو جواب دیا کہ آیت میں اخوت سے مراد حقیقی بہنیں ہیں، یہ علّاتی بہن کو شامل نہیں، استغفراللہ من الجراۃ فی الدین (میں اللہ تعالیٰ سے دین کے معاملہ میں ایسی جرأت کرنے سے پناہ مانگتا ہوں) اگر کسی شخص کو بلا دلیلِ شرعی ایسی تفنّنات کا اختیار حاصل ہو تو دوسرا شخص یہ کہہ دے گا کہ عَلَيْكُمْ میں ضمیر خطاب کی ہے، اور اصل مقتضا خطاب کا مخاطب کا موجود عند التکلّم ... (بولنے کے وقت موجود) ہونا ہے، اور ہم نزولِ آیت کے وقت موجود تھے نہیں، پس اس کے مخاطبِ خاص اسی زمانے کے حضرات ہیں، جن کو یہ خطاب ہی نہیں، اور اس لئے وہ شخص حقیقی بہنوں کو بھی حلال سمجھے، اسی طرح اُمّہات و بنات (ماؤں اور بیٹیوں) کو بھی حلال سمجھے، تو

اس متجرئ فی الدین (دین میں جرأت کرنے والے) سے سوال ہے کہ تمھارے پاس اس شخص کے دعویٰ کے ابطال کی ایسی کونسی دلیل ہے جو تمھارے فعل کے کرنے والے کے پاس نہ ہو، اگر تمھاری وہ دلیل اس کے مقابلہ میں کافی ہے تو تمھارے منکر کی بھی دلیل تمھارے مقابلہ میں کافی ہے اور اگر تمھارے منکر کی دلیل کافی نہیں تو تمھاری دلیل بھی کافی نہیں،

اجتہاد بالکل عام ہو تو شریعت کا ایک جزو بھی باقی نہیں رہ سکتا،

حضرت اجتہاد ایسا عام اور اختیاری نہیں ہے ورنہ شریعت کا ایک جزو بھی باقی نہ رہے، اس کے خاص شرائط ہیں، اس کے خاص محل (مواقع) ہیں جہاں اجتہادِ مجتہد جامع شرائط کا مقبول ہے اور اس محل کے غیر میں کسی کا اجتہاد مقبول نہیں، اور محض حرف شناسی (کتابی علم) سے اس کی اہلیت و معرفت نہیں ہو سکتی ؎

نہ ہر کہ چہرہ برافروخت دلبری داند
نہ ہر کہ آئینہ دارد سکندری داند

(یعنی ہر خوب صورت شخص کے لئے یہ ضروری نہیں کہ وہ دلبری بھی جانتا ہو، اور ہر وہ شخص جو آئینہ بناتا ہو اس کے لئے یہ لازم نہیں کہ سکندری بھی جانتا ہو)

ایک مدعیِ اجتہاد کا جدِ حقیقی کی منکوحہ سے فتویٰ جوازِ نکاح

ایک دوسرے مدعیِ اجتہاد کا فتویٰ منقول دیکھا گیا کہ جدِ حقیقی (حقیقی دادا) کی منکوحہ (بیوی) سے نکاح حلال کر دیا گیا اور جو کسی نے نصِ قرآنی پیش کی؛

وَلَا تَنْكِحُوا مَا نَكَحَ آبَاؤُكُمْ، الآیۃ (النساء، آیت ۲۲)

("اور تم ان عورتوں سے نکاح مت کرو جن سے تمھارے باپ (دادا یا نانا) نے نکاح کیا ہو")

تو جواب میں کہہ دیا کہ یہ آباء (والدین) کے منکوحات کے لئے ہے، اور آباء میں اجداد (دادا) داخل نہیں، نعوذ باللہ من الرائے فی القرآن المبین (ہم قرآن پاک میں اپنی رائے دینے سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں)

تفسیر بالرائے کی چند سنگین مثالیں

یہاں بھی مثل سابق کے معروض ہے کہ اگر ایسی تفسیریں مقبول ہو دیں تو دوسرا شخص کہہ دے گا کہ جدّہ (دادی) سے نکاح حلال ہے، کیونکہ قرآن سے امّہات (مائیں) کی حرمت ثابت ہے اور امّہات میں

جدّات (دادیاں) داخل نہیں تو اس مدعی کے پاس بجز اطلاق لفظ امہات کے (لفظ امہات کے اطلاق کے علاوہ) اشتمالِ جدّات کی کونسی دلیل ہے، سو ویسا ہی اطلاق لفظ آباء اشتمالِ اجداد (لفظ آباء دادا نانا کو شامل ہونے)... کی بھی دلیل ہے، اور جمع بین الاختین (دو بہنوں کا جمع کرنے) کی آفت تو حدِّ احصار (حدِّ شمار) سے خارج ہے، یعنی بے شمار مواقع پر جہلاء اس کا ارتکاب کر رہے ہیں، اور گو وہ اس کے حلال ہونے کا شاید منہ سے دعویٰ نہ کرتے ہوں، لیکن بیباکی اور استخفاف (ہلکا سمجھنا) اور اصرار اور اس کو عیب نہ سمجھنا اور منع کرنے والوں کو بے پروائی سے جواب دینا، بلکہ ان سے رنج و نزاع (جھگڑا) کرنا ایسا ہی ہے کہ اس کو استحلال (حلال سمجھنا) کہہ سکتے ہیں، جس میں زوالِ ایمان (ایمان جاتے رہنے) کا قوی اندیشہ ہے،

اسی طرح کا ایک اور واقعہ ہے کہ ایک صاحب فارغ عن الدرسیات کلہا او اکثرہا (درسیات کی مکمل یا بیشتر کتابوں کے فارغ التحصیل) کی نیت اپنے حقیقی ہمشیرہ زادہ کی دختر (حقیقی بہن کی پوتی) پر ڈانواڈول ہوتی، اور ان کو اس کی حلت (حلال ہونے) کا بھی احتمال ہوا، مگر کچھ تردد (شک) ہونے سے مجھ سے سوال کیا، خیر اُن کو حرمت کا فتویٰ دیا گیا، یہ بھی حیرت انگیز قصہ ہے، قرآن مجید میں بنات الاخت (بہن کی بیٹیاں) اپنے اطلاق سے اجماعاً بنت ابن البنت (نواسے کی بیٹی) کو بھی شامل ہے، فقہاء نے اس کے محرمات (نکاح کے لئے حرام ہونیوالیوں) میں سے ہونے کی تصریح کی ہے، پھر ان کو گنجائش کا احتمال ہوا، اللّٰہم احفظنا من الزیغ والہویٰ،

یہ سب خرابیاں قلتِ مناسبتِ علمِ دین و غلبۂ اتباع آراء و ہویٰ (علم دین سے تعلق کی کمی اور اپنی رائے و نفسانی خواہش کے غلبہ کی وجہ) سے ہیں، اَللّٰھُمَّ ثَبِّتْنَا عَلَی الصِّرَاطِ السَّوِیِّ وَالْیَقِیْنِ الْقَوِیِّ (اے اللہ ہمیں صراطِ مستقیم اور کامل یقین پر ثابت قدم رکھ)

حرمتِ مصاہرت سے متعلق چند کوتاہیاں

حرمتِ مصاہرت (رشتۂ دامادی) کے متعلق بعض واقعات ہیں، بعضے لوگ ایک عورت سے ایک مدت تک ناجائز تعلق رکھتے ہیں، جب وہ دل سے اُتر جاتی ہے اور اس درمیان میں اس کی کوئی لڑکی سیانی ہو جاتی ہے اس کی طرف میلان ہوتا ہے، اور اپنے نزدیک گناہ سے بچتے ہیں، کہ اس لڑکی سے نکاح کر لیتے ہیں، حالانکہ حرمتِ مصاہرت کے قاعدہ سے اس شخص پر اطلاق مدلول:-

وَرَبَآئِبُکُمُ الّٰتِیْ فِیْ حُجُوْرِکُمْ مِّنْ نِّسَآئِکُمُ الّٰتِیْ دَخَلْتُمْ بِہِنَّ	(اور تمہاری بیبیوں کی بیٹیاں جو کہ تمہاری پرورش میں رہتی ہیں اُن بیبیوں سے کہ

(النساء آیت ۲۳) | کہ جن کے ساتھ تم نے صحبت کی ہو")

میں داخل ہونے سے حرام ہے، اور بعضے دونوں ماں بیٹی کو استعمال میں رکھتے ہیں، حالانکہ بیٹی سے منقطع (علیحدہ) ہونے کے بعد اس کی ماں سے نکاح تک حرام ہوگیا، اور بلا نکاح تو دو حرمتیں جمع ہوگئیں، ایک وطی بلا نکاح (بغیر نکاح کے ہمبستری) دوسری امہات نسائکم سے انتفاع،

بیوی کی ماں یا بیوی کی بیٹی پر شہوت سے ہاتھ پڑ جانے سے بیوی حرام ہو جاتی ہے،

بعضے عمداً تو اسباب حرمت کے مرتکب نہیں ہوتے، مگر احیاناً غلطی سے بیوی کے دھوکہ میں اس بیوی کی ماں پر یا اس بیوی کی بیٹی پر شہوت سے ہاتھ پڑ جاتا ہے اور (بعد تنبہ کے فوراً دست کش ہو جاتا ہے، لیکن اس سے بھی اس شخص کی بیوی اس پر حرام ہو جاتی ہے، اس میں بہت لوگوں کو کلام ہوتا ہے، کہ عمداً (جان بوجھ کر) تو اس فعل کا ارتکاب نہیں کیا گیا،

مذکورہ حرمت کا مدار سزا نہیں بلکہ اس فعل کا خاصہ ہے

سو یہ کلام کرنا غلطی ہے، اس حرمت کا مدار سزا نہیں ہے جو یہ سوال کیا جائے جس طرح بعض اعیان (چیزوں) میں بعض خواص ایسے ہوتے ہیں کہ بلا قصد (بغیر ارادہ) کے بھی اُن کے تناول سے وہ خواص ظاہر ہوتے ہیں، جیسے سنکھیا کھانے سے ہلاک ہو جانا اور اس کو اطباء اور کبھی بعض عوام بھی جانتے ہیں، اسی طرح بعض افعال میں بھی بعض خواص ایسے ہوتے ہیں کہ بلا قصد ان کے صدور سے وہ خواص واقع ہوتے ہیں اور اس کو شارع علیہ السلام اور ماہرانِ شریعت بارشادِ شارع جانتے ہیں، پس ان اسباب حرمتِ مصاہرت میں یہ خاص اسی قبیل (قسم) کا ہے، البتہ آخرت میں جو مضار (نقصانات) بعض افعال کے واقع ہوں گے وہ سزا ہیں، وہ عمد و قصد (جان بوجھ کر اور ارادہ کے ساتھ کرنے) پر موقوف ہیں،

بہو پر براہِ شرارت ہاتھ ڈالنے سے وہ اپنے بیٹے پر بھی حرام ہو جاوے گی،

اسی طرح بعض ایسے ہی دھوکہ میں یا براہِ شرارت کوئی شخص اپنے بیٹے کی بیوی پر ہاتھ ڈال دیتا ہے تو یہ بیوی اپنے شوہر پر یعنی اس شخص کے بیٹے پر حرام ہو جاتی ہے، اس میں عوام کو پہلے سے زیادہ کلام ہوتا ہے کہ پہلی صورت میں تو جس شخص پر حرمت ہوئی ہے اس کی اتنی کوتاہی تو تھی کہ اس نے تحقیق کرنے میں بے احتیاطی کی، مگر یہاں جس شخص پر حرمت ہوئی ہے اس بیچارے کی کیا خطا اور اس کا کیا دخل جو اس پر سختی کی گئی، اس کا جواب بھی اوپر کی تقریر سے ہو چکا ہے کہ یہ سزا نہیں ہے، اس فعل کے خاصہ کا ظہور ہے، اور خاصہ ہونا دلیلِ شرعی سے ثابت ہے اور گو یہ مسئلہ حرمتِ مصاہرت بدون النکاح کا مجتہدین میں مختلف فیہ ہے،

کسی مسئلہ میں محض نفس پرستی کے لئے کسی دوسرے امام کی تقلید دین سے مذاق ہے،

مگر جو شخص ایسے مجتہد کی تقلید کا التزام کئے ہوئے ہو جو حرمت کے قائل ہوں اس شخص کا محض اتباعِ ہوی (صرف نفسانی خواہش کی پیروی) سے اس حرمت پر عمل نہ کرنا نفس پرستی ولعب فی الدین (دین کو کھیل بنانا) ہے، اور اس مسئلہ میں کچھ شرائط وتفاصیل بھی ہیں جن کا محل کتبِ فقہ ہیں، ان سے یا علماء سے وقوعِ حوادث کے وقت تحقیق کرنا ضروری ہے، تاکہ حرمت کی جگہ حلت اور حلت کی جگہ حرمت نہ سمجھ لی جائے کہ اوّل میں حقوقِ شرع کا اتلاف (ضیاع) اور دوسری میں حقوقِ زوجہ کا اتلاف ہے،

بلا قصد بھی حرمتِ مصاہرت ہو جاتی ہے

اور چونکہ یہ مسئلہ بہت نازک ہے، اور بعض صورتوں میں بلا قصد بھی حرمت ہو جاتی ہے،

بیوی سے مباشرت سے قبل سخت احتیاط کی ضرورت ہے

اس لئے اس کی احتیاط کا بہت ہی اہتمام رکھے، یعنی اوّل تو جہاں بیوی سوتی ہو اس کی ماں یا بیٹی وہاں نہ ہونا چاہیئے، اسی طرح وہاں اپنے بیٹے کی بیوی یا باپ کی بیوی نہ ہونا چاہیئے، اور اگر کسی ضرورت سے ایسا ہو تو جب تک بیوی کو پکار کر اس کی آواز نہ سن لے اور خوب پہچان نہ لے اس کو ہاتھ نہ لگائے،

اسی طرح ان مذکورہ عورتوں کے ہاتھ سے اگر کوئی چیز لے تو اس کا بہت خیال رکھے کہ اس کے ہاتھ کو ان کا ہاتھ نہ لگ جائے، نفس کا کیا اعتبار، اگر ہاتھ لگنے کے وقت مرد کے دل میں یا عورت کے دل میں شہوت کا اثر ہو گیا تو حرمتِ مصاہرت کا طوق (پٹہ) پڑ گیا، پھر بعض اوقات تو ایک کو دوسرے کی کیا خبر کہ اس وقت اس کے نفس میں کیا کیفیت تھی، جب خبر ہی نہیں تو حرمت پر عمل کیسے کرے گا، اور اگر اپنے نفس کی خبر بھی ہو گئی تو دنیا کی شرم یا خوف سے زبان سے نکالنا مشکل، تو تمام عمر ارتکابِ حرام، یا یہ شخص مباشر یا مسبب (یعنی خود کرنیوالا یا سبب بننے والا ہو گیا) کتنی مصائب جمع ہو گئیں،

حرمتِ رضاعت کے متعلق کوتاہی

ایک کوتاہی حرمتِ رضاع کے متعلق ہے کہ وہ بھی مثل حرمتِ مصاہرت کے کثیر الوقوع (اکثر واقع ہونے والی) ہے، اکثر لوگ تو بوجہ دقیق وغیر مشہور ہونے .... اس کے مسائل کے باوجود علمِ رضاع اس میں بے احتیاطی کرتے ہیں، مثلاً بعض عوام کو یہ کہتے سنا ہے کہ اگر ایک لڑکا اور لڑکی ایک ہی عورت کا دودھ پئیں، لیکن ایک ہی زمانہ میں نہ پئیں بلکہ چار پانچ سال (کے فرق) سے پئیں تو یہ بھائی بہن نہیں بنتے، حالانکہ یہ سمجھنا بالکل غلط ہے، اور مثلاً بہت لوگوں کو یہ معلوم نہیں کہ اگر ایک شخص کی ایک بی بی نے ایک لڑکے کو دودھ پلایا اور ایک ہی زمانہ میں یا دوسرے زمانہ میں اس شخص کی دوسری بی بی نے کسی

لڑکی کو دودھ پلایا تو بہ بہتوں کو معلوم نہیں کہ یہ لڑکا لڑکی آپس میں بہن بھائی ہوگئے، اور ان کا نکاح بھی باہم ناجائز ہے، یہ ضرور نہیں کہ وہ ایک ہی عورت کا ہو بلکہ دونوں کا دودھ چونکہ ایک ہی مرد کے سبب سے ہی اس لئے دونوں کا دودھ بحکم ایک ہی دودھ کے ہے،

اناکا دودھ بلاضرورت پلانا خلاف احتیاط ہے،

اور بعض اوقات خود رضاع ہی کی تحقیق نہیں کرتے، اور ایسی غلطی ان مقامات پر ہوتی ہے جہاں مائیں دودھ کم پلاتی ہیں، انائیں نوکر رہ کر زیادہ دودھ پلاتی ہیں، جیسے شہروں کے امراء ہیں، اسی لئے علماء نے فرمایا ہے کہ اوّل تو اناکا دودھ بلاضرورت پلانا خلاف احتیاط ہے، اور اگر ایسا اتفاق ہو تو اس کو خوب مشہور کردینا چاہئے، اس کا سہل (آسان) طریقہ یہ ہے کہ جس انا کا دودھ پلوائے اس سے بھی تحقیق کرلے کہ تونے کہاں کہاں دودھ پلایا ہے اور اس کی یادداشت لکھ کر اپنے خاندان میں محفوظ رکھے، تاکہ رشتہ ناطہ کے وقت اس کا لحاظ رکھنا آسان ہو، اور بعض جگہ سب سے بڑھ کر یہ غضب ہوتا ہے کہ اولاً رضاع کا علم نہ ہونے سے نکاح ہوگیا، اور پھر بعد میں معتبر طریقہ سے علم بھی ہوگیا، لیکن اب تفریق سے عار آتی ہے کہ لوگ ہنسیں گے، اور طعن کریں گے کہ ان لوگوں نے کیا حماقت کی تھی، اور بھائی بہن میں مثلاً نکاح کردیا تھا، اس لئے کبھی وہ اس کی کوشش کرتے ہیں کہ رضاع کسی طرح ثابت نہ ہو، اور کبھی اور طرح طرح کے حیلے نکالتے ہیں، کبھی دوسرے علماء کے اقوال کی تلاش کرتے ہیں، حتیٰ کہ کل جن فرقوں کو برا بھلا کہتے تھے آج ان سے استفتاء کرکے ان کے جواب کا سہارا ڈھونڈھتے ہیں، چنانچہ ایک مقام پر رضاعی بہن بھائی کے نکاح میں ایسی ہی غلطی ہوگئی، جب علم ہوا تو بہت پریشان ہوئے، مجھ سے سوال کیا، میں نے حرمت کا فتویٰ دیا، کہنے لگے صاحب اب تو بڑی بدنامی ہوگی، میں نے کہا اوّل تو حکم شرعی کے ماننے میں اگر بدنامی بھی ہو تو کچھ پرواہ نہ کرنا چاہئے،

حکم شرعی ماننے میں بجائے بدنامی کے نیک نامی ہوتی ہے،

دوسرے بدنامی بھی نہ ہوگی بلکہ نیک نامی ہوگی، کہ ایسے حق پرست دیندار لوگ ہیں کہ جب غلطی کا علم ہوا فوراً تدارک کردیا، البتہ بدنامی اب ہے کہ کیسے بے حیاء اور بددین ہیں کہ باوجود علم ہوجانے کے پھر بھائی بہن حرام کرتے ہیں، جب یہ بات نہ چلی تو کہنے لگے کہ اس لڑکے نے اس لڑکی کی ماں کا دودھ ایک ہی بار پیا تھا، میں نے کہا تب بھی حرمت ثابت ہوگئی، کہنے لگے کہ صاحب وہ تو انگلی رتّے کے ذریعہ باہر نکال بھی دیا تھا، میں نے کہا، تب بھی حرمت باقی رہی، کہنے لگے، خدا کے واسطے کوئی صورت تو حلت کی نکالو، میں نے کہا دیوانے ہوئے ہو، کیا احکام شرعیہ میں تحریف کردوں، غرض مایوس ہوکر چلے گئے، ایک مقام پر ایک اہل حدیث میں سے

کسی نے کہہ دیا کہ پانچ گھونٹ سے کم میں حرمت نہیں ہوتی، پس فوراً انھوں نے سوال تراش لیا کہ اگر پانچ گھونٹ سے کم پیا تو کیا حکم ہے؟ اور اسی قائل کے کسی ہم مشرب نے جواب لکھ دیا کہ حرمت نہیں ہوئی، پس فتویٰ لے کر بے فکر ہو گئے، حالانکہ اوّل تو یہ لوگ (اہلِ معاملہ) ان مفتیوں کو اس دن تک اہلِ حق میں سے بھی نہ سمجھتے تھے، پھر یہ کہ مرضعہ (دودھ پلانے والی) مرگئی، زمانہ دراز ہوگیا، اب یہ کس طرح معلوم ہوا کہ پانچ گھونٹ سے کم پیتے تھے، اس کو بجز دین کو دنیا کے تابع بنانے اور دین کو دنیا کے لئے بدلنے کے کیا کہا جائے گا؟ اعاذنا اللہ تعالیٰ منہا (اللہ تعالیٰ ہمیں ایسا کرنے سے بچائے)

مخطوبہ (یعنی منسوبہ لڑکی) قبل نکاح بالکل حرام ہے، بعض لوگوں کو اس میں مبتلا پایا کہ مخطوبہ (منگنی کی ہوئی عورت) کے ساتھ جو کہ قبل نکاح حرام ہے مثل منکوحہ کے معاملہ کرتے ہیں، یوں سمجھتے ہیں کہ یہ جب عنقریب حلال ہونے کو ہے تو ابھی سے حلت شروع ہوگئی، اس کا بطلان (باطل ہونا) عقلاً وسمعاً ظاہر ہے، اور شاید کسی کو اس سے شبہ واقع ہو کہ مخطوبہ کو قبلِ خطبہ کے دیکھ لینا جائز ہے، تو یہ بھی ایک قسم کا استمتاع (حصولِ لذّت) ہے، اور استمتاع سب برابر ہیں، سو جواب اس شبہ کا خود ہی سوال میں موجود ہے، یعنی خطبہ کے قبل ہی تو دیکھ لینا جائز ہے، جس سے مقصود استمتاع نہیں بلکہ اس کا اندازہ کرنا ہے کہ اس عورت میں جو وصف حُسن وغیرہ میں نے سُن کر یا سمجھ کر اس کے استمتاع کے حلال ہونے... یعنی انعقادِ نکاح کی تجویز سوچی ہے آیا وہ وصف اس میں ہے یا نہیں ہے، چونکہ نہ ہونے کی صورت میں سوءِ معاشرت کا خوف تھا شریعت نے محض اس غرض کے لئے ایک بار چہرہ دیکھ لینے کی اجازت دیدی، سو اس نظرِ ضروری پر جو کہ بغرض استمتاع نہیں ہے دوسری نظر غیر ضروری بعد الخطبہ کو اور اسی طرح مس وغیرہ کو جو کہ محض بغرض استمتاع بلاضرورت ہی، کیونکہ وہ ضرورت ایک بار دیکھنے سے مرتفع ہو چکی ... کیسے قیاس کیا جا سکتا ہے،

محصنات کے بارے میں چند کوتاہیاں منجملہ محرمات (جن عورتوں سے نکاح حرام ہے) کے بنصِ قرآنی محصنات یعنی شوہر والی بیبیاں ہیں، اور شریعت میں شوہر والی کا مفہوم عام ہے، (یعنی کسی کے نکاح میں ہو وہ بھی اور جو کسی کی عدّت میں ہو وہ بھی اس میں داخل ہی، اس میں بھی بکثرت حدود سے تجاوز کیا جاتا ہے، چنانچہ بعضے تو صرف خاوند کی مدّت تک خبر گیری نہ کرنے سے اور بعضے عورت کے اپنے خاوند کو چھوڑ کر نکل آنے سے اور بعضے عورت کے فاحشہ (بدکار) ہو جانے سے اور ایک مدّت .... اسی حالت میں گذر جانے سے سمجھ بیٹھتے ہیں کہ اب نکاح نہ رہا ہوگا، بس بے تکلف اس سے نکاح کر لیتے ہیں، اور بعضے عدّت کے اندر یہ سمجھ کر کہ جب شوہر نے

طلاق دیدی یا وہ مرگیا، تو نکاح تو رہا نہیں، اور عدت[1] ویسے ہی ایک امر زائد ہے تو اس من نکاح کرنے سے کون امر مانع ہے، معتدّہ (عدت گذارنے والی عورت) سے نکاح کر لیتے ہیں، سخت افسوس ہے، یہ لوگ نص کے مقابلہ میں اپنی رائے چلاتے ہیں،

ایامِ عدت نکاح کے بقیہ اثر میں سے ہیں، خوب سمجھ لینا چاہئے کہ وہ عدت بھی بقیہ اثر اسی نکاح کا ہے، خواہ شوہر نے طلاق دیدی ہو یا مرگیا ہو، اور یہ بقیہ اثر احکام تزویجِ غیر (دوسرے کے ساتھ نکاح حرام ہونے) میں بعینہٖ مثل نکاح کے ہے، پس ایسا نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوتا، اور تمام عمر حرام ہوتا ہے، اور بعضے یہ غضب کرتے ہیں کہ نکاح کو تو جائز نہیں سمجھتے، مگر اس لئے کرتے ہیں کہ یہ عورت دوسری جگہ نکاح نہ کرے، اس کے مفاسد بعض بعض وجوہ سے اور بھی شدید ہیں، ایک تو دھوکہ دینا جو صریح گناہ ہے، دوسرا جہلاء وعوام کو صحتِ نکاح کا گمان ہونا جس سے ان کا اعتقاد اور ایسے ہی موقع پر ان کا عمل بھی فاسد ہوتا ہے، تیسرے بعض جگہ یہ دیکھا گیا ہے کہ پھر نکاح ہی نہیں کرتے، چوتھے غلبۂ نفس میں اس سے استمتاع کرنے لگے تو وہ بگمانِ صحتِ نکاح کے انکار نہیں کرتی، جس سے ایقاع فی المعصیۃ (گناہ میں پڑنا) لازم آیا، بعض جگہ انکار کرنے پر ظلم بھی کیا گیا اور دوسرے لوگ اس مظلومہ کی اس لئے نُصرت (مدد) نہیں کرتے، کہ اس کو منکوحہ سمجھتے ہیں، جس پر زوج (خاوند) کو حقِ جبر (مجبور کرنے کا حق) حاصل ہے،

مفقود یعنی گم شدہ کے متعلق چند کوتاہیاں اور ایک کوتاہی اس نکاح محصنات (شوہر والی بیبیوں سے نکاح کرنے) کے متعلق بعض خواص میں ہو رہی ہے کہ مفقود (گم شدہ) کی بی بی سے بزعمِ خود امام مالکؒ کے مذہب پر چار برس کے بعد حکم بالموت (موت کا حکم کرنے) کے لئے قضاءِ قاضی کے اشتراط کی کتبِ مالکیہ میں تصریح ہے، اور اگر ان کے نزدیک اس کی تصریح بھی نہ ہوتی تب بھی ہمارے فقہاء نے اس اشتراط (شرط ہونے) کی تصریح کی ہے، باقی یہ شبہ کہ ہمارے فقہاءِ مالکیہ کے قول پر عمل کو جائز کہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہو کہ بجائے نوّے سال کے چار سال کی مدت کو لے لینا جائز کہا ہے، باقی یہ اشتراط مطلق ہے، کسی حال میں اس کے استثناء کی کوئی دلیل نہیں،

---

[1] عدت:۔ اگر کسی کا شوہر طلاق دیدے تو اس عورت کو (اگر حاملہ نہیں تو) تین حیض آنے تک شوہر ہی کے گھر میں رہنے کا حکم ہے، اور گھر سے نہ دن کو نکلنے کی اجازت ہے اور نہ رات کو، یہ عدت پوری ہونے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے، اور شوہر کی موت واقع ہونے پر چار مہینے دس دن تک عدت بیٹھنے کا حکم ہے، (احقر قریشی غفرلہٗ)

بلکہ نوے سال کے بعد حکم بالموت کرنے کے لئے بھی قضاءِ قاضی (حاکم شرعی کے فیصلہ) کی حاجت ہے، علاوہ اس کے بہت جگہ ایسے نکاح کے بعد شوہر اول آگیا ہے، اور یہ ضرور نہیں کہ وہ بھی مالکی بن جائے بلکہ وہ مالک بن کر جھگڑتا ہے، اور مفاسدِ عظیمہ برپا ہوتے ہیں، ان مفاسد سے بچنا بھی شرعاً ضروری ہے باقی یہ کہ عورت بلا نکاح نہیں رہ سکتی، سو اس کا جواب یہ ہے کہ اگر خاوند مفقود نہ ہو اس کا نشان و مقام سب معلوم ہو مگر زوجہ کے حقوق ادا نہ کرے تو آخر یہ عورت اُس وقت کیا کرے، بس وہی اب بھی کرے، اگر شبہ ہو کہ اس صورت میں تو اس پر دعویٰ کر سکتی ہے، تو جواب یہ ہے کہ اگر دوسری سلطنت میں ہو تو دعویٰ کیسے کرے؟ بہرحال ان سب صورتوں میں صبر کرنا پڑتا ہے، بس اب بھی صبر اختیار کرے البتہ جن ریاستوں میں قاضی شرعی با اختیار موجود ہو وہاں جا کر رجوع کرنے سے اگر وہ (تفریق کا) حکم دے تو احقر کے نزدیک گنجائش معلوم ہوتی ہے، دوسرے علماء سے بھی اس کی تحقیق فرمالیں،

پردیسن عورت کے شوہر فوت ہونے یا طلاق کے بعد عدت گزر جانے کے دعوے کا حکم، ایک صورت اسی نکاحِ محصنات کی ایک اور بھی شائع ہے، کہ ایک پردیسن عورت نے دعویٰ کیا کہ میرا شوہر مر گیا، یا اس نے طلاق دیدی، اور (عدت بھی گذر گئی، اور (اُس عورت کی ظاہری حالت قابلِ وثوق (اعتبار کے قابل) نہیں ہے، جس سے خدا ترس حلال وحرام کی احتیاط کرنے والے مسلمان کا قلب اس کے صدق پر شہادت دیتا ہے، پھر بھی بعضے لوگ غرضِ نفسانی کے غلبہ سے ایسی عورت سے نکاح کر لیتے ہیں، پھر بعد میں پتہ لگتا ہے کہ وہ خاوند والی ہے، پھر بعضے اس حالت میں بھی نہیں چھوڑتے، گویا اتنے دنوں کے قبضہ سے یہ موروثی کاشتکار ہو گئے، جن کے سامنے اصلی زمیندار کا حقِ تصرف (استعمال کا حق) مضمحل ہو گیا، فقہاء نے ایسی عورت سے نکاح کے جواز میں شہادتِ قلب کو شرط ٹھہرایا ہے،

دورِ حاضر میں شہادتِ قلب معلوم کرنے کا طریقہ، اور یہ شہادت پہلے زمانہ میں تو جلد متحقق ہو جاتی تھی، مگر اب کے زمانہ شیوعِ کذب وفساد (جھوٹ اور فساد کے عام ہونے) کا ہے بدون جرح وقدح وتحقیقِ تام وامتحانِ تدریجِ مجربہ (بغیر چھان بین اور مکمل تحقیق نیز خبر دینے والے کی دینداری کا اچھی طرح امتحان) جس کا نام شہادتِ قلب ہے وہ جلدی حاصل نہیں ہوتی، مغلوب الغرض (نفسانیت سے مغلوب شخص) دھوکہ سے غیر شہادت کو شہادت سمجھ لیتا ہے، اس میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے،

نومسلم عورت کا فوراً نکاح کر دینا صحیح نہیں، اسی طرح محصنات کی ایک صورت یہ ہے کہ نومسلم عورت کا نکاح فوراً ہی کسی سے کر دیا جاتا ہے، حالانکہ وہ شوہر والی تھی، تو بدون عرضِ اسلام علی الزوج (شوہر کے سامنے اسلام پیش کرنے) اور اباءِ زوج دار الاسلام میں یا بدون تین حیض آئے ہو

غیر دار الاسلام میں تفریق جو بحکم تطلیقِ (طلاق) ہے واقع نہیں ہوتی، پھر اس تفریق کے بعد عدتِ جدیدہ میں اختلاف ہے، اور احوط (زیادہ احتیاط) اختلاف سے بچنا ہے، واعظین و ائمہ مساجد کو اس کا زیادہ یاد رکھنا چاہئے،

نکاحِ موقّت اور متعہ بالاتفاق حرام ہیں، بعضے پڑھے لکھے لوگوں پر افسوس ہے کہ نکاحِ موقّت (معینہ مدت کے لئے نکاح) کے حرام ہونے میں اور نکاحِ موقّت کے قیاس پر متعہ کے حرام ہونے میں شبہ کرتے ہیں، ہماری کتبِ فقہ میں دونوں کی حرمت کی تصریح ہے، اور نکاحِ موقت میں جو بعض کا اختلاف منقول ہے دراصل ان بعض علماء نے اس نکاح کو موقت ہی قرار نہیں دیا، بلکہ تصریحاً فرمایا کہ یہ توقیت باطل ہے، اور نکاح تابیداً (ہمیشہ کے لئے) صحیح رہے گا، باقی جو عقد موقت ہوگا وہ بالاتفاق باطل ہے، چنانچہ متعہ کو تمام اہلِ حق نے باطل کہا ہے، خود وہ مؤطا میں اس کے تحریم (حرام ہونے) کی حدیث لائے ہیں، اور ان کے مذہب کی کسی کتاب میں وہ نسبت واقع نہیں ہوئی، پس یقیناً غلط ہے،

خریدی ہوئی عورتیں یا لڑکیاں شرعاً کنیز کہلانے کی مصداق نہیں، بعض لوگ ایسی خریدی ہوئی عورتوں یا لڑکیوں کو جن میں کنیز ہونے کے شرائط شرعیہ نہیں پائے جاتے، حلال سمجھتے ہیں، ان سے جبراً خدمت لیتے ہیں، اور بعضے ان سے صحبت کرتے ہیں، یہ بھی تحلیلِ محرمات میں داخل ہے،

تین طلاق کے بعد بدون حلالہ اسی عورت سے نکاح درست نہیں، بعضے لوگ بی بی کو تین طلاق دے کر پھر اس کو نکاح میں داخل سمجھتے ہیں، یا بلا حلالہ[۱] اس سے تجدیدِ نکاح کر لیتے ہیں، بعض کو بعض روایات سے شبہ ہو گیا ہے، لیکن یہ مسئلہ اپنے مقام پر حل ہو چکا ہے کہ تین طلاق خواہ مجتمعاً (ایک ساتھ اکٹھی) دے، خواہ متفرقاً تینوں واقع ہو جاتی ہیں، گو ایک جلسہ میں ایسا کرنا معصیت (گناہ) ہے لیکن طلاقِ مغلظہ[۲] ہو جائے گی، اور بدونِ حلالہ نکاح جدید درست نہ ہوگا، البتہ جس سے صحبت، یا خلوتِ[۳] صحیحہ نہ ہوئی اس کو

---

[۱] حلالہ:۔ عورت اگر تین طلاق ہو جانے کے بعد پھر اسی شوہر سے نکاح کرنا چاہے تو اس کے لئے ضروری ہے کہ پہلے کسی دوسرے مرد کے ساتھ نکاح کرے اور اس کے ساتھ ہمبستری بھی کرے (صرف نکاح کافی نہیں، بلکہ شوہر کے ساتھ اس کی وطی ہونا بھی ضروری ہے) پھر اس شوہر کے مرجانے یا طلاق دیدینے پر پہلے شوہر سے نکاح کر سکتی ہے، اس کو حلالہ کہتے ہیں، [۲] طلاقِ مغلظہ:۔ یعنی ایسی طلاق جس کے دینے کے بعد میاں بیوی اگر دونوں بھی نکاح کرنا چاہیں تو بغیر حلالہ کے نکاح نہ ہو سکے، ایسی طلاق کو طلاقِ مغلظہ کہتے ہیں، جس کے بعد مرد کو اس عورت کو رکھنے کا اختیار نہیں ہوتا، [۳] خلوتِ صحیحہ:۔ یعنی میاں بیوی کا ایسی تنہائی میں یکجا ہونا جس میں صحبت ممکن ہو، ۱۲ قریشی

تین طلاق متفرقًا (علیحدہ علیحدہ) دے، اس طرح کہ تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، تجھ کو طلاق، اس میں ایک پہلی ہی واقع ہوگی، دو لغو ہوں گی، باقی سب صورتوں میں تینوں طلاق واقع ہو جائیں گی،

بیک وقت چار عورتوں سے زائد نکاح درست نہیں

ایک کوتاہی اسی تحلیل محرمات کے متعلق یہ ہے کہ بعض لوگ خصوص اہل امارت و ریاست چار سے زائد عورتیں نکاح میں جمع کرنے کو حلال سمجھتے ہیں چنانچہ ایک صاحب کو میں نے دیکھا جن کے پاس سات منکوحہ مجتمع سنی جاتی تھیں، انھوں نے کسی کا فتویٰ مجھ سے نقل کیا کہ وہ اٹھارہ تک جمع کرنے کو حلال بتلاتے تھے، میں نے اس فتوی کی تغلیط کی، اور ان کو سمجھایا جس سے وہ ساکت (خاموش) ہوئے، باقی یہ تحقیق نہیں کہ زائد علی الاربع (چار عورتوں سے زائد) کو انھوں نے چھوڑ دیا یا نہیں، خدا بچائے ایسے خوشامدی بدنام کنندہ علماء سے جو دنیوی اغراض کی تکمیل و تحصیل کے لئے امراء کی خوشامد میں اس طرح دین فروشی کرتے ہیں، گو یہ قول بعض کی طرف کتب میں بھی منسوب دیکھا گیا ہے، لیکن بالیقین غلط ہے، اور بالیقین اس غلطی کا سبب وہاں تدین (دینداری) ہی تھا، اور اُس وقت اُس کا بالاجماع (بالاتفاق) اس قائل پر منکشف (ظاہر) بھی نہ تھا، اور اب تو بعد وضوحِ حق (حق واضح ہونے) کے جو ایسا کرے وہ اَضَلَّہُ اللّٰہُ عَلٰی عِلْمٍ کے مصداق ہے،

مسئلہ مصاہرت کے متعلق ایک محرّف فی الدین کا فتویٰ،

ایسے ہی ایک محرف فی الدین (دین میں تحریف پیدا کرنے والے) کا لکھا ہوا بندہ نے فتویٰ مسئلہ مصاہرت (داماد بنانے) کے متعلق دیکھا ہے، اس شخص نے سائل سے ایک ہزار روپیہ لے کر ایک تاویل باطل سے ساس کے ساتھ نکاح کی اجازت دیدی، وہ سائل اپنی ساس پر فریفتہ (عاشق) ہوگیا تھا، اس مفتی نے ترکیب یہ لکھی کہ ساس وہ ہے جو منکوحہ کی ماں ہو، تو کسی عورت کا ساس ہونا موقوف (منحصر) ہوا منکوحہ کے ماں ہونے پر، اور یہ منکوحہ جاہل ہے، اور جاہلوں کے اکثر اقوال وافعالِ شرکیہ و کفریہ صادر ہوا کرتے ہیں، اور نکاح پڑھنے کے وقت کسی نے منکوحہ کو تجدید ایمان نہیں کرائی، اور مرتدّہ (دین سے پھر جانے والی) کا نکاح مسلم سے صحیح نہیں، پس یہ نکاح نہیں ہوا، اس لئے نہ وہ منکوحہ ہوئی، اور نہ اُس کی ماں ساس ہوئی رہی حرمتِ مصاہرت بمحض الوطی (صرف ہمبستری کے سبب دامادی رشتہ سے حرام ہونا) یہ صرف امام ابوحنیفہ رح کا مذہب ہے، سائل پر فرض نہیں کہ ان کی تقلید کرے، پس اس لئے وہ ساس سائل پر حلال ہوگئی،

افسوس اس شخص نے ایک شخص کی دنیوی نفسانی خواہش پوری کرنے کے لئے بلکہ اپنی ایک رقم سیدھی کرنے کے لئے ایک مسلمان عورت کو کافر بنایا اور اتنی مدت تک زوجین (میاں بیوی)

کو مرتکب زنا (زنا کرنے والے) قرار دیا، پھر محض اتباعِ ہویٰ (نفسانی خواہش کی پیروی) کے لئے ایک مقلّدِ مذہب معیّن (ایک مقررہ مذہب کی تقلید کرنے والے یعنی حنفی مسلمان) کو اجازت ترکِ تقلید وارتحال الی مذہب الغیر (تقلید کو چھوڑ کر اجازت دوسرا مذہب اختیار کرنے) کی دی، جس کے خطرناک ہونے کے متعلق ایک حکایت...... عنقریب عرض کروں گا، اس طرح پھیر پھار کر محرّمہ (جس سے نکاح حرام تھا) کو حلال کیا، ایسے لوگوں میں اور علماءِ یہود کاتمین للحق وملبسین للحق بالباطل (حق کو چھپانے اور حق کو باطل کے ساتھ گڈمڈ کرنے والوں) میں کیا فرق ہے،

وہ حکایت موعودہ (جس کا وعدہ کیا گیا)... یہ ہے:۔

حکی ان رجلا من اصحاب ابی حنیفۃ رح خطب الی رجل من اصحٰب الحدیث ابنتہ فی عہد ابی بکر الجوزجانی فابی الا ان یترک مذہبہ فیقرأ خلف الامام ویرفع یدیہ عند الانحطاط ونحو ذلک فاجابہ فزوجہ فقال الشیخ بعد ما سائل عن ہذہ واطرق رأسہ النکاح جائز ولکن اخاف علیہ ان یذہب ایمانہ وقت النزع لانہ استخف بمذہبہ الذی ہو حق عندہ وترکہ لاجل جیفۃ نتنۃ کذا فی الشامیۃ عن التاتر خانیۃ قبیل کتاب السرقۃ

(”حکایت ہے کہ ابوبکر جوزجانی رح کے زمانہ میں ایک شخص نے جو امام ابوحنیفہ رح کے متبعین میں سے تھا، ایک اہلِ حدیث کی بیٹی سے نکاح کا پیغام دیا، اس اہلِ حدیث نے چند شرائط پر منظور کیا، وہ یہ کہ اپنا حنفی مذہب چھوڑ دے، امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھے، اور رفع یدین کرے، اس حنفی نے ان شرائط کو قبول کر لیا، اور نکاح ہو گیا، جب شیخ ابوبکر جوزجانی رح سے اس کے متعلق پوچھا گیا تو انھوں نے اپنا سر جھکا لیا، پھر فرمایا کہ نکاح تو صحیح ہو گیا، لیکن مجھے خوف ہے کہ کہیں نزع کے وقت اس کا ایمان نہ چلا جائے، کیونکہ اس نے ایک بدبودار مردار کے لئے اپنے مذہب کو چھوڑ کر جو اس کے نزدیک حق تھا،“)

چند ٹکوں کی خاطر ایک شخص کی اپنی حقیقی ہمشیرہ کو زانیہ قرار دینے کی کوشش،

اسی کی نظیر (مثال) ایک اور قصہ میرے سامنے پیش ہوا تھا، کہ اس میں بھی ایک شخص نے محض ایک نفسانی غرض سے ایک منکوحہ کو زانیہ قرار دیا تھا، یہ تو دین کے خلاف ہوا، اور وہ منکوحہ اس شخص کی بہن تھی، اس کو زانیہ کہنا، یہ حیاء وغیرت کے خلاف ہوا، وہ قصہ یہ ہے کہ ایک سنّی شخص کی سگی بہن کا نکاح ایک شیعی

مرد سے ہوا، اور وہ عورت لاولد ہزاروں روپے کا ترکہ چھوڑ کر مرگئی، تو شرع سے اس کے دو ہی وارث تھے، ایک زوج (شوہر) کہ نصف اس کا تھا، دوسرا یہ بھائی کہ نصف اس کا تھا، یہ بھائی یوں چاہتا تھا کہ زوج کو کچھ نہ ملے، سب میں ہی لے لوں، تو اس کے متعلق اس ترکیب سے سوال لکھا کہ چونکہ سنیہ کا نکاح شیعی سے حسب فتویٰ کثیر من العلماء (بہت سے علماء کے فتویٰ کے مطابق) صحیح نہیں ہوتا، اس لئے وہ مرد اس کا زوج ہی نہیں، پس وہ وارث نہ ہونا چاہیئے، صرف ایک بھائی وارث ہے، تو اس طرح کُل ترکہ کس کو ملے گا؟

میں نے کہا، افسوس! اوّل تو جس وقت یہ نکاح ہوا تھا اس وقت تم کہاں سوتے تھے، کیوں ہونے دیا تھا؟ یہ مسئلہ اور غیرت کہاں گئی تھی؟ پھر ہوجانے کے بعد شور وغل کیوں نہیں کیا! اتنے دنوں زنا ہوتا رہا، اس کو گوارہ کیا، پھر ایمان سے کہو کہ اگر اتنا ہی ترکہ شوہر چھوڑ کر مرجاتا اور اس کا کوئی وارث نہ ہوتا اور تم کو یہ توقع ہوتی کہ اگر میری بہن کو بوجہ فتویٰ ردّ علی الزوجین عند عدم وارث کے یہ کل ترکہ مل جائیگا۔ تو بوجہ اس کے لاولد ہونے کے پھر سب مجھ کو مل سکتا ہے، تو کیا اس وقت بھی تم اس نکاح کے غیر معتقد وغیر ثابت (منعقد اور ثابت نہ) ہونے کے لئے کرتے؟ یا اگر کوئی ایسا فتویٰ بھی سناتا تو کہتے کہ نہیں صاحب سب کا فتویٰ اس پر نہیں ہے، اور جواز (جائز ہونے) کا فتویٰ زیادہ معتبر اور صحیح ہے، اور میں نے کہا کہ شیعی سنی کے تناکح (شیعہ سنی سے نکاح کرنے) کا مسئلہ وہ ایک مستقل بحث ہے، میں اس وقت اس میں گفتگو نہیں کرتا، مگر تم سے صرف یہ استفسارات (چند سوال دریافت) کرتا ہوں، تاکہ تم کو اس کوشش کا مبنی (بنیاد) معلوم ہو، غرض بالکل لاجواب ہوکر اپنا سا منہ لے کر رہ گئے، یہ صورت مذکورہ مختصر نمونہ تھا، تحلیل محرمات کا جن میں لوگ بکثرت مبتلا ہیں،

اُن عورتوں کا بیان جن سے شرعاً نکاح درست ہے،

اب اس کے مقابلہ میں ایک دوسری فہرست ان کوتاہیوں کی جو تحریم بعض محللات (نکاح کے لئے بعض شرعاً حلال عورتوں سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں) کے متعلق مذکور ہوتی ہیں، یعنی احکامِ شرعیہ کی ناواقفی سے بعضی عورتوں کو جو شرعاً حلال ہیں حرام اعتقاد کرلیا گیا ہے، مثلاً بہت سے عوام ممانی سے، چچی سے، اسی طرح پیرانی اور استانی سے، اسی طرح شاگردنی اور مریدنی سے نکاح کرنا حرام سمجھتے ہیں، اسی طرح رضاع (دودھ پلانے) کا ایک مسئلہ بڑھا دیا ہے کہ ایک برتن میں میاں بی بی کے دودھ کھانے کو موجبِ حرمت رضاع و فسادِ نکاح سمجھتے ہیں،

اسی طرح ایک حکم مصاہرت میں بڑھا دیا، کہ سوتیلی ساس یعنی بیوی کی سوتیلی ماں سے نکاح کو حرام سمجھتے ہیں، اور اگر کوئی ایسا کرلیتا ہے تو اس پر بے حد طعن وملامت کرتے ہیں، یہ سب زیادت فی الدین (دین میں زیادتی کرنا) ہے، البتہ سوتیلی ساس کو زندہ بی بی کے ساتھ جو اسکی

سوتیلی بیٹی ہے، نکاح میں جمع کرنا اس کو بعض علماء نے منع کیا ہے، سو اس میں اگر احتیاط کرے افضل ہے، اور باقی صورتیں بالاجماع حلال ہیں، گو بدنامی کی بات نہ کرنا اس نیت سے کہ لوگ طعن کر کے گنہگار ہوں گے احسن ہے، اور ان علّات کو محرمات میں داخل سمجھنے پر علاوہ فسادِ اعتقاد کے ایک اور عملی مفسدہ مرتب ہوتا ہے، وہ یہ کہ مسئلہ سب کا سنا ہوا ہے، کہ محرمات سے پردہ نہیں ہے' پس بے تکلف اُن رشتوں میں بے حجابی (بے پردگی) اختیار کی جاتی ہے خصوص مریدنی تو اگر پردہ کرنے لگے، بعض اقالیم الجہالت (جہالت کے علاقوں) میں اس کی بُری گت بنتی ہے، بلکہ بعض تو بے شرع پیر بھی بُرا مانتے ہیں، سو یاد رکھو ان سب تعلقات سے محرمیت شرعیہ (شرعی حرمت) نہیں ہوتی، اس لئے پردہ واجب ہوگا،

سالی کو بھی پردہ کرنا واجب ہے اسی طرح سالی گو اپنی بہن کے بقاءِ نکاح (نکاح کے باقی رہنے) تک حرام ہے، مگر محرم ابدی (ہمیشہ کے لئے حرام) نہیں، اس لئے بھی پردہ واجب ہے،

بہ یک وقت چار عورتوں سے نکاح کو حرام سمجھنا سراسر ضلالت ہے ایک مخترع فرد (ایک نئی صورت) اس تحریم حلال کی اس وقت ملاحدہ کی تقلید کور (بے دینوں کی اندھی تقلید) سے پیدا ہوئی، یعنی بعض مریدان فطرت نے بعض اقوام یورپ کی دیکھا دیکھی دعوی کیا ہے کہ ایک عورت سے زیادہ دوسری تیسری چوتھی عورت سے نکاح جائز نہیں، اور یہ غلطی پوری مقابل ہے، فہرست سابق کی بالکل آخیر غلطی کی کہ وہاں چار سے زائد کو حلال کیا گیا، یہاں ایک سے زائد چار تک کو بھی حرام کہا گیا؛ اور منشاء تو اس قول کا استحسان ہے، آراء واہواء اہلِ یورپ کا، لیکن چونکہ اپنے کو اسلام کی طرف بھی منسوب کرتے ہیں، اس لئے اس دعوے کو زبردستی قرآن میں بھی ٹھونس دیا، کہ دو جگہ سے دو آیتیں لیں اور ہر ایک کے معنی میں تحریف کی، اس طرح سے اپنا مطلب پورا کیا، چونکہ وہ علمی مضمون ہے، اور اس کے جواب سے احقر اپنی تفسیر[1] میں فارغ ہو چکا ہے، اسی لئے یہاں اسی قدر پر اکتفاء کیا گیا، یہ صورتیں تو تحریم حلال (حرام کو حلال کرنے) کی اعتقاداً (عقیدے کے اعتبار سے) تھیں،

---

[1] احقر نے یہ تفسیر بیان القرآن سے کتاب ھٰذا کے رسالہ "الخطوب المذیبہ للقلوب المنیبہ" کی ذیلی سُرخی .... "تعدد ازواج میں عدل نہ ہونے کا احتمال قوی اور غالب" کے حاشیہ میں من وعن مکمل نقل کر دی ہے جسے آپ آگے ملاحظہ فرمالیں گے، (بندہ احقر قریشی غفرلہ)

شوہر سے فسخ نکاح کی خاطر مرتد ہونے سے نکاح باطل ہی ہوگا

ایک صورت اس کی عملی ایجاد کی گئی ہے، وہ یہ کہ کسی عورت کو خود یا کسی ناجائز تعلق کے سبب شوہر کے پاس رہنا منظور نہ ہوا اور وہ طلاق وغیرہ دیتا نہیں، نعوذ باللہ وہ مرتد ہوگئی، جس سے نکاح فسخ ہوگیا، پھر مسلمان ہو کر آزاد رہنے لگی، یا اس ناجائز موقع پر نکاح کر لیا، اللہ تعالیٰ حبائلِ شیطان (شیطان کے پھندے) سے محفوظ رکھے ہمارے فقہاء نے ایک قانونِ شرعی سے اس کا خوب انتظام فرمایا ہے، کہ مسلمان ہونے کے بعد (خواہ اپنی رضا سے ہوجائے ورنہ جبر کر کے مسلمان کیا جائے گا اس کے بعد) جبراً شوہر اوّل ہی سے نکاح کرایا جائے گا، اور ایک روایت یہ ہے کہ ایسے ارتداد سے وہ نکاح سے خارج ہی نہ ہوگی۔ (کذا فی الدر المختار و رد المحتار، ج ۳، ص ۲۹۳)

جوش میں تین طلاق کی قسم کھانے سے تینوں طلاقیں واقع ہوجاتی ہیں

بعضے لوگ کسی جوش میں قسم کھا بیٹھتے ہیں کہ میں اگر فلاں عورت سے نکاح کروں تو اس کو تین طلاق، اور اس حلف کے بعد پھر وہ نکاح کرتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہیئے کہ اس منکوحہ پر تین طلاقیں واقع ہوجائیں گی، اور اس مسئلہ میں زائد تفصیل ہے، اس سب کے لکھنے کی یہاں گنجائش نہیں، اگر کسی نے ایسی حرکت کی ہو اس کو چاہیئے کہ درمختار کی کتاب الحدود سے قبل کی یہ عبارت، حلف لا یتزوّج فزوّجہ فضولی فاجاز بالقول یحنث (یعنی کسی نے قسم کھائی کہ میں شادی نہیں کروں گا، کسی اور نے بغیر اس کی اطلاع کے اس کا نکاح کرادیا اور اس نے اس کی اجازت دیدی تو وہ حانث ہوگا[۱]) اور اس کے متعلق ردّ المحتار (شامی) کا حاشیہ کسی عالم محقق کے پاس جاکر تحقیق کرلے،

اولاد کی تعداد بیس تک پہونچ جائے تو جاہل عوام کے اعتقاد کے مطابق نکاح ٹوٹ جاتا ہے،

ایک صورت تحریم حلال کی عوام سے اور سُنی گئی ہے، وہ یہ کہ جس عورت کے بیس اولاد ہوجائیں، اس کا نکاح ٹوٹ جاتا ہے، محض لغو اور باطل ہے،

متبنّیٰ کی بی بی سے نکاح حرام نہیں

اور بعض متبنّیٰ (منہ بولے بیٹے) کی بی بی سے نکاح کو بھی مذموم سمجھتے ہیں، یہ فرد تحریم حلال کی خاص اس جاہلیت کا مسلک ہی جنھوں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اس امر میں طعن کیا تھا، اور حق تعالیٰ نے اس رسم جاہلیت کے ابطال کے لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس امر کا مامور فرمایا؛

---

[۱] حانث سے مراد یہ ہی کہ نکاح کے ہوتے ہی اس کی منکوحہ کو طلاق ہوجائے گی، ۱۲ نجیب

بیوہ کے نکاح کے اظہار میں ننگ وعار بالکل لغو ہے ، آخر میں ایک جزئیہ اس کلیہ کا جس میں اعتقاداً تو نہیں عملاً وحالاً عوام سے خواص تک اور نساء (عورتوں) سے رجال (مردوں) تک سب ہی مبتلا ہیں، اِلَّامَنْ شَاءَ اللہ (مگر جسے اللہ چاہے) اور وہ بیوہ عورت کا نکاح ہے، کہ گو اعتقاد سے تو سب اس کو حلال ہی سمجھتے ہیں، مگر اس سے اس قدر عار وننگ ہے کہ بعض اوقات اس کے اظہار میں کفر تک لازم آجاتا ہے، چونکہ اس کا استحسان بالکل طے شدہ مسئلہ ہے، اس لئے تطویلِ کلام کی حاجت نہیں،

اَللّٰھُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا وَّارْزُقْنَا اِتِّبَاعَہٗ وَالْبَاطِلَ بَاطِلًا وَّارْزُقْنَا اجْتِنَابَہٗ ،

("اے اللہ ہمیں راہِ حق دکھلا اور اس پر چلنے کی توفیق بخش اور راہِ باطل واضح کردے اور اس سے محفوظ رکھ")

ضمیمہ فہرست بالا

ایک صورت تحریم حلال کے قبیل سے جو جہلاء کا مزعوم ہے
یہ ہے کہ عنّین یعنی نامرد سے نکاح کو منعقد نہیں سمجھتے ؛

نامرد کے ساتھ نکاح بالکل صحیح ہوجاتا ہے،

یعنی اس کو مثل عورت کے سمجھ کر عورت کے ساتھ اس کے نکاح کو باطل سمجھتے ہیں، سو یہ بالکل ہی غلط ہے، صریح دلیل فقہی اس کے غلط ہونیکی یہ ہے کہ اس صورت میں منکوحہ کے مطالبہ پر اس کو علاج کے لئے مہلت دی جاتی ہے، اور اگر شفاء ہوجاوے تو اس نکاحِ سابق پر اکتفاء کیا جاتا ہے، نکاحِ جدید کا حکم نہیں کیا جاتا، معلوم ہوا کہ پہلا نکاح منعقد و صحیح ہوجاتا ہے،

نامرد کو از خود نکاح کرنا گناہ ہے

البتہ ایسے شخص کو جبکہ اس کو علامات سے اپنا عاجز ہونا معلوم ہو تو خود نکاح کرنا ہی گناہ ہے، تو تحریم بمعنی گناہ تو واقع ہے، مگر تحریم بمعنی عدمِ انعقاد نکاح (نکاح صحیح نہ ہونا) واقع نہیں، اسی لئے اس کے لئے احقر نے اوپر یہ عنوان تجویز کیا ہے "تحریم حلال کے قبیل سے" (حلال کو حرام سمجھنے کی قسم سے) کیونکہ یہ ایک وجہ سے تحریم ہے ایک وجہ سے نہیں،

نامرد کے پیچھے نماز پڑھنے سے نماز صحیح ہوجاتی ہے ؛؛؛

اور اس شخص کے اسی الحاق بالنساء (عورتوں میں شامل ہونے) کے خیال پر ایک دوسری غلطی جو کہ اس باب سے نہیں ہے، جہلاء مبتلا ہیں، یعنی اس شخص کے پیچھے نماز کو ناجائز یا مکروہ سمجھتے ہیں، جس کی کچھ اصل نہیں،

خصی اور ہیجڑے کی امامت مکروہ ہے،

اور یہی حکم ہے خصی و مجبوب کا، یعنی جس کے بیضے نکال دیئے گئے ہوں جسکو خوجہ یا خواجہ سرا کہتے ہیں، یا جس کا خاص اندام (عضو مخصوص) قطع کردیا گیا ہو جس کو ہمارے محاورہ میں مخنث یا ہیجڑا کہتے ہیں، وہ بھی مرد ہے اور اس کا حکم مردوں کا سا ہے، گو بصورت اس کے فاسق ہونے یا اس سے جماعت کی نفرت کرنے کے اس کی امامت مکروہ ہے، اوّل صورت میں تحریماً دوسری میں تنزیہاً،

نامرد، خصی اور ہیجڑے وغیرہ سے پردہ واجب ہے

ان ہی احکام ... میں سے یہ بھی ہے کہ اُس سے عورتوں کو پردہ بھی واجب ہے، جس طرح عام مردوں سے، اس میں بھی ناواقف بکثرت مبتلائے غلطی ہیں،

عنّینیت مرض ہے اور قطع عضو سخت گناہ ہے !!!

اس میں اور عنّین میں اتنا فرق ہے کہ عنّینیت مرض ہے جس میں کوئی گناہ نہیں، اور قطعِ عضو سخت گناہ ہے، اگر خود کسی نے اپنے لئے ایسا تجویز کیا وہ فاسق ہے، جب تک توبہ نہ کرے، اور جو اس کے بلا علم یا بلا اختیار کسی اور نے کیا ہے وہ فاسق ہے،

مہلا بھی مردوں میں شامل ہے؛

اور اسی کے ساتھ حکم سمجھنا چاہئے ایسے شخص کا جس کی چال ڈھال یا بول چال میں زنانہ پن ہو، اس کو ہمارے محاورے میں مہلا کہتے ہیں، سو وہ بالکل مرد ہے، البتہ اگر اس کی یہ مشابہت بالنساء خلقی (عورتوں سے مشابہت قدرتی) ہے تو وہ معذور ہے، اور اگر قصداً (جان بوجھ کر) ہے جس کو تشبّہ کہتے ہیں تو حدیث[1] میں ایسے شخص پر لعنت آئی ہے،

نامرد سے عورت کی تفریق کرانے کا خاص قانون ہے

اور ایک غلطی عنّین کے متعلق کم واقفیت لوگوں کو واقع ہوتی ہے، کہ وہ تحلیلِ حرام کی فہرست میں داخل ہو جاتی ہے، وہ یہ کہ اس کے نکاح کو تو منعقد سمجھتے ہیں، مگر شوہر سے اس کی تفریق کر دینے کو عورت یا برادری کے اختیار میں سمجھتے ہیں، کہ جب چاہا دوسری جگہ اس کا نکاح کر دیا گیا، سو یہ بھی شرع کے خلاف ہی، اس کی تفریق کا شرعاً خاص قانون ہے، جو کتبِ فقہ میں مفصلاً مذکور ہے، اور احقر نے بہت عام فہم اور سلیس عبارت میں اس کو تتمہ[2] امداد الفتاویٰ، ص ۱۶۳ مطبوعہ مجتبائی پر لکھ دیا ہے، اس کا مطالعہ ضروری ہے؛

---

[1] چنانچہ بخاری میں حضرت ابن عباسؓ سے مروی ہے کہ فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لَعَنَ اللّٰہُ الْمُتَشَبِّهِيْنَ مِنَ الرِّجَالِ بِالنِّسَآءِ وَالْمُتَشَبِّهَاتِ مِنَ النِّسَآءِ بِالرِّجَالِ (یعنی اللہ تعالیٰ نے لعنت کی ہے ان مردوں پر جو عورتوں کی شباہت بناتے ہیں اور اُن عورتوں پر جو مردوں کی شباہت بناتی ہیں) احقر قریشی غفرلہٗ

[2] احقر ناکارہ کے پاس امداد الفتاویٰ کی مذکورہ جلد نہیں، اس لئے حضرت حکیم الامت تھانویؒ کی ہی تصنیف "الحیلۃ الناجزۃ للحلیلۃ العاجزۃ" کے رسالہ "المرقومات للمظلومات" سے وہ قانون نقل کرتا ہوں جو عام فہم بھی ہے اور مفصل بھی، وہو ھٰذا:۔ (بندہ احقر قریشی غفرلہٗ) "زوجۂ عنّین کے لئے تفریق کی صورت یہ ہے کہ عورت اپنا معاملہ قاضی کی عدالت میں پیش کرے، قاضی واقعہ کی تحقیق کرے، یعنی اوّل خاوند سے دریافت کرے

مرض رتقاء والی عورت سے نکاح منعقد ہوجاتا ہے،

ایسے ہی ایک غلطی اسی قسم کی اس عورت کے متعلق ناواقفوں کو ہورہی ہے جس میں بوجہ حائل (آڑ) ہوجانے کسی ہڈی یا جلد وغیرہ کے خاص موقع پر، ہمبستری کی صلاحیت نہیں ہے، جس کو عربی میں رتقاء کہتے ہیں اس کو ملحق بالرجال

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) اگر وہ خود اقرار کرے کہ بیشک میں اس عورت سے ہمبستری پر قادر نہیں تو اس کو ایک سال کی مہلت علاج کے لئے دیدے، اور اگر وہ اقرار نہ کرے بلکہ جماع کا دعویٰ کرے تو اس وقت یہ تفصیل ہے کہ اگر عورت باکرہ ہونے کا دعویٰ کرے تب تو مرد سے حلف لیا جائے گا، اور اگر اس نے حلف کر لیا تو عورت کو تفریق کا حق حاصل نہ ہوسکے گا، اور اگر شوہر نے حلف سے انکار کر دیا تو اس کو ایک سال کی مہلت بغرض علاج دیدی جائے گی، اور اگر عورت باکرہ ہونے کی مدعی ہو تو قاضی عورتوں سے اس کی بیوی کا معائنہ کرائے، ایک عادل تجربہ کار عورت کا معائنہ بھی کافی ہے، لیکن احتیاط اس میں ہے کہ دو عادل عورتیں معائنہ کریں، آگے بعد معائنہ کے دو صورتیں ہیں، (۱) ایک صورت یہ کہ عورتیں یہ بیان کریں کہ یہ عورت باکرہ یعنی کنواری نہیں رہی، تب تو خاوند سے اس بات پر حلف لیا جائے کہ اس نے جماع کیا ہے، اور اگر وہ حلف کرے تو اس کا قول معتبر ہوگا، اور عورت کو تفریق کا حق باقی نہ رہے گا، اور اگر شوہر حلف سے انکار کردے تو تاجیل یعنی ایک سال کی مہلت کا حکم کر دیا جائے، (۲) اور دوسری صورت یہ ہے کہ عورتیں یہ بیان کریں کہ ابھی تک یہ لڑکی باکرہ (کنواری) ہے، تو پھر قاضی بدون کسی سے حلف لئے ہوئے شوہر عنین کو ایک سال کی مہلت علاج کے لئے دیدے، ——— خلاصہ یہ کہ جب کسی دلیل سے متحقق ہوجائے کہ عورت باکرہ نہیں بلکہ ثیتبہ ہے، خواہ ثیتبہ ہونا اس طرح معلوم ہو کہ وہ بیوہ ہو اور شوہر اول سے اولاد ہوچکی ہو، یا خود عورت کے اقرار سے یا عورتوں کے معائنہ سے، ان تینوں حالتوں میں مرد کا قول حلف کے ساتھ قبول کیا جائیگا کہ وہ ہمبستری کرچکا، اور عورت کو علیحدگی کا حق نہ دیا جائے گا، اور اگر تینوں حالتوں میں مرد حلف سے انکار کردے تو عورت کا دعویٰ درست مان کر مرد کو ایک سال کی مہلت دیدیں، اور اگر عورتوں کے معائنہ سے زوجہ کا باکرہ ہونا ثابت ہو تو بدون حلف ہی ایک سال کی مہلت دیدی جائے، اور اس مدت کے لئے ظاہر الروایۃ میں قمری سال کا اعتبار کیا گیا ہے، لیکن روایت حسن میں شمسی سال کو لیا ہے، اور بعض اصحاب ترجیح نے احتیاطاً اسی کو اختیار کیا ہے، اور عموماً متاخرین نے اسی پر فتویٰ دیا ہے، اور اب بھی عام اہل فتویٰ کا یہی معمول ہے، اور یہ سال حاکم کی مہلت دینے کے وقت سے شروع سمجھا جائے گا، اس سے پہلے خواہ کتنی ہی مدت گذر گئی ہو معتبر نہ ہوگی، پھر ایک سال بھر کے عرصہ میں اگر شوہر کسی طرح علاج کرا کے تندرست اور

(باقی صفحہ آئندہ)

(آدمیوں کے مشابہ) سمجھ کر اس سے بھی نکاح کو منعقد نہیں سمجھتے، یہ بھی محض غلط ہے،

خنثیٰ کا کسی سے نکاح نہیں ہو سکتا،

البتہ انسان کی ایک خاص قسم ہے جس میں شبہ الحاق بالنساء (عورتوں کے مشابہ ہونے) کا بھی ہے، اور الحاق بالرجال (مردوں کے مشابہ ہونے) کا بھی، اس کو شریعت کی اصطلاح میں خنثیٰ کہتے ہیں کہ اس میں تمام علامات ذکورت و انوثت کے (مردوں اور عورتوں کی پوری علامتیں) برابر درجہ میں متعارض ہیں، سو اس کا نکاح کسی سے

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) جماع پر قادر ہو گیا، اور ایک مرتبہ بھی ہمبستری کرلی تو عورت کو فسخ نکاح کا حق جاتا رہا بلکہ ہمیشہ کے لئے (یہ) حق باطل ہو گیا، اب کبھی علٰحدگی کا مطالبہ نہیں کر سکتی، اور اگر اس عرصہ میں ایک مرتبہ بھی جماع نہ کر سکا تو عورت کے دوبارہ درخواست کرنے پر قاضی تحقیق کرے، اگر خود شوہر نے اقرار کر لیا کہ بیشک میں قادر نہیں ہوا تب تو عورت کا دعویٰ بلا غبار صحیح ہو گیا، اس صورت میں قاضی عورت کو اختیار دیدے کہ اگر علٰحدگی درکار ہو تو طلب کرو، ورنہ اپنے خاوند کے ساتھ رہنے کو گوارا کرو، اس پر وہ اگر اسی مجلس میں علٰحدگی چاہے تو خاوند سے طلاق دلوادی جائے، اگر وہ انکار کرے تو قاضی تفریق کردے، (جیسا کہ آئندہ عنقریب آئے گا) اور اگر خاوند اقرار نہ کرے، بلکہ جماع ہو چکنے کا دعویٰ کرے تو اس وقت یہ تفصیل ہو کہ مہلت دینے کے وقت اگر عورت کا ثیبہ ہونا ثابت ہو چکا تھا، یا اب عورت اقرار کرے کہ کسی طرح بکارت زائل ہو چکی ہے، مگر ہمبستری نہیں ہوئی، تب تو خاوند سے حلف لیا جائے، اگر وہ قسمیہ کہدے کہ میں نے جماع کیا ہے تو مرد کا قول معتبر ہوگا، اور تفریق نہ ہو سکے گی، اور اگر شوہر نے اس وقت بھی حلف سے انکار کر دیا تو تو عورت کو طلب فراقت کا اختیار دیدیا جائے گا، اور اگر مہلت دینے کے وقت سے معائنہ سے باکرہ ہونا ثابت ہوا تھا، اور اگر اب دوبارہ معائنہ میں بھی باکرہ ہونے کی تصدیق ہو تب بھی عورت سے بدون حلف لئے ہوئے قاضی عورت کو اختیار دیدے کہ اپنے خاوند کے نکاح میں رہے، یا تفریق کا مطالبہ کرے، اور جن صورتوں میں قاضی عورت کو اختیار دے چکا اُن میں حکم یہ ہو کہ عورت اگر اسی مجلس میں تفریق چاہے تب تو تفریق ہو سکتی ہے ورنہ نہیں، پس اگر عورت نے اسی مجلس تخییر (اسی اختیار دیئے جانے والے مجلس) میں یہ کہہ دیا کہ میں اس شوہر سے علٰحدہ ہونا چاہتی ہوں تو قاضی اس کے شوہر سے کہے کہ اس عورت کو طلاق دیدو، اس پر اگر خاوند نے طلاق دیدی تو طلاقِ بائنہ واقع ہو جائے گی، اور اگر وہ طلاق دینے سے انکار کردے تو قاضی خود تفریق کردے یعنی مثلاً یہ کہدے کہ میں نے تجھ کو اس نکاح سے الگ کر دیا، یہ تفریق بھی شرعاً قائم مقام طلاق بائنہ کے واقع ہو جائے گی،" (الحیلۃ الناجزہ، ص ۲۳۶ تا ۲۳۹)

جائز نہیں، نہ مرد سے کیونکہ شاید وہ بھی مرد ہو اور نہ عورت سے کیونکہ شاید وہ بھی عورت ہو اور کسی دوسرے خنثیٰ مشکل سے کیونکہ شاید دونوں مرد ہوں یا دونوں عورت ہوں اور اس کے تمام احکام میں دونوں شبہوں کا لحاظ کر کے بے حد رعایت کی گئی ہے، جس سے فقہائے اسلام کی باریک بینی کا اندازہ ہوتا ہے، اور فقہ میں اس کا ایک مستقل باب منعقد کیا ہے، کیونکہ ایسے شخص کا وجود بہت ہی نادر ہے، اس لئے اس کے احکام کا بیان یہاں ضروری نہیں سمجھا گیا،

ولد الزنا سے نکاح صحیح ہو جاتا ہے | ایک صورت تحریم حلال کی بعض عوام سے سُنی گئی کہ ولد الزنا (حرامی اولاد) کے نکاح کو بھی باطل سمجھتے ہیں، سو یہ بھی غلط ہے، اپنے کفو سے بھی درست ہے، اور غیر کفو سے بھی، جہاں کفاءت کا شرط ہونا شرعاً ضروری نہ رہے، نیز درست ہے، جس کی تفصیل کے لئے فقہ کی طرف رجوع کرنا چاہئے،

نان و نفقہ کی خبر گیری نہ کرنے سے از خود نکاح باطل نہیں ہوتا | ایک صورت تحلیلِ حرام کی عوام نے ایک اور تراش رکھی ہے، یعنی جو مرد نان و نفقہ کی خبر گیری نہ کرے، یا مقدور (طاقت) نہ رکھے اس کے نکاح کو از خود منفسخ (ختم) سمجھ کر اس کا نکاح دوسری جگہ کر دیتے ہیں، اسی طرح جو عورت شوہر کے گھر سے نکل کر بدکاری کرنے لگے، یا شوہر اس کو نکال کر ایک عرصہ دراز تک اس سے تعلق نہ رکھے اس کو بھی نکاح سے خارج سمجھ کر اس کو نکاح ثانی کی اجازت دیدیتے ہیں، یہ سب بالکل غلط در غلط ہے، البتہ تفریقِ معسر (ناداری کے باعث تفریق) میں امام شافعیؒ کا مذہب ہے کہ مسلمان حاکم جس کو سلطنت سے ایسے مقدمات کا باضابطہ اختیار دیا گیا ہو، اعسار (ناداری) کی حالت میں نکاح فسخ کر دیگا، اور بدون اس شرط کے وہ بھی از خود منفسخ نہیں کہتے، جیسا عوام نے غلط سمجھ رکھا ہے، جس طرح مفقود کی تفریقِ نکاح میں امام مالکؒ کے مذہب پر قضاءِ قاضی شرط ہے جس کو بندہ نے اوپر بھی لکھا ہے، کہ اس اشتراط کی کتبِ مالکیہ میں بھی تصریح ہے، اس وقت اس کا پتہ بھی عرض کئے دیتا ہوں، زرقانی مالکیؒ نے شرح مؤطا میں ایک ہی عبارت میں چار جگہ اس کی تصریح کی ہے، بندہ کے تتمۂ ثانیہ امداد الفتاویٰ، ص ۱۶۸ میں وہ عبارت بعینہٖ منقول ہے ضرور ملاحظہ فرمائی جائے بہرحال حلت و حرمت میں سخت احتیاط درکار ہے،[۱]

یہ ضمیمہ ختم ہوا، ۲۶؍ ربیع الاول ۱۳۳۴ھ

---

[۱] جہاں ایسے مسائل کی ضرورت پڑے تو علماءِ محققین یا کسی معروف دار الافتاء سے رجوع کرنا چاہئے۔ (قریشی)

ضمیمۂ ثانیہ

در نقل رسالہ

الخطوب المذیبۃ للقلوب المنیبۃ

متعلقہ بعض اغلاط متعلقہ تحریم محللات

که خطے یکے از کارانست ؛

برادر عزیزم سلمۂ ، السلام علیکم ورحمۃ اللہ ، آں عزیز کے استفساری خط کی رسید اور تعجیل (جلدی) جواب نہ ہو سکنے کا عذر اس خط کے آنے کے قبل ہی جس کو آئے ہوئے تقریباً پچیس روز ہو گئے ہوں گے، ایک کارڈ پر لکھ چکا ہوں گو مجھ کو بفضلہ تعالیٰ بخار سے نجات ہو گئی ہے، لیکن ضعف و نقاہت سے کسی معمولی سے معمولی کام کی بھی ہمت نہیں ہوتی، مگر ساتھ ہی آنعزیز کے انتظار کے تصور سے اضطراب اور خود اس جواب کا بھی غالباً بعض مضامین مفیدہ کو متضمن ہونا (شامل ہونا) یہ دونوں امر متقاضی ہیں کہ بنام خدا جواب شروع تو کر ہی دوں، اتمام قبضۂ قدرت الٰہیہ میں ہے، اس لئے اختصار کے ساتھ مگر قدرے ضروری تفصیل کے ساتھ جواب خط لکھتا ہوں،

آنعزیز نے لکھا ہے کہ اتنا معلوم ہوا کہ اس جدید تعلق سے بھابی صاحبہ کی حالت میں بہت تغیر ہو گیا ہے، اور آپ کو بھی کچھ باعث مسرت نہ ہوا،

عزیزمن! یہ دونوں امر صحیح ہیں، اس تفصیل کی تو حاجت نہیں کہ کیا تغیر ہوا؟ اور اس تغیر کے سبب مجھ کو کیا تکدر رہا؟ کیونکہ اوّل تو اس کی حقیقت معلوم ہونا مشاہدہ پر موقوف ہے، دوسرے کم شخص ایسے ہوں گے جنھوں نے اس کے نظائر کا مشاہدہ نہ کیا ہو اس لئے یہ تفصیل بیکار ہے،

تغیر کے اسباب

البتہ نتیجہ خیز بات اس تغیر کے اسباب کی تحقیق ہے، جس کی تقریر سے خود نتیجہ تک ذہن پہنچ جائے گا، اور ممکن ہے آخر میں اس کی کچھ تصریح بھی کر دی جائے، سو ان اسباب کا مجموعہ راجع ہے دو امر کی طرف، ایک حد سے زیادہ جاہل ہونا طبقۂ اناث (عورتوں) کا، خواہ جہل علمی یعنی ناواقفی شرائع (علمی جہالت یعنی شریعت سے ناواقفیت ہونا) خواہ جہل علمی جس کو ہمارے محاورہ میں جہالت کہتے ہیں، جس کے شعبوں میں زیادہ تر دخل بدگمانی و بدزبانی و کبر

حسد وحبِ دنیا ونسیانِ آخرت (دنیا سے محبت اور آخرت کو بھلانے) کو ہے، دوسرا حد سے زیادہ محبت ہونا بیبیوں کو شوہروں سے، امرِ اول کا ظہور خود منکوحہ اُولیٰ سے زیادہ جو کہ صاحبِ معاملہ ہے دوسری عورتوں میں زیادہ معلوم ہوا، چنانچہ ایسے موقع پر جو اقوال ان جہلاء کے سننے میں آئے وہ اس کی بیّن (واضح) دلیل ہیں؛

خاوند کے دوسری عورت سے نکاح کرنے پر جاہل عورتوں کی مختلف خیالی باتیں

(۱) ہائے بادشاہی چھن گئی (۲) ہائے ایسا ظلم (۳) بس جی مولویوں کا بھی اعتبار نہ رہا (۴) بھلا بدون اجازت منکوحۂ اُولیٰ[۱] کے یہ دوسرا نکاح کب جائز ہوسکتا ہے، (۵) اگر عورت بھی دوسرے مرد کو ڈھونڈ لے تو مرد پر کیسی گزرے (۶) ہائے بیٹی بیٹی کہا کرتے تھے جورو بنا کر بیٹھ گئے (۷) بیٹی کیا نواسی کی جگہ تھی؛ (۸) ارے بھائی بھانجہ تو بیٹا ہوتا ہے، پھر اس کو بیٹا بنایا بھی تھا، ہائے بیٹے کی بیوی کو لے بیٹھے، یہ غضب (۹) بس جی ایسی عورت کا کیا اعتبار، اس کا تو اگر نانا حقیقی زندہ ہوتا اس کو بھی کر بیٹھتی (۱۰) لو اور پڑھواؤ لڑکیوں کو، ہائے استاد ہو کر شاگردنی کو کر بیٹھے (۱۱) اور مریدنی بھی تو تھی، پیر میں اور باپ میں کیا فرق ہوتا ہے (۱۲) اجی معلوم ہوتا ہے اُن میں پہلے سے ساز باز ہوگی (۱۳) بس جی اب تو سب مرید ایسا کریں گے (۱۴) اجی لڑکی نے بھی ظلم ہی کر دیا جو کرنا ہی تھا اور دس تھے، بھلا جس کے پاس بچپن میں رہی، لکھا پڑھا، اسی کی چھاتی پر مونگ دلنا تھا، (۱۵) خدا کرے ان کو آرام ہی نصیب نہ ہو؛ (۱۶) اجی ایسی بے حیا ہے تو ستر کرے گی ستر چھوڑے گی (۱۷) بس اب یہ اس بیچاری غریب کا حصہ رزق میں بھی بانٹ لے گی، (۱۸) اگر اتفاق سے کوئی حادثہ پیش آگیا، مثلاً معاش کی کمی یا بیماری تو یہ رائے قائم کی جاتی ہے کہ اس کا ایسا منحوس پیر آیا تھا کہ رزق اُڑ گیا، صحت اُڑ گئی، ونحو ذٰلک من الخرافات، (اور ایسی ہی بے شمار خرافات ہیں)

بعض اوقات عبادت گذار عورتیں بھی بلا سوچے کلمات کفر بک دیتی ہیں،

جن میں بعض اقوال تو صاف شریعت کا رد اور کفر کے قریب ہیں، اس واقعہ سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ بڑی بڑی لکھی پڑھی تسبیح نفلوں کی پابند، مگر تمام دین ان کا ملمع (ظاہری ٹیپ ٹاپ) ثابت ہوا، نہ یہ تمیز کہ ہم منہ سے کیا بکتے ہیں؛ اس میں کفر ہو جائے گا، یا گناہ ہو جائے گا، نہ یہ ہوش کہ آخر نتیجہ ان خرافات کا کیا ہے،

---

[۱] موجودہ دور کے عائلی قوانین میں خلافِ شریعت یہ پابندی بھی عائد کردی گئی، اِنَّا لِلّٰہِ وَ اِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْن،

شعور و فکر کی یہ کافری معاذ اللہ!

فرنگ ترے خیال و عمل کا ہے مسجود

شوہر کے نکاح ثانی کر لینے پر عام عقلاء کے نزدیک اس کی پہلی بیوی کو تلقینِ صبر کرنا اور تسلی دینا

اپنے نزدیک تو صاحبِ معاملہ کے ساتھ ہمدردی کی جاتی ہے مگر سلیقہ نہیں کہ اس سے تو اور دونا غم کو اشتعال ہوتا ہے، ایسے وقت میں سخت ضرورت تسلی دینے کی ہوتی ہے، جس کا طریقہ عام عقلاء کے نزدیک تو صبر دلانا ہے، اور جو شبہات آئندہ کے متعلق صاحبِ معاملہ کو واقع ہوں مثلاً یہ کہ (۱) میرے ساتھ التفات نہ رہے گا، (۲) میرے حقوق ضائع کر دیئے جائیں گے، (۳) جدیدہ کی چغلیوں سے مجھ کو تکلیف دی جائے گی، ان سب شبہات کو خوبصورتی سے رفع کرنا، اور میرے نزدیک ایسے موقع پر تسلی کا طریقہ یہ ہے کہ اس کو مصیبت ہی تسلیم نہ کیا جائے کہ صبر کی ترغیب دی جائے، اور یہ جو میں نے کہا کہ "ایسے موقع پر تسلی کا طریقہ یہ ہے" مراد ایسے موقع سے وہ موقع ہے جہاں اس کا نعمت ہونا بھی ثابت کر سکے، جیسے :۔

حضرت حکیم الامتؒ کا طریقۂ عمل

بفضلہٖ تعالیٰ اس ناکارہ کی حالت ہی، وہ یہ کہ میں نے قدیمہ (یعنی پہلی بیوی) کی دل جوئی میں بے حد بیشی (پہلے سے بہت زیادتی) کر دی، گو میں نے کوئی گناہ کا، یا عیب کا کام نہ کیا تھا، لیکن اُن کے عین فورانِ شکایت (شکایت کے دوران خون کا جوش مارنے) میں اُن کے تجاوز عن التھذیب (تہذیب کی حد سے گذرنے) کو غلبۂ حال پر محمول کر کے اُن کو معذور قرار دیا، اور اس طرح سکون و سکوت و ضبط سے کام لیا، جیسے کوئی عیب کر کے خجل و شرمندہ ہوتا ہی، اور تمام تر جوش و خروش کا جواب ان الفاظ سے دیا کہ خیر میں نے دل سے سب معاف کیا، اللہ تعالیٰ تمہاری اصلاح فرمائے، میں بوجہ پختگیٔ سن و کثرتِ مشاغل خدمتِ خلائق ان سے بالکل بے فکر ہو گیا تھا بعض اوقات دن دن بھر گھر جانے کی نوبت نہ آتی تھی، عشاء کی نماز پڑھکر فوراً سو رہتا، بات کی بھی فرصت نہ ملتی تھی، مگر اب اُن کی دلجوئی کا خاص اہتمام شروع کر دیا، ذرا ذرا ... بات میں ان کی رعایت ملحوظ کرنے لگا، چونکہ میرا مزاج فطرۃً تیز ہے اور عورتوں میں کجی (ٹیڑھاپن) لازم ہے، کسی میں کم کسی میں زیادہ، اکثر جب کبھی ایسا موقع پیش آتا تھا اس میں تحمل (برداشت) نہ کرتا تھا قولاً (زبان سے) بھی تیز الفاظ کہتا، اور عملاً بھی، بعض اوقات کھانا چھوڑ کر گھر سے مدرسہ میں چلا آتا تھا، ایسا اتفاق بکثرت ہوتا تھا، جب سے یہ واقعہ ہوا اُس برتاؤ کا نام و نشان نہیں رہا، اور اُدھر سے کتنی ہی کجی ہوئی ادھر سے بہت زیادہ نرمی اور راستی (سیدھاپن) برتی گئی، خلاصہ یہ کہ اس قدر نرم برتاؤ اختیار کیا گیا کہ بعض لوگ تو مجھ کو بے غیرت کہنے لگے، بعضے بیوی سے ڈرنے والا، دبنے والا کہنے لگے، بعض نے یہ رائے قائم کی کہ یہ نرمی ہی سبب ہے دوسری جانب کی دلیری کا، البتہ یہ تو ہوا کہ جب کبھی شریعت پر

اعتراض پہنچنے لگا، گو صاحبِ اعتراض کو اس کا احساس نہیں ہوا یا بیہودگی کو زیادہ امتداد ہونے لگا، اول تو نرمی سے فہمائش کر دی، اگر پھر اصرار ہوا تو دوبارہ فہمائش (سمجھانے) میں قدرے آواز بلند ہوگئی، مگر اس میں بھی الفاظِ خشن (درشت) اور تیز سے زبان کو نہایت تکلف کے ساتھ روکا

غرض یہ خلاصہ تھا اور ہے میری حالت کا، تو اس میں غور کر کے ہر عاقل سمجھ سکتا ہے کہ میرا برتاؤ پہلے سے زیادہ اچھا ہو گیا، اور سبب اس کا وہی دل شکنی کے احتمال پر دلجوئی اور اس دلجوئی کا سبب یہی واقعۂ جدیدہ، تو اس صورت میں کیا شک رہا، کہ اس واقعہ کا قدیمہ کے حق میں نعمت ہونا بھی نہایت آسانی سے ثابت کیا جا سکتا ہے، پس طریق تسلّی کا یہ تھا، اور اگر یہاں تک ذہن نہ پہنچتا تو خیر صبر ہی کی تعلیم دی جاتی، اگر دو چار عاقل عورتیں بھی اس طرف توجہ کرتیں تو انکے رنج و غم کی یہاں تک نوبت نہ پہنچتی، مگر جو آئی ان کے خیالات کی جن میں اکثر بلکہ کُل کے کُل لغو اور بے بنیاد تھے تصدیق ہی کرتی آئی، کسی نے تکذیب نہیں کی، اِلّا ما شاء اللہ، اور تصدیق بھی سرف خوشامد میں اور اس مصلحت سے کہ یہ یوں نہ کہیں کہ فلانی کو میرے ساتھ ہمدردی نہیں، بس اس تصدیق سے اُن کے اوہام اور خیالات اور پک گئے، اور وہ مثال ہوگئی جیسے کسی میاںجی کو اس کے مکتب کے لڑکوں نے باہم متفق ہو کر بیمار ڈال دیا تھا کہ جو آتا ہے "خیر ہے؟ چہرہ اُداس کیوں ہے؟" آخر بیچارہ بیمار پڑ گیا،

جو شخص اپنی اصلاح خود نہ چاہے نبی بھی اس کی اصلاح نہیں کر سکتا،

میں نے اس دلجوئی کے علاوہ اصلاحِ باطن کے طریقوں سے اس قدر کام لیا کہ شاید بیس پچیس برس کی مدت میں کسی کے لئے نہ لیا ہوگا، ان میں بعض طریقے منقول تھے اور بعضے بزرگوں کے کلام سے مستنبط کئے ہوئے اور ایسے لطیف لطیف کہ اگر ان کی کوئی قدر کرتا تو ضبط کرنے سے تو ایک بے نظیر رسالہ سلوک کا بنتا، اور عمل کرنے سے انسان کامل بن جاتا، مگر تجربہ سے معلوم ہوا اور پہلے سے بھی معلوم تھا مگر اب اور زیادہ معلوم ہو گیا کہ جو شخص اپنی اصلاح نہ چاہے اس کی اصلاح کوئی مخلوق نہیں کر سکتا حتّٰی کہ نبی بھی،

اپنے مصلح کے ساتھ اصلاح کے لئے اعتقاد اور انعقاد ہونا ضروری ہے،

دوسرے یہ تجربہ سے معلوم ہوا کہ اصلاح کے لئے مصلح (اصلاح کرنیوالے پیر و مرشد) کے ساتھ اعتقاد اور عظمت کا ہونا شرط ہے، اور شوہر کے ساتھ یہ دونوں امر ضعیف ہیں، بہر حال میں نے تھک کر حق تعالیٰ سے التجا اور دعا شروع کی ہے، اور حضرت زکریا علیہ السلام کے قول کے موافق:۔

وَلَمْ اَكُنْ بِدُعَآئِكَ رَبِّ شَقِيًّا (مریم: ۱ آیت ۴) "اور اس کے قبل کبھی میں آپ سے مانگنے میں اے میرے رب ناکام نہیں رہا ہوں،،"

امید قبول رکھتا ہوں اور غالباً پہلے کی نسبت سکوت و سکون دونوں کی رفتار ترقی پر ہے، اور جب مرض میں روزانہ انحطاط ہو امید قوی وہاں صحت کی ہی ہوتی ہے، یہ تو خلاصہ تھا اُن کے غم اور اس غم میں اُن کے ساتھ میرے معاملہ کا،

اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے تو کلفت بھی مسرت ہے، اس سے آنعزیز کے اس سوال کا جواب بھی معلوم ہوگیا کہ آپ کو بھی کچھ باعثِ مسرت نہ ہوا، ظاہر ہے کہ ایسی حالت میں کیا مسرت ہو سکتی ہے، جبکہ اسبابِ مسرت پر اسبابِ کلفت غالب ہوں، مگر یہ نفی مسرت کی جو میں نے تسلیم کرلی یہ ظاہری مسرت کے اعتبار سے ہے، ورنہ باطناً تو اگر اللہ تعالیٰ معرفت نصیب کرے یہ کلفت بھی مسرت ہے، کیونکہ مسرت کے جو منافع ہیں اس کلفت میں اس سے کم نہیں، بلکہ بہت زیادہ حاصل ہیں، گو اس زیادہ پر نظر کرکے نہ کلفت کی تمنا کرے اور نہ اس کے رفع کی دعا کو ترک کرے، حق تعالیٰ سے برابر عافیت مانگتا رہے، لیکن جب تک عافیت ظاہری نہ ہو اس میں مصلحتیں و حکمتیں سمجھ کر ویسے راضی اور ثواب کا متوقع (امیدوار) رہے، چنانچہ الحمد للہ کچھ کچھ اس پر عمل ہے، جس سے زخم پر مرہم رکھا جا رہا ہے، ورنہ ع

بلا بودے اگر ایں ہم نہ بودے

اسبابِ تغیر جہالت اور محبت ہیں ہاں میں نے اسبابِ تغیر میں ایک امر جہل بتلایا تھا، دوسرا امر محبت بی بی کو شوہر کے ساتھ مسرت کے جواب سے اس کو ترتیب میں مقدم لکھنا چاہئے تھا، مگر خیر اوّل کا ذکر ابھی دور نہیں ہوا، گویا دوسرا اس اوّل کے ساتھ مذکور ہے، اس امر ثانی کی سببیت اس طرح ہے کہ چونکہ بی بی کو شوہر سے خصوص ہندوستان میں یہاں کی آب و ہوا کی خاصیت سے محبت زیادہ ہوتی ہے، اور خاصۂ محبت کا یہ ہے ؎

با سایہ ترا نمی پسندم　　　عشق است و ہزار بدگمانی

(عشق میں ہزاروں بدگمانیاں ہیں، اسی لئے محبوب کے سایہ کے ساتھ بھی کسی کا ساتھ رہنا عاشق کو پسند نہیں)۔

بس اس سے یہ شرکت کہ اس کے شوہر میں دوسری آکر حصہ دار ہو جائے سخت ناگوار ہوتی ہے، اور گو یہ شرکت دوسری کو بھی کسی قدر ناگوار ضرور ہو لیکن پھر دونوں میں یہ فرق ہے کہ دوسری تو اوّل ہی سے شرکت کو گوارا کرکے آتی ہے، اور پہلی مدتوں انفراد و اختصاص کی حالت میں رہ چکی ہے، اس کو خلاف

ارادہ وخلافِ توقع وخلافِ رضا یہ شرکت پیش آتی ہے، اس لئے اس کو زیادہ صدمہ ہوتا ہے، اور اس کا خلافِ ارادہ وخلافِ رضا ہونا تو ظاہر ہے، باقی خلافِ توقع اس لئے کہ ہندوستان میں اس کا رواج اس قدر کم ہے گویا کہ ہے ہی نہیں،

رسم کو جذبات میں بڑا دخل ہے

اور رسم کو جذبات میں بہت دخل ہوتا ہے، اور یہاں تک دخل ہوتا ہے کہ جو امر خلافِ ارادہ وخلافِ رضا بھی نہ ہو مگر خلافِ رسم ہونے کے سبب خلافِ ارادہ و۔۔۔۔ رضا ہونے کا بھی اثر نہیں رہتا، چنانچہ بعض جگہ سنا گیا ہے کہ منکوحہ اولیٰ خود ہی دوسری کو اپنی رغبت و کوشش سے لائی، اور پھر آنے کے بعد ناگواری اسی درجہ تک پہونچ گئی جیسے اس کی لائی ہوئی نہ ہوتی، بہر حال یہ محبت بھی اس کا سبب ہے،

امرِ طبعی میں انسان معذور رہتا ہے

اور گو اس درجہ سے کہ محبت امرِ طبعی ہے تو اس کا مسبب یعنی ناگواری بھی امرِ طبعی ہوگا، اور امرِ طبعی میں انسان معذور رہے، اس لئے منکوحہ اولیٰ نفسِ ناگواری میں معذور رہے، لیکن اگر محبت کے ساتھ علم ہوتا تو یہ ناگواری حدِ اعتدال سے نہ بڑھنے پاتی، اور بلاشک وہ قابلِ ملامت نہ ہوتی،

شہوت وغضب وحسد وکبر کا صدور جہالت کے سبب ہے

لیکن چونکہ محبت کے ساتھ مجموعۂ سبب کا ایک جزو جہل بھی ہے، جو کہ اختیاری ہے، بایں معنی کہ اس کا ازالہ اختیاری ہے، اور پھر شرعاً وعقلاً مذموم ہے اس لئے اس مجموعۂ سبب پر جو آثار مرتب ہوتے ہیں، ان میں جس قدر آثار جہل کے حصہ کے ہیں اس میں نقلاً وعقلاً معذوری نہیں ہوگی، اس لئے یہ رائے کہ علی الاطلاق ان امور میں سوتیاڈاہ (سوتن ہونیکا جلاپا) کے سبب معذور سمجھا جائے محض غلط ہے، ورنہ اس کیفیتِ غیظیہ (غصہ کی حالت) سے زیادہ اکثر اوقات کیفیاتِ شہوت وغضب وحسد وکبر جن سے صدورِ معاصی کا ہوتا ہے غالب ہوتی ہیں، تو چاہئے کہ گناہ کوئی چیز ہی نہ ہو، اور بطلان (غلط ہونا) اس کا ظاہر ہے، یہ تحقیق تھی ناگواری کے دونوں سببوں کی، اب اسی تقریر سے ان اسباب کے متعلق جو بات نتیجہ خیز ہے وہ بھی معلوم ہوگئی،

ملکات اور جذبات کی اصلاح تعلیم دین اور تربیت روحانی سے ہو سکتی ہے،

پس امر اوّل کے متعلق، تو وہ بات یہ ہے کہ تعلیم واصلاحِ نفس کی کمی جب سبب ان پریشانیوں کا ہے جن کا واسطہ در واسطہ دور۔۔۔ پہنچتا ہے، تو اس کا تدارک سب عقلاء کو متفق ہو کر کرنا چاہئے، مگر یہ جان لینا چاہئے کہ تعلیم وتہذیب سے مراد تعلیمِ دین وتربیت روحانی ہے نہ کہ تعلیم وتہذیب جدید کہ اس کو ملکات وجذبات (عادات وخصائل) کی اصلاح میں جس کی کہ ضرورت ہے، کوئی دخل نہیں، چنانچہ ظاہر ہے بلکہ وہ تو اس میں بالعکس مضر ہے، چنانچہ تجربہ شاہد ہے اگر عورتوں کو علمِ دین وحالِ باطنی ہو چکا،

طریقہ ضروریاتِ دین وحالاتِ اہل اللہ پر عبور اور وقتاً فوقتاً ان ناقصات العقل (کم عقل رکھنے والیوں) کے اقوال وافعال پر روک ٹوک کرتے رہنا ہے، تو ان بیہودہ اقوال میں سے ایک قول زبان پر تو کیا قلب میں بھی نہ آنے پائے، اور یوں حزن طبعی ہونا عجیب نہیں، تو اگر اس میں اعتدال ہو تو موجبِ اجر ہے، اور صبر کرنے سے بتدریج (آہستہ آہستہ) خود سکون بھی ہو جاتا ہے،

اور امر ثانی کے متعلق وہ بات یہ ہے کہ حالتِ موجودہ میں بدونِ اضطرارِ شدید (بغیر سخت ضرورت) کے جس کا فیصلہ نفس سے نہ کرانا چاہئے، بلکہ عقل سے کرانا چاہئے، بلکہ عقلاء کے مشورہ سے کرانا چاہئے، بدون اضطرار کے ہرگز نکاح ثانی نہ کرنا چاہئے، خصوص پختگیِ سن کے بعد کہ منکوحۂ اُولیٰ کو بعد بے فکر ہو چکنے کے فکر میں ڈالنا ہے، اور جہل اس کا لازمِ حال ہے وہ اپنا رنگ لائے گا اور اس رنگ کے چھینٹے سے نہ ناکح بچے گا نہ منکوحہ ثانیہ بچے گی، خواہ مخواہ دریائے غم میں بلکہ دریائے خون میں سب غوطے لگائیں گے، خصوص جبکہ مرد بھی عالم اور متحمل نہ ہو،

ازواجِ متعددہ والے عموماً ظلم وستم کے معاصی میں مبتلا ہیں،

علم نہ ہونے سے وہ حدودِ عدل کو نہ سمجھ سکے گا، اور تحمل نہ ہونے سے ان حدود کی حفاظت نہ کرسکے گا، اس وجہ سے وہ ضرور ظلم میں مبتلا ہوگا، چنانچہ عموماً ازواجِ متعددہ (کئی بیویوں) والے جور وظلم (ظلم وستم) کے معاصی میں مبتلا ہیں، کیونکہ حقوق اس تعدد (ایک سے زیادہ ہونے) کے اس قدر نازک ہیں کہ ہر ایک کا نہ وہاں ذہن پہنچ سکتا ہے اور نہ اُن کی رعایت کا حوصلہ ہو سکتا ہے،

تعددِ ازواج کی صورت میں باہم عدل رکھنے کے چند فقہی مسائل

چنانچہ باوجودیکہ شب کو رہنے میں اور ملبوس وماکول (لباس اور کھانے پینے) میں برابر رکھنے کا وجوب (واجب ہونا) سب جانتے ہی ہیں، مگر اس تک کا اہتمام نہیں، باقی ان مسائل کا تو کون خیال کرتا ہے، کہ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر ایک بی بی کے پاس بعد مغرب آجاتا ہے اور دوسری کے پاس بعد عشاء، تو اس نے عدل کے خلاف کیا، اور لکھا ہے کہ ہر ایک کی باری میں دوسری سے صحبت جائز نہیں، اگرچہ دن ہی ہو، اور لکھا ہے کہ ہر ایک کی باری میں دوسری کے پاس جانا بھی نہ چاہئے، اور لکھا ہے کہ اگر مرد بیمار ہوگیا اور اس وجہ سے دوسری کے پاس نہیں جاسکتا اس لئے ایک ہی کے پاس رہا تو بعد صحت کے اتنی مدت دوسری کے پاس رہنا چاہئے، اور دینے لینے میں برابری کرنے کی جزئیات بھی اس قدر دقیق (باریک) ہیں کہ انکی رعایت ہر شخص کا کام نہیں،

تعددِ ازواج میں عدل نہ ہونے کا احتمال قوی اور غالب ہے

مجھ کو اس قدر دشواریاں اس میں پیش آئیں کہ اگر علمِ دین اور حُسنِ تدبیر حق تعالیٰ نہ عطا فرماتے تو ظلم سے بچنا مشکل تھا، سو ظاہر ہے کہ اس مقدارِ علم اور اس قدر اہتمام کا عام ہونا بعید بلکہ ابعد (زیادہ دور) ہے، نیز ہر شخص کو نفس کا مقابلہ کرنا بھی کارے دارد (مشکل کام)۔ اب تعددِ ازواج بجز اس کے کہ اضاعتِ حق (حق ضائع) کر کے عاصی (گنہگار) ہو کیا نتیجہ ہو سکتا ہے،

اور یہ تو حقوقِ واجبہ تھے، بعضے حقوق مروّت کے ہوتے ہیں گو واجب نہیں ہوتے، مگر ان کی رعایت نہ ہونے سے دل شکنی ہوتے ہیں، جو کہ حقوقِ رفاقت کے خلاف ہے، ان کی رعایت اور بھی دقیق اور غامض ( ) ہے، غرض کوئی شخص ہر وقت کے واقعات و معاملات کے جزئیات کو خیال رکھے اور مستحضر کرے، پھر ان واقعات کے احکام علما سے پوچھے پھر اُن پر عمل کرے تو نانی یاد آجائے گی، اور تعددِ ازواج سے توبہ کرے گا، اِلَّآ اَنْ تُضْطَرَّ اِلٰی ذٰلِكَ بِوَجْہٍ مِّنَ الْوُجُوْہِ الْقَوِیَّۃِ (مگر کوئی شخص کسی قوی سبب سے مجبور ہو وہ مستثنیٰ ہے) اسی لئے حق تعالیٰ نے اجازتِ تعدد کے بعد اس احتمال کو مصرحاً ارشاد فرمایا:

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَۃً،	"پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ کر سکو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو۔"

خود حق تعالیٰ کا اس کو اس طرح فرمانا صریح دلیل ہے کہ یہ احتمال بہت ہی غالب اور قوی ہے، پھر اکتفاء علی الواحدہ (ایک پر کفایت کرنے) کی نسبت اَدْنٰٓی اَنْ لَّا تَعُوْلُوْا فرمانا یہ اس احتمال کی جانب وجود کو جانبِ عدم پر صاف ترجیح دے رہا ہے، اس لئے ع

اگر خواہی سلامت بر کنار است

کا اختیار کرنا اسلم ہے، نتیجۂ مقصودہ جس کو میں بعد ذکر اسباب کے ذکر کرنا چاہتا تھا اور جس پر میں مزید زور دینا چاہتا ہوں، اور کسی کو یہ وہم نہ ہو کہ خود کیوں اس مشورہ کے خلاف کیا، بات یہ ہے کہ خلاف کرنے ہی سے یہ مشورہ سمجھ میں آیا، ع

من نکردم شما حذر بکنید

میں نے طبقۂ اناث سے وعدہ کیا تھا کہ میرے فعل کو تم سبب سمجھتی ہو مردوں کی جرأت کا تعددِ ازواج پر، میں اپنے فعل کے نتائج بتلا کر اس فعل کو سبب بنا دوں گا مردوں کے رُک جانے کا تعددِ ازواج سے، کیونکہ اس فعل سے مجھ کو تجربہ ہو گیا، اور تجربہ کار کا قول زیادہ ماننے کے قابل؟

پس میں اپنے تجربہ کی مدد سے اپنے احباب اور بھائیوں کو اس تعدد سے مشورۃً منع کرتا ہوں، اگر میں اگر میں اس تعدد کو اختیار نہ کرتا تو میرے اس منع کی زیادہ وقعت اس وقت خواہ آپ لوگ نہ کرتے تو بعید نہ تھا، لیکن اب اس ممانعت کی خاص وقعت اور اس ممانعت پر عمل کرنا چاہیے، مگر ساتھ ہی احکامِ شرعیہ میں تحریف نہ کی جائے،

بعض نے آیت فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا (پس اگر تم کو احتمال ہو اس کا کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو) اور وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ (اور تم سے یہ بھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو) میں النساء کو جمع کر کے معنوی تحریف کی ہے، جس کی تفسیر بیان القرآن میں کر دی گئی ہے[1]،

تعددِ ازواج اختیار نہ کرنا ہی اسلم ہے،

بہرحال حکم شرعی تو یہی ہے کہ تعددِ ازواج میں نکاح تو منعقد ہر حال میں ہو جاتا ہے، خواہ عدل ہو یا نہ ہو لیکن عدمِ عدل (انصاف نہ کرنے) کے وقت گناہ ہو گا، اس لئے اسلم یہی ہے کہ تعدد اختیار نہ کیا جائے، ایک ہی پر قناعت کی جائے اگرچہ ناپسند ہو،

فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ فَعَسَىٰ أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَيَجْعَلَ اللَّهُ فِيهِ خَيْرًا كَثِيرًا (النساء، آیت ۱۹)	"اور اگر وہ تم کو ناپسند ہوں تو ممکن ہے تم ایک شے کو ناپسند کرو اور اللہ تعالیٰ نے اس کے اندر کوئی بڑی منفعت رکھ دی ہو،"

إِلَّا اضْطِرَارًا استثنیتہ من قبل (مگر اضطراری حالت نے اس سے قبل کے بیان میں مستثنیٰ کر دی،

---

[1] یہاں اس تفسیر کا نقل کرنا مناسب معلوم ہوا، وہو ہذا، بعض ہواپرستوں نے دنیوی غرض سے آیاتِ الٰہیہ کے مضمون میں تحریف کی ہے اور کہا ہے کہ یہ آیت بالکل کثرتِ ازواج کی نفی کر رہی ہے اس طرح سے کہ یہاں فرمایا کہ جب عدل نہ ہو سکے تو ایک پر اکتفاء کرو، اور دوسری آیت میں فرما دیا کہ تم سے کبھی عدل ہی نہ ہو گا، "وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ"، دونوں آیتوں کے ملانے سے معلوم ہوا کہ ایک سے زیادہ جائز نہیں، فقط، یہ محض مغالطہ باطلہ ہے کیونکہ دونوں آیتوں میں عدل جدا جدا معنوں میں ہے اس آیت میں تو عدل فی الحقوق الواجبہ ہے، جب حضرت نے تصریح بھی کر دی، اور یہ قدرت میں ہے اور اس کے اعتبار سے واحد اور کثیر کے اختیار میں تفصیل فرمائی ہے اور اس آیت میں عدل فی المحبت ہے، اور وہ عادتاً قدرت میں نہیں، اس لئے اس کی نفی فرمائی، بس اس ہواپرست کے دعویٰ سے اس کو اصلاً مس نہیں، بلکہ اس آیت میں بعد نفیِ عدل کے ارشاد ہے، فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ جس کا حاصل یہ ہوا کہ یہ تو ہم جانتے ہیں کہ عدل فی المحبت نہ ہو سکے گا، بلکہ قلب کو ایک طرف میلان رہے گا، اور اس میلان پر

حضرت حکیم الامتؒ کے نکاح ثانی کے اسبابؒ

آگے آنعزیز لکھتے ہیں کہ بناء کار کی بابت معلوم ہوا کہ مشیت پر مبنی تھا اور چند مصلحتیں شرعی تھیں، ورنہ ضرورت کا سوال نہ تھا، عزیز من یہ دونوں بالکل صحیح ہیں، لیکن عنوان ان کا مجمل ہے، تفصیل نہ ہونے سے محبین و معتقدین کے بڑھانے کا احتمال ہے، کیونکہ اس کے یہ معنی سمجھائے جائیں گے، کہ کوئی الہامی حکم ہوا ہوگا، اس وجہ سے اسکو اختیار کیا گیا جو غلو فی نفسہ بھی ناپسندیدہ ہے، پھر تلبیس (ملاوٹ) اس میں اور بھی زیادہ مذموم ہے، اس لئے میں نے اصلی حالت کو منکشف (ظاہر) کرتا ہوں،

سب سے اوّل اس امر کا اقرار کرتا ہوں کہ میرا یہ فعل کسی مصلحت کی نیت سے یا کسی اشارۂ غیبیہ پر عمل کرنے کے قصد سے نہیں ہوا، سببِ قریب اس کا محض طبیعت کا تقاضا تھا، گو اس تقاضے میں کسی امرِ عقلی کو دخل ہو، اور گو پھر اس پر بہت سی مصلحتیں بھی مرتّب ہو گئی ہیں، بلا تشبیہ (بغیر مشابہت کے) ایسی مثال جیسے حضرت موسیٰ علیہ السلام کا طور پر تشریف لے جانا بہ قصدِ عطاءِ نبوت (نبوّت عطاء ہونے کا ارادہ) نہ تھا، آگ کی ضرورت پر طبعی تقاضا تھا، مگر وہاں جانے پر خاص عطاء مرتب ہوگئی،

قصہ اس کا یہ ہے کہ میں نے مدت ہوئی ایک خواب دیکھا تھا، کہ مجھ سے نکاح کے لئے کہا جا رہا ہے میں بطور تردد کے یہ کہہ رہا ہوں کہ میرے گھر میں کا کیا حال ہوگا؟ تو اس کا یہ جواب دیا جاتا ہے کہ وہ قرآن شریف پڑھا کریں گی، میں بیدار ہوا تو قرآن شریف پڑھنے کے معنی تو یہ سمجھا کہ یہ مشاغل دنیہ میں مشغول ہو کر اس غم کو بھول جائیں گی (چنانچہ اس کا سامان بھی ہوتا ہوا معلوم ہوتا ہے) لیکن خواب کو کچھ زیادہ باوقعت نہیں سمجھا، بلکہ اس کے اتباع کا خیال تو کیا کرتا، اس کی کوشش کی کہ ایسا موقع نہ ہو، چنانچہ اپنے بھانجے سے پہلا نکاح کردیا گیا، اور طبیعت خالی ہوگئی، خدا کی قدرت وہ بیوہ ہوگئی، تو اس کی کوشش کی کہ اس کا کہیں نکاح کردیا جائے، چنانچہ متعدد مواقع پر اس کی تدبیر و تحریک کی گئی، لیکن کہیں سامان نہ ہوا، نیز میں نے بڑی تدبیروں سے اس کو اپنے سے پردہ کرادیا، اپنے مکان میں تدبیر لطیف (نرم تدبیر) سے اس کی آمد و رفت، بود و باش اس قدر کم کرادی کہ قریب قریب منقطع کے کردی، تاکہ وہ احتمال کلیۃً مدفوع و مسدود (ختم اور بند) ہو جائے، نیز میں اس امر کو خود اپنی مصلحت کے خلاف بھی سمجھتا تھا، کہ میرا زمانہ ان باتوں کا نہیں رہا، آزادی کے بعد پابندی سخت امر ہے، اور منکوحۂ اولیٰ کی مصلحت کے خلاف بھی سمجھتا تھا، کہ اُن کی سخت دل شکنی و دل آزاری بھی ہوگی، اور اس منکوحۂ ثانیہ کی مصلحت کے

خلاف بھی سمجھتا تھا کہ اس کی عمر کو ضائع کرنا ہے، اسی طرح ایک زمانہ گزر گیا، اس اثناء میں ایک ذاکر صالح کو مکشوف (کشف) ہوا، کہ احقر کے گھر حضرت عائشہ رضؓ آنے والی ہیں، انھوں نے مجھ سے کہا، میرا ذہن معًا اس طرف منتقل ہوا، اس مناسبت سے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت عائشہ رضؓ سے نکاح کیا، حضورؐ کا سن شریف پچاس سے زیادہ تھا اور حضرت عائشہ رضؓ بہت کم عمر تھیں، وہی قصہ یہاں ہے مگر میں نے اس کی طرف زیادہ توجہ نہیں دی، پھر میرے ایک دوست نے ایک بہت بڑے شیخ کامل کو جو اس وقت افادۂ خلائق (مخلوق کو فائدہ پہنچانے) میں مشغول ہیں، خواب میں دیکھا کہ وہ میری آمدنی کی تقسیم کا ایک خاص طریقہ بتلا رہے ہیں، کہ جس طرح گاہ گاہ میرے ذہن میں بطور احتمال خطور کیا کرتا تھا، کہ اگر ایسا امر ہوا تو آمدنی کو اس طرح تقسیم کیا کروں گا، اور میں نے اس کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا تھا، تو خواب میں وہی طریقہ یا اس کے قریب قریب (مدّت گزرنے سے اچھی طرح یاد نہیں) وہ بزرگ بتلا رہے ہیں، اُن دوست نے جو عالم ہیں مجھ سے ذکر کیا، میں اس سے بھی وہی واقعہ سمجھا، مگر باوجود ان سب منامات و مکاشفاتِ صلحاء (نیک لوگوں کے خواب اور کشف) کے میں نے اس قصہ کو اپنے دل میں زیادہ جگہ نہیں دی، اور اس کی مدافعت (روک تھام) کی کوشش کی، یہاں تک کہ اس رمضان ۱۳۳۴ھ کے نصف کے بعد پھر میں نے خواب دیکھا کہ خواب اوّل سے زیادہ مؤثر (اثر والے) عنوان سے مجھ کو اس طرف متوجہ کیا جاتا ہے، اور اس کے ساتھ ہی یہ بھی کہا جاتا ہے کہ منکوحۂ اُولیٰ سے ڈر لگتا ہے،

اس خواب کے بعد طبیعت میں وہی تقاضا جو مٹادیا گیا تھا یا دبا دیا گیا تھا پہلے سے بہت زیادہ قوت کے ساتھ پیدا ہوا، اور وہ اپنی قوت سے ایسا غالب آیا کہ میں اس کی مخالفت نہ کرسکا، اور سب مصالح و موانع (مصلحتیں اور رکاوٹیں) مغلوب ہوگئے، یہاں تک کہ میں نے ایک عزیز کو اس پیام لے جانے کے واسطے تجویز کیا، اور ان سے ذکر کیا، انھوں نے ایک بڑے شیخ کا جو کہ ظاہری و باطنی افادہ میں بفضلہٖ تعالیٰ مشغول ہیں نام لیا، کہ انھوں نے مجھ سے تصریحًا فرمایا تھا کہ ایسا ہوجانا بہتر ہے مگر لحاظ اس کے اظہار سے مانع رہا تھا اس کو ظاہر کردیا، چونکہ اہل اللہ کے قلب میں بوجہ نورانی ہونے کے اکثر امر صواب وارد ہوتا ہے، اس سے کسی قدر اپنے خوابوں کا اور دوسرے صلحاء کے مکاشفات وغیرہا کا محض اضغاثِ احلام (پراگندہ خواب) نہ ہونا راجح ہونے لگا، آخر اس عزیز کا پیام لے کر روانہ کردینا طے کرلیا گیا، ہنوز (ابھی) وہ روانہ نہ ہوئے تھے، میں ایک بار خلوت میں بیٹھا تھا دفعۃً (اچانک) خیال آیا کہ ظاہر میں یہ معاملہ بے ربط سا معلوم ہوتا ہے معلوم نہیں

اس قدر قلب میں اس کا تقاضا کیوں ہے، فوراً ہی قلب میں بیساختہ یہ واقع ہوا کہ بہت سے درجات موقوف ہیں سقوطِ جاہ و بدنامی پر جن سے تو اب تک محروم ہے، کیونکہ تیرا جاہ ہر پہلو سے انتہا کو پہونچ گیا ہے پس اس واقعہ میں حکمت یہ ہے کہ تو بدنام ہوگا اور حق تعالیٰ وہ درجات عطا فرما دیں گے، بس یہ تھی وہ مشیت خاص جس پر یہ قصہ بھی تھا، اور یہ تھیں وہ خاص مصلحتیں جو اس .... قصہ پر مرتب تھیں،

خلاصہ یہ کہ میری تحریک تو طبیعت کے تقاضے سے تھی، باقی یہ تقاضا خواہ ان واقعات ہی سے ہوا اور پھر اس میں حکمتیں بھی ہوں، غرض وہ پیام منکوحہ کے اور اس کے والدین کے پاس گیا، اس کے والد نے سنتے ہی اپنے خواب اس کے متعلق بیان کرنے شروع کر دیئے، اور بعد نکاح مجھ کو معلوم ہوا کہ پیام سے ایک روز قبل خود اس نے بھی خواب دیکھا تھا، اور وہ پیام باوجود مخالفت ... عرف کے نہایت خلوص اور عالی ہمتی سے منظور کر لیا گیا، اتفاق سے منکوحہ کے باپ یہاں آئے تھے، اُن سے درخواست کی گئی کہ مجھ کو رمضان میں سفر سے بچا لیا جائے، انھوں نے بوجہ اس کے کہ اس عزیز پیغام رساں کی معیت میں اختیار شرعی حاصل کر لیا تھا نکاح پڑھوا دیا، یہ خبر گھر پہونچی تو ہوا جو کچھ ہوا جس کا اثر قلب پر اس درجہ تھا کہ اس وقت مجھ کو موتِ محبوب معلوم ہوتی تھی، اُدھر گھر میں کا صدمہ نہ دیکھا جاتا تھا، اِدھر کچھ علاج نہ تھا، گھر میں کے ساتھ سختی کرنا اس لئے گوارا نہ تھا کہ ضبط سے اندیشۂ امراض صعبیہ (دشوار بیماریوں کا) تھا، اور نرمی سے شکایت کا لب و لہجہ حدِ تہذیب سے گذرا جاتا تھا، ان اسباب سے بے حد تنگی معلوم ہوئی اس وقت دین کی قدر معلوم ہوتی، کہ:۔

دل کو سنبھالنے والی چیز سوائے دین کے کچھ نہیں

بجز دین کے کوئی چیز اس وقت دل کو سنبھالنے والی نہ تھی، اور منجملہ اُن مصالح کے جو اس واقعہ میں مضمر (پوشیدہ) تھیں اور بعد میں ظاہر ہوئیں، دین کے اس اثر کا مشاہدہ تھا جو پہلے سے علم الیقین کے درجہ میں تو تھا مگر اب عین الیقین ہو گیا،

حضرت حکیم الامتؒ کو نکاح ثانی سے موت کی محبوبیت نصیب ہونا

ایک مصلحت یہ بھی ظاہر ہوئی کہ اس کے قبل موت کی محبوبیت کی دولت مجھ کو نصیب نہ تھی، عقلاً گو محبوب تھی، مگر طبعاً محبوب نہ تھی، بلکہ ایک گونہ (ایک طرح) حیات سے دلچسپی تھی، الحمد للہ کہ اس واقعہ سے یہ دولت بھی نصیب ہوئی، اور گو ابتداء اس کی دل تنگی کے سبب ہوئی، مگر الحمد للہ کہ پھر باوجود رفع سبب (باوجود وجہ ختم ہو جانے کے) بھی وہ مسبّب باقی ہے، اللہ تعالیٰ اس کو باقی رکھے،

نکاح ثانی سے حضرت حکیم الامتؒ کو آخرت کی رغبت بڑھ جانا

ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ مجھ کو ثوابِ آخرت سے طبعاً رغبت کم تھی، امتثال اور رضاءِ الٰہیہ کو جنت سے بھی افضل سمجھتا تھا، مگر اس کے ثمرہ میں

ثواب کا تصوّر کم ہوتا تھا، صرف رضائے حق وطلبِ نجات مرکزِ خیال تھا، اور اب معلوم ہوا کہ یہ ایک قسم کی کمی تو صورتِ استغنا بھی، الحمد للہ کہ اس کوتاہی کا بھی تدارک ہو گیا، اور تنگی کے پیش آنے کے وقت صرف احکام کے ضروری ہونے کے خیال نے طبیعت میں قوت نہ بخشی، استحضارِ ثواب نے پورا کام دیا، ...
والحمد للہ علیٰ ہذہ النعمۃ ،

نکاحِ ثانی سے حضرت حکیم الامتؒ کا صبر اور رضا بالقضاء و تفویض الی اللہ کی حقیقت کا مشاہدہ کرنا	ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ مجھ کو اس وقت تک صبر اور رضا بالقضاء و تفویض الی اللہ (صبر اور اللہ کی رضا پر راضی رہنے اور اپنے آپ کو حق شانہٗ کے سپرد کرنے) کی حقیقت کا مشاہدہ نہ ہوا تھا، الحمد للہ کہ ان محبوبوں کا جمال اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا،
نکاحِ ثانی سے حلم و تحمّل کی دولت نصیب ہونا	ایک مصلحت یہ ظاہر ہوئی کہ حلم و تحمّل کا مجھکو ذوق نہ تھا، خدا تعالیٰ کا احسان ہے یہ کام بھی مجھ سے بوجہِ احسن (اچھے طریقہ سے) لیا گیا جس سے آئندہ بھی کام لے سکنے کی امید توکلاً علی اللہ رکھتا ہوں،
نکاحِ ثانی سے رسمِ جاہلیت کا ابطال ہونا	ایک مصلحت یہ بھی ہوئی کہ رسمِ جاہلیت کا ابطال ہو گیا،

نکاحِ ثانی سے تعدّدِ ازواج کی حکمتوں کا انکشاف	اسی ضمن میں خود تعدّدِ ازواج کی بعض حکمتیں بھی ظاہر ہوئیں، مثلاً صفتِ عدل کا استعمال بطرزِ عجیب، تفصیل اس کی یہ ہے کہ آدمی کسی پر حاکم ہی نہ ہو یا حکومت سے استعفاء دیدے، اس کو اس صفت کے استعمال کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، دوسرے یہ کہ حاکم ایسے لوگوں پر ہو جن کے ساتھ استعمالِ عدل میں سیاست وضابطہ کا برتاؤ کر سکے، یہ بھی آسان ہے، اس لئے کہ اس شخص کو صرف ایک حکومت کا حق ادا کرنا پڑتا ہے جس میں کوئی امر مزاحم (روکنے والا) نہیں،
دو بیویوں کے مابین عدل کرنا سلطنت میں عدل کرنے سے مشکل ہے،	بخلاف صاحبِ ازواجِ متعدّدہ کے، کہ اس کے ماتحت ایسے دو محکوم ہیں جو اس کے محبوب بھی ہیں، اور اس محبوبیت کے سبب ایک درجہ میں معنیً اس پر حاکم بھی ہیں، پھر محکوم بھی کیسے جن میں انصاف وعدل کرنا صرف اسی حالت کے ساتھ خاص نہیں جبکہ ان دونوں میں جھگڑا واقع ہو بلکہ اگر وہ خود بھی نہ جھگڑیں تب بھی اس حاکم پر ہر وقت کے برتاؤ میں ان میں برابری رکھنا واجب ہے، پھر جب جھگڑا پڑے اس وقت یہ کشاکشی ہوگی کہ اُن کی محکومیت کے حق ادا کرتا ہے تو محبوبیت کے حقوق فوت ہوتے ہیں

ان دونوں کا جمع کرنا جمع بین الاضداد (مخالف چیزوں کے جمع ہونے سے) کم نہیں، اور نہایت ہی عقل اور دین کی اس میں ضرورت ہے کوئی کرکے دیکھے تو معلوم ہو، اور اگر حکومت سے سبکدوش (علیحدہ) ہونا چاہئے تو وہ اس لئے مشکل ہے کہ حقیقت اس کی زوجیت کو قطع کرنا ہے، سو اوّل تو زوجیت کا یہ فطرۃً بھی محتاج، دوسرے محبوبیت سے استغفیٰ، تیسرے شریعت اس کو مبغوض ٹھہرا رہی ہے، پھر اس کا اجلاس کا کوئی وقت نہیں، ہر وقت اس کے لئے آمادہ رہنا چاہئے، پھر استغاثہ (دعویٰ کرنے) کا انتظار نہیں، ورنہ خود دست اندازی لازم، تو جو شخص اس نازک موقع پر عدل کو استعمال میں لے آیا وہ اعلیٰ درجہ کا عادل ہوگا، اور دوسری جگہ اس صفت سے کام لینا اس کو بالکل پانی ہوجائے گا، اور مثلاً اس کی قدر بڑھ جانا کہ جس طرف جاتا ہے اس طمع میں کہ مجھ سے اس کو زیادہ التفات ہو، اسکی بہت قدر کی جاتی ہے، خاص طور سے خدمت کی جاتی ہے بشرطیکہ دونوں زوجہ (بیویوں) میں نری شیطنت نہ ہو، ورنہ مجاہدۂ عظیمہ (بہت بڑا مجاہدہ) ہے، کہ یہ بھی ایک مصلحتِ عظیمہ ہے تعدّد کی، مثلاً صحت کا اچھا ہونا، کیونکہ ہر یوم میں ایک جدید چیز اس کو میسر ہے، اور جدت کے لئے نشاط اور نشاط کے لئے درستیِ صحت عادۃً لازم ہے،

تعدّدِ ازدواج کی ایک مصلحت زیادتِ تعفیف ہے

اور ایک مصلحت تعدّد میں زیادتِ تعفیف (پاکدامنی) ہے، اور بھی مصالح متعدّدہ (بہت ساری مصلحتیں) اس تعدّد میں ظاہر ہوئیں، مگر یہ مصالح ان خطرات و خلجانات (وساوس و شبہات) مذکورہ سابقہ کے ساتھ ایسے ہیں جیسے جنت کے رستہ میں پل صراط کہ بال سے باریک تلوار سے تیز جس کو طے کرنا سہل کام نہیں، اِلَّا مَنْ یَّسَّرَ اللّٰہُ تَعَالٰی، اور جو طے نہ کرسکا وہ سیدھا جہنم میں پہنچا، اس لئے ایسے پل پر خود چڑھنے کا ارادہ نہ کرے بقول سعدیؒ ؎

بدریا در منافع بے شمار است ؛ وگر خواہی سلامت برکنار است

(دریا کے منافع بے شمار ہیں، مگر سلامتی اسی میں ہے کہ کنارے پر ہی رہو!!!!)

ان خطرات و مہالک کو عبور کرنے کے لئے جن اسباب کی ضرورت ہے وہ ارزاں نہیں ہیں، دین کامل، عقل کامل، نور باطن، ریاضت سے نفس کی اصلاح کرچکنا و مثل ذلک، چونکہ یہ مجموعہ شاذ ہے، اس لئے تعدّدِ ازدواج میں پڑنا یا اپنی دنیا برباد و تلخ کرنا ہے، اور یا آخرت و دین کو تباہ کرنا ہے

ہرگز بگندم گوں لاتقربا کہ زہر است ؛ حالِ پدر بہ یاد از اُمّ الکتاب دارم

(حضرت آدم علیہ السلام کو حکم ملا تھا کہ گندم کے قریب نہ جاؤ کیونکہ یہ زہر ہے، میں اپنے باپ (حضرت آدم علیہ السلام) کا حال لوحِ محفوظ سے یاد رکھتا ہوں!!)

سقوطِ جاہ اور بدنامی میں بہت سے درجات موقوف ہیں ،

خلاصہ یہ کہ کچھ مصلحتیں خاص اس نکاح میں ظاہر ہوئیں، جو پہلے سے قلب میں واقع ہوئی تھیں، جن کو مختصراً میں نے اوپر ذکر کیا ہے کہ بہت سے درجات موقوف ہیں سقوطِ جاہ پر الی قولہ توکلاً علی اللہ رکھتا ہوں، اور کچھ مصلحتیں مطلق تعددِ ازواج میں ظاہر ہوئیں، ان مصالح میں سے مصلحت سقوطِ جاہ کی بہت مجمل مذکور ہوئی، اب اس کی کسی قدر تفصیل کرتا ہوں، کیونکہ اعظم مصالح اس واقعہ میں یہی ہے،

سو بیان اس کا یہ ہے کہ واقعی بدنامی اور ملامت واقعہ میں اس قدر ہوئی کہ شاید تمام عمر بھی اگر میں خدانخواستہ واقعی عیب کرتا تب بھی اس قدر نہ ہوتی، اس واقعہ کے تین مواقع تھے، ہر موقع پر میری قسمت میں یہ دولت لکھی تھی، چنانچہ اوّل موقع نکاح کا تھا، اس میں جو کچھ ہوا اس کا مختصر بیان بضمن اقوالِ جہلاء کے اوپر کر چکا ہوں، دوسرا موقع یہ ہوا کہ جب گھر کے لوگوں پر زیادہ صدمہ دیکھا اور اندیشہ ہوا کہیں زیادہ نوبت نہ پہونچے، ادھر اپنے قلب کو تحمل سے عاجز پایا، آخر تنگ آکر ایک مختصر مجمعِ احبابِ عقلاء سے مشورہ کر کے اس جدیدہ کو قطعِ تعلق بواحدۃ صریحہ (ایک طلاق صریح ذکر قطع تعلق کرنے) کا مضمون اسی عزیز کے ہاتھ جو نکاح کا پیام لے کر گئے تھے لکھ بھیجا، اس فعل سے گھر میں مجھ کو روکا بھی، مگر میں نے یہ سمجھا کہ بدون اس کے اس مصیبت کا کوئی علاج نہیں ،

اُدھر میں مردوں سے مشورہ کر چکا تھا، عورت کی رائے کو میں نے ناقص سمجھ کر بھی عمل نہ کیا،

اس تحریر و پیام کا جو اثر دوسری طرف ہوا، اس کو سُن کر دوسرا صدمہ پہنچا، مگر بجز برداشت کرنے کے اس کا کوئی علاج میرے ہاتھ میں نہ تھا، اب یہ دوسرا موقع ہوا بدنامی و ملامت کا .

کسی نے کہا خواہ مخواہ دل شکنی کی، کسی نے کہا بیوی سے اتنا دبنا نہ چاہئے، کسی نے کہا یہ جائز کہاں تھا، اوّل موقع پر عوام نے زیادہ بدنام کیا تھا، اس دوسرے موقع پر اہلِ فہم (سمجھدار لوگوں) نے زیادہ بدنام کیا،

اب تیسرا موقع سب سے زیادہ عجیب ہوا کہ جب وہ عزیز پیام پہنچا کر واپس آگئے، تو اب منکوحہ اُولیٰ کو یہ خیال غالب ہوا کہ افسوس میرے سبب انھوں نے اپنے ایک رغبت کے معاملہ کو قطع کیا اب ان کو عمر بھر قلق و رنج رہے گا، اور مجھ کو سخت شرمندگی رہے گی، اور لوگ بھی یہ سمجھیں گے کہ اس کے سبب ایسا ہوا، غرض ان خیالات نے اس قدر غلبہ کیا کہ اصل واقعہ سے زیادہ صدمہ کے آثار ظاہر ہونے لگے ، اور ارادہ کیا کہ اب میں خود جا کر پھر نکاح کی تجدید (نئے سرے سے نکاح کرنے) میں کوشش کر دوں، میں نے انجام سوچ کر ہر چند منع کیا، اپنے ایک مخلص دوست صالح عالم سے

بطور وعظ کے فہمائش بھی کرائی، مگر ان کا یہ خیال قوی ہوتا گیا حتیٰ کہ خود وہاں جا کر سب کو راضی رضا کر کے مجھ کو یہاں سے بلا کر تجدید کرا دی، اس تجدید میں قوی قوی رکاوٹیں پیش آئیں، کہ جن میں بعض کا مجھ کو بار ڈالنے کی تجویز بھی تھا جس کو میں برداشت کرنا پسند نہ کرتا تھا، اور بد دن اس کے ظاہراً تجدید شوار تھی، اس وقت بیساختہ میرے قلب میں آیا کہ اب تک تو منامات و مکاشفات (خوابوں اور کشفوں) سے احباب استدلال (دلیل دیا) کرتے تھے، کہ یہ من الغیب (غیب سے) ہے، مگر میرے قلب میں ان چیزوں کا زیادہ اثر نہ تھا اب میں اس کے من الغیب ہونے نہ ہونے پر اسی سے استدلال کرتا ہوں، کہ میں کسی شرط زائد کو قبول نہ کروں گا، اگر پھر بھی اس کا وقوع ہو گیا تو میں من الغیب سمجھوں گا، ورنہ اس بار سے بچا رہوں گا، چنانچہ باوجود اس کے حق تعالیٰ نے سب کے قلوب کو دفعۃً (اچانک) بدل دیا کہ سب شرطیں محذوف (ختم) ہو گئیں، اور تجدید ہو گئی، مزاحمات کا اس طرح بلا کوشش دفع ہو جانا میرے نزدیک ایک باوقعت دلیل ہے، اور اس سے بڑھ کر دلیل خود مزاحم کا کوشش کرنا یعنی منکوحۂ اولیٰ کا اس طرح سعی کرنا ہے، اب اس سے ان منامات و مکاشفات کا صدق راجح ہوتا ہے،

یہ تیسرا موقع تھا اس میں بھی بے حد ملامت کی گئی، کسی نے کہا طلاق کے بعد بلا حلالہ تجدید کہاں جائز ہے، کسی نے کہا واحد صریحہ (ایک صریح طلاق) میں تجدید کی کون حاجت تھی، کسی نے کہا بس مسئلے مولویوں کے قبضہ میں ہیں، جس چیز کو دل چاہا اس کو درست کر لیا، کبھی نکاح کو کبھی طلاق کو وغیر ذلک من الجہالات،

غرض تینوں موقعوں پر مختلف عنوانات سے اطراف و نواح میں آگ لگنے کا سا غل تھا کہ جس کو دیکھئے یہی قصہ یہی چرچا، دکانوں پر یہی تذکرہ، نشستگاہوں (بیٹھکوں) میں یہی مشغلہ، کوئی میرے احباب کو چھیڑتا ہے، کوئی احباب ہونے کے دعوے کے بعد شبہات و اعتراض کر کے اپنے دوست ہونے کا ثبوت دیتا ہے،

نکاح ثانی میں حضرت حکیم الامتؒ کی بفضل تعالیٰ اضطراراً موافقت سنت کی بہت سی باتیں ہوئیں،

ان کے مقابل اللہ تعالیٰ نے ایک جماعت اہل فہم کی بھی قائم کر دی، جو ان سب واقعات کو سنت کے موافق سمجھ رہے تھے اور ان کی محبت زیادہ بڑھتی جاتی تھی، چنانچہ سب سے پہلا واقعہ خواب کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ ہوئی، کہ اس طرح جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی صورت ایک حریر کے ٹکڑے پر دکھلائی گئی، کہ یہ آپ کی زوجہ ہیں دوسرا واقعہ بھانجے کی بیوی سے نکاح کرنے کا تھا، اس میں سنت کی موافقت یہ تھی کہ اسی طرح

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت زینب رضی اللہ عنہا سے جو آپ کے متبنٰی (منہ بولے بیٹے) کی بیوی تھیں اُن کے طلاق دینے کے بعد نکاح فرمایا، تیسرا واقعہ وہ تھا جو جہلاء کے اقوال میں یہ قول نقل کیا گیا کہ ابھی معلوم ہوتا ہے ان میں پہلے سے ساز باز ہوگا، اسی طرح نعوذ باللہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کہا گیا توبہ توبہ حضرت زینبؓ پر عاشق ہو گئے تھے، استغفر اللہ،

چوتھا واقعہ تفاوتِ عمر میں نکاح تھا، اس میں موافقت سنت کی یہ ہوئی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عمر میں اور حضرت عائشہ رض کی عمر میں اس سے زیادہ تفاوت تھا، پانچواں واقعہ منکوحہ اُولیٰ کی دل جوئی کیلئے ثانیہ کو جواب دیدینے کا تھا، اس میں سنت کی دو موافقتیں ہوئیں، ایکؔ وجہ اس آیت میں مذکور ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ لِمَ تُحَرِّمُ مَا أَحَلَّ اللَّهُ لَكَ ۖ تَبْتَغِي مَرْضَاتَ أَزْوَاجِكَ ۚ

(التحریم، آیت ۱)

"یعنی اے نبیؐ! جس چیز کو اللہ نے آپؐ کے لئے حلال کیا ہے آپؐ (قسم کھاکر) اس کو اپنے اوپر کیوں حرام فرماتے ہیں (پھر وہ بھی) اپنی بیبیوں کی خوشنودی حاصل کرنے کیلئے۔"

دوسری وہ جو اس آیت کا شانِ نزول ہے :۔

يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ إِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ (الطلاق، آیت ۱)

"یعنی اے پیغمبرؐ (آپؐ لوگوں سے کہدیجئے کہ) جب تم لوگ (اپنی) عورتوں کو طلاق دینے لگو۔"

یعنی حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو آپؐ نے ایک طلاق دیدی تھی، پھر بحکم الٰہی آپؐ نے رجعت فرمائی، کذا فی الدر المنثور عن ابی حاتم وابن المنذر،

چھٹا واقعہ تجدیدِ نکاح کا تھا، اس میں سنت کی موافقت ابھی مذکور ہوئی، کہ حضرت حفصہؓ سے بعد طلاق کے رجعت فرمائی تھی،

ساتواں واقعہ مہر کے خفیف (کم) ہونے کا تھا، اس میں موافقتِ سنت قولاً و عملاً ظاہر ہے غرض اہلِ فہم کو خدا تعالیٰ نے اس طرح سمجھا دیا، میں یہ جھوٹا دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے یہ سب کام اتباعِ سنت کی نیت سے کئے ہیں، بلکہ یہ بھی خدا تعالیٰ کا ایک فضل ہے کہ اضطراراً سنت کی موافقت ہو جاتی ہے، جس سے زیادہ برکت کی امید ہوتی ہے، چنانچہ امید برکت کی مزید تائید دو واقعوں سے اور ہوتی ہیں، ایک یہ کہ اس واقعہ کی خبر سن کر ایک شیخ کامل نے جس کا میں نے اوپر اس عنوان سے

ذکر کیا ہے کہ اس وقت افادۂ خلائق میں مشغول ہیں، مجھ کو خط لکھا، اس میں یہ تھا کہ حق تعالیٰ اس عقد کو موجب ترقی درجاتِ سامیہ (بلند درجات کی ترقی کا سبب) فرمائے،

دوسرا یہ کہ ایک دوسرے شیخ کامل نے جن کا میں نے اوپر اس عنوان سے ذکر کیا ہے کہ ظاہری و باطنی افادہ میں بفضلہٖ تعالیٰ مشغول ہیں میری اس درخواست کے جواب میں کہ اللہ تعالیٰ سے دعا کیجئے کہ اس میں برکت فرمادیں، یہ فرمایا کہ ہم کو تو برکات کی توقع ہے،

بس یہ خلاصہ ہے مضمونِ مشیت اور مصلحتوں کا جس کا بنا کار معلوم ہونا آنعزیز نے لکھا ہے

حضرت حکیم الامتؒ نے نکاحِ ثانی اولاد ہونے کے خیال سے نہیں کیا،

اسی سے آنعزیز کے اس سوال کا جواب بھی نکل آیا، کہ اس زمانہ میں جب تمام اعزہ کی تمنا تھی کہ اولاد ہو اور اس کے سبب زور دیا کہ نکاح ثانی ہوجائے، تو آپ نے نہ مانا جب اس کی عمر تھی، اور طبعاً اولاد کی خواہش ہوگی، لیکن وہ زمانہ گذر گیا، تو اب کیا وقت تھا، تقریر جواب کی ظاہر ہے کہ اس وقت بھی میں نے اولاد کے خیال سے نہیں کیا، اور نہ اقتضائے عمر (عمر کے تقاضا) سے کیا، اسباب مذکورۂ بالا سے طبیعت میں ایک قوی تقاضا پیدا ہوا جس میں بلا قصد (بغیر ارادہ کے) بہت سے دقیق مصالح بھی پیدا ہوگئے، اور عجب نہیں کوئی اولاد بھی ہوجائے، چنانچہ میں نے اس تقاضہ کے قلب میں آنے کے وقت دعائے استخارہ کے ساتھ دینی کتابوں سے تفاؤل (نیک فال کا حصول) بھی کیا، گو میں تفاؤل کو مؤثر نہیں سمجھتا، اور نہ ایسا سمجھنا جائز ہے، مگر محض تقویتِ رجاء (تقویتِ امید) کے لئے تفاؤل چند بار کیا، اس آیت کا مضمون ہر بار میں نکلا:۔

رَبِّ لَا تَذَرْنِیْ فَرْدًا وَّ اَنْتَ خَیْرُ الْوٰرِثِیْنَ (الانبیاء: آیت ۸۹)

"اے میرے رب مجھ کو لاوارث مت رکھیو (یعنی مجھ کو فرزند دیدیجئے کہ میرا وارث ہو) اور سب وارثوں سے بہتر آپ ہی ہیں"

واللہ اعلم، اتفاقی بات ہے، یا اشارہ ہو عطاءِ اولاد کی طرف، چنانچہ اس کے بعد کی تحریر میں آنعزیز کو اس بات کا احساس ہوگیا چنانچہ لکھا ہے، لیکن ان شرعی مصلحتوں اور حِکَمِ خداوندی کی باریکیوں کو دنیاوی امور پر ترجیح دینا بڑا کام ہے جو دنیاداروں سے اور خاص کر مستورات سے ممکن نہیں، چنانچہ اس میں احساسِ جواب کے ساتھ دنیاداروں اور مستورات کی ایک درجہ میں معذوری بھی بیان کی ہے، اس کی نسبت یہ ہے کہ درجۂ حال میں ترجیح دینے کا کسی کو مکلف بھی نہیں بنایا، یہ تو ایک موہبتِ الٰہیہ (اللہ تعالیٰ کی عطاء) ہے جس کو عطا ہو،

حدودِ شرعیہ میں قولاً و فعلاً تجاوز نہ کرنے کا سبب کو حکم ہے،

لیکن اس قدر کاسب کو مکلف بنایا ہے کہ حدودِ شرعیہ سے قولاً و فعلاً تجاوز نہ کریں، اور تجربہ سے ثابت ہے کہ اس تحفظِ حدود میں حق تعالیٰ نے یہ اثر دیا ہے کہ حزن و تشویشِ طبعی (طبعی فکر و غم) بھی اس قدر ضعیف ہو جاتا ہے کہ بالکل کالعدم ورنہ وہ کمبخت برابر ہی تازہ ہوتا چلا جاتا ہے، جہلاء اس نکتہ کو نہیں سمجھتے اور تجاوز عن الحدود (شرعی حدسے بڑھنے) کو اپنے مرض کا علاج سمجھتے ہیں، جو ان اشعار کا مصداق ہوتا ہے ؎

ہر چہ کردند از علاج واز دوا ؛ رنج افزوں گشت وحاجت نارِوا

بے خبر بودند از حالِ درون ؛ استعیذ اللہ مما یفترون

گفت ہر دارو کہ ایشاں کردہ اند ؛ آں عمارت نیست ویراں کردہ اند

(یعنی ہر قسم کی دوا اور علاج کیا مگر ع مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی، وہ باطنی حال سے غافل ہیں، اللہ کی پناہ جو وہ جھوٹ بولتے ہیں، کہا کہ انھوں نے ہر قسم کی دوا دارو کی ہے مگر اس بیماری کو ختم نہیں کیا، (گویا طبیبوں کے نزدیک یہ مرض لاعلاج نہیں ہے)۔"

حضرت حکیم الامتؒ کا نکاحِ ثانی سے اہلیہ کو مطلع نہ کرنے کا سبب

آگے آنعزیز نے لکھا ہے تاہم جس قدر حالات (زنام عزیزے) کی تحریر سے معلوم ہوئے، "میری ناقص رائے میں اتنی کسر (کمی) رہ گئی کہ ان امور کو اول اگر بھابی صاحبہ کے سامنے پیش کر دیا جاتا تو شاید اُن کو اتنا خیال نہ ہوتا، اب جو ہونے والا تھا ہو گیا، اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ ان واقعات کی جو کہ بنا بکار ہیں اُن کو خبر دی جاتی، سو یہ تو میں چند موقعوں پر کرتا رہا جس کا اُن پر ہمیشہ گہرا اثر ہوا، کیا میں نے ان سے اپنا پہلا خواب کہہ دیا تھا، ایک بزرگ کا مکاشفہ متعلق مضمون حضرت عائشہ رضی وہ بھی کہہ دیا تھا، باوجودیکہ انھوں نے تعبیر میں میرے ساتھ اختلاف کیا، مگر پھر بھی اُن پر کئی کئی ماہ تک اثر رہا جس کو دیکھ کر میں نے سچی بات دل کی کہدی کہ میرا اس وقت تو بالکل آئندہ کیلئے بھی ارادہ نہیں، یہانتک کہ میں نے کہا لاؤ میں عمر بھر کے لئے ایسی قسم کھالوں کہ نکاح ہی نہ ہو سکے، لیکن مجھ کو تقدیر کی خبر نہیں نہ یہ میرے قبضہ میں ہے، کہ حق تعالیٰ نے اگر دل کو بدلنا ہے تو بدلنے نہ دوں، انھوں نے ایسی قسم کھانے سے اسی بنا پر ہمیشہ منع کیا، کہ خدا جانے تقدیر میں کیا لکھا ہے، بہرحال اُن کو یہ احتمال ہمیشہ ستاتا رہا، اور میں اپنے ارادہ کے موافق اطمینان دلاتا رہا اور واقعی میرا ارادہ کوسوں بھی نہ تھا، اور اگر یہ مطلب ہے کہ ارادہ ہونیکے بعد ان کو ارادہ کی اطلاع نہ کی، اور بہت سے اہل الرائے بھی

یہ کہتے ہیں، سواس میں میرا یہ خیال ہوا، اب خواہ وہ غلط ہو یا صحیح کہ یہ قیامت تک موافقت نہ کریں گی اور صریح مخالفت (کھلی مخالفت) کے بعد پھر مجھ کو مناسب نہ ہوگا، کہ اسمیں زیادہ دل شکنی ہے، اور اگر بلا اطلاع کر لیا تو آخر مجبور ہو کر ساکت و ساکن (خاموش) ہو جائیں گی، بس اس خیال سے میں نے اپنے ارادہ کی اطلاع نہیں کی، اور بعد کے واقعہ تجدید سے تو یہ صاف ظاہر ہو گیا کہ اطلاع تو کیا معنیٰ اگر مشورہ و اجازت بھی حاصل کر لیتا تب بھی کچھ نفع نہ ہوتا، چنانچہ خود سعی کرنا تو مجھ کو اجازت دینے سے بڑھ کر اس رضاء و سکون میں مؤثر ہے، مگر کوئی اس کا اثر ظاہر نہیں ہوا، اب تو آنعزیز کا یہی جملہ تسلّی بخش ہو سکتا ہے کہ جو ہونے والا تھا ہو گیا، اس کے ساتھ اتنے اضافہ کی اور ضرورت ہے کہ دعاء و التجا آخیر علاج ہے اور اکسیر علاج ہے،

بعدِ قلبیہ کے بعد پریشانی اور رنج و غم کہاں؟

آنعزیز نے اپنی محبت سے لکھا ہے "لیکن مجھ کو اس کا صدمہ ہوتا ہے کہ جب مجھ کو یہ معلوم ہوا کہ آپ کے عیش و آرام میں فرق پڑ گیا۔"

یہ آنعزیز کی محبت کا مقتضا ہے اور ہونا بھی چاہئے، اور حقیقی بھائی کے ساتھ تو کیوں نہ ہوتا، ہر نوعی بھائی کے ساتھ ہونا چاہئے ؎

چو از محنتِ دیگراں بے غمی ⁂ نشاید کہ نامت نہند آدمی

"یعنی اگر دوسروں کے رنج و غم سے تم بے خبر ہو تو مناسب نہیں کہ تمھارا نام آدمی رکھیں"

مگر میں آنعزیز کو بے فکر اور مطمئن کرتا ہوں کہ حق تعالیٰ نے اس عیش سے زیادہ مجھ کو عیش عطا فرمائی، یعنی وہ عیش دنیا کا تھا اور واقع میں مجھ کو اس سے ایک گونہ دلچسپی ہو گئی تھی، اور کبھی کبھی سوچ کر ڈرتا تھا کہ خدا نہ کرے اس آیت کا مضمون تو مجھ پر صادق نہیں آنے لگا:-

رَضُوا بِالْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وَاطْمَاَنُّوْا بِهَا (یونس آیت ۷)

"اور وہ دنیوی زندگی پر راضی ہو گئے (اور آخرت کی فکر اصلا نہیں کرتے) اور اسی میں جی لگا بیٹھے، (آئندہ کی کچھ فکر نہیں)"

خدا تعالیٰ کا شکر ہے کہ ان واقعات نے اس حدیث کے معنی سمجھا دیئے،

اَللّٰهُمَّ لَا عَيْشَ اِلَّا عَيْشُ الْاٰخِرَةِ

"اے اللہ آخرت کے عیش کے سوا کوئی عیش نہیں"

اوّل اوّل ذرا جی گھبرایا مگر حق تعالیٰ نے دکھلا دیا ؎

درد از یار ست و درماں نیز ہم ⁂ دل فدائے او شد و جاں نیز ہم[1]

---

[1] "درد دوست کی طرف سے ہے اور اس کا علاج بھی انہی کے پاس ہے، دل و جان اس پر قربان ہو"

اور اس آیت کے معنی دکھلادیتے ؛

مَاۤ اَصَابَ مِنۡ مُّصِيۡبَةٍ اِلَّا بِاِذۡنِ اللّٰهِ ؕ وَمَنۡ يُّؤۡمِنۡۢ بِاللّٰهِ يَهۡدِ قَلۡبَهٗ ؕ

(التغابن آیت ۱۱) "کوئی مصیبت بدون حکم خدا کے نہیں آتی، اور جو شخص اللہ پر پورا ایمان رکھتا ہو اللہ تعالیٰ اس کے قلب کو صبر و رضا کی راہ دکھاتا ہے"۔)

بس یَہۡدِ قَلۡبَہٗ کے بعد پریشانی کہاں، کہاں رنج و غم، باقی طبعی اثر خفیف (ہلکا) سا کسی وقت ہو وہ پریشانی کُن نہیں، دوسرے اس سے کوئی خالی نہیں، تیسرے وہ خود علاج ہے بہت سے امراض کا جن میں نفوسِ عامّہ مبتلا ہیں، اس حیثیت سے وہ سب رحمت ہیں، اس لئے میں الحمدللہ پہلے سے زیادہ عیش میں ہوں اور بفضلہٖ تعالیٰ اب تو ظاہراً بھی سکوت و سکون بڑھتے رہنے سے پہلے رنگ کا عیش بھی مع شئے زائد کے عود (واپسی) کرتا آتا ہے،

خط کے جواب میں مکمل رسالہ لکھنے کا سبب

آگے آنعزیز کے خط کے خاتمہ کا جملہ ہے ؛ "اس لئے اپنے اطمینانِ خاطر کے لئے میں التجا کرتا ہوں کہ اپنے قلم سے اس کے مفصّل حالات تحریر فرمائیں، زیادہ نیاز مند، فقط"۔ میری بدنی حالت اس وقت بوجہ نقاہت (کمزوری) کے اتنی تفصیل کی متحمل (برداشت کرنے والی) نہ تھی، نیز واقعات کے ساتھ علوم کا منضم (شامل) کرنا شاید یہ بجائے تفصیل کے تطویل (طویل) ہونا معلوم ہو، مگر آنعزیز کے تعلق طبیعت و اثر محبت نے قلب میں ایک جوش پیدا کر دیا، جس سے جو بیساختہ قلم میں آتا گیا، پھر اس مجموعی مضمون کی نافعیت (فائدہ مند ہونے) پر نظر کر کے کہ اس کو ایک رسالہ قرار دے کر اس کا ایک با دلالت نام بھی رکھ دوں، چنانچہ یہ نام خیال میں آیا: "الخطوبُ المذیبہ للقلوبِ المنیبہ" یعنی وہ واقعات جو خدا کی طرف رجوع ہونے والے قلب کو گداختہ اور نرم کر دیں،

تعدّدِ ازدواج سے بچنے ہی میں سلامتی ہے

اب میں اپنے اس خط کو ایک مناسب مقام و مفید دستور العمل پر ختم کرتا ہوں، جس کے تین جُز و ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ یہ تو میں اصل خط میں مشورہ دے چکا ہوں کہ تعدّدِ ازدواج ایک پُرخطر مسلک ہے، جس طرح قضاء یعنی حکومت کے قبول کرنے میں حدیث میں نہایت تہدید (دھمکی) ہے، یہ بھی اس سے کم نہیں، بلکہ میں نے جو وجہ مصلحت حصول صفتِ عدل کے متعلق بیان کی ہے، اس سے یہ تو معلوم ہو گیا ہوگا کہ بعض وجوہ سے یہ قضاء بھی اشد ہے، جب اس سے تحذیر (ڈرنے کا حکم) وارد ہے تو اس کی جرأت کب زیبا ہے اور مکرر کہتا ہوں کہ میرے اختیار کرنے سے دھوکہ نہ کھایا جائے اس اختیار کرنے سے تو پورا پتہ چلا ہیں

ع من نکردم شما حذر بکنید

لیکن جو شخص اس مشورہ سے قبل اس زنجیر میں بندھ چکا ہو اس کے لئے ضرورت ہے کہ اس کے پورے حقوق ادا کرے، اس طرح ان متعدد بیبیوں پر بھی واجب ہو کہ نفس کا اتباع چھوڑ کر شریعت کو اپنا رہبر بنائیں، احکامِ شرعیہ کی تفصیل تو علماء کی مراجعت سے معلوم کرنا چاہئے، اس مقام پر میں مشورہ کے درجہ میں ایک دستور العمل جو بعد تفصیل کے تین دستور العمل ہیں تینوں شخصوں کے لئے لکھتا ہوں :۔

پہلا دستور العمل شوہر کے لئے (۱) ایک بی بی کا راز دوسری سے نہ کہے، (۲) دونوں کا کھانا اور دونوں کا رہنا الگ الگ رکھے، ان کا اجتماع آگ اور بارود کے اجتماع سے کم نہیں (۳) ایک سے دوسری کی شکایت ہرگز نہ سنے (۴) ایک کی تعریف دوسری سے نہ کرے (۵) غرض ایک کا تذکرہ نہ دوسری سے کرے نہ دوسری سے سنے، اگر ایک شروع بھی کرے فوراً روک دے کہ اور کچھ بات کرو (۶) اگر ایک دوسری کی کوئی بات پوچھے ہرگز نہ بتلائے، مگر خشونت (سختی) نہ کرے، لطف سے منع کردے (۷) دینے لینے میں یہ شبہ نہ ہونے دے کہ ایک کو زیادہ دیدیا ہو، اس کو صاف صاف ظاہر کردے (۸) باہر سے آنے والی عورتوں کو سختی سے روکے کہ وہ دوسری جگہ کی حکایات یا شکایات بیان نہ کریں (۹) اور نہ خوشامد میں ایک ساتھ کم محبتی کا دعویٰ دوسری کے سامنے کرے (۱۰) اگر موقع ہو ایک سے ایسی روایت کردے کہ دوسری تمہاری تعریف کرتی تھی (۱۱) لطف سے اس کی تدبیر ہو سکے تو مفید ہو کہ ایک دوسری کے پاس ہدیہ وغیرہ بھی بھیجا کریں،

دوسرا دستور العمل منکوحۂ قدیمہ کے لئے (۱) جدیدہ پر حسد نہ کرے (۲) اس پر طعن و تشنیع نہ کرے (۳) بہ تکلف جدیدہ کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرے، تاکہ اگر اس کے دل میں محبت نہ ہو تو عداوت بھی نہ ہو، (۴) شوہر سے کوئی ایسی بے تکلف گفتگو نہ کرے کہ شوہر کو اس جدیدہ کے سامنے اس کا ہونا اس لئے ناگوار ہو کہ اس کو یہ احتمال ہو کہ یہ جدیدہ بھی ایسی بے تمیزی نہ سیکھے، (۵) شوہر سے جدیدہ وغیرہ کا کوئی عیب بیان نہ کرے کہ کوئی شخص اپنے محبوب کی عیب گوئی خصوص رقیب کی زبان سے پسند نہیں کرتا، (۶) جدیدہ سے ایسا برتاؤ رکھے کہ اس کی زبان اس قدیمہ کے سامنے ہمیشہ بند رہے (۷) شوہر کی اطاعت و خدمت و ادب میں اور بیشی (اضافہ) کردے تاکہ اس کے دل سے نہ اُتر جائے (۸) اگر شوہر سے ادائے حقوق میں کچھ کمی بھی ہو جائے تو جو کمی حدِ تکلیف تک نہ پہنچے اس کو زبان پر نہ لائے، اور اگر حدِ تکلیف تک ہو تو جس وقت مزاج خوش پائے ادب سے عرض کردے،

(۹) جدیدہ کے اعزہ (رشتہ داروں) سے خوش اخلاقی ومدارات (حُسنِ سلوک) کا برتاؤ رکھے کہ جدیدہ کے دل میں گھر ہو (۱۰) گاہ گاہ (کبھی کبھار) اپنا دن جدیدہ کو دیدیا کرے، تاکہ شوہر کے دل میں قدر بڑھے،

تیسرا دستور العمل منکوحہ جدیدہ کے لئے

(۱) قدیمہ کے ساتھ ایسا برتاؤ کرے جیسے اپنے بڑوں کے ساتھ کرتے ہیں، (۲) شوہر پر زیادہ ناز نہ کرے اس گمان سے کہ میں زیادہ محبوب ہوں خوب سمجھ لے کہ قدیمہ سے جو تعلقات رفاقت ہیں جو کہ دل میں جاگزیں ہو چکے ہیں، یہ نفسانی نیا جوش اس کا مقابلہ نہیں کر سکتا (۳) شوہر سے خود جدا رہنے کی درخواست نہ کرے (۴) اگر شوہر جدا رکھنے لگے تب بھی گاہ گاہ قدیمہ سے ملنے جایا کرے، قدیمہ کو دعوت وغیرہ کے لئے بلالیا کرے (۵) شوہر کو سمجھاتی رہے کہ قدیمہ سے بے پروائی نہ کرے (۶) اگر قدیمہ کچھ سختی یا طعن وغیرہ کرے تو اس کو ایک درجہ میں معذور سمجھ کر معاف کردے، اور شوہر سے تو ہرگز شکایت نہ کرے (۷) قدیمہ کے عزیزوں کی خوب خدمت کرے (۸) قدیمہ کی اولاد سے بالخصوص ایسا معاملہ رکھے کہ قدیمہ کے دل میں اس کی محبت وقدر ہو جائے (۹) ضروری امور میں قدیمہ سے مشورہ کرتی رہے کہ اس کے دل میں قدر بھی ہو اور اس کو تجربہ بھی زیادہ ہے (۱۰) اگر اپنے میکے میں جائے قدیمہ سے خط وکتابت بھی رکھے،

اشعار:-

ما نصیحت بجائے خود کردیم روزگارے دریں بسر بردیم
گر نیاید بگوش رغبت کس بر رسولاں بلاغ باشد وبس

ترجمہ:- "ہم نے اپنی جگہ نصیحت کردی اور اسی طرح اپنی زندگی بسر کردی اگر کسی کو اس میں رغبت نہ ہو (تو مضائقہ نہیں) کیونکہ قاصدوں کے ذمہ صرف پہنچانا ہے اور بس"!!

وَالسَّلَامُ مَنِ اتَّبَعَ الْهُدٰى وَالدُّعَاءُ مَنْ وَّقَى الْهَوٰى وَاَنَا الْحَقِيْرُ

بَنَامِ عَجِيْبُ

۲۶، ۲۷؍ ذی الحجہ ۱۳۳۴ھ

دوسرا ضمیمہ ختم ہوا

تیسرا ضمیمہ
فہرست تحلیل بعض محرمات

اس سے پہلے کے ۲ دو ضمیمے تحریم بعض محللات کے تھے، یہ تیسرا ضمیمہ اس کے مقابل کی فہرست یعنی تحلیل بعض محرمات (بعض شرعاً حرام برائے نکاح کو حلال سمجھنے) کا ہے، منجملہ ان کے ایک یہ صورت ہے کہ بعض لوگ رضاعی بھائی بہن خاص انہی کو سمجھتے ہیں جو ایک زمانہ میں ایک عورت کا دودھ پئیں، اور مختلف زمانوں میں دودھ پینے والے بچوں کو ایک دوسرے کے لئے حلال سمجھتے ہیں،

سو یہ اعتقاد بالکل باطل ہے، اس حرمت کے لئے زمانے کا اتحاد و اختلاف سب برابر ہے منجملہ اُن کے ایک یہ صورت ہے کہ اکثر لوگ لاوارث لڑکیوں کو جن کا کوئی ولی شرعی نہیں ہے، پرورش کر کے ان کے بلوغ کے قبل اپنی ولایت سے ان کا نکاح کر دیتے ہیں، سو یہ نکاح اصلاً منعقد نہیں ہوتا،

تیسرا ضمیمہ ختم ہوا

بعض جُزئیات انقلاب مع اصلاح

اصلاح معاملہ متعلقِ ولایتِ نکاح

ولایتِ نکاح سے متعلق چند کوتاہیوں کا بیان

اس ولایتِ نکاح (نکاح کا اختیار ہونا) میں بھی مختلف کوتاہیوں کا وقوع شائع ہے، اس لئے مختصراً ان پر متنبہ کرنا ضروری ہے، وہی ہذہٖ (اور وہ یہ ہیں):-

لاوارث نابالغ لڑکی کا نکاح کردینا

ایک کوتاہی تو وہی ہے جو ابھی قریب اور ضمیمہ ثالثہ میں لاوارث نابالغ لڑکی کے نکاح کردینے کے مضمون میں مذکور ہوئی ہے،

ماں کا حقِ ولایت اس وقت تک ہی جب عصبات میں سے کوئی نہ ہو

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض جگہ اتباعِ رسم وعرف کے سبب ولی اقرب (نزدیک کے ولی) کو ولی ابعد (دور کے ولی) کے سامنے بیکار سمجھتے ہیں مثلاً ایک نابالغ لڑکی کا ایک بالغ بھائی ہے، اور ایک چچا، تو چچا اپنے کو بڑا سمجھ کر اس بھائی کا کچھ دخل نہیں سمجھتا اور اپنے کو مختار مستقل سمجھ کر اپنی ولایت سے اس کا نکاح کردیتا ہے، اور اس سے اجازت حاصل نہیں کرتا، بلکہ بعض جگہ اس کی ناراضی کی حالت میں بھی جبراً نکاح کردیتا ہے، حالانکہ شرعاً اس صورت میں بدون بھائی کی صریح اجازت کے نکاح درست نہیں ہوتا خصوصاً اس رسم کا اثر لڑکی کے نکاح کے بارے میں ماں پر خاص طور پر ہوتا ہے، کہ خود ماں اپنے سامنے کسی کو مختار نہیں سمجھتی، خصوص عصبات (خاص طور پر شوہر کے ددھیالی رشتہ داروں) کو (جو کہ اس کے حق میں ماں پر شرعاً مقدم ہیں) یہ جاہل ماں اپنے سے مقدم تو کیا مؤخر بھی نہیں سمجھتی، یعنی اُن کا بالکل حق ہی نہیں سمجھتی، تو سمجھ لینا چاہئے کہ ماں کا حقِ ولایت اس وقت ہی جب عصبات (ددھیالی رشتہ داروں) میں سے کوئی نہ ہو،

نابالغ بچی کی پرورش میں کوتاہی کے باوجود باپ کا حقِ ولایت باقی رہتا ہے،

ایک کوتاہی جس میں بعضے نیم مُلّا بھی گرفتار ہیں یہ ہے کہ باپ کی ولایت کو اس کے ساتھ مشروط سمجھتے ہیں، کہ وہ اس نابالغہ کی خدمت اور پرورش کرتا ہو، ورنہ اگر وہ کسی عذر سے بی بی کے ساتھ ناچاقی (نا اتفاقی)

کی وجہ سے اس کی پرورش میں کوتاہی کرے تو اس کی ولایت کو ساقط سمجھتے ہیں، گو بلا عذر اولاد کا حق ضائع کرنا معصیت (گناہ) ہے، لیکن معصیت سے ولایتِ نکاح تو سلب نہیں ہوتی، (چھن نہیں جاتی) اور سوءِ اختیار (برے اختیار) کی صورت جو فقہاء نے لکھی ہے وہ اور بات ہے، ہر کوتاہی اس سوءِ اختیار میں داخل نہیں، ہمارے وطن میں ایک زاعمِ علم (خود ساختہ عالم) نے عجیب مضمون لکھا تھا، اور لطف یہ ہے کہ ایک مجمع میں اس کا اعلان بھی کیا، مگر نظرِ ردّ سے سنا گیا، اور یہ لکھا تھا کہ جب معصیت سے ولی اللہ کی ولایت زائل ہو جاتی ہے تو ولی النکاح کی ولایت کیوں زائل نہ ہو جائے گی، یہ تو ایسی بات ہے جیسے کوئی کہے کہ دیکھو نماز ایک تعلق ہے عبد (بندہ) اور رب کے درمیان میں، اور نقضِ وضو (وضو کے ٹوٹنے) سے باطل ہو جاتی ہے، تو نکاح جو کہ ایک تعلق ہی عبد اور عبد میں تو وہ نقضِ وضو سے کیونکر باطل نہ ہو جائے گا، یاد رکھنا چاہئے کہ دین کے لئے محض رائے کافی نہیں، حجّتِ شرعیہ (شرعی دلیل) کی حاجت ہے، اور اس تقریر کا حجّتِ شرعیہ نہ ہونا ظاہر ہے،

سوتیلے باپ کو حقِ ولایتِ نکاح کسی صورت حاصل نہیں،

ایک کوتاہی اس سے بڑھ کر ہی کہ جس شخص کو کبھی اور کسی درجہ میں بھی حقِ ولایت نہیں وہ اپنے کو ولی النکاح سمجھتا ہے، چنانچہ اکثر جگہ سوتیلے باپ کو ولایتِ نکاح کا دعویٰ کرتے ہوئے، بلکہ اسی ولایتِ مزعومہ کی بناء پر نابالغہ کا نکاح کرتے ہوئے دیکھا گیا ہے، حالانکہ یہ شخص ولی اَبْعَدْ بھی نہیں، البتہ اگر کسی صورت میں ماں کو حقِ ولایت ہو، یعنی جبکہ عصبات میں سے کوئی نہ ہو، اور ماں اپنی طرف سے اس شوہر کو وکیلِ نکاح کر دینے کا بنا دے، تو یہ وکالت کی بنا پر البتہ اس کو اس نکاح کا اختیار حاصل ہو جائے گا، اور بدون اس کے یہ کوئی چیز نہیں،

ولی کے جبراً نکاح کرا دینے سے نکاح درست نہیں ہوتا،

ایک کوتاہی یہ ہوتی ہے کہ ایک شخص کو ولایتِ نکاح تو حاصل ہے، مگر ولایتِ جبریہ (زبردستی کے اختیار کی ولایت) نہیں ہے، صرف یہ ولایت ہے کہ اس کے استیذان (اجازت مانگنے) پر منکوحہ کا سکوت (خاموشی) اذن (اجازت) سمجھا جاتا ہے، یعنی لڑکی بالغہ ہے، مگر یہ شخص جبراً اس کا نکاح کر دیتا ہے، یعنی وہ تصریحاً انکار اور رد کرتی ہے، مگر اس کی پرواہ نہیں کی جاتی اور ظلم اور زور کر کے اس کو بیوی بنا لیتا ہے اور عمر بھر حرام کاری ہوتی ہے، اور افسوس کہ عام لوگ بناء بر جہل (جہالت کی وجہ سے) ان ظالموں کا ساتھ دیتے ہیں اور اپنی عاقبت برباد کر دیتے ہیں، لوگوں کے خیال میں نکاح کے چند الفاظ ایسے مؤثر اثر

رکھنے والے ہیں کہ ان کی تاثیر کی کوئی شرط نہیں،

باکرہ بالغہ کا سکوت ہی اذن ہے | ایک کوتاہی جو کہ بہت ہی عام ہے خاص ولی جائز سے صادر ہوتی ہے، وہ یہ کہ مسئلہ شرعیہ یہ ہے کہ باکرہ لڑکی جب بالغہ ہو تو اس سے استیذان یعنی اجازت لینا صحتِ نکاح کے لئے ضروری ہے، اتنا فرق ہے کہ اگر ولی جائز یا اس کا وکیل یا اس کا رسول یعنی جس کو اس نے بھیجا ہو یہ لوگ اس بالغہ سے اذن چاہیں تب تو اس کا سکوت اذن ہے، اور اگر کوئی اور شخص اذن چاہے تو جب تک وہ زبان سے اجازت نہ دے محض اس کا سکوت (خاموش رہنا) اذن نہ ہوگا، البتہ اگر قبل اذن ولی نے نکاح کر دیا اور بعد نکاح اس منکوحہ بالغہ کو خبر پہونچی تو اگر یہ خبر پہنچانیوالا ولی کا فرستادہ (بھیجا ہوا) ہو، یا اگر فرستادہ نہیں تو وہ خبر پہنچانے والا اگر ایک ہے تو عادل اور دیندار ہو، یا کم از کم دو شخص ہوں، اگرچہ ثابت العدالت (عادل ثابت) نہ ہوں مگر مستور الحال ہوں، (جن کا حال چھپا ہوا ہو) تو اس صورت میں بھی اس کا سکوت اذن ہوگا، اور اگر ایک شخص غیر عادل ہو تو اس وقت اُس کا سکوت کافی نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار، ورد المحتار ج ۲ صفحہ ۴۸۹، ۴۹۰)

اور جن صورتوں میں اذن نہیں ان صورتوں میں صحتِ نکاح اُس وقت ہوگی جبکہ وہ زبان سے اجازت دے یا اس سے کوئی فعل صادر ہو جو اس کی رضا پر دلالت کرے، مثلاً وہ اپنا مہر یا نفقہ مانگنے لگے، یا ہمبستری کے وقت انکار نہ کرے، اور جب تک یہ امور نہ پائے جائیں نکاح موقوف (رُکا ہوا) رہے گا،

نکاحِ موقوف کے احکام | نکاحِ موقوف کے احکام میں سے یہ امور ہیں:۔

(۱) اگر قبل نفاذِ نکاح کے احد الزوجین (میاں بیوی میں سے کوئی ایک) مرجائے نکاح باطل ہو جائے گا، نہ مہر واجب ہوگا اور نہ ایک کی میراث دوسرے کو پہنچے گی، (۲) قبل نفاذِ نکاح کے اس عورت سے بوس وکنار یا صحبت کرنا حرام ہے، کیونکہ نفاذ خود ان افعال سے معلّل (علّت والا) ہے، تو یہ افعال نفاذ پر مقدم ہوئے، اور ظاہر ہے کہ بدونِ نکاح کے یہ افعال حرام ہیں، اگرچہ پھر انہی افعال سے نفاذ ہو جائے، کذا فی رد المحتار (عن البحر) ج ۳، ص ۲۱۱ سطر ۹ قولہ وکتقبیلہا الخ، یہ تو مسئلہ کی تفصیل ہوئی،

قبل نکاح باکرہ منکوحہ سے اذن نہ لینے سے نکاح موقوف رہے گا، | اب اس کوتاہی کا ذکر کیا جاتا ہے کہ اس وقت عموماً عادت ہے کہ قبل نکاحِ باکرہ (کنواری کے نکاح سے پہلے) منکوحہ سے اذن نہیں لیا جاتا، اور بعض اوقات خبر بھی بطریقِ مذکورہ اس کو نہیں پہونچتی، اور وہ اسی

حالت سے رخصت کردی جاتی ہے، تو یہ رخصت ایسی حالت میں ہوتی ہے کہ اس کا نکاح نافذ نہیں ہوتا موقوف رہتا ہے، پھر جب شوہر کے ساتھ اس کی خلوت ہوتی ہے اور وہ اظہار ناراضی کا نہیں کرتی تب نکاح نافذ ہوتا ہے، تو ایسی صورت میں یہ بوس وکنار یا ہمبستری سب حرام ہوتا ہے، گو اس کے بعد نکاح صحیح ہو جاتا ہے، اور پھر یہ سب افعال حلال ہوتے ہیں، مگر اول بار کا بوس وکنار وغیرہ سب حرام ہوا، جس میں زوجین تو مبتلا ہوئے ہی خود وہ ولی صاحب بھی جو سبب اس ارتکاب محرم (حرام کاری) کے ہوئے اس ذیل میں شریک ہوئے،

نکاح سے قبل منکوحہ سے اذن حاصل کرنا ضروری ہے،

اور اس کا بہت آسانی سے انتظام ہو سکتا ہے، کہ قبل نکاح اذن حاصل کریں، یا نکاح کرکے فوراً خود جا کر اطلاع کردیں، نیز اگر اتفاق سے زوجین میں سے کوئی مرگیا تو مہر اور میراث کے احکام میں بوجہ جہل کے اختلال واختلاف (جہالت کی وجہ سے خرابی اور اختلاف) ہوگا گو ایسا واقعہ کم پیش آتا ہے مگر پیش آتا بھی ہے،

نکاح موقوف کی صورت میں شب زفاف میں عورت اظہار ناراضی کردے تو نکاح نافذ ہی نہیں ہوگا

اور ہمبستری کی حرمت (حرام ہونے) کی خرابی تو سب ہی جگہوں پر پیش آتی ہے، اور اگر ایسی صورت میں کہ نکاح نافذ نہ ہو ہمبستری کے وقت بھی ناراضی ونفرت کا اظہار کرے جیسا کہ زفاف (پہلی مرتبہ کی ہمبستری) کے وقت بعض عورتیں کرتی ہیں تو وہ نکاح نافذ بھی نہیں ہوتا، پس تمام عمر حرام ہوتا رہتا ہے، انہی وجوہ سے بہت ضروری ہے کہ کم از کم نکاح خواں قاضی (نکاح پڑھانے والا قاضی) عالم ہونا چاہئے تاکہ ان امور کا انتظام پورے طور سے کرے،

بارہ برس کی عمر کی لڑکی کی اجازت معتبر نہیں

ایک کوتاہی مسئلہ ولایت کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ عموماً لوگ یہ سمجھے ہوئے ہیں کہ بارہ برس کی عمر میں لڑکا اور لڑکی بالغ ہو جاتے ہیں، پس بعض جگہ ایسا ہوتا ہے کہ لڑکی بارہ برس کی ہے اور واقع میں وہ نابالغ ہے، اور ولی قریب موجود ہے مگر باوجود اس کے ولی بعید یا اجنبی غیر ولی اس لڑکی کو بالغ سمجھ کر اس کے منہ سے اجازت لے کر اور اس کو کافی سمجھ کر کہیں اس کا نکاح کر دیتا ہے، حالانکہ بوجہ نابالغ ہونے کے اس کی اجازت اصلا معتبر نہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بارہ برس میں بالغ ہونا ضروری نہیں، بلکہ اس کا بالغ ہونا حیض کے آنے سے ہے، البتہ اگر پندرہ برس پورے ہو کر بھی حیض نہ آئے تو پھر اس کے بلوغ (بالغ ہونے) کا حکم کر دیا جائے گا،

اگر کسی نابالغ لڑکی کا نکاح باپ دادا کے علاوہ کسی ولی جائز نے کرایا ہو تو بعد بلوغ لڑکی کو فسخ نکاح کا اختیار ہوگا،

ایک کوتاہی ولایت کے متعلق ایک اور مسئلہ میں ہوتی ہے، وہ مسئلہ یہ ہے کہ اگر بجز باپ اور دادا (باپ اور دادا کے علاوہ) کوئی دوسرا ولی جائز نابالغ لڑکی کا نکاح کفو سے مہر مثل[1] پر کردے تو نکاح تو صحیح ہوجاتا ہے، لیکن اس لڑکی کو بالغ ہونے کے وقت جبکہ اس کو پہلے سے خبر نکاح کی ہو یا بعد بالغ ہونے کے جب اول بار اس کو نکاح کی خبر ہو اختیار ہے اس نکاح کے فسخ (ختم) کردینے کا اور یہ خیارِ فسخ دخول (ہمبستری) کے بعد بھی باقی رہتا ہے، لیکن اس میں اتنی تفصیل ہے کہ یہ لڑکی اس وقت تک باکرہ ہو تب تو اس فسخ کی شرط ہے کہ بالغ ہونے کے ساتھ ہی یا خبر پہونچنے کے ساتھ ہی زبان سے کہے کہ میں اپنا نکاح فسخ کرتی ہوں، اگر فوراً نہ کہا تو یہ اختیار باطل ہوگیا، اور اگر یہ ثیبّہ (کنواری نہیں) ہے، خواہ تو اس نکاح سے پہلے ہی ثیبّہ تھی، مثلاً یہ نکاح ثانی تھا یا اس نکاح کے بعد اس کے ساتھ دخول ہوا ہو تو یہ اختیار اس وقت تک باقی رہے گا کہ صراحۃً (وضاحت سے) زبان سے رضا ظاہر کرے یا دلالۃً رضا پائی جائے مثلاً لمس و قبلہ (چھونے اور بوسہ لینے) وغیرہ پر انکار نہ کرے،

خیارِ فسخ کے مؤثر ہونے میں قضاءِ قاضی شرط ہے

اور ایک شرط اس خیار فسخ کے مؤثر ہونے میں اور بھی ہے کہ قضاءِ قاضی (شرعی حاکم کا فیصلہ) اس کے ساتھ متصل ہو، یعنی یہ عورت قاضی یعنی حاکمِ مسلم کے یہاں دعویٰ فسخ کا کرے، اور وہ حاکم تفریق کا حکم کردے تب نکاح فسخ ہوگا، ورنہ نہیں، یہ تو مسئلہ کا بیان تھا،

نکاح فسخ ہونیکے چند شرائط

اب کوتاہی اس میں یہ ہوتی ہے کہ ناتمام مسئلہ سن کر صرف عورت کے اس کہہ دینے کو کہ میں نے نکاح فسخ کیا ہر حال میں کافی سمجھتے ہیں، خواہ وہ مجلسِ بلوغ و مجلسِ وصولِ خبر (بالغ ہونے اور خبر پہونچنے کی مجلس) کے بعد ہی کہے اور اگرچہ اس کے ساتھ قضاءِ قاضی نہ ہو، تو یہ سخت غلطی ہے، اور اس کے علاوہ اور بھی بہت مسائل ہیں جن میں قضاءِ قاضی شرط ہے جن کو اس کا علم نہیں، اُن کو تو یہ دینی ضرر ہوتا ہے، کہ وہ بدون قضاءِ قاضی کے ان احکام کو نافذ

---

[1] مہر مثل: خاندانی مہر یعنی اس عورت کے باپ کے گھرانے میں دوسری عورت جو اس کے مثل ہو (یعنی وہ عورت عمر، خوبصورتی، کنوارے پن، مالداری، وطن، دینداری، ہوشیاری اور سلیقہ شعاری میں اس عورت کے مانند ہو) اس عورت کا مہر مقرر ہوا تھا اس کے برابر "مہر مثل" کہلاتا ہے، بندہ احقر قریشی غفرلہ

سمجھتے ہیں اور جن کو اس کا علم ہے ان کو ان بلاد میں یہ دنیوی ضرر ہے کہ قاضی مسلم نہ ہونیکے سبب ان کو ان کلفتوں سے نجات پانے کا بجز اس ذریعہ نہیں، اس لئے احقر کی رائے مدت سے یہ ہے کہ اگر عامۂ اہلِ اسلام گورنمنٹ سے درخواست کریں کہ ہر ضلع میں ایک عالم بہ انتخاب (ایک عالم کو منتخب کر کے) اہلِ اسلام ایسے مقدمات کی سماعت وفیصل (ایسے مقدموں کو سننے اور فیصلہ کرنے) کے لئے مقرر کر دیئے جائیں اور اُن کی تنخواہ کے انتظام کے لئے مالگذاری کے ساتھ فی سینکڑہ کچھ مختصر سی رقم مسلمان زمینداران سے وصول کر لی جائے، کیونکہ جمہورِ اہلِ اسلام کو اس کا نفع پہونچے گا تو جن مسائل میں قضاءِ قاضی شرط ہے، ان میں مسلمانوں کو آسانی ہو جائے،

بعض مقامات پر ولیِ اقرب کا لڑکی کے ساتھ ظلمِ عظیم

ایک کوتاہی ولایت کے باب میں یہ ہے کہ بعض اوقات ولیِ اقرب اپنے اختیارات کے زعم (گمان) میں لڑکی کو بہت دق (تنگ) کرتا ہے کبھی سالہا سال بے نشان (لاپتہ) ہو جاتا ہے، کبھی اس انتظار میں نکاح نہیں کرتا کہ بہت سا روپیہ ہو جس سے سامانِ تفاخر (فخر کا سامان) کیا جائے تب نکاح کروں، کبھی اچھی اچھی جگہوں کے پیغاموں کو رَدّ کر کے ترفّع (خوش حالی) کی طلب میں غلو کرتا ہے، اور ان افعال کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ لڑکی یوں ہی بیٹھی رہتی ہے، بعض جگہ ننگ وناموس (عزت ووقار) برباد ہو گیا، بعض جگہ غایت صبر وضبط (بہت زیادہ صبر وضبط کرنے) سے لڑکی کو امراضِ صعبہ (پیچیدہ امراض) لاحق ہو گئے، یہ ولی صاحب سمجھ رہے ہیں کہ میرے سامنے کوئی با اختیار نہیں ہے، سو جس طرح چاہوں گا کروں گا اس کا ظلمِ عظیم ہونا تو معلوم ہی ہے، لیکن اس شخص کے اس خیال کا غلط ہونا بھی معلوم ہونا چاہئے کہ اسی پر دار ومدار ہے،

غَیبت منقطعہ ہونے سے ولایت ولیِ ابعد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے

سو سمجھ لینا چاہئے کہ ان دونوں مذکورہ صورتوں میں یعنی جب کہ وہ بے نشان ہو جائے اور بہت دور دراز چلا جائے اور مدتوں تک نہ آئے اور نہ کسی بات کا جواب دے، یہ بھی بے نشان ہونے کے حکم میں ہے، اس کو غیبتِ منقطعہ (مستقل غائب ہونا) کہتے ہیں، پس جب وہ بغیبتِ منقطعہ غائب ہو جائے، یا باوجود اچھا موقع ملنے کے محض جاہلانہ خیالات کی وجہ سے ٹالتا ہو تو ان دونوں صورتوں میں ولایت اس ولیِ اقرب سے ولیِ ابعد کی طرف منتقل ہو جاتی ہے، اور اس ولیِ ابعد کو اس لڑکی کے نکاح کر دینے کا مثل ولیِ اقرب کے اختیار حاصل ہوتا ہے، پھر وہ ولیِ اقرب کچھ نہیں کر سکتا،

بالغ لڑکی ولی کی غفلت اور لاپرواہی کی صورت میں خود نکاح کرسکتی ہے

اور اگر وہ لڑکی بالغ ہو تو پھر خود وہ لڑکی اختیار رکھتی ہے کہ مناسب موقع پر اپنی زبان سے اجازت دے کر نکاح کرلے، البتہ غیر کفو میں نہ کرے، کہ اس میں ایک قول میں ولی کو حقِ فسخ حاصل ہے بشرط القضاء، اور ایک قول میں نکاح ہی صحیح نہیں ہوتا، اس لئے غیر کفو میں کرنے سے ممانعت کی جاتی ہے،

یہ مختصر بیان ہے ولایت کے متعلق کوتاہیوں کا۔

اصلاحِ معاملہ متعلقہ بہ کفاءت

شرع نے کفاءت (برابری) میں چند اوصاف کا اعتبار کیا ہے، جن میں ایک نسب بھی ہے، اس کے متعلق خاص ہندوستان میں چند کوتاہیاں ہوتی ہیں:۔

کفاءتِ نسب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ نسب میں ماں کا بھی اعتبار کرتے ہیں، یعنی اگر ماں کسی کی نجیب (شریف) نہ ہو تو اس کو نجیب نہیں سمجھتے، اور اس لئے اس کو اپنا ہمسر نہیں جانتے، حالانکہ شریعت نے کفاءتِ نسب کے باب میں ماں کا کچھ اعتبار نہیں کیا، اسی طرح دوسرے احکامِ نسبیہ میں بھی ماں کا اعتبار نہیں کیا، مثلاً ایک شخص کی ماں صرف بنی ہاشم میں سے ہو اس کو زکوٰۃ حلال ہے، پس صرف نجیب الاب ہمسر ہی نجیب الطرفین کا،

ماں کی طرف سے سیادتِ نسبیہ صرف حضرتِ فاطمہ رضؓ اور اُن کی اولاد کے لئے ثابت ہے

البتہ اس کلیہ سے صرف ایک جزئیہ مستثنیٰ (ایک جز علیحدہ) ہے، وہ یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادتِ نسبیہ حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے لئے بھی ثابت ہو کر آپ کی اولاد میں جو لوگ ہیں وہ بھی سید ہیں اور افضل ہیں دوسرے بنی ہاشم سے، حتیٰ کہ جو لوگ حضرت علی رضی اللہ عنہ کی اولاد میں بھی ہوں مگر حضرت فاطمہ رضؓ کے بطن سے نہ ہوں وہ سید نہ ہوں گے، بلکہ علوی ہوں گے، اور یہاں یہ بھی معلوم ہوا کہ بعض نسب ناموں میں علویوں کے ناموں کے ساتھ "سید" ملا ہوا ہے یہ صحیح نہیں، اور علویوں کا دعویٰ سیادت محض غلط ہے، البتہ بنی ہاشم میں سے ہیں، اور بنی ہاشم کے جو فضائل ہیں وہ ضرور اُن کے لئے حاصل ہیں،

نسب میں فخر کی کوئی بات نہیں ہے،

ایک کوتاہی یہ ہے کہ نسب پر فخر کرتے ہیں اور دوسروں کو حقیر سمجھتے ہیں، حالانکہ نسب کوئی فخر کی بات نہیں، البتہ حق تعالیٰ کی نعمت ہے جس پر شکر کرنا چاہئے نہ کہ کبر و تحقیر (تکبر اور دوسروں کو حقیر سمجھنا) جو کہ پوری ناشکری ہے، خصوصاً جبکہ خود اس پر کوئی دلیل کافی نہیں کہ یہ مفتخرین (فخر کرنے والے) جس

جدِّ (دادا) کیطرف انتساب (منسوب ہونے) کا دعویٰ کرتے ہیں وہ دعویٰ صحیح بھی ہے، بلکہ بعض قرائن (دلائل) سے اس کے خلاف کا شبہ ہوتا ہے چنانچہ ایک شبہ احقر نے بعض بڑے بڑے مجامع (مجلسوں) میں جہاں ایسے حضرات کا اجتماع تھا بیان کیا، وہ یہ کہ اکثر جگہ لوگوں کو دیکھا جاتا ہے کہ چند صحابہؓ کی طرف اپنے کو منسوب کرتے ہیں، مثلاً حضرات خلفاءِ اربعہ حضرت عباسؓ، حضرت ابوایوب انصاریؓ،

ہندوستان کے نسب ناموں میں ایک قوی اشکال، اب خلجان (شبہ) اس میں یہ ہے کہ ہندوستان میں فتوحات وغزوات کے لئے خاص انہی حضرات کی اولاد منتخب ہو کر آئی یا اوروں کی نسل منقطع ہوگئی، اور یہ دونوں امر عادۃً مستبعد (ناممکن) ہیں، اس سے صاف یہ شبہ ہوتا ہے کہ شاید دوسروں نے انہی حضرات کی طرف افتخار (فخر کرنے) کے لئے منسوب کر دیا ہے، تو ایسے شبہ کے ہوتے ہوئے اس قدر فخر کرنا نادانی نہیں تو اور کیا ہے[1]؟

شرافتِ نسبیہ کا شریعت نے اعتبار کیا ہے، ایک کوتاہی اس کے مقابلہ میں بعض لوگوں میں یہ پائی جاتی ہے کہ وہ لوگ عرفاً شریف نہیں ہیں، مگر زبردستی اپنے کو اصطلاحی شریفوں میں داخل کرتے ہیں، اور اپنے لئے نسب غیر معروف وغیر ثابت بالدلیل کا محض مجازفت (تخمینہ اور اٹکل) سے دعویٰ کرتے ہیں، حدیث میں ایسے مدعی کو (دعویٰ کرنے والے) پر لعنت آئی ہے، ان عرفی غیر شریفوں میں سے بعض نے اپنے اوپر ایک اور طریق سے یہ دھبہ دھونا چاہا ہے، وہ یہ کہ شرافتِ نسبیہ ہی کی سرے سے نفی کرنے لگے، کہ سب بنی آدم برابر ہیں، کسی کو کسی پر نسباً شرف نہیں، سو اس کا اگر یہ مطلب ہے کہ ایسا شرف نہیں جس پر دنیوی فخر کیا جائے، یا اس کو اخروی نجات میں کچھ دخل ہو تو ٹھیک ہے، اور اگر یہ مطلب ہے کہ شرفِ نسب میں تفاوت (فرق) کا بالکلیہ کسی حکم میں اعتبار نہیں تو محض غلط ہے، خود شریعت نے نکاح کفاءت کا اعتبار کیا ہے، امامتِ کبریٰ میں قریشیت کو شرط ٹھہرایا ہے، امامتِ صغریٰ میں اشرفیۃ نسبیہ (خاندانی شرافت) کو مرجحات (ترجیح ہونے) میں سے کہا ہے،

---

[1] حق تعالیٰ شانہٗ کا ارشاد ہے: یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ ذَكَرٍ وَّ اُنْثٰى وَ جَعَلْنٰكُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآئِلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ○ (الحجرات، ایت ۱۳) "یعنی اے لوگو ہم نے تم کو ایک مرد اور ایک عورت سے پیدا کیا ہے اور تم کو مختلف قومیں اور مختلف خاندان بنایا تاکہ ایکدوسرے کی شناخت کر سکو، اللہ کے نزدیک تم میں سب سے عزت والا وہ ہے جو سب سے زیادہ پرہیزگار ہے اللہ تعالیٰ خوب جاننے والا پورا خبردار ہے"، واقعی صحیح ہے ؎ بندۂ عشق شدی ترکِ نسب کن جامی ؛ کہ دریں راہ فلاں ابن فلاں چیزے نیست (احقر قریشی)

شرافتِ نسب میں پردیسیوں کو رذیل اور ذلیل سمجھنا صحیح نہیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض قصباتی دیہاتی لوگ تمام پردیسیوں کو رذیل اور ذلیل سمجھتے ہیں، گویا ان کے نزدیک شرافت محصور (بند) ہے چند قریٰ (بستیوں) میں، جس پر کوئی دلیل نہیں، اسی وجہ سے اگر کوئی شخص باہر سے کوئی نکاح کر کے لے آئے، برادری کی عورتیں ہرگز اس کو اپنے برابر نہیں سمجھتیں، پھر اس کی اولاد کی شادی برادری میں مصیبت ہو جاتی ہے،

کفاءتِ نسبیہ میں افراط و تفریط مذموم ہے،

دو کوتاہیاں اس باب میں کفاءتِ نسبیہ میں اور وقوع میں آتی ہیں، ایک افراطی دوسری تفریطی، افراطی (حد سے آگے بڑھنا) تو یہ کہ بعضے لوگ خصوصاً پرانے زمانے کے اس کو اس قدر مہتم بالشان سمجھتے ہیں کہ اس کے ہوتے ہوئے وہ ناکح کے کسی وصف کو نہیں دیکھتے، نہ لیاقت کو نہ دین کو نہ صحت کو نہ عمر کو نہ وسعتِ مالیہ کو، اور اپنے اس خیال پر اس عنوان سے افتخار کرتے ہیں کہ میاں ہڈی بوٹی اچھی ہونا چاہیئے، کسی ظریف نے اس عنوان کا جواب نہایت لطیف دیا ہے کہ ہم تو کتے نہیں جو فقط ہڈی بوٹی کو دیکھیں، اور واقعی اس خیال کا لغو ہونا ظاہر ہے، نکاح سے جو اصل مقصود ہے یعنی مصالح خاصہ، اس کے لئے سب ہی امور پر نظر کرنے کی ضرورت ہے نہ کہ صرف ایسے وصفِ اضافی (زائد خوبی) پر جو کہ خود ناکح کے کسی وصفِ حقیقی کی طرف راجح نہیں، محض آباء و اجداد کی طرف انتساب اس کا منشاء ہے، اس پر مفاسد یہ مرتب ہوتے ہیں کہ بعض دفعہ ناکح محض نالائق، بددین، یا مریض، بے کار یا بہت بوڑھا، یا بالکل بچہ یا فاقہ زدہ ہوتا ہے، اور منکوحہ کے لئے عمر بھر کا جیل خانہ ہو جاتا ہے،

اور تفریطی (کمی کرنے والے) یہ کہ بعضے لوگ خصوصاً نئے زمانہ کے دوسرے اوصاف کے ہوتے ہوئے نسب کا ذرا لحاظ نہیں کرتے، کہیں حُبِّ دین (دین کی محبت) کے غلبہ کے سبب اور کہیں محبتِ دنیا (دنیا کی محبت) کے غلبہ کے سبب، امرِ ثانی کو کثیر الوقوع (اکثر واقع ہونے والا) ہے، امرِ اول کا بھی ہم نے ایک مادہ تحقیق دیکھا ہے، کہ دو نوجوانوں میں دوستی تھی، جو کہ دونوں نیک بخت، دیندار تھے، جن میں ایک عالی نسب سید زادہ (اونچے خاندان کے سید کا لڑکا) اور دوسرے برہمن زادہ نومسلم (برہمن کے بیٹے نومسلم) تھے اور وہ سید زادہ اپنی یتیم ہمشیرہ کا عقد اس اپنے دوست سے کرنے کی فکر میں تھے، اور وہ دوست اپنے لئے اس امر میں بیحد کوشاں (بے انتہا کوشش کرنے والے) تھے، مجھ کو اطلاع ہوئی، چونکہ دونوں شخصوں کو مجھ سے دینی خصوصیت تھی میں نے دونوں کو خصوصاً خاطب (نکاح کا پیغام دینے والے) کو بہت سختی کے ساتھ روکا،

اور کہہ دیا کہ اگر وہ لڑکی بالغ ہے تب تو گو بھائی کے بعد استیذان (بھائی کے اجازت حاصل) کرنے سے نکاح منعقد ہو جائے گا، لیکن حمیت و مصلحت (غیرت اور مصلحت) کے خلاف ہے، کہ شریفہ کو فراش (بیوی) بنایا جاتا ہے دنی (کم مرتبہ والے) کا، نیز اکثر ایسے موقع پر عورت کی نظر میں زوج (خاوند) کی وقعت بھی نہیں ہوتی جس سے تمام مصالح نکاح فوت ہو جاتے ہیں، اور اگر وہ نابالغ ہے تو چونکہ نکاح کرنے والا باپ اور دادا نہیں اس لئے یہ نکاح منعقد ہی نہ ہوگا، (کذا فی الدر المختار و رد المحتار، ج ۲، ص ۵۰۰) چنانچہ بفضلہ تعالیٰ ایک مدت کے بعد دونوں اس خیال سے باز آگئے، البتہ اگر نکاح کرنے والا باپ دادا ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے،

عجمی عالم بھی عربیہ کا کفو نہیں

چنانچہ ابھی تازہ ایک واقعہ ہوا ہے کہ ایک غریب شیخ زادہ نے اپنی نابالغ دختر کا نکاح ایک ذی وسعت عجمی النسل مگر دیندار شخص کے فرزند سے کیا ہے، اور گو بعض نے عجمی عالم کو عربیہ کا کفو کہا ہے، مگر درمختار میں تصریح ہے:

العجمی لا یکون کفو للعربیۃ ولو کان العجمی عالماً او سلطاناً وھو الاصح فتح عن الینابیع وادعی فی الحیرا نہ ظاھر الروایۃ (ج ۲ ص ۵۲۹)	"عجمی مرد عربی عورت کا کفو نہیں ہو سکتا اگرچہ وہ عجمی عالم اور بادشاہ ہی کیوں نہ ہو اور یہ زیادہ صحیح ہے جسے فتح القدیر نے ینابیع سے نقل کیا ہو اور ظاہر روایت پر حیرانگی کا اظہار کیا ہے۔"

کفو کا اعتبار مرد کی جانب سے ہوگا عورت کی جانب سے نہیں

اور بعض نے اس افراط و تفریط کے درمیان بزعم خود (اپنے گمان کے مطابق) ایک معتدل فیصلہ اختراع (وضع) کیا ہے، وہ یہ کہ کم ذات کو خواہ لڑکی دیدے مگر کم ذات کی لڑکی لے نہیں، اور اپنے ذہن میں اس کا مبنیٰ ایک نکتہ نکالا ہے، وہ یہ کہ اگر کم ذات کی لڑکی آئی اور اس سے اولاد ہوئی تو اپنے خاندان کی نسل بگڑتی ہے، اور اگر کم ذات کے گھر لڑکی چلی گئی تو اس کی نسل سنورتی ہے، اس شخص نے خود حکم میں بھی اور اس کی بناء میں بھی شریعت کے ساتھ مزاحمت کی ہے، حکم میں..... یہ مسئلہ فقہ ہے کہ:۔

الکفاءۃ معتبرۃ من جانبہ ای الرجل لان الشریفۃ تابی ان یکون فراشاً للدنی ولا تعتبر من جانبھا لان الزوج مستفرش	"کفاءت اس کی طرف سے یعنی مرد کی جانب سے معتبر ہے، کیونکہ شریف عورت کم درجہ کے مرد کی فراش (بیوی) بننے سے انکار کرتی ہے، اور اس عورت کی طرف سے

فلا تغیضنہ وتأثۃ الفراش وھذا عند الکل فی الصحیح، الخ

معتبر نہیں کیونکہ خاوند صاحبِ فراش ہی تو وہ فراش کے استعمال میں کراہت نہیں کرتا، اور یہ صحیح ہی سب کے نزدیک،،

البتہ بعض نے ناکح صغیر میں اس کا اعتبار کیا ہے، کما فی ردالمحتار تحت القول المذکور صفحہ ۵۲ ج ۲
اس فیصل کنندہ (فیصلہ کرنے والے) نے خلاف شریعتِ منکوحہ کا وضیع (کمتر) ہونا تو جائز نہ رکھا، اور ناکح کے وضیع (کمتر) ہونے کو جائز رکھا، اور اس حکم کی بناء میں شریعت کے ساتھ یہ مزاحمت کی کہ اس شخص نے نسب میں ماں کا اعتبار کیا ہے، دوسری مزاحمت یہ کی کہ اصل حکمت اس اعتبارِ کفاءت کی وہ ہی جو درمختار کی عبارتِ بالا میں مذکور ہے، لانّ الشریفۃ تأبی، اور اس شخص نے اس کے مقابلہ میں خود ایک غلط بنا گھڑی، پس اس شخص کا یہ فیصلہ ہر طرح بناء الفاسد علی الفاسد (فاسد کی بنیاد فاسد پر) ہے، یہ تو قانونِ شرعی کی تفصیل تھی جس میں لوگوں کی کوتاہیاں مذکور ہیں

غیر کفو کی منکوحہ لانے سے اس کیلئے چند دشواریاں،

باقی اقرب الی المصلحت (مصلحت کے زیادہ قریب) یہ ہی کہ منکوحہ بھی اپنی ہی کفو کی لائے، کیونکہ غیر کفو کے اخلاق وعادات اکثر اپنے موافق نہیں ہوتے، تو ہمیشہ باہم ناچاقی رہتی ہے، نیز وہ منکوحہ مرد کے خاندان میں بے قدر رہتی ہے، تو ایک مسلمان عورت کو بے وجہ مدت العمر کے لئے بے قدر کرانا کیا ضرور، نیز عرفاً اس کی اولاد کی شادی میں دشواریاں پیش آتی ہیں، تو بلا ضرورت ان کلفتوں میں کیوں پڑے، یہاں تک تو اوصاف معتبرہ عند الشرع (شریعت کی نظر میں اعتبار کی گئی خوبیوں) میں سے کفاءتِ نسبیہ کا بیان تھا،

شرع نے کفاءت میں دین کا بھی اعتبار کیا ہے،

اور منجملہ ان اوصاف کے جن کا شرع نے کفاءت میں اعتبار فرمایا ہے، ایک دین بھی ہے اور اس میں بھی مثل کفاءت فی النسب (خاندان میں برابری) کے عورت کا مرد سے کم ہونا مضر نہیں، مرد کا عورت سے کم ہونا مضر ہے، اس میں بھی چند کوتاہیاں ہورہی ہیں، جو ایک تحقیق کے ضمن میں مذکور ہوتی ہیں، اور وہ یہ ہے کہ :-

مرد کی بد دینی کی تین قسمیں

مرد کی بد دینی تین طرح کی ہے، ایک اعتقادی اصولی، دوسری اعتقادی فروعی، تیسری اعتقادی عملی،

قسم اوّل ؛ جیسے عورت مسلمان ہو اور مرد غیر مسلمان ہو، خواہ کتابی ہو مثل یہودی ونصرانی کے، خواہ غیر کتابی ہو، مثل مجوسی وبت پرست ودہری کے، اس کا حکم تو ظاہر ہے کہ نکاح صحیح نہ ہوگا،

البتہ مرد اگر مسلم اور عورت کتابیہ ہو تو نکاح درست ہو جاتا ہے، گو مناسب نہیں، وجہ مناسب نہونے کی یہ ہے کہ اختلاط کافرہ کا (کافر عورت سے میل جول) لازم آتا ہے، اور یہ درست ہونا بھی جب ہے کہ عورت باعتبار عقائد کے یہودی یا عیسائی ہو، اور اگر صرف قوم کے اعتبار سے ہو جیسے آجکل بہت سے نام کے عیسائی ہیں اور عقیدہ میں دہرتیے، اس کا حکم کتابی کا سا نہیں، ایسی عورت سے نکاح اصلاً درست نہیں، اور اگر عورت غیر کتابیہ ہو تو بھی نکاح درست نہیں،

قسم ثانی :- جیسے عورت سنّیہ ہو، اور مرد مبتدع جیسے شیعی وغیرہ ہو، اس کا حکم یہ ہے کہ اگر اس کی بدعت حدِّ کفر تک پہنچ جاتے، مثلاً حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو تہمت لگانا یا وحی لانے میں جبرئیل علیہ السلام کو غلطی کی طرف منسوب کرنا ونحوہما (اور انہی جیسے دوسرے عقائد) یا اس زمانہ میں مرزا[۵۱] کی نبوت کا قائل ہونا، تو اس شخص کا حکم بھی مثل قسم بالا کے ہے، یعنی ایسے شخص سے سُنّیہ کا نکاح جائز نہیں، اور اگر اس کی بدعت حدِّ کفر تک نہیں پہنچی، تو وہ شخص مسلمان تو ہے، لیکن سنّیہ کا کفو نہیں، اس عورت کا نکاح اگر ایسے مرد سے کیا جاتے تو اس کا حکم بوجہ غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے کے ویسا ہی ہے جیسا اوپر غیر کفو نسبی کے بیان میں ذکر کیا گیا، اس عبارت میں کہ "اگر وہ لڑکی بالغ ہے تب گو بھائی کے الی قولہ اگر نکاح کرنے والا باپ یا دادا ہو تو نکاح منعقد ہو جاتا ہے"، فقط ،

بعض مبتدع فرقوں کے کفر میں اختلاف ہے

ایک صورت اس میں اور ہے وہ یہ کہ بعض مبتدع (بدعتی) فرقوں کے کفر میں علماء کا اختلاف ہے، جیسے شیعہ کے باب میں فتووں کا مختلف ہونا مشہور ہے، سو مکفرین (کافر قرار دینے والوں) کے نزدیک تو سنّیہ کا نکاح ایسے شخص سے باطل ہے، اور غیر مکفرین (کافر نہ کہنے والوں) کے نزدیک یہ نکاح غیر کفو میں ہے، اس لئے اس میں وہی تفصیل ہے جو ابھی غیر کفو کے ساتھ نکاح ہونے میں مذکور ہوئی، اور احقر کا معمول اس صورت مختلف فیہا (اختلاف والی) میں یہ فتویٰ دینے کا ہے کہ جب تک نکاح نہ ہوا ہو بطلانِ نکاح (نکاح باطل ہونے) کے قول پر عمل لازم ہے، کہ اس میں احتیاط ہے، کہ ایک خوش اعتقاد (اچھے عقیدہ والی) عورت ایک بد اعتقاد (غلط عقیدہ والے) مرد سے اور

---

[۵۱] مرزا غلام احمد قادیانی کو نبی یا مجدد ماننے والا دائرۂ اسلام سے خارج ہے، اس کا نکاح سُنّی مسلمان عورت سے نہیں ہو سکتا ۱۲ احقر قریشی غفرلہٗ

بداعتقاد بھی ایسا کہ جس کی بداعتقادی بعض کے نزدیک حدِ کفر تک پہنچتی ہے، اور جب نکاح ہو چکا تو صحتِ نکاح کے قول کو اخذ کرنا (نکاح کے صحیح ہونے کو لینا) لازم ہے کہ اسی میں احتیاط ہے کیونکہ اس صورت میں اگر بُطلان (باطل ہونے) کا قول لیا گیا، اور اس بناء پر دوسرے شخص سے نکاح کر دیا جائے تو احتمال (شبہ) ہے کہ واقع میں وہ پہلا نکاح صحیح ہو گیا ہو تو یہ دوسرا عقد ہمیشہ کے لئے زنا ہوا کرے گا، تو ایک متدینہ (پرہیزگار عورت) کا عمر بھر مبتلائے زنا ہونا لازم آئے گا، اور صحتِ نکاح کے قول پر اس احتمال کا اعتبار نہیں کیا گیا، کہ اَلْاِسْلَامُ یَعْلُوْ وَلَا یُعْلٰی (یعنی اسلام غالب آتا ہے مغلوب نہیں ہوتا)

قسمِ ثالث :- فاسق مرد عورت صالحہ کا کفو نہیں، جیسے عورت صالحہ ہوا ور بقول بعض فقہاء دخترِ شخصِ صالح (نیک آدمی کی بیٹی) بھی بحکم صالحہ ہے، اور مرد فاسق ہو اور بقول بعض فقہاء معلن (جس کا فسق علانیہ ظاہر ہو) ہونا بھی شرط ہے، تو یہ مرد اس عورت کا کفو نہیں ہے، اور غیر کفو کے ساتھ نکاح نہ ہونے کی تفصیل اوپر مذکور ہوئی ہے،

غرض یہ تین قسمیں ہیں غیر کفو کی، ان میں جو کوتاہیاں ہیں اُن کا مختصر بیان یہ ہے کہ :-

بلادِ یورپ کی لامذہب عورت سے نکاح صحیح نہیں، بعضے لوگ بلادِ یورپ سے ایسی عورت نکاح کر کے لاتے ہیں جو صرف قوم کے اعتبار سے عیسائی ہوتی ہے اور مذہب کے اعتبار سے محض لامذہب، سو سمجھ لینا چاہئے کہ ایسی عورت سے ہرگز نکاح صحیح نہیں ہوتا، بعضے گو لاتے ہیں عیسائی ہی عورت مگر اس سے اس قدر مغلوب ہو جاتے ہیں کہ رفتہ رفتہ اپنے مذہب سے محض اجنبی ہو جاتے ہیں، اور اس کا واجبُ التحرز (پرہیز کا ضروری) ہونا بھی ظاہر ہے،

خاندانی مصالح موہومہ سے بدعقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کرنا ظلمِ عظیم ہے، بعضے لوگ محض طمعِ مال یا جاہ میں یا براہ کم شفقتی بحالِ اولاد (اپنی اولاد کے حال پر کم شفقت کرنے) یا دیگر خاندانی مصالح موہومہ (خاندان کی خیالی مصلحتوں کے گمان) کے سبب اپنی لڑکیوں کا کسی بدعقیدہ یا بدعمل مرد سے نکاح کر دیتے ہیں، تو وہ بداعتقادی حدِ کفر تک پہنچی ہوتی ہے، تو عمر بھر کے لئے علاوہ ظاہری کلفت کے بحالت عدمِ توافق فی الدین (دینداری میں موافقت نہ ہونا) لازم ہے، یہ خرابی ہوتی ہے کہ ارتکابِ زنا لازم آتا ہے، پھر اگر اولاد ہوتی وہ بھی غیر حلالی اور اگر حدِ کفر تک بھی نہ پہنچے تب بھی ہر وقت کا سوہانِ روح (روحانی عذاب) نقدِ حال رہتا ہے،

نکاح سے قبل ناکح کے عقائد کی اچھی طرح تحقیق اور چھان بین کر لینا ضروری ہے

اس باب میں سخت احتیاط لازم ہے بخصوص اس کی تحقیق قبل نکاح نہایت ضروری ہے کہ ناکح کسی فرقۂ ضالہ (گمراہ فرقہ) کے عقائد کا معتقد تو نہیں، اور قدیم گمراہ فرقوں میں سے نہ ہونے پر بھی قناعت نہ کی جائے آجکل روزانہ نئے نئے فرقے نکل رہے ہیں، اور زمانہ آزادی کا ہے، اس لئے اس شخص کی ان نئے فرقوں میں سے نہ ہونے کی مستقل تحقیق ضروری ہے، اسی طرح اگر وہ انگریزی خواں ہے تو دیکھ لیا جائے کہ جدید تعلیم کے اثر سے اس کی آزادی استخفافِ دین (دین کو ہلکا سمجھنے) یا انکارِ ضروریاتِ دین تک تو نہیں پہونچ گئی، ورنہ اگر ایک کلمہ بھی کفر کا مُنہ سے نکل گیا، تو بدون تجدیدِ اسلام و تجدیدِ نکاح (نئے سرے سے اسلام لانے اور نکاح پڑھائے بغیر) حرام کا ارتکاب ظاہر ہے، جس کو نہ غیرتِ انسانی قبول کرتی ہے نہ حمیتِ اسلامی،

یہ بیان ہے کفاءتِ دینیہ کے بارے میں کوتاہیوں کا،

ایک اہم علمی فائدہ

اوپر ابھی کفاءت فی الدین کے شروع میں بیان ہوا ہے کہ عورت کا مرد سے (مرتبہ و نسب میں) کم ہونا مضر نہیں، یعنی نکاح ہوجائے گا، اور مرد کا عورت سے (مرتبہ و نسب میں) کم ہونا مضر ہے، یعنی بعض صورتوں میں نکاح نہ ہوگا، سو آجکل چونکہ قرآن مجید کا ترجمہ بعضے عوام بھی (جو کہ اس کے سمجھنے کے اہل نہیں) دیکھتے ہیں ایسے لوگوں کو آیت سے احکام مذکورہ میں شبہ واقع ہونے کا احتمال تھا، اس لئے اس کو رفع کرنا مناسب معلوم ہوا، وہ آیت یہ ہے:

اَلزَّانِیْ لَایَنْکِحُ اِلَّا زَانِیَۃً اَوْ مُشْرِکَۃً وَّالزَّانِیَۃُ لَایَنْکِحُھَا اِلَّا زَانٍ اَوْ مُشْرِکٌ ، وَحُرِّمَ ذٰلِکَ عَلَی الْمُؤْمِنِیْنَ o

اس کے ظاہر ترجمہ سے شبہ ہوتا ہے کہ زانیہ اور زانی سے علی الاطلاق (مطلقاً) نکاح جائز نہیں، اور اس عدمِ جواز (جائز نہ ہونے میں) زانیہ و زانی کا مشرکہ اور مشرک کے ساتھ جمع ہونا قرینہ (دلیل) ہے کہ یہ عدمِ جواز بمعنی بطلان و عدمِ صحت (باطل ہونے اور درست نہ ہونے کے معنی میں) ہے، اور یہ تحقیق بالا کے خلاف ہے، اور جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں تحریم عام ہے بطلان

اور معصیت کو، پس مشرک و مشرکہ سے نکاح تو باطل ہے، اور زانیہ و زانی سے نکاح گو منعقد ہوجاتا ہے مرد عفیف (پاکباز مرد) کا زن غیر عفیفہ (بدکار عورت) سے علی الاطلاق (مطلقاً) اور زن عفیفہ (پاکباز عورت) کا مرد غیر عفیف (بدکار مرد) سے علی التفصیل (کچھ شرائط کی تفصیل کے ساتھ) لیکن جبکہ مقصود محض آب ریزی (شہوت رانی) ہو، اور تحصین (عزت کی حفاظت) مقصود نہ ہو حتیٰ کہ اگر دوسری جانب سے بدون نکاح ہی کے یا باوجود قیام مانع یعنی شرک کے رضامندی ہوجاتی تو نکاح بھی نہ کیا جاتا، اور اب نکاح کے بعد اس کے ارتکاب زنا کی پرواہ نہ ہو، اور یہی مراد ہے آیت میں تو اس مقصود کے لئے نکاح کرنا بناء بر قاعدہ "العزم علی الحرام حرامٌ والرضاء بالحرام حرام ومعصیة (جیسے امر حرام کا ارتکاب حرام ہے، اسی طرح کسی حرام کے ارتکاب پر رضامندی بھی حرام اور گناہ ہے)، اب دونوں شبہے زائل ہوگئے، اور اگر بسط (تفصیل) کا شوق ہو میری تفسیر (بیان القرآن) دیکھ لیجئے :

کفاءت سے متعلق ایک عمدہ بحث

اختلاف جنس ہونے کی صورت میں نکاح صحیح نہ ہوگا

جب باوجود اتحاد فی النوع (نسلی اتحاد) کے محض اختلاف اصناف یا اوصاف (قسموں یا صفتوں کے اختلاف) سے بعض صورتوں میں کفاءت ایسی فوت ہوجاتی ہے جس سے نکاح صحیح نہیں ہوتا، تو اختلافِ نوع کی حالت میں جس کو فقہاء اختلافِ جنس کہتے ہیں کفاءت کیوں نہ مفقود ہوجائے گی، اور نکاح کیسے جائز ہوگا، کیونکہ جو عدمِ کفاءت فی الوصف (صفت میں ہم مثل نہ ہونا) مانع صحتِ نکاح سے ہے، یہ عدمِ کفاءت فی الجنس (نسل میں ہم مثل نہ ہونا) اس سے بدرجہا اقویٰ ہے مصداق ممکن الوقوع اس قاعدہ کا نکاح ہے در میان جنّ مرد اور انسان عورت کے یا درمیان انسان مرد اور جنّ عورت کے، جس کو ہمارے فقہاء نے اسی اختلافِ جنس کی بناء پر ناجائز قرار دیا ہے چنانچہ درمختار میں ہے :۔

مخرج الذکر والخنثیٰ المشکل والوثنیة الجواز ذکورته والمحارم والجنیة وانسان الماء لاختلاف الجنس واجاز الحسن بشهود قنیة

"اس سے مذکر نکل گیا اور خنثیٰ مشکل نکل گیا، ممکن ہو وہ مذکر ہو، اس طرح جنّیہ نکل گئی، اور دریائی انسان مختلف جنس ہونے کی وجہ سے نکل گیا، (یعنی ان سے نکاح جائز نہ ہوگا) اور

امام حسنؒ نے گواہوں کی موجودگی میں جنّیہ کا نکاح جائز قرار دیا ہے، جسے قنیہ سے درمختار نے نقل کیا ہے، ردالمحتار میں ہے:

لان قوله تعالى والله جعل من انفسكم ازواجا بين المراد من قوله فانكحوا ما طاب لكم من النساء وهو الانثى من بنات آدم فلا يثبت حل غيرها بلا دليل،

(فرمانِ الٰہی "اللہ نے تم ہی میں سے تمہاری بیویاں بنائیں" کی اصل مراد کو اللہ کے اس قول نے اس طرح واضح فرمایا کہ "نکاح کرو اپنی پسندیدہ عورتوں سے" اور وہ اولادِ آدم میں صرف عورتیں ہیں، اس کے علاوہ غیر دلیل شرعی کے کسی دوسری قسم سے نکاح کا حلال ہونا ثابت نہیں ہوتا)

یہ تو دلیل نقلی سے استدلال کیا تھا، اور اس کے بعد ایک لطیف دلیل عقلی سے استدلال کیا ہے

ولان الجن يتشكلون بصور شتى فقد يكون ذكر التشكل بشكل انثى (ص۲۲۴/۲) وفيه بعد اسطر في الاشباه عن السراجية لا تجوز المناكحة بين بني آدم والجن وانسان الماء لاختلاف الجنس اھ، و مفاد المفاعلة ان لا يجوز للجني ان يتزوج انسية ايضا وهو مفاد التعليل،

"اس لئے کہ جن مختلف شکلوں میں متشکل ہوتے ہیں تو کبھی ایسا ہوتا ہے کہ مذکر جن مونث کی شکل میں متشکل ہوجاتا ہے، اس کے کچھ سطروں بعد اشباہ النظائر میں سراجیہ سے نقل کیا ہے کہ آدم علیہ السلام کی اولاد، جنات اور دریائی انسان کا آپس میں نکاح جائز نہیں، جنس کے اختلاف کی وجہ سے، اور (المناکحۃ میں) باب مفاعلہ ذکر کرنے کا فائدہ یہ ہے کہ جنّ کا نکاح بھی انسان عورت سے جائز نہیں، اور علت بیان کرنے کا یہی فائدہ ہے"

پھر چند سطر کے بعد حسنؒ کے قول مذکور کے مقابل نقل کیا ہے:-

عن شرح الملتقى عن زواهر الجواهر الاصح انه لا يصح نكاح آدمي جنية كعكسه لاختلاف الجنس فكانوا كبقية الحيوانات،

"شرح الملتقی نے زواہر الجواہر سے نقل کیا ہے کہ صحیح قول یہی ہے کہ انسان مرد کا نکاح جن عورت کے ساتھ صحیح ہی نہیں، جیسا کہ اس کے برعکس ہے، (یعنی جنّ مرد کا نکاح انسان عورت سے درست نہیں) اختلافِ جنس کی بناء پر، جنوں کا حکم وہی ہے جو دیگر حیوانات کا ہے"

جنّ عورت کا انسان مرد سے اور جنّ مرد کا انسان عورت سے نکاح صحیح نہیں،

اور ہر چند یہ صورت نادر الوقوع (کبھی کبھار واقع ہونے والی) ہے لیکن ممتنع الوقوع (واقع ہونے میں ناممکن) نہیں ہے، اور حکم اس کا عوام میں مشہور و معلوم کم ہے، تو امکانِ وقوع.... (واقع ہونے کا).... احتمال تھا، کہ شاید کسی کا اتفاق پڑتا، اور وہ حکم معلوم نہ ہونے سے اس میں مبتلا ہوجاتا جیسا کہ چند سال ہوئے ایک طالب علم جس کو احقر نے بھی دیکھا تھا ایک مدرسے سے غائب ہوگیا کئی روز

کے بعد سہارنپور کے جنگل میں پایا گیا، اس نے اپنا سارا قصّہ بیان کیا، کہ مجھ کو کچھ لوگ ہوا میں اٹھا کر لے گئے اور کسی اجنبی جگہ پہنچا دیا، وہاں ایک نفیس شاہانہ مکان میں ایک لطیف الوضع (بہترین) مجمع تھا، اور ایک جوان لڑکی بھی موجود تھی، جس نے اپنا تعشّق (عشق ہونا) اس سے ظاہر کر کے نکاح کی درخواست کی، اس نے مسئلہ کی بنا پر تو نہیں، کیونکہ اس کو معلوم ہی نہ تھا، بلکہ محض توحش (گھبراہٹ) کے سبب رونا شروع کر دیا، آخر وہ لوگ اس کو پھر ہوا میں اُڑا کر سہارنپور کے جنگل میں چھوڑ گئے، تو بہت ممکن تھا کہ اگر اس کو یہ توحش نہ ہوتا تو مسئلہ معلوم نہ ہونے کے سبب نکاح پر راضی ہو کر قبول کر لیتا خصوص جس شخص کے کان میں ایسے قصّے پڑے ہوں کہ حضرت بلقیس کے باپ آدمی اور ماں جنیہ تھیں، یا جیسا جہلا نے مشہور کیا ہے کہ حضرت محمد بن علی کی والدہ خولہ حنفیہ جنّیہ تھیں، تو ایسے قصے سُن کر کچھ عجب نہیں کہ کوئی شخص ایسے موقع پر ایسے نکاح کو جائز ہی سمجھ جائے، اس لئے اس پر تنبیہ کر دی گئی،

جنّیہ سے صحتِ نکاح کے سلسلہ میں بلقیس کے قصّہ سے استدلال صحیح نہیں،

رہا استدلال (دلیل لانا) مذکورہ قصّوں سے، سو گو پہلے قصہ میں احتمالِ صحت کا بھی ہے، لیکن اوّل تو ان لوگوں کا کسی شرع کا تابع ہونا ثابت نہیں بلکہ بلقیس کے اوّلاً شمس پرست (پہلے سورج کی پوجا کرنیوالوں میں سے) ہونے سے شبہ ہوتا ہے کہ شاید یہ طریقہ ان کا آبائی ہو، پھر اس سے قطع نظر یہ ضرور نہیں کہ سب شریعتوں کے احکام فرعیہ (فروعی احکام) یکساں ہوں تو ان کا فعل ہمارے لئے حجت نہیں ہو سکتا،

بنی حنفیہ کی بنو جنیہ کی طرف نسبت من گھڑت ہے

اور دوسرا قصّہ تو بالکل ہی غلط ہے، وہ تو قبیلۂ بنی حنفیہ سے ہیں، جو یمامہ میں سکونت رکھتا تھا، میں نے اپنے استاد[1] علیہ الرحمہ سے سُنا ہے کہ فرماتے تھے کہ یہ خاندان کرم اور شجاعت میں ممتاز ہونے کے سبب موافق محاورۂ عرب کے بنو جنّیہ کہلاتا ہوگا، عوام نے اس کا حقیقی ترجمہ کر کے ان کی طرف منسوب کر دیا،

احقر کہتا ہے کہ جس طرح ایک شاعر نے کسی قبیلہ کی مدح کی ہے ؎

بنو جنیّة ولدت سیوفاً

(ایک جنیہ عورت کی اولاد ہیں جنہوں نے تلواریں جنی ہیں)

---

[1] یعنی حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتویؒ، پہلے صدر مدرس دار العلوم دیوبند، تفصیل کے لئے ملاحظہ ہو جواہرات یعقوبی حصہ اوّل صفحہ ۷، مطبوعہ ادارۂ تالیفات اشرفیہ ہارون آباد، ضلع بہاولنگر،

باقی رہا حسنؒ کا اختلاف، سو دلیل صحیح کے مقابلہ میں وہ غیر معتبر ہے، باقی اُن پر اگر مخالفت نص کا شبہ ہو تو اس کو اس طرح دفع کیا جائے کہ شاید منشا اُن کے قول کا یہ ہو کہ قرآن مجید کا خطاب ظاہر ہے کہ انسان وجن دونوں کو عام ہے، پس قولہ تعالیٰ

مِنْ اَنْفُسِكُمْ اَزْوَاجًا، (النحل: ۷۲)	"اور اللہ تعالیٰ نے تمہیں میں سے تمھارے لئے بیبیاں بنائی ہیں"

دونوں قسم کی عورتوں کو شامل ہوگا، پس دونوں کا ایک حکم ہوگا، رہا پھر جمہور کا مسلک اس کا کیا جواب دیں گے؟ سو جواب یہ معلوم ہوتا ہے کہ یہاں جمع مقابل ہے جمع کے، پس آحاد (اکائیاں) منقسم ہوں گی آحاد (اکائیوں) پر، گو یہ آحاد جزئیات حقیقیہ (اکائیاں حقیقی جزئیات میں) نہ ہوں جزئیات اضافیہ (اضافی جزئیات) ہوں یعنی رجال الانس (انسانی مردوں) کے لئے نساء الانس (انسانی عورتیں) اور رجال الجن (جن مردوں) کے لئے نساء الجن (جن عورتیں)۔

بہرحال ظاہر اور منصور (مدلّل ومحقق) قول جمہور ہی کا ہے، لیکن حسنؒ کے قول کو قطعاً بالکل نص کے خلاف نہ کہا جائے گا، اور چونکہ مسئلہ ظنیہ ہے، اس لئے غیر قطعی ہونا جمہور کو بھی مضر نہ ہوگا اور عجب نہیں کہ جس طرح قول حسنؒ کا یہ منشا نقلی ہو جو ابھی مذکور ہوا، اسی طرح ایک دوسرا منشا عقلی ہو، مگر اس منشا کی بنا پر یہ حکم جواز مخصوص ہوگا، اس صورت کے ساتھ جبکہ وہ جن بشکل انسان ہو، سو کچھ بعید نہیں کہ حسنؒ کے نزدیک یہ قید بھی ملحوظ ہو گو اُن کے قول کے ساتھ یہ قید منقول نہیں ہوئی، لیکن بہت اقوال ناتمام بھی منقول ہو جاتے ہیں، اور وہ منشا یہ ہو کہ

آدمی کی شکل میں جن صحبت کرے تو غسل واجب ہے	ہمارے فقہاء میں سے بعض اس طرف گئے ہیں گو بحثاً سہی روایۃً نہ سہی کہ اگر آدمی کی شکل میں ہو کر جن کسی آدمیہ (انسان عورت) سے یا

آدمی کسی جنّیہ (جن عورت) سے جو کہ آدمیہ (انسانی عورت) کی شکل میں ہو صحبت کرے اور انزال نہ ہو تب بھی غسل واجب ہوگا، چنانچہ درمختار کے اس قول:۔

ایلاج حشفۃ آدمی احتراز عن الجن واذلم یظھر لھافی صورۃ الآدمی کمافی البحر،	"درمختار میں ہے کہ آدمی کا حشفہ داخل کرنا یہ جن سے احتراز ہے جب تک انزال نہ ہو اور جب تک جن انسان عورت کے لئے آدمی کی صورت میں ظاہر نہ ہو، جیسا کہ بحرالرائق میں ہے،"

کے تحت ردّالمحتار میں ہے:۔

هو بحث لصاحب البحر وسبقه اليه صاحب الحلية لكنه تردد فيه فقال اما اذا ظهر فى صورة آدمى وكذا اذا ظهر للرجل جنية فى صورة آدمية فوطئها وجب الغسل لوجود المجانسة الصورية المفيدة لكمال السببية، اللهم الا ان يقال هذا انما يتم لو لم توجد بينهما مباينة معنوية فى الحقيقة ومن ثم علل به بعضهم حرمة التناكح بينهما فينبغى ان لا يجب الغسل الا بالانزال كما فى البهيمة والميتة نعم لو لم يعلم ما فى نفس الامر الا بعد الوطء وجب الغسل فيما يظهر لانتفاء ما يفيد قصور السببية ج ۱ ص ۱۶۸۔

(یہ بحث بحر الرائق والے کی ہے، اور اسی کو اسی طرح صاحب الحلیہ نے بھی لیا تھا، مگر ان کو اس میں تردد ہو گیا ہے، اور اس میں تفصیل کرتے ہوئے یوں کہا ہے کہ جیسے جن آدمی کی شکل میں ظاہر ہو اسی طرح انسانی مرد کے لئے کوئی جنیہ (جن عورت) انسانی عورت کی شکل میں ظاہر ہو، اس (انسانی مرد) نے اس جنیہ کے ساتھ وطی (ہمبستری) کی تو غسل واجب ہو جائے گا شکلوں کی مجانست کے سبب جو کمالِ سببیت کا فائدہ دینے والی ہے، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ یہ تو تب ہوگا جبکہ ان دونوں کے درمیان حقیقت میں معنوی تضاد نہ پایا جائے، اور اسی وجہ سے اُن دونوں کے درمیان بعض فقہاء نے نکاح کے حرام ہونے کے لئے معنوی تضاد کو علت ٹھیرایا ہے، چاہئے تو یہ کہ انزال کے بغیر غسل واجب نہ ہو جیسا کہ جانور اور مُردار کے بارے میں حکم ہے، ہاں اگر اس کی حقیقت واقعی سے لاعلم ہے تو پھر وطی کے بعد غسل واجب ہو جائے گا، جیسا کہ سببِ غسل میں کوتاہی کی مفید چیز کے معدوم ہونے سے معلوم ہو رہا ہے")۔

اس فرع (وجوبِ غسل میں صرف مجانستِ صوریہ (شکل کی مشابہت) کا اعتبار کیا گیا ہے تو گنجائش ہے کہ جس طرح احکام وطی میں مجانستِ صوریہ (شکل کی مشابہت) کو معتبر قرار دیا گیا اسی طرح احکام سببِ وطی یعنی نکاح میں بھی اسی مجانستِ صوریہ کو کافی قرار دیا جائے،

جنسِ مخالف سے نکاح جائز ہونے کی ایک صورت

رہا مرد کا تشکّل (شکل اختیار کرنا) بصورتِ زن (عورت) یا بالعکس جو کہ قولِ حسنؒ پر وارد کیا گیا ہے تو اس کے حدوث مکاح (نکاح ہونے) سے مانع ہونے کا تو التزام کر لیا جائے، جس طرح ردّ المحتار کی عبارتِ قریبہ کے اخیر یعنی لو لم یعلم

ما فی نفس الامر الخ میں اس کو مؤثر سمجھا گیا ہے، لیکن بقاءِ نکاح میں اس کو مانع (روکنے والا) نہ سمجھا جا
جس کا راز یہ ہے کہ قوالب مختلفہ (مختلف شکلیں) جن کے لئے ایسی ہیں جیسے البسۂ مختلفہ (مختلف لباس)
انسان کے لئے، پس اگر منکوحہ مرد کا لباس پہن لے یا سحر (جادو) سے مرد کی شکل بن جائے، پھر خواہ
وہ شکل واقع میں ہو جائے یا محض متخیل (خیالی) ہو جائے، کیونکہ سحر میں دونوں قسمیں پائی جاتی ہیں تو
نکاح باقی رہتا ہے، اسی طرح مانحن فیہ (ہمارے زیرِ بحث مسئلہ) میں کہا جائے، رہا اس کا مقتضا کہ
حدوثِ نکاح میں بھی مانع نہ ہو تو جواب اس کا یہ ہے کہ اس وقت ہمارے پاس کوئی دلیل نہیں ہے
کہ یہ متشکل بشکلِ مرد (آدمی کی شکل اختیار کرنے والا) واقع میں جنّیہ انثیٰ (جن عورت) ہے، تو نکاح
کا محل (موقع) ہونا ہی مشکوک ہے، اور پہلے سے نکاح منعدم (غیر موجود) ہے، فلا ینعقد بالشک،
(پس شک کی وجہ سے نکاح منعقد ہی نہیں ہوگا) اور ایک بار جب حدوث ہو چکا تو تبدل بشکل
(شکل تبدیل کرنے) سے تیقنِ انعقاد (منعقد ہونے کے یقین) کے بعد زوال (زائل ہونا) مشکوک
ہو گیا، فلا یزول بالشک (پس شک سے زائل نہیں ہوتا)

جنسِ مخالف سے نکاح کے مسئلہ میں احتیاط کی راہ اور ایک شبہ کا ازالہ

اور احقر کا وجدان ان احکامِ مذکورہ کے منشا کے باب میں یہ ہے کہ
یہ کہا جائے کہ ان تمام احکام میں دلائل متعارض (ایک دوسرے سے
ٹکرانے والے.....) ہیں، کما ظہر من تقریرنا فی کل مسئلۃ (جیسا کہ ہر مسئلہ
میں ہماری تقریر سے ظاہر ہے) پس ہر مسئلہ میں احتیاط پر عمل کرنا چاہئے، چنانچہ غسل کے باب میں
احتیاط وجوب میں ہے، اور نکاح کے باب میں احتیاط عدمِ جواز (جائز نہ ہونے) میں ہی، ولعل
ہذا اقرب واصوب انشاء اللہ تعالیٰ،

اور اس قولِ جمہور یعنی مانعیت اختلاف الجنس عن التناکح (نکاح میں اختلافِ جنس کے مانع
ہونے) پر جنت میں حوروں سے نکاح ہونے پر شبہ نہ کیا جائے کہ وہ بھی جنس میں متخالف (انسانو
سے مختلف) ہیں، تو ان سے نکاح اور استمتاع (ہمبستر... ہونا) کیسے حلال ہوگا جس کی خبر قرآن مجید میں
فرمائی گئی ہے،

وَزَوَّجْنَاهُمْ بِحُورٍ عِينٍ ط الطور' آیت ۲۰)	"اور ہم ان کا گوری گوری بڑی بڑی آنکھوں والیوں (یعنی حوروں) سے بیاہ کر دیں گے"!

دنیا اور آخرت کے احکام متماثل نہیں،

جواب شبہ کا ظاہر ہے کہ دنیا و آخرت کے احکام کا متماثل (یکساں)
ہونا ضروری نہیں، یہاں مردوں کے لئے حریر ناجائز ہے، اور جنت

میں جائز ہوگا، اور راز اس میں یہ ہے کہ احکام دنیویہ کی جو علت (بنیاد) ہے وہ وہاں مرتفع (ختم) ہوجائے گی، چنانچہ حریر وحلیہ (ریشم وزیور) کی نہی کی علتِ تفاخر (فخر کرنا) ہے، سو جنت میں اس رذیلہ کا مادہ ہی منقطع (ختم) ہوجائے گا، اسی طرح ممکن ہو کہ یہاں اختلاف کا مانع عن النکاح ہونا معلل (نتیجہ) ہو علت عدمِ توافق وعدمِ تناسب (مزاج اور مناسبت میں یکساں نہ ہونے) سے جس کے سبب مصالحِ زوجیت فوت ہوجائیں گے، اور یہ علت جنت میں اس لئے مرتفع ہوجائیگی کہ وہاں خود انسان میں خواصِ بشریّہ کی جگہ خواصِ ملکیّہ (فرشتوں کے خواص) پیدا ہوجائیں گے، پس خواص میں یہ اور حوریں متکافی (باہم برابر) ہوں گے، اس لئے عدمِ توافق کا احتمال (موافقت نہونیکا شک) نہ رہے گا، البتہ جو امور قبیح لعینہٖ (اپنی اصل کے اعتبار سے بُرے ہیں) وہ جنت میں بھی نہ ہوں گے، کیونکہ ان کا قبح (بُرائی) ذاتی ہے، ان سے کسی موطن وجود (عالم وجود) میں منفک (علیحدہ) نہ ہوگا مثلاً مَردوں کو جس غرض سے انعام میں حوریں ملیں گی اسی غرض سے عورتوں کو غلمان (لڑکے) دیئے جاتے، تو یہ انعام کے درجہ میں قبیح لعینہٖ (اپنی اصل کے اعتبار سے بُرا کام) ہے، کیونکہ انعام میں اکرام ہوتا ہے، اور فراش بننا اپنے مفضول (کمتر) کا اہانت ہی، اور مؤمنین ومؤمنات اہلِ جنت حور وغلمان سے درجہ میں مطلقاً افضل ہیں، اسی راز کے سبب زوج کا کفارت میں کم ہونا شرعاً معتبر ہو اور عورت کا کم ہونا معتبر نہیں، اس لئے اکرام کے موقع میں اہانت قبیح لعینہٖ (توہین اپنی اصل کے اعتبار سے بُرائی) ہے، اور انسیہ (انسانی عورت) کا انسان کے لئے فراش بننا اہانت نہیں، کیونکہ وہ من کل الوجوہ مفضول (ہر اعتبار سے کمتر) نہیں،

جنت میں لواطت نہ ہوگی | اسی تقریر سے جنت میں لواطت کا نہ پایا جانا بھی محقق ہوگیا، اور بعض معتزلہ کا خلاف کرنا قابلِ التفات نہیں،

کما نقلہ فی ردالمحتار عن ابی علی بن الولید المعتزلی ونقل ایضا الردّ علیہ عن ابی یوسف القزوینی بقولہ المیل الی الذکور عاھة وھو قبیح فی نفسہ لانہ محل لم یخلق للواطة ولھذا لم یجز فی شریعة بخلاف الخمر منہ ۲۴

جیسا کہ ردالمحتار میں ابوعلی ابن الولید معتزلی سے نقل کیا ہو، اور امام ابویوسف قزوینیؒ سے اس کا رد بھی ان الفاظ میں نقل کیا ہو کہ مَردوں کی طرف میلان ایک آفت ہو، اور وہ فی نفسہٖ ایک بُرا کام ہے، کیونکہ لواطت کے لئے یہ محل پیدا نہیں کیا گیا، اسی وجہ سے شراب کے برعکس اس کو کسی

وفی الدر المختار عن البحر حرمتھا اشد من الزنا لحرمتھا عقلاً وشرعاً وطبعاً والزنا لیس بحرام طبعاً وتزول حرمتہ بتزوج وشراء بخلافھا،

شریعت میں بھی مباح قرار نہیں دیا گیا، (ص۲۴۰ ج۳) اور در مختار میں بحر الرائق سے منقول ہے کہ لواطت کی حرمت زنا سے زیادہ سخت ہے، کیونکہ لواطت طبعاً، شرعاً اور عقلاً حرام ہے، اور زنا طبعاً حرام نہیں، اور اس (زنا) کی حرمت نکاح کے ذریعہ یا باندی خریدنے سے زائل ہو جاتی ہے، بخلاف لواطت کے کہ اس کی حرمت کسی حال میں زائل نہیں ہو سکتی"۔

اور اس عبارت سے جنت میں انتفاء لواطت (لواطت کے نہ ہونے) کا ایک اور طریق سے بدلالۃ النص بھی ثابت ہوا، یعنی وہ زنا سے اشد ہے، اور جنت میں زنا نہ ہونا یقینی ہے، تو جو حرمت و قبح میں اس سے اشد ہے وہ بدرجۂ اولیٰ منتفی (ناپید) ہوگا،

یہ ایک تفریع تھی اس قاعدہ پر جس سے جنت میں مرد کو حوریں دیئے جانے کا عورت کو غلمان دیئے جانے کے لئے مستلزم نہ ہونا ثابت ہے، اور اصل مقصود جنیہ سے نکاح کے عدمِ جواز سے حوروں سے نکاح ہونے پر شبہ کا دفع کرنا ہے، یہ ہے تحقیق قولِ جمہور کی متعلق مسئلہ عدمِ جوازِ نکاحِ جنیہ کے (جن عورت سے نکاح کے ناجائز ہونے کی)۔

قرآن پاک کو ماننے والا اللہ کی مخلوق جنّ کا انکار نہیں کر سکتا،

اور ہماری یہ تمام بحث شاید ان صاحبوں کو فضول معلوم ہو جو تعلیم جدید کے غلبہ سے خود جنّ کے وجود ہی سے منکر ہیں، لیکن جو شخص قرآن مجید کی تصدیق کرے گا، اور رواتِ ثقات کثیر العدد (بے شمار انتہائی معتبر روایت کرنے والوں) کی بھی تکذیب نہ کرے گا، اس کو وجودِ جنّ کے قائل ہونے سے چارہ نہیں، پس اس حالت میں اس بحث کو فضول کہنا بناء الفاسد علی الفاسد (ایک غلط کی بنیاد دوسرے غلط پر رکھنا) ہے، ہمارے فقہاء نے بھی اس کو محسوس کر کے اس سے قصداً بھی تعرض فرمایا ہے:

کما فی ردّ المحتار وما قیل من ان من سأل عن جواز التزوج لھا لصفح بجھل وحماقۃ لعدم تصور ذلک بعید ألان التصور ممکن لانّ تشکلھم ثابت بالاحادیث.

(جیسا کہ ردّ المحتار میں ہے اور جو یہ منقول ہے کہ بعض لوگوں کا اس (جنیہ کے) نکاح کے جواز کا سوال کرنا اپنی جہالت و کم فہمی کے باعث اس لئے ہے کہ اُن کے نزدیک کوئی شکل اختیار کر لینا ممکن نہیں بعید ہے، اس لئے کہ ان کا متشکل ہونا ممکن

والآثار والحکایات الکثیرۃ ولذا ثبت النھی من قتل بعض الحیات کما مرّ فی مکروھات الصلوٰۃ ص۲۲۴ ج۲	.... ہے، کیونکہ حکایات صحابہؓ ...... اور احادیث سے جنات کا مختلف شکلیں اختیار

کرنا ثابت ہے، اسی وجہ سے بعض اقسام کے سانپوں کو مار ڈالنے کی ممانعت وارد ہوئی ہے، جیسا کہ باب مکروہات صلوٰۃ ج ۲ ص ۲۲۴ میں مذکور ہے ۔۔

ایک شبہ کا ازالہ

کیا تجانس امامت میں بھی شرط ہے؟

جس طرح تجانس باہم (ایک ہی جنس ہونا) نکاح میں شرط ہے شاید امامت میں بھی اس کو شرط قرار دیا جائے اور اس بنا پر جن کی امامت کو ناجائز سمجھا جائے، سو تحقیق یہ ہے کہ امامت میں اس کے شرط ہونے کی کوئی دلیل نہیں، بلکہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پیچھے جن کا اقتدا، (پیچھے نماز پڑھنا) اور اس پر آپؐ کی تقریر (یعنی اس پر آپؐ کا انکار نہ فرمانا اور باقی رہنے دینا) دلیل عدم اشتراط (شرط نہ ہونے) کی ہے، ورنہ عدم تجانس جانبین سے ہے، اور اس سے جواز اقتداء بالملائکہ (فرشتوں کے پیچھے نماز پڑھنے کے جائز ہونے) کا شبہ نہ کیا جائے، کہ جبرئیل علیہ السلام فرائض میں امام بنے تھے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے، کیونکہ یہ امامت بعد فرضیت (فرض ہونے) کے ہوئی ہے،

جواب یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام پر بوجہ مامور (حکم خداوندی کا پابند) ہونے کے خود ان دو یوم کی نماز فرض ہو گئی تھی تو وہ بھی مثل انس وجن (انسانوں اور جنوں کی طرح)، اس کے مکلّف (پابند) ہو گئے تھے، اور اقتداء مفترض (فرض ادا کرنیوالے) مفترض کیساتھ ہوتی اور مطلقاً ملائکہ پر نمازیں فرض نہیں، اس لئے وہ متنفّل (نفل پڑھنے والے) ہوں گے جو مانع اقتداءِ مفترض (...فرض پڑھنے والے کی اقتداء کے لئے مانع) ہے،

مسئلہ زیرِ بحث میں ایک عجیب نکتہ

منکوحہ جنّیہ کی اولاد کو جن اور منکوحہ آدمیہ کی اولاد کو آدمی کہیں گے،

اس تحقیق کا حاصل تو یہ تھا کہ تناکح انسان اور جن میں جائز نہیں لیکن یہ امر قابلِ تحقیق باقی رہا کہ اگر کسی نے باوجود ناجائز سمجھنے کے یا بوجہ مسئلہ معلوم نہ ہونے کے ایسا کر لیا، اور اس نکاح سے اولاد پیدا ہو گئی، گو

ظاہراً بروئے طب مستبعد (طبی اعتبار سے ناممکن) ہے تو آیا بروئے قواعد شرعیہ (شرعی اصولوں کے مطابق) اس کو انسان کہا جائے گا یا جن، مثلاً خود ایسی اولاد کا نکاح آدمی و آدمیہ سے جائز ہوگا یا نہیں؟

سو حکم اس کا قواعد کی رُو سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ اولاد نسباً باپ کی طرف منسوب ہوتی ہے، لیکن اوصاف و اصناف (صفات اور نسل) میں تابع ماں کے ہوتی ہے، مثلاً اگر مرد آزاد ہو اور عورت مملوکہ (لونڈی ہو) اور ان میں نکاح ہو کر اولاد ہو تو وہ مملوک (غلام) ہوگی یا مثلاً نر ہرن اور مادہ بکری سے بچہ پیدا ہو تو وہ بکری سمجھی جائے گی، مثلاً قربانی اس کی صحیح ہوگی، وعلیٰ ہٰذا،

پس اس قاعدہ کا مقتضا یہ ہے کہ اگر منکوحہ جنیہ ہے تو اولاد کو جن کہیں گے، اور اس کا نکاح آدمی سے درست نہ ہوگا، اور اگر ناکح جن ہے اور منکوحہ آدمیہ تو اولاد کو آدمی کہہ کر اس کے احکام جاری ہوں گے، واللہ اعلم،

ایک علمی نکتہ

کسی پر ظلماً جن آنے کے وقت دوسری عورتوں کو پردہ کرنا چاہیئے

اگر کوئی جن ظلماً کسی عورت کے پاس آتا ہو اور وہ اُس کے دفع پر کسی تدبیر مثل تعویذ و عمل وغیرہ سے قادر نہ ہو تو وہ مجبور ہونے کے سبب معذور ہے، لیکن دوسری عورتوں کو جبکہ اس مظلومہ کے خبر دینے سے یہ اطلاع ہو کہ اس وقت وہ یہاں آیا ہوا ہے اس کے ساتھ مثل اجنبی مردوں کے معاملہ کرنا واجب ہوگا، یعنی اس کے سامنے بے پردہ ہونا درست نہ ہوگا، البتہ اگر مظلومہ کی اعانت یا دفعِ وحشت (مدد کرنے یا خوف دور کرنے) کی ضرورت سے وہاں رہنا ہو تو بجز وجہ و کفین و قدمین (سوائے چہرے، دونوں ہتھیلیوں اور دونوں پاؤں) کے باقی تمام بدن ڈھانکنا واجب ہوگا، یعنی سر و باز و گردن و ساق (پنڈلی) کا ظاہر کرنا درست نہ ہوگا ثقہ و صالحہ عورتیں بھی اس مسئلہ سے غافل ہیں،

واللہ اعلم والحمد للہ العلی الماجد علی تحقیق ھٰذہ اللطائف التی لعلک لاتجدھا فی موضع واحد،

(اور اللہ ہی سب سے زیادہ جاننے والا ہے، ان علمی نکات کی تحقیق پر جن کا ایک ہی جگہ اس طرح ملنا مشکل ہے اللہ بزرگ و برتر کے لئے ہی سب تعریفیں ہیں")

کتبہ اشرف علی (نور اللہ مرقدہٗ)

اصلاحِ انقلاب متعلّق مہر

اس باب میں بھی متعدد مختلف کوتاہیاں ہوتی ہیں، بعضہا اشد من بعض (جن میں سے بعض بعض سے زیادہ سخت ہیں)۔

مہر بنص شارع حق واجب اور لازم ہے، ایک کوتاہی جو بعض وجوہ سے سب سے زیادہ سخت ہے، یہ ہوتی ہے کہ اکثر لوگ مہر ادا کرنے کا ارادہ ہی دل میں نہیں رکھتے، پھر خواہ جانب ثانی (یعنی بیوی) بھی وصول کا ارادہ نہ کرے، اور خواہ کسی سبب عارض (پیش آنے والا واقعہ یعنی) طلاق یا موت سے وہ (بیوی) یا اس کے بعد اس کے ورثہ وصول کرنے کی کوشش کریں، لیکن ہر حال میں زوج (شوہر) کی نیت ادا کی نہ ہو، سو لوگوں کی نظر میں یہ نہایت سرسری امر (معمولی معاملہ) ہے حتی کہ اس کا سرسری ہونا ان کی تصریحات سے بھی معلوم ہو جاتا ہے، چنانچہ قلت و کثرتِ مہر (مہر کے کم زیادہ ہونے) کی گفتگو میں بے دھڑک (بلا جھجک) کہہ دیتے ہیں کہ میاں کون لیتا ہے، کون دیتا ہے، خیر یہ بھی ایک بات ہے تو یہ لوگ اپنے اس اعتقاد کا صریح اقرار کرتے ہیں کہ مہر محض نام ہی کرنے کو ہوتا ہے، دینے لینے کو اس سے کوئی تعلّق نہیں، سو اوّل تو فی نفسہٖ بھی یہ دعویٰ غلط اور باطل ہے، مہر بنصِ شارع حق واجب اور لازم ہے، اور مثل دیگر دیون مفترض الاداء (دوسرے ان قرضوں کی طرح ہے جن کی ادائیگی ہر حال میں ضروری ہوتی) ہے، جب تک کہ کوئی مُسقِط... (گرانے والا یعنی ختم کرنے والا) اس کا نہ پایا جائے، مثل ابراء (معافی) یا اس کے جُز یا کُل کا زوج کو میراث میں پہنچ جانا، یا طلاق قبل الدخول (ہمبستری سے پہلے طلاق) نصف مہر کے لئے وغیرہ ذلک من اسباب المذکورۃ فی کتب الفقہ (اور اسی طرح کے دوسرے اسباب جو کتبِ فقہ میں مذکور ہیں) بہر حال وہ فی نفسہٖ (اپنی ذات میں) واجب الاداء ہے، دوسرے موقع پر خود یہ مدعی (دعویٰ کرنے والے) ہی اپنے فعل سے اس قول کی تکذیب کرنے لگتے ہیں، یعنی جب اُن کی متعلّقہ کا جبکہ وہ معلّقہ یا مُطلّقہ (ویسے ہی ترکِ تعلق کر رکھا ہو یا طلاق یافتہ ...) ہو جائے کوئی معاملہ پیش آتا ہی

تو سب سے اوّل یہی مدعی اس مہر کے لزوم (ضروری ہونے) کے مدعی بن جاتے ہیں،

بہرحال اس کے سرسری ہونے کا دعویٰ تحقیقاً و الزاماً (تحقیق اور لازم ہونے کی رُو سے) ہر طرح غلط ہے، مگر پھر بھی بفحوائے یَقُوْلُوْنَ بِاَفْوَاهِهِمْ مَّا لَيْسَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ (اپنے منہ سے وہ کہتے ہیں جو ان کے دلوں میں نہیں) عام طور سے اُس کا سرسری ہونا زبان زد (مشہور) ہوگیا ہے،

دل میں مہر ادا نہ کرنے کی نیت ہو تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا

سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس کو سرسری سمجھنا اور ادا کی نیت نہ رکھنا اتنی بڑی سخت بات ہے کہ حدیث شریف میں اس پر بہت ہی بڑی وعید آئی ہے، چنانچہ کنز العمال بروایت ابو یعلی و طبرانی و رافعی و ابن النجار و ابن عساکر و بیہقی کے حضرت صہیبؓ سے بروایت ابن مندہ کے میمون بن جابان البصری عن ابیہ سے باختلاف بعض الفاظ یہ حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص کسی عورت سے نکاح کرے اور اس کا کچھ مہر ٹھہرائے پھر یہ نیت رکھے کہ اس کے مہر میں سے اس کو کچھ نہ دے گا، یا اس کو پورا نہ دے گا تو وہ شخص زانی ہو کر مرے گا اور اللہ تعالیٰ سے زانی ہو کر ملے گا، (جلد ۸ صفحہ ۲۴۸)

سو ملاحظہ کیجئے کہ کتنی بڑی سخت وعید[1] ہے کہ باوجود صورت نکاح پھر اس شخص کا شمار زانیوں میں ہوا تو کیا اب بھی یہ کوتاہی قابلِ تدارک (تلافی کے قابل) نہیں ہے، اور ہر چند کہ عمل میں اور وعید میں وجہ تعلق معلوم کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن تبرعاً (بطور بھلائی) ایک ظاہری وجہ بر منتبہ بھی کرتا ہوں، اس سے پہلے دو مقدمے جاننا چاہئے،

نکاح اور زنا میں فرق،

ایک یہ کہ بتصریح حدیث نکاح اور زنا میں مابہ الفرق (فرق کرنے والے) یہ امور ہیں، ولی بعض صورتوں میں اور دو گواہ اور مہر، جاء فی الروایات مصرحاً کما فی کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۵، ۲۴۶، ۲۴۷ و ۲۴۹ و ۲۹۶ و ۲۹۷ فی شهادة رجل وامرأة بطلها عمر،

کوئی عملِ شرعی بدون نیت عند اللہ معتبر نہیں،

دوسرا یہ کہ مہر مقرر کرنا ایک عمل ہے، اور جب نیت دینے کی نہ ہو تو یہ مقرر کرنا معتبر نہ ہوا، للمقدمة الثانیة (اس دوسرے مقدمہ کی رُو سے) پس گویا مہر مقرر ہی نہیں ہے، اور مہر مقرر نہ کرنا خاصہ زنا کا ہے، للمقدمة الاولی (مقدمہ اوّل کے اعتبار سے) پس اس حیثیتِ خاص سے یہ نکاح مشابہ زنا کے ہوا، اس لئے ناکح کو زانی فرمایا گیا، مراد

---

[1] گفتۂ او گفتۂ اللہ بود ٭ گرچہ از حلقوم عبد اللہ بود، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کی اس وعید کے مصداق بننے سے گریز کرنے کی پوری کوشش کرنا چاہئے ۱۲ احقر قریشی،

یہ کہ مشابہ زانی کے ہے، جس کی وجہ ابھی مذکور ہوئی، اور اس تقریر سے وجہِ وعید بھی معلوم ہوئی، اسی طرح اس حدیث کی شرح اور توجیہ بھی ہوگئی،

مہر ادا نہ کرنے کی نیت رکھنے والا خائن اور چور بھی ہے،

نیز اسی حدیث مذکور میں ایک جزء اور بھی ہے، وہ یہ کہ اگر کسی سے کچھ مال خریدے اور اس کی قیمت ادا کرنے کی نیت نہ رکھے، یا کسی کا کچھ دَین (ذمہ میں واجب) ہو اور وہ اس کے ادا کی نیت نہ رکھے، یا کسی سے کچھ قرض لیا ہو اور اس کو ادا نہ کرنا چاہتا ہو، تو وہ شخص موت کے وقت اور قیامت کے روز خائن (خیانت کرنے والا) اور چور ہوگا، اور ظاہر ہے مہر ایک دین (ذمہ میں واجب حق) ہے، جب اس کے ادا کی نیت نہ ہوئی تو حدیث کے اس دوسرے جزء کے اعتبار سے یہ شخص خائن اور چور بھی ہوا تو ایسے شخص پر دو جرم قائم ہوئے، زانی ہونے کا للجزء الاوّل (پہلے جزء کی رُو سے) اور خائن و سارق ہونے کا للجزء الثانی (دوسرے جزء کے اعتبار سے) اور اس عمل میں اور اس کی وعید میں وجہِ تعلق اوّل کی طرح مخفی (پوشیدہ) نہیں، بلکہ ظاہر ہے، کیونکہ کسی کے حق مالی کو ضائع کرنا ظاہر ہے کہ خیانت و سرقہ (چوری) ہے، جب ایک ہی وعید کے ترتب (مرتب ہونے) پر میں نے اوپر کہا ہے کہ کیا اب بھی یہ کوتاہی قابلِ تدارک نہیں؟ اب تو دو وعیدوں کا ترتب ثابت ہوگیا، اب زیادہ زور کے ساتھ کہا جائے گا کہ کیا اب بھی یہ کوتاہی قابلِ تدارک نہیں؟

اپنی وسعت سے زیادہ مہر مقرر نہیں کرنا چاہیے،

سو اس کا تدارک ظاہر ہے، کہ ادا کرنے کی مصمم نیت (پکی نیت) رکھی جائے مگر تجربہ اور وجدان شاہد ہے کہ بعادت اکثر (اکثر عادت کے مطابق) یہ مصمم نیت اسی عمل ہوسکتی ہے جس پر عادۃً قدرت ہو، ورنہ نیت کا محض تخیّل (خیال) ہوتا ہے تحقق (وقوع) نہیں ہوتا، اور ظاہر ہے کہ جس شخص کو سو روپیہ دینے کی قدرت نہ ہو وہ عادۃً لاکھ سوا لاکھ بلکہ دس ہزار پانچ ہزار دینے پر بھی قادر نہیں، جب قادر (ادائیگی کی طاقت رکھنے والا) نہیں تو بحکم مقدمۂ مذکورہ (مذکورہ مقدمہ کے مطابق) وہ اس کے ادا کی بھی نیت نہ رکھے گا، پس اگر اگر ایسے شخص کا اتنا مہر مقرر ہوا تو وہ ادا کی نیت نہ رکھنے کے سبب لامحالہ (ضرور) اس وعید کا محل (موقع) بنے گا، پس نیت ادا کے تحقق کی صورت میں بنا۔ بر تقریر مذکورہ بجز اس کے کچھ نہیں کہ وسعت سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، اور چونکہ وسعت اکثر لوگوں کو اکثر زمانوں قلیل (کم) ہے، اس لئے اسلم و احوط طریقہ (زیادہ سلامتی والا اور محتاط طریقہ) یہی ٹھہرا کہ مہر قلیل ہو،

احادیث میں مہر زیادہ مقرر کرنے کی کراہت اور کم مقرر کرنے کی ترغیب آئی ہے،

پس مہر کا کثیر تعداد میں مقرر کرنا ایک کوتاہی ہے، جس پر پہلی کوتاہی ملزوم عادی (عام طور پر پائی جانے والی)

مرتب ہوتی ہے، اسی واسطے حدیثوں میں مہر زیادہ ٹھہرانے کی کراہت (نا پسندیدگی) اور کم ٹھہرانے کی ترغیب (پسندیدگی کی طرف توجہ) آئی ہے، چنانچہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے خطبہ میں فرمایا کہ مہروں میں زیادتی مت کرو، کیونکہ اگر یہ دنیا میں عزت کی بات یا اللہ کے نزدیک تقوے کی بات ہوتی تو سب سے زیادہ اس کے مستحق جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے، مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی تو کسی بی بی کا اور اسی طرح کسی بیٹی کا مہر بارۂ اوقیہ سے زیادہ نہیں ہوا، (ایک اوقیہ چالیس درہم کا ہوتا ہے، اور ایک درہم تقریبًا چار آنہ چار پائی کا) اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا عورت کا مبارک ہونا یہ بھی ہے کہ اس کا مہر آسان ہو،

اخرجھما فی کنز العمال عن عب ط و والحمیدی ص وابن سعد وابی عبید فی الغریب ش حم والعدنی والدارمی دت وقال صحیح ن ع حب کر قط فی الافراد حل ق، ص ۲۹۷ والثانی عن حم ک ھق، ص ۲۳۹

اور ایک حدیث میں ہے کہ اچھا مہر وہ ہے جو آسان اور قلیل ہو، (کنز العمال، ص ۲۴۸) اور حدیث میں ہے کہ آسانی اختیار کرو مہر میں (کنز ۲۴۹) اور اگر حضرت عمرؓ کی روایت پر کسی کو عجوزہ (بڑھیا) کے معارضۂ مشہورہ (مشہور اعتراض) کے بعد حضرت عمرؓ کے رجوع کا شبہ ہو تو جواب اس کا یہ ہے کہ یہ رجوع اس کی ترجیح یا اس کی ضد سے کراہت نہیں ہے، بلکہ پہلے حضرت عمرؓ کی یہ رائے ہوگئی تھی کہ اس کو ایک قانون بنا دیں، کہ مقدار خاص سے زیادہ مقرر کرنا باطل قرار دیا جائے، اور اس کو واجب ہی نہ کہا جائے، سو اس سے آپ نے رجوع فرمالیا، یعنی ایسا قانون نہیں بنایا، اس توجیہ میں روایات مصرح ہیں، وہ روایات ان نمبروں کی کنز العمال میں مذکور ہیں ۵۱۰۶، ۵۱۰۷، ۵۱۰۸، ۵۱۰۹ وغیرہا، ص ۲۹۸ ج ۸)

اپنی ہمت سے زیادہ مہر قبول کرنا شرعًا منع ہے،

غرض دلائل صریحہ مرفوعہ وموقوفہ (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی احادیث اور صحابہ کے اقوال) سے نیز قواعدِ شرعیہ سے کہ تحمل مالا یطیق (اپنی طاقت سے بڑھ کر بوجھ اٹھانے) سے ممانعت آئی ہے، کما فی حدیث :-

رواہ الترمذی قال رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم لَا یَنْبَغِیْ لِلْمُؤْمِنِ اَنْ یُّذِلَّ نَفْسَہٗ قِیْلَ یَا رَسُوْلَ اللّٰہِ وَکَیْفَ یُذِلُّ	"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کسی مؤمن کے لئے مناسب نہیں کہ وہ اپنے آپ کو ذلیل کرے، عرض کیا گیا کہ اے اللہ کے رسولؐ وہ اپنے آپ کو کس طرح ذلیل

نَفْسَهُ قَالَ يَتَحَمَّلُ مِنَ الْبَلَاءِ مَالَا يُطِيقُهُ ،	کرتا ہو؟ ارشاد فرمایا ایسی مصیبت کو اٹھاتا ہے جس کے اٹھانے کی طاقت نہیں رکھتا۔

تحمل سے زیادہ مہر کے التزام (مقرر) نہ کرنے کا اور اس کی تقلیل (کم ہونے) کا مطلوب شرعی ہونا ثابت ہو گیا،

حضرت امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک مہر کی کم از کم مقدار دس درہم ہے

اب یہ کلام باقی رہا کہ اس تقلیل کی بھی کوئی حد ہے یا نہیں ؟ سو امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک تو اسکی کوئی حد مقرر نہیں قلیل سے قلیل مقدار بھی مہر بن سکتا ہے، بشرطیکہ مال متقوم (قیمت والا مال) ہو، خواہ ایک ہی پیسہ ہو، اور احادیث کثیرہ (بہت سی حدیثوں) کے ظاہر الفاظ اس کے موافق ہیں، مثلاً (یتزوج[1] بقلیل اوکثیر) اور (ولو بسوط[2])، اور (ولو بخاتم[3] من حدید) اور (ملأ کفیہ[4] براً او سویقاً او تمراً او دقیقاً) اور (او بدرہم[5]) اور (ما تراضی[6] بہ الاھلون ولو قبضۃ من اراک) اور (ملأ[7] یدیہ طعاماً) (کنز العمال ص ۲۴۸ و ۲۴۹) اور (تزوج[8] علی نعل ص ۲۹۹)، اور امام ابوحنیفہ رحمہ اللہ کے نزدیک اس قلیل کی حد دس درہم ہیں یعنی اس سے کم مہر جائز نہیں، حتیٰ کہ اگر تصریحاً بھی اس سے کم مقرر کیا جائے گا، تو بھی دس درہم واجب ہوں گے، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب میں یہ حدیثیں مع تضعیف (ضعف کے ساتھ) مشہور ہیں،

عن جابر لا صداق اقل من عشرۃ دراھم قسط ق وضعفاہ وعن علی قال ادنی ما یستحل بہ الفرج عشرۃ دراھم ق وضعفہ وعن علی قال لا صداق دون عشرۃ دراھم قط ق وضعفہ ،	"حضرت جابرؓ سے مروی ہو کہ وہ مہر نہیں جو دس درہم سے کم ہو، اور حضرت علیؓ سے مروی ہے کہ فرمایا کہ کم از کم جس سے فرج حلال ہو سکتی ہو دس درہم ہیں، اس روایت کو ضعیف قرار دیا گیا ہے، اور حضرت علیؓ سے ہی مروی ہے کہ دس سے کم مہر نہیں اسے بھی ضعیف قرار دیا گیا ہے"

---

[1] نکاح کرے کم یا زیادہ مہر کے ساتھ۔ [2] خواہ ایک کوڑا ہو، [3] خواہ لوہے کی انگشتری ہو، [4] خواہ دونوں ہتھیلیوں میں گندم یا ستو یا کھجور یا آٹا بھرا ہو، [5] یا ایک درہم ہو، [6] خواہ اس کے قبضہ میں پیلو کے درخت کا پھل ہو، [7] خواہ دونوں ہاتھ کھانے سے بھرے ہوں، [8] یا جوتا مہر مقرر کر کے شادی کی ۱۲

مگر صاحب فتح القدیر نے اس حدیث کا ایک طریق حسن نقل کیا ہے، اس کی عبارت ہے: ورواہ ابن ابی حاتم بسند حسن کما قالہ ابن حجر (ابن ابی حاتم نے سند حسن سے روایت کیا جیسا کہ ابن حجر کا قول ہے) اور مزید تحقیق اس کی احیاء السنن اور اس کی تعلیق میں ہے، باقی تمسکات شافعی (امام شافعی کے دلائل) کا یہ جواب دیا جا سکتا ہے کہ وہ سب مہر معجل (وہ مہر جو نکاح کے بعد مدت معین میں ادا کر دیا جائے) پر محمول ہیں، چنانچہ بعض روایات کے الفاظ اس کا قرینہ بھی ہیں:

فی کنز العمال عن ابی عباس قال اذا تزوج المرأۃ فان استطاع ان لا یدخل علیھا حتی یعطیھا شیئا فان لم یجد الا احدی نعلیہ فلیخلعھا فلیعطھا ایاھا، (ابن جریر، ص ۲۹۹)	(کنز العمال میں حضرت ابو العباس رضؓ سے مروی ہے کہ انھوں نے فرمایا جب کوئی مرد کسی عورت سے نکاح کرے، سو اگر وہ اس کی استطاعت رکھتا ہے کہ عورت کے پاس اس وقت تک داخل نہ ہو جب تک اسے کوئی چیز نہ دے، اور اس کے پاس دینے کے لئے سوائے ایک جوتے کے کچھ نہ ہو تو اس کو چاہئے کہ وہ جوتہ اُتار کر اس عورت کو دیدے)"

اور چونکہ متمسک امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا اپنے مدلول میں اصرح ہے، بہ نسبت متمسکات شافعیؒ کے، اس لئے صریح میں تاویل مناسب نہیں ہوئی، یہ کلام تو عالمانہ ہے،

موضع اختلاف میں احوط پر عمل زیادہ مناسب ہے

باقی عاملانہ تقریر یہ ہے کہ موضع اختلاف (اختلاف کی جگہ) میں احوط (زیادہ احتیاط) پر عمل مناسب ہے، تو دس دراہم سے کم کا جواز تو مختلف فیہ (جائز ہونا تو اختلافی مسئلہ) ہے، اور دس درہم کا جواز متفق علیہ (جائز ہونے پر سب کا اتفاق) اس لئے احوط یہی ہے، اور یہ احتیاط ایسی ہے جیسے نصاب سرقہ (چوری کے نصاب) میں ایک قول ربع دینار یعنی اڑھائی درہم [۱] ہے، اور ایک قول دس درہم، پس ربع دینار نصاب مختلف فیہ ہوا، اور دس درہم متفق علیہ، پس دس ہی درہم لینا احوط ہے، اور اس سے کم میں مختلف فیہ ہونے سے شبہ ہو گیا کہ موجب حد (حدِ شرعی واجب کرنے والا) ہے یا نہیں؟ اور شبہ دافع حدود ہوتا ہے، اس لئے اس میں قطع نہ کرنا (ہاتھ نہ کاٹنا) احوط ہوا پس مہر میں تو دس درہم کو اقل نصاب (کم از کم نصاب) ٹھہرانا احوط ہوا

---

[۱] موجودہ دور میں دس درہم کی قیمت کا اندازہ کرنے کے لئے ۲ تولہ ۸ ماشے ۵ رتی چاندی کی قیمت لگائی جائے، جو دس درہم کے برابر ہوگی، (بلکہ احتیاطاً اس میں ایک رتی ایک ماشہ شامل کی گئی ہے)، بندہ احقر قریشی غفرلہ

اور دس درہم نصابِ سرقہ ہونا یہ بھی وجداناً مؤید (عقلاً تائید کرنے والا) معلوم ہوتا ہے۔ قول امامؒ کا، کیونکہ اس سے ایک عضو یعنی ہاتھ کی قیمت کا کم از کم دس درہم ہونا معلوم ہوا، تو بضع زن (عورت کے عضوِ مخصوص) کی قیمت بھی اس سے کم نہ ہوگی، وتفطن لہ صاحب الھدایہ فی الھدایہ۔ بہرحال احتیاط بہت سے بہت اس سے کم نہ کرنے کو مقتضی ہوگی، لیکن یہاں تک تو کمی کرنے کا بالاتفاق اختیار ہے، پھر زیادتی پر کیا مجبوری ہے؟

مہر زیادہ مقرر کرنے کی دنیوی خرابیاں

اوپر تو بیان تھا کثرتِ مہر کی دینی خرابی کا کہ فی نفسہ (اپنی ذات میں) بھی خلافِ سنت ہے، اور پھر وہ سبب ہوجاتا ہے عدم قصدِ ادا (ادا نہ کرنے کا ارادہ) جس پر اس شخص کو گناہ میں زانی سے تشبیہ دی گئی ہے، اور اس کے علاوہ اس میں جو دنیوی خرابیاں ہیں وہ آنکھوں سے نظر آتی ہیں، مثلاً بہت جگہ موافقت نہیں آتی اور زوجہ کے حقوق نہیں ادا کئے جاتے، مگر طلاق اس لئے نہیں دیتے کہ مہر زیادہ ہے، یہ لوگ دعویٰ کرکے پریشان کریں گے، پس کثرتِ مہر بجائے اس کے کہ عورت کی مصلحت کا سبب ہوتا اُلٹا اس کی کلفت کا سبب ہوگیا، بعض عقلاء اس کثرت میں یہی مصلحت سمجھتے ہیں کہ چھوڑ نہ سکے گا، مگر یہ نہیں سمجھتے کہ چھوڑ نہ سکنا ہر جگہ تو مصلحت نہیں، مثلاً اس صورتِ مذکورہ میں اس میں کیا مصلحت ہوئی، اور مثلاً بہت جگہ بعد طلاق یا موت دعویٰ ہوا ہے، اور چونکہ تعداد میں لاکھوں تک ہوا ہے تمام جائداد سب کی نذر ہوجاتی ہے، اور زوج یا اس کے ورثہ اس کی بدولت نان شبینہ (رات کے کھانے تک) کے محتاج ہوجاتے ہیں، پس دینی و دنیوی خرابیوں کے مجموعہ سے وہ مضمون صادق آتا ہے:

خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ ط ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ (الحج، آیت ۱۱)	(دنیا اور آخرت کا نقصان اٹھایا یہی کھلا خسارہ ہے)

اور یہ سب خرابیاں تو کثرتِ مہر کی اس وقت ہیں جب ادا نہ کیا جائے، یا ادا کا ارادہ نہ ہو، اور اگر مرد پر خدا کا خوف غالب ہوا اور حقوق العباد (بندوں کے حقوق) سے اس نے سبکدوش (فارغ) ہونا چاہا اور ادا کا قصد کیا، تو اس وقت یہ مصیبت پیش آتی ہے کہ اتنی مقدار کا ادا کرنا اس کے تحمل سے زیادہ ہوتا ہے تو اس پر فکر اور تردد کا بارِ عظیم پڑتا ہے، اور کما کما کر ادا کرتا ہے، مگر مقدار زیادہ ہونے سے وہ ادا نہیں ہوتا، اور تمام تر اس کا ذخیرہ اسی میں کھپتا چلا جاتا ہے اور طرح طرح کی تنگی برداشت کرتا ہے، پھر اس سے دل میں تنگی اور پریشانی ہوتی ہے، یہ تو مرد کی تکلیف ہوئی، پھر چونکہ سبب اس تمام تر تکلیف کا وہ عورت ہے اس لئے انجام کار (نتیجہ میں)

اس مرد کے دل میں اس سے انقباض (کھنچاؤ) پھر انقباض سے تنفر (نفرت) پھر عداوت (دشمنی) پیدا ہو جاتی ہے، پس جو نکاح کہ موضوع تھا مصالحِ زوجین اور اتحاد باہمی کے لئے وہ بالواسطہ اس کے ایک حقِ خاص یعنی مہر کے اس طریق پر سبب ہوگیا اس کے ضد یعنی عداوت و کدورت (دشمنی اور نفرت کا) پس یہ صریح قلب موضوع (اُلٹا معاملہ) ہے جس کا سبب کثرتِ مہر کی ہے، پس قلبِ موضوع جب قبیح (خرابی) ہے اس کا سبب بھی قبح (خرابی) سے خالی نہ ہوگا، اس حدیث کا یہی مطلب ہے:۔

تیاسروا فی الصداق فان الرجل لیعطی المرأة حتّٰی یبقی ذلک فی نفسه علیها حسیکة رعب الخطابی من الخرائب عن ابن حسین مرسلاً کنز العمال ج ۸ ص ۲۴۹،	(مہر کے اندر آسانی رکھی (اختیار کرو اس لئے کہ مرد عورت کو (زیادہ مہر دے) بیٹھتا ہے، حتّٰی کہ اس دینے سے اس کے نفس کے اندر عورت سے متعلق دشمنی باقی رہ جاتی ہے)) (کنز العمال ص ۲۴۹))

اور اوپر جو خطبہ حضرت عمرؓ کا گذرا اس میں یہ بھی ہے:۔

ان احدکم لیغلی صدقة المرأة حتّٰی یکون لها عداوة فی نفسه الخ	(تم میں سے کوئی عورت کو کثیر مہر ادا کرتا ہے، یہاں تک مرد کے دل میں عورت کے لئے عداوت بیٹھ جاتی ہے))

چنانچہ خود مجھ کو اس کا اندازہ ہوا کہ میری ایک اہلیہ کا مہر پانچ ہزار اور دوسری کا پانچ سو تھا، بفضلہٖ تعالیٰ دونوں ادا کئے گئے، مگر اول مہر کے ادا میں جو کچھ گرانی ہوئی اگر والد صاحب مرحوم کا ذخیرہ اس میں اعانت نہ کرتا تو وہ گرانی ضرور کدورت کی صورت پیدا کرتی، اور دوسرا مہر صرف فتوحاتِ یومیہ کی آمدنی سے بہت آسانی سے ادا ہوگیا، اس کا کوئی معتدبہ (قابلِ ذکر) بار قلب پر نہیں پڑا، پھر اگر اس کوشش پر بھی ادا نہ ہوسکا، تو نفس میں ایک دوسری کم ہمتی جو خلافِ غیرت ہے پیدا ہوتی ہے، وہ یہ کہ عورت سے معاف کرایا جائے، پس اس سے درخواست کی جاتی ہے، سو اوّل تو اس درخواست کا پورا کرنا اس کے قبضہ میں ہے، اگر وہ پورا نہ کرے اس کو اختیار ہے، دوسرے خود یہ درخواست ہی ذلت سے خالی نہیں، اس لئے حق تعالیٰ نے جہاں برأت (سبکدوش ہونے) کی دو صورتیں فرمائی ہیں:۔

اِلَّآ اَنْ يَّعْفُوْنَ اَوْ يَعْفُوَا الَّذِيْ بِيَدِهٖ عُقْدَةُ النِّكَاحِ (البقرہ آیت ۲۳۷)	(مگر یہ کہ وہ عورتیں (اپنا نصف) معاف کردیں یا وہ شخص معاف کردے جس کے ہاتھ میں نکاح [illegible]

اس کے بعد ہی دوسری صورت کی ترجیح کی تصریح ہے؛

وَاَنْ تَعْفُوْٓا اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى ،	"اور تمہارا معاف کر دینا (بہ نسبت وصول کرنے کے) تقویٰ سے زیادہ قریب ہے"

اور اس کے ساتھ ہی پہلی صورت کی اباحت (جائز ہونا) بھی عام مفہوم سے ارشاد فرما دی ہے؛

وَلَا تَنْسَوُا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ ،	"اور آپس میں احسان کرنے سے غفلت مت کرو"

جس کے مجموعہ کا حاصل یہ ہوا کہ پہلی صورت باوجود مباح ہونے کے مرجوع (ناپسندیدہ) ہے لکونہ ابعد من الغیرۃ (کیونکہ یہ غیرت کے خلاف ہے) تو دیکھئے یہی کثرت بعض صورتوں میں اخلاقی کمزوری کا بھی سبب بن گئی، جو کہ پسندیدہ نہیں سمجھی گئی، اور یہ بھی اس وقت تک ہے جبکہ مرد اس طلبِ معافی میں حق تعالیٰ کے اس ارشاد کا لحاظ رکھے فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا اھ

معافیٔ مہر میں طیبِ نفس سے معاف ہونا شرط ہے،	یعنی طیبِ نفس (دل سے راضی ہونے) کی رعایت کرے، ورنہ اگر غیرت کے ساتھ خشیت (خوفِ خدا) بھی مفقود ہے تو وہ صرف لفظی معافی

کی ناجائز تدبیریں نکالے گا، یعنی یا عورت کو دھوکہ دے گا یا اس کو دھمکاوے گا، اس پر جبر کرے گا، جس سے وہ معاف کر دے، مگر یاد رہے کہ ایسی معافی عنداللہ ہرگز معتبر و مقبول نہیں، اس صورت میں یہ عنداللہ علیٰ حالہ مشغول الذمہ (اللہ کے نزدیک اپنی ذمہ داری کے بوجھ تلے) رہے گا، اور اگر اس کو غیرت بھی ہوئی اور خشیت بھی ہوئی مگر وسعت نہ ہوئی تو اس کی پوری مصیبت ہے کہ تمام عمر اسی میں گھلا کیا، کہ میں کس طرح اس حق سے سبکدوش (فارغ) ہوں، دیکھئے اس کثرت سے کیسے پھل پھول کھلے ہیں، گو اس صورت میں اگر یہ نیت مصمم (پکی) رہی کہ جب ہوگا اور جتنا ہوگا ضرور دے گا اور تھوڑا تھوڑا دیتا بھی رہا مگر پورا نہ ہو سکا، تو آخرت میں امید ہے کہ مواخذہ نہ ہوگا، لیکن اس بے چارہ کی دنیوی زندگی تو تلخ ہوگئی، اور جب شوہر کی زندگی تلخ ہے تو بی بی کی زندگی کیا بالطف ہو سکتی ہے، غرض اس میں ہر طرح کی خرابی ہی خرابی ہے،

زیادہ مہر مقرر کرنے کے سب مصالح موہومہ ہیں	اگر کسی شخص کو وسوسہ ہو کہ بعضے مفاسد (کچھ خرابیاں) قلیل میں ہیں، اور بعضے مصالح (کچھ مصلحتیں) کثیر میں ہیں، مثلاً اگر مہر قلیل ہو تو شوہر

پر کوئی بار نہیں پڑتا اس کو کوئی امر اس سے مانع نہیں ہوتا کہ اس کو چھوڑ کر دوسری کرلے، تو کثرت میں ذرا رکاوٹ رہتی ہے،

اس کا جواب یہ ہے کہ اوّل تو ہمارا یہ مطلب نہیں کہ بہت ہی قلیل ہو، بلکہ مقصود یہ ہے کہ اتنا کثیر (زیادہ) نہ ہو جو اس کی دینی و دنیوی تباہی کا سبب بن جائے، عدم ادا کی نیت میں بھی، ادا کی کوشش میں بھی، اور ابراء (بری ہونے) کی تدبیر میں بھی، بلکہ اس میں اعتدال ہو جس میں تمام مصالح محفوظ رہیں، دوسرے جس شخص کے دل میں خدا کا خوف نہ ہو تو کوئی چیز کسی امر سے نہیں روک سکتی، کیا ایسے واقعات پیش نظر نہیں ہیں کہ بڑے بڑے مہروں کے مدیون (مقروض) ہیں اور باوجود اس کے منکوحہ کا کوئی حق ادا نہیں کرتے اور نہ دوسری طرف ملتفت (متوجہ) ہونے سے رکتے ہیں خواہ وہ حلال ہو یا حرام، ایسے ظالموں کا کوئی کچھ بھی نہیں کر سکتا، خواہ اس وجہ سے کہ وہ صاحبِ وجاہت (بارعب شخصیت) ہے، اس سے ڈرتے ہیں، خواہ اس وجہ سے کہ اس کے پاس کچھ ہے ہی نہیں، اور نرا جیل خانہ کرانے سے کیا ملتا ہے، پھر داماد کے جیل جانے سے اپنی بیٹی کو کیا آرام ملا،

کثرتِ مہر محض رسم پرستی ہے، جس میں کوئی مصلحت نہیں،

بعضے لوگ اس میں مصلحت یہ بیان کرتے ہیں کہ قلت میں ذلت ہے اور کثرت میں عزت، سو اوّل تو مہر قلت میں جب کہ درجۂ اعتدال پر ہو ذلت نہیں، دوسرے اگر یہ مصلحت بھی ہوئی مگر مفاسد بے تعداد (بے شمار) ہوئے تو وہ مصلحت کب قابلِ تحصیل (حاصل ہونے کے قابل) ہوگی، تیسرے اگر تحصیلِ مصلحت تفاخر کے ساتھ قدرت علی الاداء (اظہار فخر کے ساتھ ادا کرنے کی قوت) کی کچھ بھی رعایت نہ ہو تو بقول میرے استاذ[1] علیہ الرحمۃ کے پھر اسی مقدار پر کیوں بس کی جاتی ہے؟ اس سے زیادہ مقدار میں اس سے زیادہ عزت اور فخر ہے، تو بہتر ہے کہ ہفت اقلیم کی سلطنت کا خراج بلکہ اس کا بھی مضاعف (دوچند) یا اضعافاً مضاعفۃً (چند در چند) مقرر کیا جائے کیونکہ نہ دینا نہ لینا، صرف نام ہی نام تو اچھی طرح سے کیوں نہ نام کیا جائے، حقیقت یہ ہے کہ یہ سب رسم پرستی ہے، ورنہ واقع میں مصلحت کچھ نہیں، اور مفاسد متنوع (خرابیاں قسم قسم کی) ہیں، لہٰذا اس کے واجب الاصلاح (اس کی اصلاح ضروری) ہونے میں کوئی شبہ نہیں رہا، پس رسم کو چھوڑو، اور عقل و شرع کا اتباع کرو، البتہ جن صورتوں میں مہر مثل سے کم کا مقرر کرنا ولی کو جائز نہ ہو جیسا فروعِ فقہیہ (فقہی احکام و مسائل) میں مذکور ہے، وہاں اس پر عمل کی یہ صورت ہے کہ سب متفق ہو کر اپنے عرف کو بدلیں، جس سے خود قلیل ہی مہر مثل بن جائے، بہرحال یہ صورت بھی اشکال کی نہیں جس سے کوئی نیم مُلّا شبہ کر سکے،

---

[1] حضرت مولانا محمد یعقوب صاحب نانوتوی قدس سرہٗ (المتوفی ۱۳۰۲ھ) (جواہرات یعقوبی حصہ اوّل ص۱) احقر قریشی

مہر مقرر کرتے وقت مقدار کا تعیین کرنا ضروری ہے،

ایک کوتاہی مہر کے بارے میں یہ ہے کہ بعضے لوگ بدون ذکر مقدار کے محض شرع محمدی کے عنوان سے مہر ٹھیراتے ہیں، اور پھر اُس کے مفہوم کی تعیین میں کوئی اصطلاح بھی بیان نہیں کرتے، تو اس طرح کا ٹھیرانا بجائے نہ ٹھیرانے ہی کے ہے اور مہر نہ ٹھیرانا گناہ ہے، جیسا اوپر مہر ادا کرنے کی نیت نہ ہونے میں مشابہ زنا کے قرار دینے کی تقریر میں گذرا ہے، پس یہ گناہ کے مرتکب ہوئے، پھر اگر کسی وقت وصول کے لئے نزاع (جھگڑا) ہوا تو کیا مقدار ادا کی جائے گی، اور چونکہ قوم کی قوم میں یہی رسم ہے، اس لئے مہر مثل کی تحکیم (فیصلہ) بھی دشوار ہی، پس اس ابہام میں یہ خرابیاں ہیں، اور اسی قبیل (قسم) سے ہے وہ رسم جو بعض نواح (نزدیکی علاقوں) میں معلوم ہوئی ہے کہ سوا سیر کودوں کے عنوان سے مہر ٹھیراتے ہیں، جس کی شرح تحقیق کرنے سے یہ معلوم ہوئی کہ سوا سیر کودوں کی جس قدر شمار ہے اتنے شمار سے روپے ہوں، سو ظاہر ہے کہ یہ کوئی معین (مقررہ) شمار نہیں ہے، اگر سوا سیر کودوں کے دو انبار (ڈھیر) ہوں، یقیناً ان کے شمار میں تفاوت بھی ہوگا، پس یہ بھی مبہم رہا، اور اس میں بھی مذکورہ خرابیاں ہوئیں، اور علاوہ ان کے کثرتِ مقدار کی خرابی مزید برآں (اس کے علاوہ) ہے،

مہر مقرر کرنے کے لئے مال ہونا شرط ہے،

اور ان سب سے بڑھ کر بعض جگہ یہ بیہودگی سننے میں آئی ہے کہ مہر میں مچھر اور پسّو اور کھٹمل کئی کئی ٹکے ٹھیراتے ہیں، جس کا حاصل یہ ہے کہ مہر ایسا ہو کہ اس کے ادا پر کبھی قدرت ہی نہ ہو، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے لئے مال ہونا شرط ہے، یہ چیزیں جب مال نہیں ہیں تو واجب فی الذمہ (ذمہ میں واجب) بھی نہیں ہوتی، ان کا ذکر و عدم ذکر (ذکر کرنا یا نہ کرنا) برابر ہے، اور تغییر شرع (شریعت کو بدلنے) کا گناہ الگ رہا،

بعد وفاتِ شوہر زوجہ کو مہر میں تمام اشیاء منقولہ و غیر منقولہ پر قبضہ کرنا شرعاً صحیح نہیں،

ایک کوتاہی در بارۂ مہر کے زوجہ کی طرف سے یہ ہے کہ اکثر بعد وفات زوج کے اس کی تمام اشیاء منقولہ و غیر منقولہ میں سے جس جس سے قبضہ ہو سکے سب پر قبضہ کر کے اپنے دل کو سمجھا لیتی ہیں کہ یہ سب میں نے اپنے مہر میں رکھ لیا، اگرچہ وہ قیمت میں مہر سے کئی حصّے زیادہ ہو، سو سمجھ لینا چاہئے کہ جب یہ اشیاء جنس مہر سے نہیں ہیں تو اس کو خود مہر میں لگا لینا جائز نہیں، بلکہ اس کے لئے یا تو حکمِ حاکم کی ضرورت ہے، اور یا دوسرے ورثاء کی رضامندی کی بشرطیکہ ان میں کوئی نابالغ نہ ہو، اور اگر کوئی نابالغ ہو تو اس میں خاص نابالغ کے حصّے کے اعتبار سے پھر بھی شرط ہے کہ جائیداد قیمت میں مہر سے اس قدر زیادہ نہ ہو کہ اس کو سب مقوّمین (قیمت لگانے والے) زیادہ بتلاتے ہوں، البتہ جہاں دونوں صورتیں ممکن نہ ہوں، کہ

نہ حاکم سے رجوع کرنے کا سامان ہو اور نہ ورثہ اس کا حق دینا چاہتے ہیں، اس خاص صورت میں اگر اس کو قدرت ہو جائداد مہر میں لگا سکتی ہے، بشرطیکہ جائیداد مہر کے برابر ہو، اصل میں یہ عملی فرع ہے خلاف جنس سے اپنا حق لے لینے کی، اس میں بھی تفصیل ہے،

مہر سے متعلق شوہر کی کوتاہیاں ایک کوتاہی اس کے مقابل زوج (شوہر) کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ اپنی رائے سے زوجہ (بیوی) کو کوئی چیز خواہ قسم زیور سے یا پارچہ و متاع (کپڑے اور سامان) سے یا مکان اور زمین بی بی کو دیدے اور اس کے نام کر دے اور خود بھی نیت کرے کہ میں مہر میں دے چکا، اور مہر ادا کر دیا، سو سمجھ لینا چاہئے کہ مہر کے عوض (بدلہ) میں یہ چیزیں دینا بیع (خرید و فروخت) ہے، اور بیع میں تراضی جانبین مطلقاً شرط (دونوں طرف سے مکمل شرط) ہے، اور بعض میں تساوی مقدار میں (مقدار میں برابری) بھی شرط ہے، پس اگر ان چیزوں کا دینا مہر میں منظور ہے تو زوجہ سے صریح الفاظ میں پہلے پوچھنا چاہئے، کہ ہم تمہارے مہر میں یہ چیزیں دیتے ہیں، آیا تم رضامند ہو، پھر اگر وہ رضامند ہو تو اگر وہ چیز جنس مہر سے نہیں ہے مثلاً مہر روپیہ تھا اور یہ چیز مکان یا کپڑا ہے تو بلاشرط قلیل و کثیر کے رضامندی سے یہ مبادلہ جائز ہے، اور اگر وہ چیز جنس مہر سے ہے مثلاً روپیہ تھا، یہ چیز چاندی کا زیور ہے تو اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ دونوں کی مقدار برابر ہو، مثلاً مہر اگر سو روپیہ ہوا اور زیور پچاس روپیہ کے برابر ہوا تو یہ مبادلہ جائز نہیں، البتہ دو صورتیں درست ہوں گی، ایک یہ کہ پچاس میں زیور لگا دے، اور پچاس معاف کر دے، دوسرے یہ کہ صلح کے طور پر لے لے، تو اس کے معنی شریعت خود یہ تجویز کر لیتی ہے کہ پچاس میں زیور لے لیا، اور پچاس معاف کر دیئے،

عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف نہیں کر سکتی ایک کوتاہی مہر کے بارہ میں یہ ہوتی ہے کہ اکثر عورت اپنے مرض الموت میں مہر معاف کر دیتی ہے اور اس معافی سے زوج بالکل بے فکر ہو جاتا ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ معافی وصیت للوارث کی فرع (وارث کے لئے وصیت کی ایک صورت) ہے، اور یہ بدون رضا دوسرے ورثہ کے ناجائز ہے، پس اس معافی سے مہر معاف نہ ہوگا، البتہ زوج کو جس قدر میراث میں پہنچے گا وہ بے شک معاف ہو جائے گا، باقی اس کے ذمہ واجب الادا رہے گا۔ جو دوسرے وارثوں کو دیا جائے گا، البتہ اگر سب ورثہ اس معافی کو جائز رکھیں تو کل معاف ہو جائیگا اور اگر بعض نے جائز نہ رکھا یا بعض نابالغ ہوں تو اُن کے حصہ کے قدر معاف نہ ہوگا،

شوہر کو مرض الموت میں عورت کو مہر معاف کرنے کی رائے نہیں دینا چاہئے ایک کوتاہی اس بارے میں یہ ہے کہ زوج کے مرض الموت میں عورت مہر معاف کر دیتی ہے، اس میں تفصیل یہ ہے کہ اگر

خوشی سے معاف کردے معاف ہوجاتا ہے، اور اگر عورتوں کی زبردستی گھیر اگھیری سے معاف کرے عند اللہ (اللہ تعالیٰ کے نزدیک) معاف نہیں ہوتا، اوپر والوں کو ایسے موقع پر اس طرح مجبور نہ کرنا چاہئے بلکہ بعض مواقع پر معاف کرنا مصلحت بھی نہیں ہوتا، مثلاً میراث کا حصہ زوجہ کا اس کی بسر کے لئے کافی نہیں، اور ورثہ سے بھی امید رعایت و کفالت (اخراجات برداشت کرنے) کی نہیں، ایسے موقع پر تو بجائے ترغیب معافی (معاف کرنے کی رغبت دلانے) کے معاف نہ کرنے کی رائے دینا مناسب ہے

زوجۂ متوفیہ کی اولاد کا حصہ میں زوج کو تصرف کرنا حرام ہے،

ایک کوتاہی مہر کے بارے میں یہ ہے کہ اگر زوجۂ متوفیہ (فوت شدہ بیوی) کے ورثہ اس کے ماں باپ یا بھائی وغیرہ ہوتے ہیں تب تو اُن کے مطالبہ پر زوج ان کا حصہ مہر دیدیتا ہے، اور اگر خود اسی زوج کے اولاد وارث ہوئی تو چونکہ وہ مطالبہ کر نہیں سکتے یہ اُن کا حق ادا نہیں کرتا، یہ فعل سراسر ظلم اور خیانت ہے، ان کا حق امانت ہے، اس اولاد کے نام سے جمع رکھنا چاہئے، اور خاص ان کے مصالح میں صرف کرنا چاہئے، خورد سنبرد کرنا (خرچ کرنا) حرام ہے، اسی طرح اُن بچوں کو جو ماں سے میراث میں پہنچی ہوں ان سب کی حفاظت اس کے ذمہ فرض ہے، اس میں بے جا تصرف (بلا وجہ خرچ کرنا) حرام ہے،

نکاح یا رخصت سے قبل مصارفِ شادی کے لئے شوہر سے کچھ لینا حرام ہے،

ایک کوتاہی بعض بلاد (علاقوں) میں بابِ مہر میں یہ ہے کہ زوج سے قبل نکاح یا قبل رخصت کچھ روپیہ اس غرض سے لے لیتے ہیں کہ مصارفِ شادی (شادی کے اخراجات) میں خرچ کریں گے، اور جب اُن کو منع کیا جاتا ہے کہ یہ رشوت اور حرام ہے تو یہ تاویل کرتے ہیں کہ ہم نے مہر میں لیا ہے، اگر یہ واقعی مہر ہے تو اس کی مالک عورت ہے، اور کسی کے مال میں بدون اس کے اذن بطیب خاطر (بغیر اجازت دل کی رضامندی کے) تصرف کرنا حرام ہے، سو ان لوگوں نے عورت سے کب پوچھا ہے اور اس نے کب خوشی سے اجازت دی ہے؟ اگر یہ کہا جائے کہ اذن لاحق (بعد میں اجازت دینا) بھی مثل اذن سابق (پہلے اجازت دینے کے) ہے، اور اذن دلالۃً بھی مثل اذن صراحۃً کے ہے (یعنی عرف عام کے اعتبار سے جس کو اجازت سمجھا جائے وہ بالکل واضح طور پر اجازت دینے کے مانند ہوتا ہے) تو جواب یہ ہے کہ یہ بالکل مسلّم ہے (تسلیم شدہ) ہے، لیکن اذن کی حقیقت کا تو پایا جانا ضروری ہے، اور حقیقت اس کی وہاں ہوگی جہاں عدمِ اذن (اجازت نہ دینے) پر بھی قدرت ہے، سو ظاہر ہے کہ یہاں بوجہ اتباعِ رسم کے (رسم و رواج کی پیروی کی وجہ سے) اس کے روکنے یا اس کا ضمان (جرمانہ) اور بدل لینے کی عورت کو قدرت ہی نہیں، پس اذن کہاں پایا گیا؟ خلاصہ یہ کہ اگر

یہ مہر نہیں تو رشوت ہے، اور اگر مہر ہے تو غصب ہے، اور دونوں حرام ہیں،

نابالغ زوجہ کے مہر کی معافی شرعاً معتبر نہیں، ایک کوتاہی اس بارہ میں یہ ہوتی ہے کہ بعضے لوگ ویسے ہی یا طلاق دینے کے وقت نابالغ زوجہ سے مہر معاف کرا لیتے ہیں، یہ سو یہ معافی معتبر نہیں لان تبرع الصغیر باطل (تحقیق بچّہ کا صدقہ وغیرہ کرنا باطل ہے) بعض جگہ اس سے بڑھ کر ہوتا ہی، کہ ولی زوجہ نابالغہ کا طلاق کا مطالبہ زوج سے کرتا ہے، اور یہ ولی ہی مہر معاف کر دیتا ہے، سو اس صورت میں اگر زوج نے طلاق دیدی تو طلاق تو واقع ہو جاوے گی، مگر مہر ساقط نہ ہوگا،

عورتوں کا مہر مانگنا شرعاً کوئی عیب کی بات نہیں ایک کوتاہی کہ وہ عملی غلطی ہے اس بارہ میں یہ ہے کہ عورتیں مہر مانگنے کو یا بے مانگے لے لینے کو عیب سمجھتی ہیں، اور اگر کوئی ایسا کرے تو اس کو بدنام کرتی ہیں، سو اپنے حقِ واجب کا مانگنا یا وصول کر لینا جب شرعاً کچھ عیب نہیں تو محض اتباعِ رسم سے اس کو عیب سمجھنا گناہ سے خالی نہیں،

مہر اور نان ونفقہ دونوں علٰحدہ علٰحدہ حقوق ہیں، ایک کوتاہی کہ وہ علمی غلطی ہے یہ ہے کہ عورتیں یہ سمجھتی ہیں کہ اگر ہم نے مہر لے لیا تو پھر ہمارا کوئی حق خاوند کے ذمہ نہ رہے گا، یعنی نان ونفقہ اور دیگر حقوقِ معاشرۃ سب ساقط ہو جائیں گے، سو یہ اعتقاد محض غلط ہی، سب حقوق الگ الگ ہیں، ایک حق دوسرے پر مبنی نہیں، مہر لینے سے دوسرا کوئی حق ساقط نہیں ہوتا، اور اس اعتقادِ باطل کا یہ اثر ظاہر ہوا ہو کہ شوہر مہر ادا کرتا ہے اور عورت نہیں لیتی، اور نہ معاف کرتی ہے، ایسی صورت میں اگر زوج پر ادائے حق کا غلبہ ہوا اور مسائل سے ناواقف ہوا تو بے حد پریشان ہوتا ہے، کہ اب میری برأت (سبکدوشی (ذمہ داری سے فراغت) کی کیا صورت ہو سکتی ہے، اس لئے اس کا مسئلہ بتلایا جاتا ہے کہ اس صورت میں اگر شوہر مالِ مہر کا زوجہ کے سامنے اس طرح رکھدے کہ وہ اس کے قبضہ پر قادر ہو اور رکھ کر یہ کہدے کہ یہ تمہارا مہر ہے، اور یہ کہہ کر اس مجلس سے اُٹھ جاوے تو مہر ادا ہو گیا، خواہ عورت اٹھالے یا نہ اٹھاوے، اگر اس نے نہ اٹھایا اور دوسرا کوئی لے گیا تو وہ زوجہ کا گیا اور اگر بخیالِ ضائع ہونے کے خاوند اٹھالے گا تو وہ اس کے پاس زوجہ کی امانت رہے گا، شوہر کی ملک نہ ہوگا،

دَینِ مہر مانعِ وجوبِ زکوٰۃ نہیں ایک کوتاہی کہ وہ بھی علمی غلطی ہے کہ بعضے لوگ دَینِ مہر کو مانعِ وجوبِ زکوٰۃ (زکوٰۃ کے واجب ہونے کو روکنے والا) سمجھتے ہیں، یعنی جس شخص کے ذمہ مہر واجب ہو وہ یوں سمجھتا ہی کہ چونکہ میں اتنے کا قرضدار ہوں اس لئے مجھ پر اتنے مال میں زکوٰۃ واجب نہیں، گو اس مسئلہ میں کسی قدر

اختلاف بھی ہوا ہے، لیکن صحیح یہ ہے کہ وہ مانع نہیں، یعنی مہر کے لازم ہوتے ہوئے بھی کُل مال میں زکوٰۃ واجب ہوگی، چنانچہ شامی نے بعد نقلِ اقوال کے کہا ہے :-

زاد القهستانی عن الجواهر والصحیح انه غیر مانع (۲۲ص)	(قہستانی نے جواہر سے یہ اضافہ کیا ہے اور صحیح یہی ہے کہ وہ مانع نہیں،)

خصوص جبکہ ادا کی نیت بھی نہ ہو، تو پھر مانع ہونے کے کوئی معنی نہیں، کیونکہ عازمِ ادا (ادا کرنے کا ارادہ رکھنے والا) جب کسی بار کا التزام ہی نہیں کرتا پھر اس کی رعایت بے وجہ ہے،

مہر کے وصول ہونے تک عورت کے ذمہ زکوٰۃ واجب نہیں	ایک اور کوتاہی کہ وہ بھی علمی غلطی ہے، اور وہ عوام کا تو ملتفت الیہ بھی نہیں (یعنی عوام اس طرف توجہ نہیں دیتے) اُن سے گذر کر

خواص کو پیش آئی ہے وہ یہ کہ جس طرح اموالِ تجارت میں تاجر کے ذمہ مثل عین یعنی نقد موجود مال کے دَین (جو روپیہ دوسروں کے ذمہ ہے اس) میں بھی (یعنی اُن حقوق میں جو کہ لوگوں کے اس کے ذمہ واجب ہیں مثلاً اس کا قرض چاہتا ہے یا اُدھار سودا لینے والوں کے ذمہ دام چاہتے ہیں) زکوٰۃ فرض ہے، اسی طرح عورت کا جو دین مہر زوج کے ذمہ ہے اس میں بھی زوجہ کے ذمہ زکوٰۃ ہے یا نہیں؟ سو عوام کو اس طرف التفات ہی نہیں ہوا، جس کی وجہ عدمِ اہتمامِ دین (دین کی طرف توجہ کا نہ ہونا) ہے، یہی وجہ ہے کہ انھوں نے کبھی یہ مسئلہ ہی نہیں پوچھا، حالانکہ تردد کی اور پوچھنے کی بات تھی، کیونکہ آخر میں یہ بھی تو ایک قرض ہے، البتہ خواص کو تردد ہوا، سو اُن میں جو غیر محقق تھے وہ قیاس سے وجوب (واجب ہونے) کے معتقد ہو بیٹھے، اور پھر یہ فکر ہوئی کہ اس وجوب میں تو تمام مہر زکوٰۃ ہی کی نذر ہو جائے گا، اس لئے انھوں نے اپنے نزدیک ایک دانائی سے کام لیا، کہ مہر میں بجائے روپیوں کے تانبے کے ٹکوں کی رسم تجویز کی، کہ ٹکے اموالِ زکوٰۃ سے نہیں ہیں، چنانچہ ہمارے قصبات میں اس رسم کی یہی اصل ہے، کذا سمعت استاذی مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ تعالیٰ (جیسا کہ میں نے اپنے استاذ مولانا محمد یعقوب صاحب رحمہ اللہ سے سُنا ہے) اور جو محقق تھے انھوں نے فقہ سے رجوع کیا، سو تحقیق سے ثابت ہوا کہ جو دَین بدل تجارت ہے یا قرض ہے وہ دَین قوی ہے، اور مہر دَین ضعیف، اس کا قیاس اس پر جائز نہیں، دَینِ قوی میں زکوٰۃ فرض ہے، اور دَینِ ضعیف میں نہیں ہے، جب تک وصول نہ ہو جائے، اور وصول ہونے کے بعد بھی زمانہ گذشتہ کی زکوٰۃ واجب نہ ہوگی، تازہ زکوٰۃ ہوگی، کذا فی الدر المختار، خلاصہ اخیر کے دو مسئلوں کا یہ ہوا کہ مہر نہ مانعِ زکوٰۃ ہے اور نہ موجبِ زکوٰۃ۔

ہٰذا ما حضرنی الآن فی باب المہر،

ٹکوں میں مہر مقرر کرتے وقت چند غور طلب باتیں

کہ اس میں بھی کوتاہی کی جاتی ہے، اس کے سمجھنے کے لئے ایک تمہید کی حاجت ہے، جو مرکب ہے چند مقدمات سے،

ایک مقدمہ یہ ہے کہ ہمارے قصبات میں مدتِ مدیدہ (عرصہ دراز) سے رسم ہے کہ مہر ٹکوں سے ٹھہراتے ہیں، جس کی بناء اور اس بنار کا ضعیف ہونا اوپر لکھ چکا ہوں،

دوسرا مقدمہ یہ کہ ان اطراف میں ٹکے دو قسم کے پائے جاتے ہیں، ایک منصوری جو موٹے موٹے پیسے ہوتے ہیں، دوسرے ڈبل، یعنی انگریزی سکہ کے پیسے،

تیسرا مقدمہ یہ ہے کہ مسئلہ فقہیہ ہے کہ اگر کسی وقت ایک نام کے کئی سکے چلتے ہوں اور معاملہ میں اس سکہ کا نام لیا جائے تو اگر وہ رواج میں سب برابر ہیں تو ان میں قید لگانے کی ضرورت ہوگی، بدون اس کے محض نام لینا کافی نہ ہوگا، اور اگر کوئی زیادہ چلتا ہے کوئی کم تو اطلاق (مطلقاً ذکر کرنے) کے وقت وہی زیادہ چلنے والا مراد ہوگا، جیسے پہلے زمانہ میں منصوری پیسے زیادہ چلتے تھے، اور اب ڈبل پیسے زیادہ چلتے ہیں، پس پہلے زمانہ میں جب مہر ٹکوں سے ٹھیرایا جاتا تھا، منصوری ٹکے مراد ہوتے تھے، اور اب جب اس عنوان سے مہر ٹھیرایا جائے گا ڈبل پیسے مراد ہوں گے،

چوتھا مقدمہ یہ مسئلہ ہے کہ اگر معاملہ کے وقت کسی قسم کے پیسوں کا رواج تھا اور قبل ادا (ادا کرنے سے پہلے) رواج جاتا رہا تو اب صاحبِ حق اسی مقرر شدہ کا مطالبہ کر سکتا ہے، رائج حال (یعنی اس موجودہ وقت چلنے والے پیسوں) کا مطالبہ نہیں کر سکتا، کذا فی الدر المختار، کتاب البیوع، فصل القراض من قولہ استقرض من الفلوس الرائجۃ،

پانچواں مقدمہ، جو پیسے واجب ہیں تراضی جانبین (دونوں فریقوں کی باہمی رضامندی) سے اس کی قیمت بھی لینا جائز ہے، مگر صاحبِ حق زمانہ وجوب (واجب ہونے کے زمانہ) کی قیمت جبراً نہیں لے سکتا، جب یہ پانچوں مقدمے ممہد (مکمل) ہوگئے تو:۔

ٹکوں سے مقرر کردہ مہر کی وصولی میں چند کوتاہیاں

اب سمجھئے کہ وہ غلطی یہ ہے کہ جن عورتوں کے نکاح ان منصوری اسّی ہزار ٹکوں پر ہوئے جن کی قیمت اس وقت ڈبل پیسے سے تقریباً پون پیسہ تھی، اور اب آدھا پیسہ یعنی ایک دھیلا ہوگیا ہے، بعض جگہ دیکھا گیا ہے کہ عورت یا اس کے اولیاء یا ورثہ زوج سے اسّی ہزار ٹکے ڈبل پیسے کے یا انہی ڈبل ٹکوں کی قیمت لگا کر ان منصوری ٹکوں کی جو قیمت اب ہے یعنی فی ٹکہ ایک پیسہ ڈبل، اس سے زیادہ مطالبہ نہیں ہو سکتا، اور اگر اس میں زیادہ نزاع

کرے تو زوج کو شرعاً جائز ہے کہ اسی منصوری پیسے کے اسّی ہزار ٹکے خرید کر حوالہ کرے، صاحبِ حق اس کے لینے سے انکار نہیں کر سکتا، یہ ہے وہ غلطی، البتہ جو نکاح اب ہوں گے جس وقت کہ زائد رواج ڈبل پیسوں کا ہے اس وقت بھی ڈبل پیسے واجب ہوں گے، پس اس کی قیمت سے روپیوں کا حساب ہوگا، یہ بیان تو غلطی کا تھا،

مہر میں دوسری جنس کی قیمت لگانے کا طریقہ

اب ایک اور عام مسئلہ اس قیمت لگانے کے متعلق معلوم کرنا ضروری ہے، وہ یہ کہ اگر واجب ایک چیز ہو اور لینے کے وقت اس کی قیمت لگا کر لی جائے دوسری چیز، تو یاد رکھنا چاہئے کہ جس قدر حق اُس وقت وصول کیا جاتا ہے، اسی حساب کا کرنا چاہئے، یہ جائز نہیں کہ پورے کا حساب دوسری جنس سے کر لیا جائے، پھر اس دوسری جنس سے کچھ اب لیا جائے کچھ دوسرے وقت، بلکہ بقایا حق کا حساب اگر دوسرے وقت اسی جنس سے کیا جاتا ہے، تو اس دوسرے وقت کے نرخ وغیرہ کا اعتبار ہوگا، وقت سابق کے نرخ پر صاحبِ حق مجبور نہیں کر سکتا مثلاً ایک شخص نے منصوری (پیسہ) کے رواج کے وقت چالیس پیسے قرض لئے تھے، جو اس وقت آٹھ آنے کے تھے اور اب پانچ آنے کے ہیں، اور ان میں سے نصف اب وصول کرتا ہے، تو یہ جائز نہیں کہ اب حساب کر کے اس کے ذمہ پانچ آنے ٹھیرا دے، اور ڈھائی آنے اب لے لے، اور ڈھائی آنے پھر، بلکہ اس وقت بیس ہی پیسوں کا حساب کیا جائے، پھر بیس کا دوسرے وقت کرے،

اگر فرض کیجئے اس وقت نرخ منصوری کا ڈبل کے چار ہوگیا، تو اس دوسرے وقت میں پانچ ڈبل لے سکتا ہے، پہلے حساب سے دس نہیں لے سکتا، اسی طرح غلہ کے عوض روپے لینے میں اس کا خیال رکھنا واجب ہے،

مثال:۔ ایک کاشتکار کے ذمہ ٹھیکہ کا غلہ گندم چالیس سیر چاہئے، پھر اس سے یہ اقرار پایا کہ اچھا اس کے دام نقد سے لگا کر حساب کر لیا جائے، اور حساب کے وقت نرخ گندم کا روپیہ کا دس سیر ہے، اور اس حساب سے چالیس سیر غلہ چار روپیہ کا ہوا، سو اگر اسی جلسہ میں چاروں روپے وصول ہو جائیں تب تو پورے غلہ کا حساب کر لینا جائز ہے، اور اگر فرض کیجئے کہ اس کو دو روپے وصول ہوں گے تو اُس وقت یہ چاہئے کہ صرف بیس ہی سیر غلہ کا حساب کرے، اور اس کے دام اسی وقت وصول کر لے، اب اس کاشتکار کے ذمہ بیس سیر غلہ باقی واجب رہے گا، اس وقت عموماً زمینداروں کی عادت ہے کہ پورے چالیس سیر غلہ کا حساب روپیوں سے کر کے کاشتکار کے ذمہ مثلاً چار روپے کر دیتے ہیں، پھر اگر اس وقت دو روپے وصول ہوئے تو آئندہ اس کے ذمہ دو روپے باقی

سمجھ کر دو روپے کا مطالبہ کرتے ہیں، سو یہ جائز نہیں، حدیث میں جو بیع الکالی بالکالی کی ممانعت آئی ہے اس کا یہی مطلب ہے، پھر جب موافق مسئلہ مذکورہ کے بیس سیر غلہ اس کے ذمہ واجب رہا، سو جب اس کا حساب ہوگا اس وقت پہلے حساب کا اعتبار نہ ہوگا، بلکہ نیا حساب ان دونوں کی رضامندی سے ہوگا، مثلاً اُس وقت نرخ سولہ سیر کا ہوا تو باقی غلہ اڑھائی روپیہ کا ہوگا، پس پہلی صورت میں زمیندار دو روپیہ جبراً نہیں لے سکتا، اور دوسری صورت میں کاشتکار دو روپیہ جبراً نہیں دے سکتا،

اسی طرح اگر گیہوں واجب تھے اور تراضی جانبین سے وصول کرنا ہے نخود (چنا) تو جس قدر نخود اس وقت لینا ہے اتنے ہی گندم کا اس وقت حساب کیا جاوے، بقیہ اس کے ذمہ گندم رہیں گے، آئندہ وصولی کے وقت اُن کا حساب باہمی رضامندی سے جس طرح بھی ہو جاوے، یہ نہیں کہ آئندہ اس کے ذمہ نخود (چنے) کا بقایا نکالا جاوے، خوب سمجھ لینا چاہئے :

اصلاحِ انقلاب

متعلق بعدل بین الزوجتین؛

دو بیویوں میں عدل وانصاف نہ کرنے کی کوتاہیاں،

اس باب میں محدود کوتاہیاں ہوتیں تو مثل دوسرے ابواب کے ان کی بھی فہرست بتلائی جاتی، یہاں تو بالکل کوتاہی ہی کوتاہی ہے، عدل کا نام و نشان بھی نہیں، اس کی طرف التفات ہی نہیں، اِلّا نادراً نادر کالمعدوم (یعنی ایسا عدل بہت کم پایا جاتا ہے جو نہ ہونے کے برابر ہے) چونکہ بڑا سبب اس بے التفاتی کا اس کے متعلق احکام نہ جاننا ہے، اس لئے بجائے بے شمار کوتاہیوں کے اس باب کے احکام بتلا دینا کافی ہے،

عدل نہ کرسکنے کی امید ہو تو دوسرا نکاح کرنا ہی گناہ ہے،

مسئلہ نمبر(۱): سب سے اول یہی ہے کہ بلا ضرورت دوسری زوجہ سے نکاح نہ کرے، اگرچہ عدل کی امید ہو، اگر خیال سے ترک کردے گا کہ پہلی کو غم نہ ہو تو ثواب ہوگا، (ع) اور اگر عدل کی امید نہ ہو تب تو دوسرا نکاح کرنا بالکل گناہ ہے، بقولہ تعالیٰ:۔

فَاِنْ خِفْتُمْ اَنْ لَّا تَعْدِلُوْا فَوَاحِدَةً

"پس اگر تم کو اندیشہ اس کا ہو کہ عدل نہ کرسکو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر اکتفا کرو"

نفقات اور شب باشی میں عدل واجب ہے

مسئلہ نمبر۲: نفقات (اخراجات) میں اور بغرض تالیف (دلجوئی) وانس کے شب باشی میں عدل واجب ہے اور ہمبستری[۱] میں نہیں،

---

[۱] یہاں سے یہ وہم نہ ہو کہ باوجود قدرت کے اگر کسی ایک منکوحہ سے ہمیشہ ترک ہمبستری کئے رہے، اور اس منکوحہ کو حاجت بھی ہمبستری کی ہو تب بھی کوئی مضائقہ نہیں، کیونکہ یہ خیال بالکل غلط ہے، اور نہ اس عبارت کا مقصود ہے، عبارت کا مقصود تو یہ ہے کہ عورت کے ساتھ ہمبستری کے باب میں (باقی برصفحہ آئندہ)

رغبت اور نشاط غیر اختیاری ہے

مسئلہ نمبر۳: لیکن اگر جمیع استمتاعات میں مثل ہمبستری و بوس کنار وغیرہ میں برابری کرے تو مستحب ہے، گو واجب نہیں،

مسئلہ نمبر۴: اور یہ عدم وجوب اس وقت متفق علیہ ہے کہ جب رغبت اور نشاط نہو، اس صورت میں معذور ہوگا، لیکن اگر رغبت اور نشاط ہے گو دوسری کی طرف زیادہ ہے اور اس کی طرف کم مگر ہے، تو اس صورت میں ایک قول یہ ہے کہ داخل تحت القدرۃ (قدرت میں داخل) ہے، اس لئے اس میں برابری واجب ہے، اور غالباً یہ غیر حنفیہ کا مذہب ہے (ش)

تبرعات اور تحائف میں بھی عدل واجب ہے،

مسئلہ نمبر۵: باقی تبرعات و تحائف (عطیات اور تحفے) جو کہ غیر لازم میں ہیں، ان میں عدل واجب ہے یا نہیں، ظاہر اطلاق اقوال حنفیہ کا وجوب ہے، اور ابن البطال مالکیؒ نے بحثاً (کلی طور پر) غیر واجب کہا ہے، اور صحابہ رضی اللہ عنہم کے ہدایا بھیجنے سے نوبت میں عائشہ رضی اللہ عنہا میں (یعنی حضرت عائشہؓ کی باری میں حضور اکرمؐ کو ہدیہ بھیجنے سے) استدلال کیا ہے (ف، ج ۵ ص ۱۵۲) لیکن یہ استدلال بچند وجوہ مخدوش (یہ دلیل چند وجوہ سے صحیح نہیں) ہے،

اوّل ممکن ہے کہ وہ حضرت عائشہؓ کی ملک کی جاتی ہو، اور اس کا یہ جواب دینا اگر ایسا ہوتا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما دیتے کہ میں اس ہدیہ کا مالک نہیں اس لئے ضعیف ہے کہ ازواج کی درخواست تقسیم ہدایا نہ تھی، بلکہ مہدین (ہدیہ بھیجنے والوں) کو یہ فرما دینا کہ تخصیص (کسی کے لئے خاص) نہ کریں

ثانیاً ممکن ہے کہ آپؐ کی ملک ہو، مگر آپؐ تقسیم فرما دیتے ہوں، اور اس پر یہ شبہ ہو کہ اگر ایسا ہوتا تو شکایت کیوں ہوتی؟ اس طرح مدفوع ہے کہ ایسے موقع پر بھی تو ناگوار ہوتا ہے کہ ایک کے گھر سے سب جگہ پہنچے،

ثالثاً حنفیہ کے نزدیک آپؐ پر یہ عدل واجب ہی نہ تھا تو اس پر دوسروں کا قیاس نہیں ہو سکتا، اور اس پر یہ شبہ ہو کہ پھر آپؐ نے کیوں نہ فرما دیا، اس لئے معتد بہ (قابلِ ذکر) نہیں کہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) دیانۃً حکم یہ ہے کہ عورت کی حاجت اور ضرورت کے موافق ہر زوجہ سے ہمبستری کرنا مرد پر واجب ہے، اگر اس کو باوجود قدرت، اور خواہش عورت کے ترک کرے گا تو گنا ہگار ہوگا، ہاں اگر کسی وجہ سے خود مجبور ہو یا عورت اپنا حق معاف کر دے یا عورت کی خواہش ہی نہ رہے تو پھر گناہ نہ ہوگا، اور اگر یہ شخص معذور رہو اور عورت اپنا حق معاف نہ کرے اور اسے خواہش جماع کی ہو اور طلاق چاہے تو دیانۃً زوج کو طلاق دینا واجب ہوگا ۱۲ احمد حسن عفی عنہ

آپ باوجود عدم وجوب کے اس کے ساتھ معاملہ وجوب کا سا فرماتے تھے،

بہر حال ابن بطال کا استدلال مخدوش ہے، اور ظاہر اطلاق دلائل سے وجوب ہی ہے،

ازواج میں سے سفر میں کسی کو ساتھ لے جانے کے لئے قرعہ اندازی افضل ہے،

مسئلہ نمبر۶: برابری شب باشی (رات گذارنے) میں حضر (گھر میں رہنے) میں ہے، اور سفر میں اختیار ہے جس کو چاہے ساتھ لے جائے، لیکن رفع شکایت (شکایت دور کرنے) کے لئے قرعہ ڈال لینا افضل ہے، اور ظاہراً یہ اُس صورت میں ہے جب تک قرار (سکون) سے قیام نہ ہو، ورنہ حالتِ قیام کا حکم مثل حکم حضر کے ہوگا، دوسرے علماء سے بھی تحقیق کرلیا جائے،

مسئلہ نمبر۷: یہ برابری شب باشی میں اس شخص کے لئے ہے جو شب میں فارغ ہو، اور جس کی رات ہی کی نوکری ہو جیسے چوکیدار تو اس کا دن مثل شب کے ہے (د)

دونوں بیویوں کی رہائش گاہ میں برابری واجب ہے،

مسئلہ نمبر۸: مسکن (رہائش گاہ) میں جو برابری واجب ہے اس کا مطلب یہ ہے کہ ہر ایک کو جدا گھر دینا چاہئے، جبراً دونوں کو ایک گھر میں رکھنا جائز نہیں، البتہ اگر دونوں رضامند ہوں تو ان کے رضامند ہونے تک جائز ہے،

ایک شب میں دوسری کو شریک کرنا صحیح نہیں،

مسئلہ نمبر۹: جس شخص پر شب میں عدل واجب ہو ایک کی شب میں دوسری کو شریک کرنا درست نہیں، یعنی ایک کی شب میں دوسری کے پاس نہ جائے،

مسئلہ نمبر۱۰: اسی طرح یہ بھی درست نہیں کہ ایک کے پاس بعد مغرب جائے اور دوسری کے پاس بعد عشاء، بلکہ اس میں بھی برابری ہونا چاہئے، (ش)

مسئلہ نمبر۱۱: اسی طرح ایک شب میں دونوں جگہ تھوڑا تھوڑا رہنا درست نہیں (ل)

مسئلہ نمبر۱۲: لیکن ان تین اخیر کے مسئلوں میں یعنی ۹، ۱۰، ۱۱ میں اگر اذن و رضامندی ہو تو درست ہے،

مسئلہ نمبر۱۳: اور جس طرح رضامندی سے تھوڑی تھوڑی رات رہنا دونوں کے پاس درست ہے، اسی طرح اگر دونوں کی باری کا دورہ ختم کرکے ایسا کرے اور پھر جس طرح چاہے باری درست کرلے، یہ بھی درست ہے (ش)

اور ان اخیر کے مسائل میں صاحب نیل الاوطار نے یہ مذہب بھی لکھا ہے کہ شب کو بھی ایک کی باری میں دوسری کو عارضی طور پر بُلا لینا یا خود اس کے گھر چلا جانا اور اس سے بات چیت کرنا اور اس کے پاس بیٹھنا اور اس کو لمس کرنا (چھونا) سب درست ہے، صرف شب بھر رہنا اور

ہمبستری دوسری کے ساتھ درست نہیں، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بیبیوں کے جمع ہونے سے استدلال کیا ہے، مگر یہاں احتمال اذن (اجازت میں شک) یا عدم وجوب قسم کا ہے،

دن کے وقت برابری کا حکم | مسئلہ نمبر ۱۴؛ دن کے آنے جانے میں برابری واجب نہیں، بلکہ تھوڑی دیر کے لئے ہو آنا بھی کافی ہے،

مسئلہ نمبر ۱۵؛ یا کسی ضرورت سے ایک ہی جگہ جائے تب بھی درست ہے،

مسئلہ نمبر ۱۶؛ البتہ اس روز جس کی باری نہ ہو اس سے دن کو صحبت درست نہیں، اور ظاہراً قواعد سے یہاں بھی رات تابع دن کی ہوگی، البتہ تصالح زوجتین (دونوں بیبیوں کی صلاح) یا اصلاحِ زوج سے اس میں تبدیلی درست ہوگی، اس کو بھی دوسرے علماء سے تحقیق کر لیا جائے (ش)

باری کی مقدار اور تعیین کے چند مسائل | مسئلہ نمبر ۱۷؛ باری کی مقدار مقرر کرنا مرد کی رائے پر ہے، لیکن وہ مقدار اتنی طویل نہ ہو کہ دوسری کو انتظار سے کلفت ہونے لگے، مثلاً ایک ایک سال اور یہ خلاصہ ہی بحث طویل کا (ش)

مسئلہ نمبر ۱۸؛ اور اگر بیماری کے سبب ایک کے گھر زیادہ مقیم رہا تو بعد صحت کے اتنے ہی روز دوسری کے گھر رہنا چاہئے (ش)

مسئلہ نمبر ۱۹؛ اسی طرح اگر ایک بی بی بہت سخت بیمار ہوگئی تو اس ضرورت سے اس کے گھر مقیم رہنے میں مضائقہ نہیں (ع) اور ظاہر اطلاق قول درمختار مریضہ سے اُن ایام کی قضا بھی ضروری معلوم ہوتی ہے،

مسئلہ نمبر ۲۰؛ ایک منکوحہ کو اپنی باری دوسری کو ہبہ کر دینا درست ہے، پھر جب چاہے اس کو واپس لے سکتی ہے،

مسئلہ نمبر ۲۱؛ اگر کسی شخص کے مثلاً چار بیبیاں ہیں، الف، ب، ج، د، ان میں سے الف نے اپنی باری ب کو ہبہ کر دی اور ان دونوں کی باری کے دن متصل نہ تھے، تو شوہر کو ان دونوں کا متصل کرنا درست نہیں، بلکہ وہی پہلی ترتیب رہے گی، اور اس موہوب بہا (جس کو باری ہبہ کی گئی ہے اس) کے پاس دو شبوں میں فصل رہے گا، (ش) لیکن قواعد سے معلوم ہوتا ہے کہ بعد ختم دورہ کے پھر ترتیب بدل سکتا ہے،

عدل قائم کرنے کی اہمیت | یہ اکیس ۲۱ مسائل ہیں مختلف کتب سے جن کے یہ رموز ہیں، (ع) عالمگیریہ (ق) قاضی خاں، (ش) شامی (ف) فتح الباری (د) درمختار (ل) اشعۃ اللمعات، اگران مسائل کو

مستحضر کرکے ان کو دستور العمل بنالے، انشاء اللہ اس باب میں کبھی خلافِ عدل کا وقوع ہی نہ ہو، مگر افسوس لوگوں نے بجائے عدل کے اس وقت عدول (ترکِ عدل) کو شیوہ (طریقہ) بنا رکھا ہے، حتیٰ کہ اکثر عدول نے بھی فَلَا تَتَّبِعُوا الْهَوٰى اِنْ تَعْدِلُوْا وَ اِعْدِلُوْا هُوَ اَقْرَبُ لِلتَّقْوٰى (پس خواہش نفسانی کی پیروی نہ کرو اگر انصاف کرو، (اور) تمہارا تقویٰ زیادہ قریب ہے (انصاف سے)

مضمون بالا عدل بین الزوجتین کا ضمیمہ

ملقب بہ

خیر الانتہاء فی معاشرۃ النساء

مضمونِ مذکور جورِ زوج کا انسداد (شوہر کے ظلم کو روکنا) تھا، جو تعددِ زوجہ (کئی بیویوں) کے وقت میں ہوتا ہے، کبھی یہ جوران زوجاتِ متعددہ (یہ ظلم متعدد بیویوں) کی طرف سے بھی ہوتا ہے جس کا سبب باہمی تنافس و تحاسد (آپس میں ایک دوسری پر برتری کا اظہار اور حسد) اور کبھی غیظ علی الزوج (خاوند پر غصہ) ہوتا ہے، اور اس باہمی تنافس و تحاسد کے اثر کا بھی اکثر حصہ اسی زوج پر واقع ہوتا ہے، تو ہر حال میں تختۂ مشق یہی ٹھیرا، اس ضمیمہ میں اس جور کا انسداد ہے، اور ہر چند کہ قرآن مجید میں جو اصلاح معاشرت بین الزوجین (شوہر بیوی کے باہمی تعلقات کی اصلاح) کے متعلق مختلف تعلیمات وارد ہیں، جن میں بعض میں خطاب عام ہے، بعض میں خطاب خاص بقصد تعمیم حکم (باوجودیکہ حکم عام ہونے کا قصد ہے) ان کا مجموعہ سب حالتوں کو شامل ہے، یعنی خواہ زوجہ میں تعدد نہ ہو یا کہ تعدد ہو، پھر جور زوج کی جانب سے ہو یا زوجہ کی جانب سے ہو، مگر ظاہر ہے کہ تعدد کی حالت میں اُن کی اس لئے زیادہ حاجت ہوگی کہ اس حالت میں ایسے جور کا وقوع زیادہ ہوتا ہے، کبھی زوج کی طرف سے، جس کا انسداد آیت وجوبِ عدل بین النساء (بیویوں کے درمیان عدل کے واجب کرنے والی آیت) سے فرمایا گیا ہے، اور مضمون بالا اسی کی تفصیل تھی، اور کبھی زوجہ کی طرف سے، جس کا بیان اب کیا جاتا ہے، اور گو اس باب میں جن نصوص کا حوالہ ہے وہ صورتِ تعدد کے ساتھ خاص نہیں، مگر چونکہ صورتِ تعدد میں ان کی سب سے زیادہ حاجت ہے جیسا ابھی اوپر ذکر کیا گیا ہے، اس لئے تعدد ہی کے ذیل میں وہ مذکور ہوتی ہیں،

وہ تعلیمات یہ ہیں:۔

آیات	ترجمہ
(۱) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا تَعْدِلُوا فَوَاحِدَةً (النساء، آیت ۳۳)	"پس اگر تم کو احتمال اس کا ہو کہ عدل نہ رکھو گے تو پھر ایک ہی بی بی پر بس کرو"
(۲) وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ لِتَذْهَبُوا بِبَعْضِ مَا آتَيْتُمُوهُنَّ (الیٰ قولہ) فَإِنْ كَرِهْتُمُوهُنَّ ، (النساء، آیت ۱۹)	"اور عورتوں کو اس غرض سے مقید مت کرو کہ جو کچھ تم لوگوں نے اُن کو دیا ہے اس میں کا کوئی حصہ وصول کرو"
(۳) وَلَنْ تَسْتَطِيعُوا أَنْ تَعْدِلُوا بَيْنَ النِّسَاءِ وَلَوْ حَرَصْتُمْ فَلَا تَمِيلُوا كُلَّ الْمَيْلِ فَتَذَرُوهَا كَالْمُعَلَّقَةِ ط (النساء، آیت ۱۲۹)	"اور تم سے یہ تو کبھی نہ ہو سکے گا کہ سب بیبیوں میں برابری رکھو، گو تمہارا جی چاہے مگر اس کا خیال رکھو کہ بالکل ایک ہی طرف نہ ڈھل جاؤ جس سے دوسری کو ایسا کر دو جیسے کوئی درمیان میں لٹکی ہو"
(۴) وَاللَّاتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ فَعِظُوهُنَّ وَاهْجُرُوهُنَّ فِي الْمَضَاجِعِ الیٰ قولہ تعالیٰ إِنْ يُرِيدَا إِصْلَاحًا يُوَفِّقِ اللَّهُ بَيْنَهُمَا ، ( )	"اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو تو ان کو زبانی نصیحت کرو اور اُن کو لیٹنے کی جگہوں میں تنہا چھوڑ دو اگر ان دونوں کو صلح کرنا منظور ہوگی تو اللہ تعالیٰ میاں بی بی میں اتفاق فرما دیں گے"
(۵) وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا نُشُوزًا أَوْ إِعْرَاضًا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يُصْلِحَا بَيْنَهُمَا صُلْحًا ط وَالصُّلْحُ خَيْرٌ ، (النساء، آیت ۱۲۸)	"اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی یا بے پرواہی کا ہو سو دونوں کو اس امر میں کوئی گناہ نہیں کہ دونوں باہم خاص طور پر صلح کرلیں، اور یہ صلح بہتر ہے"
(۶) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ إِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيَاةَ الدُّنْيَا ، (الاحزاب، آیت ۲۸)	"اے نبی آپ اپنی بیبیوں سے فرما دیجئے کہ اگر تم دنیوی زندگی اور اس کی بہار چاہتی ہو"
(۷) فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ ط (البقرہ، آیت ۲۲۹)	"سو اگر تم لوگوں کو احتمال ہو کہ وہ دونوں ضابطہ خداوندی کو قائم نہ کر سکیں گے تو دونوں پر کوئی گناہ نہ ہوگا (اس مال کے لینے دینے ...) میں

(ترجمہ حضرت مولانا اشرف علی تھانوی)

جن کے مجموعہ کا حاصل امورِ ذیل کا مجموعہ ہے، اور گو ان میں کوئی خاص ترتیب منصوص نہیں، اور نیز باعتبار حالات وخصوصیاتِ خاصہ (اپنے اپنے مخصوص حالات) کے اُن میں وقوعاً بھی کوئی خاص ترتیب لازم ودائم نہیں (خاص ترتیب عام طور پر ضروری نہیں) لیکن اور حالات میں اُن کے حقائق وآثار کے اعتبار سے اُن میں جو ترتیب مرعی ہے (یعنی اس کی رعایت کی گئی ہے) اسی ترتیب سے اس فہرست کو ذکر کرتا ہوں،

نمبر۱، صبر، زوجہ کی حماقت وکجراہی (غلط روِیہ اختیار کرنے) پر وفی ہذا قولہ تعالیٰ:۔۔۔۔۔ وَلَا تَعْضُلُوهُنَّ، الخ،

نمبر۲، اگر پھر بھی باز نہ آئے، یا مرد اس پر قادر نہ ہو تو اس کو نصیحت وفہمائش،

نمبر۳، پھر اس سے الگ دوسرے بستر پر سونا،

نمبر۴، وَاضْرِبُوهُنَّ، یعنی ضرباً غیر مبرح (سخت پٹائی نہیں)،

نمبر۵، یہ بھی نافع نہ ہو تو دو شخص فیصلے کے لئے تجویز کرنا، ایک مرد کی جانب سے ایک عورت کی جانب سے، جو دونوں کے اظہار لے کر رفع نزاع (جھگڑے کو ختم) کردیں، وھذا فی قولہ تعالیٰ وَاللّٰتِي تَخَافُونَ نُشُوزَهُنَّ (اور جو عورتیں ایسی ہوں کہ تم کو ان کی بد دماغی کا احتمال ہو)

نمبر۶، زوجہ سے کہہ دینا کہ اگر تم کو ہمارے نکاح میں رہنا منظور ہے تو فلاں فلاں شرطیں منظور کرنا پڑیں گی، یا اپنے سب حقوق معاف کردینے ہوں گے، تاکہ اس کے بعد جتنے حقوق ہم ادا کریں اُن کو غنیمت سمجھو، اور کوتاہی کے گمان کے وقت ہماری شکایت نہ کرسکو، جیسا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے حسب وحی (اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق) اپنی ازواج سے فرمادیا تھا، وھذا فی عموم قولہ تعالیٰ وَإِنِ امْرَأَةٌ خَافَتْ مِنْ بَعْلِهَا وفی قولہ (الذی ھو اعظم افراد المصلح المذکور فیما قبلہ تاثیرا) يَا أَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِأَزْوَاجِكَ اھ (اور اگر کسی عورت کو اپنے شوہر سے غالب احتمال بد دماغی کا ہو) (اے نبی صلی اللہ علیہ وسلم آپ اپنی بیبیوں سے کہدیں)۔

نمبر۷، اس پر بھی سیدھی نہ ہو تو رخصت، وھذا فی عموم قولہ تعالیٰ فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا الخ (سو اگر تم کو اس کا احتمال ہو کہ وہ دونوں ضابطۂ خداوندی کو قائم نہ رکھ سکیں گے)۔

یہ ہے فہرست جس کے اجزاء میں یہ ترتیب اکثری ہے، اور اتفاق سے اسی ترتیب سے یہ آیات بھی لکھی گئیں، پس اس دستور العمل سے جور من الزّوجات (عورتوں کی طرف سے ظلم) کا بھی پورا انسداد ہوجاتا ہے، جیسا تجربہ سے مشاہدہ ہوسکتا ہے، اب اس ضمیمہ کو ایک حکایت پر جو کہ ایک

مفید دستور العمل پر مشتمل ہے ختم کرتا ہوں، اور اس حکایت کے اس تجربہ کے تیقن ریقین ہونے میں قوت بڑھتی ہے۔

حکایت ایک صاحب ثقہ مسمّیٰ حاجی عبد الغنی ساکن محمد پور کا بیان ہے جو کہ دو زوجہ (بیویوں) کے اجتماع سے ضیق (تنگی) میں تھے، اور جو کہ تمام تدبیرات ختم کر چکے تھے، اور وہ تدبیرات نافع بھی ہوتی تھیں، مگر نزاع قطع اور خلجان رفع (جھگڑا ختم اور رشک دور) نہ ہوتا تھا، آخر انھوں نے بجز نمبر ۴ کے بوجہ اس کے کہ واجب نہیں اور بعض مواقع پر مناسب نہیں، اس ترتیب پر عمل شروع کیا، نمبر ۱۶ تک پہنچے تھے بفضلہ تعالیٰ تمام خرخشے (جھگڑے) ختم ہوگئے، اور تلخیِ عیش مبدل بہ حلاوت ہوگئی، (زندگی کی تلخی خوشگواری میں بدل گئی) نہ صرف زوج کی، بلکہ دونوں زوجہ کی بھی، اس نمبر کے امتثال (بجا لانے) کی عملی صورت ان صاحب نے یہ اختیار کی کہ اپنی دونوں زوجہ سے ایک یادداشت کی صورت میں (کہ صلح کی عظیم النفع فرد ہے، اور غالباً اسی لئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لئے تجویز کی گئی) چند امور کا عہد لیا، اور صاف کہہ دیا کہ ہمارے پاس رہنے کی یہ شرطیں ہیں، اب اختیار ہے جس شق (صورت) کو چاہے اختیار کیا جائے، چونکہ دونوں صالحہ اور سعیدہ تھیں، اس لئے انھوں نے نہایت خوشی سے سب شرطیں منظور کرلیں، اور سب کدورات (رنجشیں) صاف ہوگئیں، چونکہ اس یادداشت کے مضمون کا نافع ہونا تجربہ سے ثابت ہوا، لہٰذا ان سے حاصل کرکے اس مقام پر نقل کرتا ہوں، کہ دوسرے اہلِ ضیق (پریشان حال) بھی اس سے منتفع ہوں (یعنی نفع حاصل کرسکیں) جس سے مجوّز اور ناقل دونوں کو اجر ہو، وھو ھذا:۔

نقلِ مضمونِ مذکورہ والصلح خیرٌ

یادداشت وعدہ ہر دو اہلِ خانہ حاجی عبد الغنی:

"ہم دونوں اہلِ خانہ حاجی عبد الغنی امور ذیل کا وعدہ کرتے ہیں اللہ تعالیٰ مدد فرمائے،

نمبر ۱: ہم دونوں نے اپنے تمام حقوق واجب اور غیر واجب ہمیشہ کے لئے حاجی صاحب کو معاف کئے، ہم کسی حق کا مطالبہ نہیں کریں گے، وہ خود اپنی خوشی سے جتنا حق ادا کردیں گے ہم احسان سمجھیں گے، البتہ ادب کے ساتھ ہم کو درخواست

ے اس میں اشارہ ہو کہ مضمون ھذا ایک فرد ہے اس کلی منصوص کی ۱۲ (منہ)

کرنے کی اجازت ہے، لیکن اس کو پورا نہ کرنے کا ان کو اختیار ہے، اگر وہ پورا نہ کریں گے نہ ہم اصرار کریں گے نہ ہم کو ناگواری ہوگی،

نمبر۲: اس بناء پر ان کو اختیار ہوگا رات کو جس کے پاس چاہیں رہیں، اور خواہ کسی کے پاس بھی نہ رہیں، مردانہ میں رہیں، خواہ ایک کے پاس دوسری کے باری میں رہیں،

نمبر۳: کھانا کھانے میں ان کو اختیار ہوگا جس وقت جس جگہ جی چاہے کھائیں، خواہ کسی کے پاس بھی نہ کھائیں، بازار وغیرہ میں انتظام کرلیں، ہم کو کوئی شکایت نہ ہوگی، خواہ ایک کے ہفتہ میں دوسری کے گھر جائیں پھر خواہ گھر آکر کھائیں خواہ مردانہ میں منگائیں، خواہ ایک کے گھر سے کھانا منگا کر دوسری کے گھر میں کھائیں ہم کسی امر کے متعلق کوئی حرف زبان پر نہ لائیں گے،

نمبر۴: علیٰ ہذا دن میں یا شام میں گھر میں آنے کے متعلق ان کو اختیار ہے، خواہ وہ ایک جگہ آئیں خواہ دونوں جگہ، پھر خواہ ایک جگہ زیادہ دیر تک ٹھیریں اور ایک جگہ کم ٹھیریں، خواہ ایک جگہ بالکل نہ آئیں، خواہ دونوں جگہ نہ آئیں،

نمبر۵: علیٰ ہذا خرچ پیسے میں یا دوسری اشیاء از قسم سوغات (تحفے) وغیرہ دینے میں خواہ دونوں جگہ برابر دیں، یا کم و بیش، پھر خواہ مردانہ سے بھیجیں خواہ کسی ملازمہ کے ہاتھ سے بھجوائیں، ہر طرح ان کو اختیار ہے ہم ہر طرح خوش رہیں گے،

نمبر۶: ہم کسی چغلخور کی بات کو نہ سنیں گے، بلکہ جب وہ کچھ بات کرے گا ہم منع کر دیں گے، اور جس قدر کان میں پڑ جائے گا اس کو سچ نہ سمجھیں گے، اور نہ کسی کے سامنے اس کا ذکر کریں گے، نہ حاجی صاحب سے نہ اور کسی سے،

نمبر۷: ہم ہر امر میں جو کہ شریعت کے خلاف نہ ہو حاجی صاحب کی اطاعت کریں گے، وہ جو پوچھیں گے ہم فوراً بتلادیں گے، ان کی کسی بات کو رد نہ کریں گے، نہ اس کو جھٹلائیں گے،

نوٹ (۱): اگر ہم کبھی جان بوجھ کر یا بھول کر اس کے خلاف کریں گے اسی یادداشت سے ہم کو لاجواب کر دیا جائے،

نوٹ (۲) شرعاً اس صلح سے رجوع کرنے کا جس طرح، ہم دونوں زوجہ کو

اختیار ہے، اسی طرح حاجی صاحب کو اختیار ہے کہ ہمارے رجوع کے وقت خواہ وہ حقوقِ واجبہ کے مقیّد ہوں یا اپنی آزادی و سبکدوشی کا کوئی شرعی طریقہ اختیار کریں"

۲۹ ر ذوالحجہ ۱۳۲۵ھ (انتہی)

حقوق سے بری ہونے کا باہمی عہد کرنے کے باوجود بیویوں میں عدل کرنا چاہئے

اسی کے ساتھ یہ امر بھی قابلِ اطلاع ہے جس کی شہادت یہ احقر بھی اپنے مشاہدہ سے دیتا ہے کہ اُن صاحب نے باوجود ہر قسم کے مطالبات سے برأت حاصل کر لینے کے اس کے بعد بھی کسی قسم کے حق میں خواہ فی نفسہٖ واجب تھا یا غیر واجب سستی یا کمی نہیں کی، اصلی غرض اُن کی بے جا الزام و شکایات کا انسداد و کفِ لسان (خواہ مخواہ کے الزامات و شکایات کو روکنا اور زبان بند کرنا) تھا، جو حاصل ہو گیا نہ کہ حقوق سے سبکدوشی، اور اس کفِ لسان کا اثر طبعاً بشرطِ سلامت یہ ہوتا ہے کہ صاحبِ معاملہ میں زیادہ رفق اور شفقت (یعنی نرمی اور مہربانی) پیدا ہو جاتی ہے، چنانچہ وہاں ایسا ہی ہوا، اور ایسی صورت میں لطفِ زندگی کیوں نہ ہو، کہ زوجہ یہ سمجھ لے کہ میرا کوئی حق شوہر کے ذمہ نہیں، اور شوہر باوجود اس کے یوں سمجھے کہ میرے ذمہ اور حقوق بڑھ گئے ہیں پس ایسی حالت میں اگر شوہر کچھ حق ادا بھی کرتا تب بھی زوجہ غنیمت سمجھتی چہ جائیکہ حقوق سے بھی زیادہ ادا کرے تو زوجہ کو کس قدر راحت اور فرحت ہوگی، اور اصل اس صورت کی قرآن و حدیث میں ہے، قال اللہ تعالیٰ:۔

إِنَّمَا نُطْعِمُكُمْ لِوَجْهِ اللَّهِ لَا نُرِيدُ مِنكُمْ جَزَاءً وَلَا شُكُورًا (الدھر، آیت ۹)

"ہم تم کو محض اللہ کی رضامندی کے لئے کھانا کھلاتے ہیں، نہ ہم تم سے بدلہ چاہیں اور نہ شکریہ"

وَقَالَ رَسُولُ اللهِ صَلَّى اللهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ مَنْ صَنَعَ إِلَيْكُمْ مَعْرُوفًا فَكَافِئُوهُ فَإِنْ لَّمْ تُكَافِئُوهُ فَاثْنُوا عَلَيْهِ خَيْرًا

"یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس نے تمہارے ساتھ بھلائی کی پس تم اس کو اچھا بدلہ دو اور اگر بدلہ نہ دے سکو تو اس کی اچھی تعریف ہی کر دو"

سبحان اللہ! کیا تعلیم ہے کہ محسن کو تو یہ سکھلایا کہ تم عوض یا شکریہ کی توقع مت رکھو اور محسن الیہ (جس پر احسان کیا جاوے) کو یہ بتلایا کہ تم عوض اور شکریہ کو اپنے ذمہ سمجھو، اور جیسا یہ ایک کلی تعلیم محسن و محسن الیہ (احسان کرنے والا اور جس پر احسان کیا گیا ہو) کو کی گئی، اسی طرح خاص معاشرتِ زوجین کے باب میں یہ خصوصیت کے ساتھ وارد ہے قولہ تعالیٰ تُرْجِي مَنْ

تَشَآءُ اِلیٰ قولہ ذٰلِكَ اَدْنٰى اَنْ تَقَرَّ اَعْيُنُهُنَّ وَلَا يَحْزَنَّ وَيَرْضَيْنَ بِمَآ اٰتَيْتَهُنَّ كُلُّهُنَّ (علی تفسیر الحنفیۃ)

اس آیت میں ازواج مطہرات کو یہ عدم الزامِ حقوق (آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم پر ازواج پر حقوق لازم نہ ہونے کا حکم) سُنا کر اس کا یہ اثر تصریحًا (وضاحت کے ساتھ) بیان فرمایا، ذٰلِکَ اَدْنٰی، پس اس دستور العمل کی صحیح تقلید یہ ہے کہ زوجہ تو اپنے کسی حق کی شکایت نہ کرے، اور زوج اس کے حقوق سے زیادہ اس کی دل جوئی کرے، پھر انشاء اللہ غبار یا کدورت کا کبھی نام بھی نہ آئے گا، اور سب کی زندگی اس شعر کا مصداق ہو جائے گی ؎

بہشت آنجا کہ آزارے نباشد کسے را با کسے کارے نباشد

(”بہشت وہ جگہ ہے جہاں کسی قسم کی تکلیف نہیں، اور نہ کسی کو کسی سے کام ہے“)

غرض اگر یہ یادداشت خصوصیت کے ساتھ عورتوں کا دستور العمل رہے اور مضمون بالا عدل کا مردوں کا دستور العمل رہے تو جانبین کو حیاتِ طیّبہ (پاکیزہ زندگی) نصیب ہو جائے۔

اِصلاحِ انقلاب

متعلقِ رضاع

اس باب میں ناواقفی کے سبب متعدد کوتاہیاں اور مختلف غلطیاں کی جاتی ہیں،

دودھ شریک بہن بھائی ہونے کے لئے ایک ہی زمانہ ہونا ضروری نہیں

منجملہ اُن کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے عوام یہ سمجھتے ہیں کہ دودھ شریک بہن بھائی جب ہی ہوتے ہیں جب کہ ایک زمانہ میں کسی عورت کا دودھ پئیں، اور اگر ایک کے دودھ چھڑانے کے بعد دوسرا دودھ پئے تو دودھ شریک بہن بھائی نہیں ہوتے، سو یہ بالکل غلط ہے، بلکہ خواہ دونوں کے دودھ پینے کا زمانہ ایک ہو یا مختلف ہو دونوں حالتوں کا ایک ہی حکم ہے، یعنی دونوں حالتوں میں دودھ شریک بھائی بہن ہوجائیں گے،

حرمتِ رضاعت دو سال عمر کے بعد کسی عورت کا دودھ پینے پر ثابت نہیں ہوتا،

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ حرمتِ رضاع کے ثبوت کے لئے کسی عمر کی قید نہیں سمجھتے، حتیٰ کہ اگر غلطی سے کسی عورت کا دودھ آٹے میں جا گرے اور اس آٹے کی روٹی خاوند نے کھالی تو سمجھتے ہیں کہ حرمتِ رضاع ثابت ہوگئی، اور بی بی اس پر حرام ہوگئی، سو یہ بھی بالکل غلط ہے، بلکہ جو زمانہ بچے کے دودھ پینے کا... شریعت نے مقرر کیا ہے، یعنی دو سال جمہور کے نزدیک اور اڑھائی سال امام ابوحنیفہؒ کے نزدیک (اور اکثر حنفیہ نے بھی فتویٰ پہلے ہی قول پر دیا ہے) اس زمانہ کے اندر دودھ پینے سے حرمت ثابت ہوتی ہے، پس صورتِ مذکورہ میں یہ بی بی اپنے شوہر پر حرام نہیں ہوئی، البتہ خود عورت کا دودھ پینا بعد مدتِ رضاع (بچے کے دودھ پینے کی مدت) کے ایک حرام فعل ہے، مگر اس سے رشتہ ثابت نہیں ہوگا،

مدتِ رضاع کے اندر دودھ پینے سے حرمتِ رضاع ثابت ہوجاتی ہے

منجملہ ان کے ایک غلطی اس غلطی کے مقابلہ میں

یہ کی جاتی ہے کہ مدت رضاع کے اندر اگر اس مدت کی تکمیل سے قبل بچّہ کا دودھ چھڑا دیا جائے اور پھر کسی اتفاق سے یہ بچّہ دودھ پی لے تو بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس صورت میں بھی حرمت ثابت نہیں ہوتی، بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ خود یہ دودھ پلانا بھی حرام ہے، سو دونوں باتیں غلط ہیں، بلکہ اس صورت میں حرمتِ رضاع بھی ثابت ہو جائے گی، (فی الدر المختار ولو بعد الفطام) اور دودھ پلانا بھی حلال ہوگا،

گائے، بھیڑ، بکری کا دودھ ایک ساتھ پینے سے حرمتِ رضاع ثابت نہیں ہوتی

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ حرمتِ رضاع کو عورت کے دودھ کے ساتھ خاص نہیں سمجھتے، بلکہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر میاں بی بی گائے وغیرہ کا دودھ بھی ایک دوسرے کا جھوٹا پی لے تو وہ بھائی بہن ہو جاتے ہیں، سو یہ بھی بالکل لغو ہے، اس سے کچھ نہیں ہوتا (فی الدر المختار من ثدی آدمیۃ)

بچّہ کے دودھ پی کر قے کر لینے سے حرمتِ رضاع زائل نہیں ہوگی

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر بچّہ دودھ پی کر فوراً قے کر ڈالے تو حرمتِ رضاع بھی زائل ہو جاتی ہے مجھ کو اس غلطی عوام کی پہلے اطلاع نہ تھی، مگر مجھ سے ایک واقعہ میں استفتاء کیا گیا (فتویٰ پوچھا گیا) تو میرے حرمتِ رضاع کے حکم بتلانے پر سائل نے یہ معارضہ کیا، کہ صاحب اس بچّہ نے اوّل تو پیا تھا بہت قلیل اور پھر وہ اُگل دیا تھا، تو گویا وہ پینا باطل ہو گیا، تو حکم بھی ثابت نہ ہوگا، اُس وقت معلوم ہوا کہ بعض کا یہ بھی خیال ہے، سو خوب سمجھ لیا جائے کہ اس باب میں قلیل و کثیر (کم زیادہ) کا ایک حکم ہے، اگر ایک قطرہ بھی حلق کے اندر چلا جائے گا تو حکم رضاع ثابت ہو جائے گا (فی الدر المختار وان قل) اسی طرح اگر حلق میں جانے کے بعد قے بھی ہو جائے تب بھی حکم رضاع بدستور باقی رہے گا (وقد مرّ ایضاً حیث مرت المسئلۃ الاولیٰ من ہذا الباب)

حرمتِ رضاع جن جن صورتوں میں واجب ہوگی

اور خواہ مُنہ کے راستہ سے جائے یا ناک کے رستہ سے اور خواہ خالص دودھ جائے یا کسی دوا یا پانی میں ملا ہوا جائے اور ملنے کی صورت میں خواہ غالب ہو یا دوسری چیز کے ساتھ مساوی (برابر) ہو، سب کا ایک حکم ہے، (کذا فی الدر المختار) یہ تو علمی غلطیاں تھیں۔

بچّوں کو دودھ پلانے سے متعلق عملی کوتاہیاں،

شوہر کی اجازت کے بغیر کسی کو دودھ نہیں پلانا چاہئے،

اور اس باب میں عملی کوتاہیاں بھی ہیں، منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ بعضی عورتیں (ایسی ہوتی ہیں) کہ جس بچہ پر رحم آیا اس کو دودھ پلا دیا، حالانکہ

بلا اذن شوہر کے کسی کو دودھ پلانا مکروہ ہے، البتہ اگر بچہ کے ہلاک ہوجانے کا اندیشہ ہو وہ حالت اس سے مستثنیٰ ہے، (کذا فی البحر من الخانیہ، شامی، ج ۲، ص ۶۶۴)

رضاعی بہن کے پاس تخلیہ میں بیٹھنا جائز نہیں،

منجملہ اُن کے ایک یہ ہے کہ اکثر مرد و عورت رضاع کے رشتہ سے باہم نسبی محارم (نسب کے اعتبار سے جن سے نکاح حرام ہے ان لوگوں) کی طرح خلا ملا رکھتے ہیں جس سے بڑے بڑے فساد واقع ہوگئے ہیں، فقہاء نے یہی رنگ دیکھ کر تصریح کی ہے کہ رضاعی بہن کے پاس تخلیہ (تنہائی) میں بیٹھنا ناجائز ہے، اسی طرح مصاہرت (دامادی) کے رشتہ میں گو وہ رشتہ حُرمت ہی کا ہو، جیسے جوان ساس یا سوتیلی ماں، ان سب مواقع میں حسبِ فتویٰ علماء نامحرموں کا سا برتاؤ کرنا چاہیئے، یعنی پورا اور گہرا پردہ کیا کریں،

رشتہ نکاح کے وقت دودھ پلانیوالے سے تحقیق کرنا ضروری ہے

منجملہ ان کے ایک کوتاہی یہ ہے کہ رضاع کے باب میں یہ احتیاط کوئی نہیں کرتا کہ دودھ پلانے والے سے تحقیق کرلیں کہ اس نے کس کس کو دودھ پلایا ہے؟ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات ایسی ہی لڑکی سے اس کا رشتہ کردیا جاتا ہے کہ اس نے بھی اس عورت کا دودھ پیا تھا، اسی واسطے فقہاء نے فرمایا ہے کہ عورتوں پر واجب ہے کہ بلا ضرورت ہر بچہ کو دودھ نہ پلا دیا کریں، اور جب پلائیں تو خوب یاد رکھیں اور خوب شہرت دیدیا کریں، بلکہ احتیاطاً لکھ بھی لیا کریں، (شامی عن الفتح، ج ۲ ص ۶۶۴)

ہر کس و ناکس کا دودھ بچے کو پلانا درست نہیں

منجملہ اُن کے ایک کوتاہی جو اولاد کے آداب و حقوق کے متعلق ہے، حرمت سے متعلق نہیں ہے، کہ ہر کس و ناکس کا دودھ بچہ کو پلا دیا جاتا ہے، جس سے اس کے اخلاق پر اثر پڑتا ہے، مناسب ہے کہ صحیح المزاج، سلیم الطبع، عاقل، صالح عورت کا دودھ پلوایا کریں،

اپنے دودھ پلانے والی کا احترام اور ادب کرنا ضروری ہے،

منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ اکثر لوگ دودھ پلانے والی کا اگر وہ چھوٹی قوم سے ہو کچھ حق نہیں سمجھتے، اور اس کا کچھ احترام نہیں کرتے حالانکہ حدیثِ قولی سے جس میں غلام یا لونڈی اس کی خدمت میں پیش کرنے کی ترغیب ہے اس کا حق معلوم ہوتا ہے، اور حدیث فعلی سے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی مرضعہ (دودھ پلانیوالی، یعنی حلیمہ سعدیہ رضؓ) کا اُن کے آنے کے وقت اکرام (عزت واحترام) فرمایا، اس کا احترام ثابت ہوتا ہے،

نسبی ماں کا حق رضاعی ماں سے مقدم ہے

منجملہ ان کے ایک غلطی جو اس کے مقابل جانب میں ہے یہ ہے کہ بعضے آدمی اس کا اتنا بڑا حق سمجھتے ہیں کہ خود نسبی (حقیقی) ماں کا حق بھی اس کی

ماں ہونے کے سبب اتنا نہیں سمجھتے جتنا دودھ پلانے کے سبب سمجھتے ہیں، حتیٰ کہ خود ماں بھی، چنانچہ بعض مواقع پر یہ کہتی ہیں کہ میں دودھ نہ بخشوں گی اور مخاطب ڈر جاتا ہے، بلکہ بعض کو اس فکر میں مبتلا دیکھا گیا ہے کہ کیا کریں ہماری ماں مرگئی اور ہم دودھ نہیں بخشوانے پائے، سو یہ اصلاً و فرعاً ہر طرح باطل ہے، اصلاً تو ظاہر ہے کہ ماں کا ہر حال میں حق منصوص ہے، اور فرعاً اس لئے کہ دودھ پینا بچے کے لئے کوئی گناہ تھوڑا ہی ہے، جس کے ارتکاب کے بعد بخشوانے کی ضرورت ہو، اور اگر گناہ ہے تو بچہ اس وقت غیر مکلف (احکامِ شریعت کا شرعی اصطلاح میں پابند) تھا، ماں البتہ مکلف (احکامِ شریعت کی پابند) تھی، اس کو پلانا بھی گناہ ہوگا، وہ خود بھی گنہگار ہوئی کہ حرام چیز بچہ کو پلائی، خود اس کو اولاد سے معاف کرانا چاہئے، غرض یہ لغویات ہے،

فعلِ ناجائز کی کسی کی اولاد کو اجازت نہیں ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ اس دودھ پلانے کے سبب حضرت حلیمہؓ کا اتنا بڑا حق سمجھتے ہیں کہ اُن کی اولاد قرار دے کر ان کے لئے لوٹ مار جو کہ فعلِ حرام ہے حلال سمجھتے ہیں، بہت ہی سخت عقیدہ ہے، جب خاص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد کے لئے کسی فعلِ ناجائز کی اجازت نہیں تو آپؐ کی مرضعہ (دودھ پلانے والی) کی اولاد کا تو ان کی نسبت بعید ہی تعلق ہے، پھر سب بدوؤں کا اُن کی اولاد میں ہونا یہ بھی مہمل حکایت ہے،

فرع قابلِ توجہ اہلِ علم فقہاء نے رضاع کی تفسیر میں آدمیت کی قید لگائی ہے، اور اس کو محترز بہیمیت و رجل (جانور اور آدمی کے دودھ سے بچنے) کو لکھا ہے، مگر جنیہ سے اثباتاً یا نفیاً (ہاں یا نہ میں) تعرض (بحث) نہیں دیکھا گیا، کہ آیا وہ اس باب میں بہیمہ (جانور) کے مثل ہے، جیسے نکاح کے باب میں یہی ہے کہ جنیہ سے انسان کا نکاح جائز نہیں، یا مثل آدمی کے ہے، کہ اگر کوئی لڑکا یا لڑکی کسی جنیہ کا دودھ پئیں تو وہ دونوں رضاعی بھائی بہن ہو جائیں گے، جب تک مسئلہ کی تحقیق نہ ہو احوط موقعِ اشتباہ (شک کے موقع پر زیادہ احتیاط پر عمل کرنے) میں عملاً یہی ہوگا کہ حرمتِ رضاع کا فتویٰ دیا جائے، جیسے اڑھائی سال پر گو فتویٰ نہیں مگر احتیاط وہاں بھی یہی ہے کہ باوجود ممانعت کے اگر اس مدت کے اندر رضاع واقع ہو تو حرمت پر عمل کریں،

تنبیہ: رضاع کے مسائل نہایت دقیق (باریک) ہیں، ان میں بدون محقق متیقظ عالم (بیدار مغز تحقیق سے کام لینے والے عالم) کے کسی نیم آموز (کم علم) کے قول کو معتبر نہ سمجھیں، اور سوال کے سمجھنے سمجھانے میں بھی بہت ہی احتیاط (ہوشیاری و بیداری) سے کام لیں، فقط،

ابوابُ الطلاق

وَمَا يَلحَقُ بِہٖ

طلاق سے متعلق کوتاہیوں کا بیان ابوابِ احکام میں سے یہ باب بھی ایک وسیع باب ہے، اس لئے اس کی کوتاہیاں اور غلطیاں بھی اہتمام کے ساتھ ظاہر کرنے کے قابل ہیں،

مصلحت اور ضرورت کے موقع پر طلاق موجبِ عار نہیں، منجملہ ان کے ایک غلطی یہ ہے کہ اس کے ایقاع (یعنی طلاق دینے) کے متعلق بہت افراط و تفریط ہو رہا ہے، چنانچہ بعضے لوگ تو طلاق دینے کو اس قدر عار و عیب سمجھتے ہیں کہ خواہ کیسی ہی مصلحت وضرورت ہو اور خواہ باہم زوجین (میاں بیوی) میں کتنی ہی نا اتفاقی ہو جس سے ایک یا دونوں حقوقِ زوجیت ادا کرنے سے قاصر ہوں، اور خواہ زوجہ میں کسی درجہ کی بد دینی ہو جس کی اصلاح شوہر کی قدرت سے خارج ہو گئی ہو، چنانچہ یہی اسباب ہیں مشروعیتِ طلاق (طلاق کے مشروع ہونے) کے (چنانچہ عورت کے موذی ہونے یا بالکلیہ تارکِ صلوٰۃ ہونے کی صورت میں فقہاء نے طلاق کو مستحب اور مرد کی طرف سے عورت کے حقوق ادا نہ ہو سکنے کی صورت میں واجب کہا ہے کما فی رد المحتار) مگر پھر بھی خلافِ وضع، خاندانی ہونے کے خیال سے اس کو گوارہ نہیں کرتے، اور عمر بھر اپنی زندگی یا زوجہ کی زندگی تلخ کرتے ہیں اور اس ناگواری کا سبب اس کا ابغض المباحات (جائز چیزوں میں سب سے ناپسندیدہ) ہونا نہیں ہے، کیونکہ وہ ان مصالح وضرورت کے وقت وہ مباح مطلق ہے، بلا مبغوضیت کے (بالکل جائز، بغیر ناپسندیدگی کے) اور جب اس کا استحباب یا وجوب (مستحب یا واجب ہونا) بعض صورتوں میں ثابت ہے، اور استحباب و وجوب کا مبغوضیت (مستحب اور واجب کا ناپسندیدگی) کے ساتھ مجتمع ہونا محال ہے (جمع ہونا ناممکن ہے) اور قرآن مجید میں نص ہے لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ، اور حدیث رزین میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت سودہ رضی اللہ عنہا کو طلاق دینے کا ارادہ فرمایا تھا، پھر اُن کے عرض کرنے پر طلاق نہیں دی (کذا فی المشکوٰۃ) اسی طرح صحابہؓ

سے بکثرت منقول ہے (کذا فی ردالمحتار) تو پھر علی الاطلاق اس کو مبغوض کیسے کہہ سکتے ہیں؟ بلکہ یہ مبغوضیت اسی صورت میں ہے جبکہ کوئی داعی معتدبہ (قابلِ اعتبار محرک) نہ ہو، اس وقت بے شک مکروہ ہے، (نقلہ فی الدر المختار عن الکمال) اور حلال ہونا مبغوضیت کے منافی نہیں، کیونکہ حلال مکروہ کو بھی شامل ہے، تو حلال کی تفسیر یہ ہوگی:۔

مالیس فعلہ بلازم الشامل المباح والمندوب والواجب والمکروہ کما قال الشمنی ونقلہ فی ردالمحتار عن البحر،

(ایسا فعل جس کا کرنا ہی لازم نہ ہو اس میں مباح، مستحب، واجب اور مکروہ سب ہی شامل ہیں، جیساکہ شمنی نے کہا اور آگے ردالمحتار نے بحرالرائق سے نقل کیا۔)

طلاق کو حد درجہ معیوب سمجھنے کی عملی کی خرابیاں

اس درجہ میں معیوب سمجھنے پر مفاسدِ عملیہ متفرع ہوتے ہیں (یعنی عملی زندگی میں خرابیاں پیدا ہوتی ہیں) کہ ایسے لوگ اگر کبھی جوشِ غضب میں مغلوب (بے قابو) ہو کر طلاق دے گزرتے ہیں، تب بھی طوقِ عار (شرمندگی) سے بچنے کے لئے اس کو دبلانے کی کوشش کرتے ہیں، اور (خواہ شرعًا اس کا تدارک ممکن ہو یا نہ ہو مگر وہ اس کا قصد کرتے ہیں، چنانچہ اکثر باوجود تین طلاق واقع ہوجانے کے اس کو پھر اپنے گھر بی بی بنا کر رکھتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ چھوڑنے میں ذلت و بدنامی ہے، اور افسوس ہے کہ بدکاری میں ذلت و بدنامی نہیں سمجھتے، حالانکہ اس میں طلاق سے زیادہ ذلت و بدنامی ہے، دنیا میں بھی اور آخرت کی رسوائی و عقوبت (سزا) کا تو کچھ پوچھنا ہی نہیں، کہ کس قدر ہوگی، پھر ان میں جو بددین و بے باک (نڈر) ہیں ان کو تو حرام و حلال کی کچھ پرواہ ہی نہیں، کھلم کھلا حرام کرتے ہیں، پھر اگر عورت بھی ایسی ہی ہوئی، تب تو خوشی بخوشی حرام کا کارخانہ قائم رہتا ہے، اور اولاد حرام کی ہوتی چلی جاتی ہے، اور اگر عورت خداترس ہوئی اور اس نے کچھ عذر و انکار کیا تو اس پر ظلم کیا جاتا ہے، اور دوہرے گناہوں کا ارتکاب ہوتا ہے، زنا بھی اور ظلم بھی، مگر عورت پر واجب ہے کہ جس قدر قدرت ہو اس سے بچے، اور جب تک جان کا اندیشہ نہ ہو اس سے موافقت نہ کرے، اور جو ذرا دین کا دعویٰ رکھتے ہیں وہ اول تو اس تدارک کے لئے طرح طرح کی تدبیریں سوچتے ہیں، خواہ چلیں یا نہ چلیں، مثلاً کسی مجتہد جدید (موجودہ زمانہ میں اجتہاد کا دعویٰ کرنے والے) سے سن لیا، کہ تین طلاقیں ایک دم سے دینے سے ایک ہی طلاق ہوتی ہے، جس میں رجعت[۱] یا تجدید نکاح بلا حلالہ جائز ہے، بس اس قول کو لے لیا، اور کہتے ہیں کہ آخر

---

[۱] ایک یا دو طلاق کے بعد شوہر کو حق حاصل ہے کہ عدت پوری ہونے سے پہلے طلاق سے رجوع کرسکتا ہے، جس سے اس کی بیوی نکاح سے نہیں نکلتی، اس میں عورت کی رضامندی ضروری نہیں ۱۲ نجیب ہے۔ عدت گذرنے کے

وہ بھی تو عالم ہیں، ان کے قول پر بھی عمل جائز ہے، حالانکہ اپنے محل پر ثابت ہو چکا ہے کہ یہ قول بالکل صحیح نہیں اور نہ اُس پر عمل جائز ہے، وانظر ما نقل فی ردّ المحتار عن الفتح فی قول اکثر الطلاق (ص ۶۸۵ ج ۲)

مفتی کے سامنے جہلاء کے جاہلانہ اشکالات

یہ تو مدعیانِ علم (علم رکھنے کا دعویٰ کرنے والوں) کے حیلے ہیں اور جہلاء اور بھی جاہلانہ باتیں نکال کر اہلِ فتویٰ سے مزاحمت (جھگڑا) کرتے ہیں، کوئی کہتا ہے کہ صاحب نیت تھوڑا ہی تھی طلاق دینے کی، حالانکہ طلاقِ صریح میں نیت شرط ہی نہیں، کوئی کہتا ہے کہ صاحب ویسے ہی غصہ میں نکل گیا تھا، خوشی سے نہیں کہا، حالانکہ طلاق کا غصہ میں ہی وقوع ہو جاتا ہے، غایت ما فی الباب (زیادہ سے زیادہ اس معاملہ کی) ایسی طلاق کو مکروہ کہیں گے، مگر وقوع میں کوئی شبہ نہیں، اور جب سب تدبیروں میں ناکامی ہوتی ہے، بس اخیر فیصلہ ان لوگوں کے یہاں یہ ہوتا ہے (اور بعض جگہ خود عورتیں اس کی درخواست کرتی ہیں) کہ خیر میاں بی بی کی طرح نہ رہیں گے مگر گھر ہی میں رکھا جائے، اور نان ونفقہ دیا جایا کرے تاکہ طلاق کا نام نہ ہو اور دوسرے نکاح کی حاجت نہ ہو،

طلاق کے بعد عورت کا حکم مثل اجنبیہ کے ہے،

سو اس عمل میں بھی طرح طرح کے مفاسد ہیں، مثلاً ایک مکان میں رہنے کی صورت میں کچھ بعید نہیں کہ کسی وقت ایسی خلوت ہو کہ اُس مکان میں بجز اس مرد و عورت کے کوئی نہ رہے، تو خلوت بالاجنبیہ (اجنبی عورت سے تنہائی میں ملاقات) لازم آتی ہے، جو کہ حرام ہے، پھر چونکہ ان مرد و عورت میں ایک زمانہ تک بے تکلفی رہ چکی ہے اس لئے دوسری اجنبیات (اجنبی عورتوں) کی نسبت اس میں زیادہ احتمال ہے کہ یہ دونوں کسی فتنہ میں مبتلا ہو جائیں، نیز اپنی پچ بھرنے کے لئے مرد کو تمام عمر کے لئے نان ونفقہ کا مقید کیا جاتا ہے، اور عورت کو تمام عمر کے لئے نکاح سے محبوس (مقید) کیا جاتا ہے، پہلا فعل گویا مباح کا ایجاب (قبول کرنا) ہے اور دوسرا فعل گویا مباح کی تحریم (حرام کرنا) ہے، اور دونوں میں عملاً اعتداء عن الحدود (حدود سے تجاوز کرنا) ہے، جو کہ نصّاً مذموم ہے،

طلاق میں افراط اور تفریط دونوں مذموم ہیں

اور اُسے عار سمجھنے کی فرع یہ ہے کہ بعض اوقات زوجہ سے شرعاً تمتع جائز نہیں رہتا، مگر اس کو طلاق نہیں دیا جاتا، پس وہ نہ اس کے کام کی رہی نہ دوسرے کے کام کی، مثلاً یہ عورت زوج پر حرمتِ مصاہرت کے سبب حرام ہو گی، اور حرمتِ مصاہرت سے نکاح مرتفع (ختم) نہیں ہوتا، صرّح الفقہاء (فقہاء نے اس کی تصریح کی ہے) مگر تمتع بھی اس سے درست نہیں رہتا، ایسی صورت میں بجز طلاق کے دیدینے کے اور کوئی صورت نہیں، مگر

مگر اس عار (شرم) کے سبب طلاق نہیں دیتے، پھر یا تو اس سے متمتع ہوتے رہتے ہیں، اور یا اس کو معلقہ کر کے گھر میں ڈالے رکھتے ہیں، یہ تو اہلِ افراط کی حالت ہے، بعضے لوگ اس کے مقابلہ میں یہ تفریط کرتے ہیں، کہ طلاق دینے سے ذرا نہیں رُکتے، اُن کے لئے ادنیٰ (معمولی) بہانہ کافی ہو جاتا ہے، حالانکہ بلا سبب قوی اس کی اجازت نہیں، حدیث:

اَبْغَضُ الْحَلَالِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ (رواہ ابوداؤد)	(یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک حلال چیزوں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ چیز طلاق ہے)

اسی صورت میں ہے، اور ایسی ہی طلاق سے اس آیت میں منع فرمایا ہے،

فَاِنْ اَطَعْنَكُمْ فَلَا تَبْغُوْا عَلَيْهِنَّ سَبِيْلًا، (النساء، آیت ۳۴)	(پھر اگر وہ تمہاری اطاعت کرنا شروع کر دیں تو اُن پر بہانہ مت ڈھونڈو)
ای لا تطلبوا الفراق، فسرہ بہ الشامی،	شامی نے اس کی تفسیر جدائی کا طریقہ اختیار کرنے سے کی ہے۔

اور ایسی طلاق بلا وجہ میں اتنے ممنوعات (برائیوں) کا ارتکاب ہے، حماقت و سفاہت رائے و کفرانِ نعمت نکاح و ایذاء رسانی بزوجہ و بخاندانِ زوجہ و باولادِ زوجہ[عہ] (کذا فی ردالمحتار) اور زوجہ کا ذلیل اور بدنام کرنا علاوہ برآں (اس کے علاوہ) کیونکہ اس پر کوئی شبہ بدکاری کا کرے گا، کوئی بدخلقی (بُرے اخلاق) کا کرے گا تو دوسری جگہ اس کا نکاح مشکل ہوگا تو تمام عمر اس کی مصیبت میں گزرے گی، اس مقام پر مجھ کو ایک عبارت یاد آئی جو میرے ایک دوست نے میرے پاس اس مضمون کے متعلق لکھ کر بھیجی تھی، اس کو نقل کرتا ہوں:-

فی فتح القدیر فمن المبیحۃ ان یلقی الیہ عدم اشتہائہا بحیث یعجز اوینظر باکراھہ نفسہ علی جماعہا فھذا اذا وقع فان کان قادراً علی طول غیرہا مع استبقائہا ورضیت باقامتہا	(فتح القدیر میں ہے کہ طلاق کو مباح قرار دینے والی صورتوں میں سے ایک یہ بات ہے کہ خاوند کے دل میں بیوی سے متعلق عدمِ اشتہار ڈال دیا جائے اس طرح کہ وہ اپنے آپ کو عورت کے ساتھ جماع کرنے پر مجبور کرنے کے باوجود عاجز ہو یا ایسا کرنے

عہ یعنی بلا ضرورت طلاق دینے سے اتنے لوگوں کو تکلیف پہنچے گی اس لئے مذکورہ حالت میں طلاق مکروہ ہے، (احقر قریشی)

فی عصمة بلا وطی او بلا قسم فیکرہ طلاقہ کما کان بین رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم وسودۃ وان لم یکن قادرا علیٰ طولہا او لم ترضیٰ ھی بک بترک حقھا فھو مباح لان مقلب القلوب رب العلمین ؎

سے اُسے ضرر پہنچے، تو یہ معاملہ جب واقع ہو اگر اس وقت وہ دوسری عورت پر جماع کے لئے قادر ہو، اور اگر وہ عورت بغیر وطی یا بغیر نوبت کے اس کے نکاح میں رہنے پر راضی ہو تو پھر اُس عورت کو طلاق دینا مکروہ ہے، جیسا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اور حضرت سودہؓ کے درمیان ایسا تھا، اور اگر وہ اپنے حق کو چھوڑنے کے لئے راضی نہ ہو تو طلاق مباح ہے، اس لئے کہ دلوں کو پھیرنے والے رب العلمین ہیں ؎؎

بلاضرورتِ شدیدہ طلاق مانگنا سخت ممنوع ہے،

اسی تفریط کے قبیل سے ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ ادنیٰ ادنیٰ بات پر شوہر سے طلاق مانگتی ہیں، اس باب میں حدیث میں سخت وعید آئی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جو عورت بدون کسی ضرورت شدیدہ کے اپنے شوہر سے طلاق کی درخواست کرے، اس پر جنت کی خوشبو حرام ہے، روایت کیا اس کو احمد اور ترمذی اور ابوداؤد اور ابن ماجہ و دارمی نے (کذا فی المشکوٰۃ)

کسی دوسری عورت کے لئے طلاق کی درخواست بھی ممنوع ہے

اور جس طرح اپنے لئے طلاق مانگنا ممنوع ہے اسی طرح دوسری عورت کے لئے طلاق کی درخواست کرنا، مثلاً کسی مرد نے اس سے نکاح کی درخواست کی جس کے نکاح میں ایک عورت ہے، اور یہ اُس سے یہ کہے کہ پہلی بی بی کو طلاق دیدو تب نکاح کروں گی، اس سے بھی حدیث میں ممانعت آئی ہے، اور اپنی قسمت پر راضی رہنے کا حکم آیا ہے، اس حدیث کے الفاظ اس وقت یاد نہیں، ایسے الفاظ ہیں:

لا تسأل طلاق اختھا لتکفئ مافی انائھا،

"اپنی بہن کے لئے طلاق کا سوال مت کر اس غرض سے کہ تو اس کے برتن کی چیز بھی حاصل کرلے"

تین طلاق ایک دم دینا گناہ ہے

ایک کوتاہی طلاق کے باب میں یہ شائع ہے کہ جب طلاق دیتے ہیں تین ہی دیتے ہیں، اس طرف رُکتے نہیں، سو ایسا کرنا اوّل تو گناہ ہے، کما فی الدر المختار:-

ویحرم لو بدعیا الی ان قال والبدعی ثلث متفرقة او ثنتان بمرة او مرتین فی طھر واحد

"اگر طلاق بدعت ہو تو حرام ہے، اور .... طلاقِ بدعی تین طلاقیں ہیں، الگ الگ یا دو طلاقیں ایک ہی دفعہ

لارجعة فيه اوواحدة فى طهر وطئت فيه اوواحدة فى حيض موطوءة فى ردالمحتار قوله ثلث متفرقة وكذا بكلمة واحدة بالاولى اه

یا دو مرتبہ ایک طہر میں جس میں رجوع نہ کیا ہو یا ایک طلاق ایسے طہر میں جس میں وطی کی گئی ہو یا ایک طلاق ہے موطوئہ کے ایامِ حیض میں، رد المحتار میں ہو مصنف کا قول تین طلاق الگ الگ، اس ایک لفظ سے تین طلاق دینا بدرجۂ اولیٰ بدعت ہوا،)

تین طلاق ایک ساتھ دینے کے دنیوی مفاسد

اور علاوہ گناہ کے یہ دنیوی مصلحت کے بھی اس لئے خلاف ہے کہ بعض اوقات بعد طلاق کے آدمی نادم ہوتا ہے، تو اگر ایک طلاق دیا ہو تو اگر وہ رجعی ہو تب تو رجعت کرکے اس کا تدارک کرسکتا ہے، اور اگر بائنہ ہے تو گو رجعت نہیں ہوسکتی لیکن زوجہ کی رضامندی سے نکاحِ جدید تو ہوسکتا ہے، بہرحال تدارک تو آسانی سے ممکن ہی ایک صورت میں محض ارادۂ زوج سے ایک صورت میں ارادۂ زوجین سے، اور تین ہیں تو دونوں کے ارادہ سے بھی کوئی تدارک ممکن نہیں، جب تک کہ تیسرا آدمی حلالہ کرنے والا نہ ہو، پھر اس حلالہ کا تدارک ہونا بھی مشکوک (مشتبہ) ہے، کیونکہ اگر حلالہ کرنے والے سے یہ شرط ٹھیرائی جائے کہ صحبت کرکے اس کو طلاق دیدینا تب تو اس فعل سے حدیث میں لعنت آئی ہے، محلِّل (حلالہ کرنے والے) پر بھی اور محلَّل لہ (جس کے لئے حلالہ کیا جائے) اس پر بھی، اور فقہاء نے اس کو مکروہ تحریمی کہا ہے (کذافی الدر المختار) اور پھر شرط کے بعد بھی طلاق دینا اس کے اختیار میں ہے، زوجین کے اختیار سے خارج ہے، اور اگر یہ شرط ٹھیرائی تو اس صورت میں تدارک کا بعید تر ہونا اور بھی ظاہر ہے، سو تین طلاق میں یہ خرابی ہے،

ایک طلاق بائن دینا بھی بدعت ہے

بلکہ بعض فقہاء نے واحدہ بائنہ (ایک طلاق بائن) کو بھی بدعی کہا ہے جو کہ حرام ہے، کمافی ردالمحتار؛

فالواحدة البائنة بدعية فى ظاهر الرواية (ص ٦٥٥ ج ٢)

"یعنی ایک بائن طلاق بھی ظاہر روایت کے اعتبار سے بدعی طلاق ہے"،)

کیونکہ جو مصلحت تھی توسیعِ عدد (تعدادِ طلاق کے زیادہ ہونے) میں کہ شوہر کو اگر ندامت ہو تو تدارک اس کے قبضہ میں ہو، یہ مصلحتِ واحدہ بائنہ میں بھی فوت ہوئی ہی، اس مصلحت کا اس عبارت میں ذکر ہے،

ومنها شرعه ثلثا لان النفس

("اور اسی قبیل سے تین طلاق کی مشروعیت ہی کیونکہ

كذ وبة بما تظهر عدم الحاجة اليها ثم يحصل الندم فشرع ثلثاً ليجرب نفسه وثانياً اھ رد المحتار عن فتح القدير ص ۶۸۴ ج ۲)

نفس جھوٹا ہے، اس کی ضرورت نہ ہونے کا اظہار کرتا ہے، پھر نادم ہوتا ہے، اس لئے شریعت نے تین طلاقیں مشروع کیں تاکہ اس کے نفس کو سوچنے سمجھنے کا اچھی طرح موقع مل جائے۔"

حیض اور نفاس کی حالت میں طلاق دینا گناہ ہے

اسی طرح طلاق دینے کے وقت اس کا خیال نہیں رہتا کہ یہ اس وقت حائضہ (حیض والی) تو نہیں یا اگر غیر حائضہ ہے تو اس طُہر میں اس سے ہمبستری تو نہیں ہوئی، حالانکہ حالتِ حیض میں یا ایسے طُہر میں جس میں ہمبستری ہوگئی ہو طلاق دینا گناہ ہے، (کما مر عن الدر المختار) اور نفاس میں طلاق دینا ایسا ہی ہے جیسے حیض میں طلاق دینا (شامی، ج ۲ ص ۲۹۰)

غصہ یا ہنسی میں طلاق دینے سے طلاق ہو جاتی ہے

ایک غلطی طلاق کے باب میں بعض جہلاء میں یہ ہے کہ ہنسی میں یا غصہ میں بی بی کو طلاق کہہ کر پکارتے ہیں، اور سمجھتے ہیں کہ اس سے طلاق نہیں ہوئی، حالانکہ اس سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے[1]،

طلاق کی تعداد صرف تین تک ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعض لوگوں نے یہ مسئلہ سُن لیا کہ اگر ایک طلاق دے کر رجوع کرلے تو نکاح بدستور قائم رہتا ہے، تو اس مسئلہ کے معنی یہ سمجھتے ہیں کہ خواہ کتنی ہی بار ایسی حرکت کرے ہمیشہ رجعت جائز ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ مسئلہ اس طرح نہیں ہے، طلاق کی حد ہی تین ہے، خواہ ایک بار یا دو بار یا تین بار میں، اور خواہ درمیان میں رجعت ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، پس اگر کسی نے ایک طلاق رجعی دے کر رجعت کرلی، یہ رجعت درست ہے، کیونکہ ایک طلاق کے بعد ہوئی، پھر اگر دوسری طلاق رجعی دے کر پھر رجعت کرلی یہ رجعت بھی درست ہے، کیونکہ یہ رجعت دو طلاق کے بعد ہوئی، اور اس کو دو طلاق کے بعد اس لئے کہا جائے گا کہ اس دوسری طلاق کے ساتھ اس پہلی طلاق کو بھی شمار کیا جائے گا، اگرچہ رجعت ہو چکی تھی، سو رجعت سے طلاق

---

[1] مشکوٰۃ میں بروایت ترمذی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد مروی ہے ثَلَاثٌ جِدُّهُنَّ جِدٌّ وَهَزْلُهُنَّ جِدٌّ اَلنِّكَاحُ وَالطَّلَاقُ وَالرَّجْعَةُ یعنی تین چیزیں ایسی ہیں جو ارادہ کرنے سے بھی واقع ہو جاتی ہیں، اور ہنسی دل لگی میں بھی وقوع پذیر ہو جاتی ہیں، اور وہ ہیں نکاح، طلاق اور رجعت (یعنی طلاق دے کر پھر رجوع کرلینا) (بندہ احقر قریشی غفرلہٗ)

کا اثر جاتا رہا، مگر طلاق کی ذات موجود ہے، پھر اگر اس نے تیسری طلاق دی اب رجعت درست نہیں، کیونکہ حسب تقریر مذکور یہ تین طلاق کے بعد رجعت ہوئی، اور تین طلاق کے بعد رجعت درست نہیں، اسی طرح اگر ایک یا دو طلاق کے بعد رجعت نہ کی ہو اور عدت گذارنے سے وہ نکاح زائل (ختم) ہوگیا ہو اور پھر دونوں نے راضی ہوکر باہم نکاح کرلیا ہو اور پھر اتفاق طلاق دینے کا ہو تو اس طلاق کے وقت پھر سابق طلاقوں کو جمع کیا جائے گا، جب جمع ہوکر مجموعہ تین ہوجائے گا پھر رجعت جائز نہ رہے گی، البتہ صرف ایک صورت ہے پہلی طلاق کے کالعدم ہوجانے کی، اور وہ صورت یہ ہے کہ اس شوہر کے بعد عدت گزار کر اس عورت نے دوسرے شوہر سے نکاح کرلیا، اور اس نے ہمبستری کے بعد طلاق دیدی، یا ہمبستری کے بعد مرگیا، اور پھر یہ شوہر اوّل کے نکاح میں آگئی، اب البتہ پہلی طلاقوں کا کچھ اعتبار نہ ہوگا، یعنی یہ از سر نو تین طلاقوں کا مالک ہوجائے گا، جس طرح اپنے نکاح اوّل میں تین طلاق کا مالک تھا، مگر یہ امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے، اور امام محمد رحمہ اللہ نے اس میں خلاف کیا ہے، اور دونوں کی ترجیح میں علماء نے اختلاف کیا ہے، (الدر المختار ورد المحتار، ج ۲ ص ۸۶۳)

تنبیہ:- یہ دربارۂ رجعت طلاقِ رجعی میں ہے، بائنہ میں نہیں، تفصیل اس کی فقہ میں ہے، اور بقدرِ ضرورت بہشتی زیور میں بھی ہے، ملاحظہ کرلیا جائے، فقط

وسط ماہ شعبان ۱۳۳۷ھ

شوہر کی تنہائی میں طلاق کا مسئلہ ایک عام غلطی باب طلاق میں یہ ہے کہ بعض اوقات منکوحہ دعویٰ کرتی ہے کہ شوہر نے مجھ کو طلاق دیدی ہے، مگر کوئی گواہ پیش نہیں کرسکتی، تنہائی میں طلاق دینا بیان کرتی ہے، اس موقع میں لوگ دو قسم کی غلطیاں کرتے ہیں، اکثر تو اس صورت میں طلاق واقع نہ ہونے کا حکم کرتے ہیں، اور کہتے ہیں کہ اگر بدون گواہوں کے عورت کے قول کا اعتبار کرلیا جائے تو بس عورتیں تو خوب آزاد ہوجائیں گی، ذرا شوہر سے اَن بَن ہوئی اور طلاق کا دعویٰ دھر مارا، اور بعضے عورت کی بیکسی پر ترحم کرکے اور قرائنِ عادیہ سے کام لے کر (کہ عورت کی مقابلہ شوہر کے کب جھوٹ بولنے کی ہمت ہوتی ہے، یا یہ کہ عورت شوہر سے جدا ہونے کو کب گوارا کرتی ہے، اگر وہ طلاق نہ دیتا تو بھلا عورت کو ایسے دعوے کی کیا ضرورت تھی) طلاق واقع ہونے کا حکم کردیتے ہیں، حالانکہ دونوں فریق کے استدلالات لچر ہیں، فریق ثانی کا تو ظاہر ہے کہ اس کے خلاف کا کثرت سے مشاہدہ کیا جاتا ہے، بہت عورتیں بیباک بھی ہوتی ہیں، اور جھوٹ بھی بولتی ہیں، اور شوہر سے نفرت رکھنے والیاں بھی بہت ہیں، اور فریق اوّل کا اس لئے کہ کوئی اس کے مقابلہ میں یوں کہہ سکتا ہے کہ اگر عورت کی علی الاطلاق

تکذیب کردی جائے تو جن صورتوں میں شوہر قصداً تنہائی میں اس لئے طلاق دے کہ دعوے کے وقت انکار کرسکوں اور عمر بھر اس کو پریشان کروں تو عورتیں سخت قید میں اور ظلم میں گرفتار ہو جائیں گی، یہ تو معارضہ ہے، اور اس فریق کی دلیل کا جواب یہ ہے کہ یہ شبہ اس وقت کیا جاسکتا ہے جب کہ ہم یہ حکم دیں کہ طلاق واقع ہوگئی، سو اس حکم کے لئے بے شک گواہوں کی ضرورت ہے، بدون گواہوں کے ایسا حکم نہیں دیا جاسکتا، لیکن اگر یہ حکم نہ دیا جائے، کیونکہ غیب کی خبر تو اللہ تعالیٰ کو ہے، بلکہ عورت کو یہ مسئلہ بتلایا جائے کہ اگر واقعی اس نے تیرے سامنے طلاق دی ہے تو تجھ کو اس سے علیحدہ رہنا چاہئے، جس صورت میں رجعت ناجائز ہو اس سے ہمبستر نہ ہونا چاہئے، تو اس حکم میں یہ واقع نہ ہوگا، غرض حکم بالطلاق اور چیز ہے اور حکم بصون النفس بشرطِ طلاق اور چیز ہے،

غصہ اور مذاق میں بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ ایسے ہی بطور ہزل (مذاق) کے مُنہ سے لفظ طلاق نکال دیتے ہیں، مگر ان کا قصد طلاق دینے کا نہیں ہوتا، تو بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اس سے طلاق واقع نہیں ہوتی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ اس صورت میں طلاق واقع ہو جائے گی، کیونکہ تکلم تو بالقصد (بات کرنا تو ارادہ کے ساتھ) ہوا ہے، گو اس کے ساتھ اس کے معنی کو واقع ہونے کا قصد نہیں ہوا، بلکہ اس کے عدمِ وقوع (واقع نہ ہونے) کا قصد ہوا ہے سو یہ شریعت میں معتبر نہیں، بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ یوں سمجھے ہوئے ہیں کہ غصہ میں طلاق واقع نہیں ہوتی، یہ بھی غلط مسئلہ ہے، طلاق غصّہ میں بھی واقع ہو جاتی ہے، اور طلاق تو اکثر غصّہ میں ہی دی جاتی ہے،

زبردستی سے بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے، بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی زبردستی کسی سے طلاق دلوادے تو طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بات بھی صحیح نہیں، اکراہ (زبردستی) میں بھی طلاق واقع ہوتی ہے، گو اکراہ کرنے والے پر مواخذہ ہو، جیسے کوئی زبردستی کسی کو کسی سے پٹوادے تو کیا اس ضرب کا اثر نہ ہوگا، یعنی چوٹ نہ لگے گی؟

طلاق کا لفظ مُنہ سے نکالتے ہی طلاق واقع ہو جاتی ہے، اسی طرح تلفّظ بالطلاق (طلاق کا لفظ زبان سے نکالنے) کا اثر وقوعِ طلاق (طلاق کا واقع ہونا) ہے وہ بھی واقع ہو جائے گی، اسی طرح اگر مُنہ سے لفظ طلاق قصداً نہ کہے، بلکہ ویسے ہی مُنہ سے بلا ارادہ نکل گیا، یا کوئی شخص الفاظ طلاق کے معنی نہ جانتا ہو کچھ اور مطلب سمجھ کر مُنہ سے کہہ دیا تو ان دونوں صورتوں میں قضاءً (دنیاوی فیصلے کے اعتبار سے) تو طلاق کا وقوع ہو گیا، یعنی عورت کو جائز نہیں کہ اس سے تعلق زوجیت کا

رکھے بلکہ مرد کو بقدر قدرت روکے، اور اگر روکنے پر قدرت نہ رہی بلکہ اندیشہ جان کے تلف (ضائع) ہونے کا یا ظلم شدید کا ہو جس کا تحمل نہ ہو سکے تو پھر اس عورت پر گناہ نہ ہوگا، لیکن اگر فرضاً عورت کو اس واقع کی اطلاع نہ ہو تو مرد پر یہ واجب نہیں کہ اس کو اطلاع کرے، بلکہ یہی سمجھے کہ طلاق واقع نہیں ہوئی،

بلا قصور بھی طلاق واقع ہو جاتی ہے ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ بے قصور طلاق دینے سے طلاق نہیں ہوتی، یا بلا رضامندی عورت کے طلاق نہیں ہوتی، سو یہ دونوں باتیں بھی غلط ہیں، دونوں حالت میں طلاق واقع ہو جاتی ہے، گو بلا قصور ایسا کرنا سخت مذموم ہے،

نشہ کی حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع ہو جاتی ہے بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نشہ کی حالت میں مثل جنون کے غیر مکلف ہوتا ہے اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بھی غلط ہے، اس کا حکم جنون کا سا نہیں ہے، البتہ اگر کسی حلال چیز کے کھانے سے ضعفِ مزاج ... (طبیعت کی کمزوری) کے سبب نشہ ہو گیا اس نشہ کا حکم مثل جنون کے ہے، کہ اس حالت میں طلاق دینے سے طلاق واقع نہ ہوگی،

کلمۂ کفر زبان سے نکل جانے پر تجدیدِ نکاح ضروری ہے، بعض لوگ صرف طلاق ہی کو مزیلِ نکاح (نکاح ختم کرنے والی) سمجھتے ہیں یعنی زوالِ نکاح کو صرف طلاق میں منحصر سمجھتے ہیں، چنانچہ اس بنا پر اگر کسی سے کلمۂ کفر صادر ہو جائے تو تجدیدِ ایمان کی تو ضرورت سمجھی جاتی ہے مگر تجدیدِ نکاح کی ضرورت نہیں سمجھتے، حالانکہ مرتد ہو جانا بھی سبب زوالِ نکاح ہے، بعد تجدیدِ ایمان کے تجدیدِ نکاح بھی واجب ہے۔

شوہر کو باپ یا بھائی کہنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی ایک غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعض ایسے اسباب کو موجبِ حرمت سمجھتے ہیں جو واقع میں مزیلِ حلّت (حلال ہونے کو ختم کرنیوالا) نہیں، جیسے عورت اپنے شوہر کو باپ یا بھائی کہہ دے تو اس سے نہ طلاق ہو، نہ وہ اس پر حرام ہو، یعنی ظہار بھی نہیں نہیں ہوتا، بلکہ اگر مرد بھی عورت کو یہ کہہ دے کہ تو میری ماں ہے یا بہن ہے تب بھی ایک لغویات تو ہے لیکن اس کا اثر نکاح پر یا حلّت پر کچھ بھی نہیں ہوا، البتہ بعض الفاظ سے ظہار ہو جاتا ہے، تو وہ خاص خاص الفاظ ہیں، جو مع اپنے حکم کے کتبِ فقہ میں مذکور ہیں،

ایلاء اور اس کا حکم، ایک غلطی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعض اسباب طلاق کو اسبابِ طلاق نہیں سمجھتے، بیان اس کا یہ ہے کہ اگر کوئی شخص یہ قسم کھالے کہ میں اپنی بی بی کے پاس کبھی نہ جاؤں گا، اور وہ مدّت چار مہینے یا چار مہینے سے زائد ہو تو اس کا حکم یہ ہے کہ اگر چار مہینے سے پہلے اس نے قسم

توڑدی اور بی بی کے پاس چلا گیا تب تو نکاح باقی رہا اور صرف کفارۂ قسم کا دینا پڑے گا، اور اگر چار مہینے اپنی قسم پر رہا تو چار مہینے گزرنے پر اس عورت پر طلاق بائن واقع ہو گئی، اس کو ایلاء کہتے ہیں، اور اگر وہ مدت چار مہینے سے کم ہے تو اس میں طلاق تو کسی حال میں واقع نہیں ہوتی صرف تفصیل یہ ہے کہ اگر قسم پوری کر دی تو خیر اور اگر قسم توڑ دی تو صرف کفارۂ[۱] قسم کا دینا پڑے گا،

فسخِ نکاح بدونِ قاضی مسلم کے فیصلہ کے نہیں ہو سکتا، بعضے لوگ اس غلطی میں ہیں کہ انھوں نے یہ مسئلہ سُنا کہ اگر بجز باپ یا دادا کے کوئی اور ولی نابالغ عورت کا نکاح کر دے تو گو اس وقت نکاح تو ہو جاتا ہے مگر بالغ ہو کر اس کو فسخ کرنا جائز ہے، اور اس کو سُن کر یہ سمجھے کہ صرف اس عورت کا فسخ کر دینا کافی ہے تو سمجھ لینا چاہئے کہ اس مسئلہ میں اوّل تو متعدد شرائط ہیں، دوسرے ان شرائط کے بعد بھی فسخ بدون حکم قاضی یعنی حاکم مسلم کے نہیں ہو سکتا، اور غیر مسلم عدالت کا فسخ یا تفریق کافی نہیں، جب تک ایسا نہ ہو نکاح صحیح اور مکمل ہے،

شوہر کے باپ کو اپنی بہو کو طلاق دینے کا کوئی اختیار نہیں، بعضے لوگ اس غلطی میں (مبتلا) ہیں کہ نابالغ کی بی بی کو یا مجنون (پاگل) کی بیوی کو اس نابالغ یا مجنون کا باپ طلاق دے سکتا ہے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ بجز شوہر کے یا شوہر جس کو اختیار دیدے یعنی وکیل بالطلاق کے اور کسی کو طلاق دینے کا اختیار نہیں،

کسی کا خط بغیر اجازت کھولنے سے بیوی پر طلاق واقع نہیں ہوتی، بعضے لوگ ایسا کرتے ہیں کہ کسی خط کے لفافہ پر مثلاً یہ لکھ دیتے ہیں کہ اگر کوئی یہ خط کھولے تو اس کی بی بی پر طلاق، اور وہ لکھنے والے بھی اور بہت سے دیکھنے والے بھی یوں سمجھتے ہیں کہ جو کوئی کھولے گا اس کی بی بی پر طلاق واقع ہو جائے گی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ اسی قاعدۂ مذکورہ مسئلہ متصلہ (جو مسئلہ اس سے پہلے مذکور ہے) کی بناء پر یہ سمجھنا بھی محض غلط ہے اس کے خلاف کرنے سے طلاق واقع نہ ہو گی، گو کسی کا خط بلا اذن (بغیر اجازت) دیکھنا یا اسی طرح کسی چیز میں تصرّف بلا اجازت کرنا مستقل دلیل سے حرام ہے، مگر طلاق واقع ہونا اور بات ہے،

تعلیق میں محض نیت کافی نہیں ایک غلطی درباب فیصلہ باہمی زوجین متعلق طلاق و معافیِ مہر درمیاں بیوی

---

[۱] قسم توڑنے کا کفارہ تین مسلسل روزے یا دس محتاجوں کو دو وقت پیٹ بھر کر کھانا کھلانا ہے، اگر اناج دینا چاہیں تو ہر محتاج کو احتیاطاً دو سیر گندم یا چار سیر جو یا انکی قیمت بھی دے سکتا ہے، مجیب

کے درمیان طلاق اور معافیِ مہر کے بارے میں فیصلہ) سے کے یہ ہوتی ہے کہ بنا بر مصالح (مصلحتوں کی بناء پر) یہ قرار داد (تجویز) ہوتی ہے کہ شوہر طلاق لکھ دے، اور منکوحہ مہر کا معافی نامہ لکھ دے، اب اس کی ترتیب کے متعلق دو غلطیاں ہوتی ہیں، کبھی تو یہ ہوتا ہے کہ مرد نے پہلے طلاق نامہ لکھ دیا اور طلاق واقع ہو گئی، گو عورت کے حوالہ نہ کیا گیا ہو، اب عورت نے مہر معاف کرنے سے انکار کر دیا، تو مرد کا نقصان ہوا، اور کبھی یہ ہوتا ہے کہ عورت نے مہر کا معافی نامہ لکھ دیا اور مہر معاف ہو گیا، گو مرد کو حوالہ نہ کیا گیا ہو، اب مرد طلاق دینے سے انکار کرتا ہے، تو اس میں عورت کا خسارہ ہوا، کیونکہ مہر کی معافی میں بھی اور طلاق میں بھی نیت تعلیق کی ہے، مگر تعلیق میں محض نیت کافی نہیں، لفظوں میں اس کی تصریح ضروری ہے، اس لئے اس کا ایسا طریقہ بتلایا جاتا ہے کہ دونوں کا مقصود حاصل ہو جائے اور کسی کو افسوس نہ ہو، وہ طریقہ یہ ہے کہ مرد جو طلاق نامہ لکھے تو اس طرح لکھے کہ اگر عورت مجھ کو مہر معاف کر دے تو میری طرف سے اس کو طلاق بائن ہو جائے، اس کے بعد عورت نے اگر معافی نامہ مہر کا نہ لکھا تو عورت پر طلاق واقع نہیں ہوئی، اور مرد خسارہ سے بچا رہا، اور اگر معافی نامہ لکھ دیا تو طلاق ہو گئی، مگر ایسے وقت میں کہ مہر بھی معاف ہو گیا، غرض دونوں میں سے کسی کو دھوکا نہ ہوا،

طلاق کے بارے میں اہلِ علم کا ایک مغالطہ

ایک غلطی بعض اہلِ علم کو یہ ہو جاتی ہے کہ فقہا نے اِخْتَارِیْ (تجھے طلاق کا اختیار ہے) کو کنایات طلاق (طلاق کے لئے استعمال ہونے والے الفاظ) میں سے لکھا ہے، تو بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر یہ لفظ بہ نیت طلاق کہہ دیا تو طلاق بائن ہو جاتی ہے، حالانکہ یہ غلط ہے، اس لفظ سے یا اس کے ہم معنی مثل اَمْرُکِ بِیَدِکِ وغیرہ (تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے یا تیرے قبضہ میں ہے) سے وقوع طلاق کی یہ بھی شرط ہے کہ اس کہنے کے بعد عورت اپنی طلاق کو اختیار کر لے، اس صورت میں یہ تفصیل ہے کہ اگر مرد نے اس لفظ کے کہنے میں نیت طلاق کی کی تھی تو طلاق ہو گی ورنہ نہیں، اور اگر عورت خاموش رہی تو صرف مرد کے اِخْتَارِیْ کہنے سے اگرچہ اس میں نیت طلاق کی بھی کی ہو، طلاق واقع نہ ہو گی، درمختار میں تصریح ہے:۔

ولا تقع به (اى بقوله اختارى) ولا بامرك بيدك مالم تعلق المرأة نفسها كما يأتى،	(یعنی خاوند نے بیوی سے کہا تجھے اختیار ہے، یا تیرا معاملہ تیرے ہاتھ میں ہے تو اس کہنے سے طلاق واقع نہیں ہو گی، جب تک کہ عورت نے اپنے آپ کو معلق نہ کیا ہو، جیسا کہ آگے آ رہا ہے۔)

ردالمحتار میں ہے:۔

قولہ مالم تعلق ای معنیۃ الزوج الطلاق اودلالۃ الحال لان ذلک کنایۃ تفویض لاکنایۃ ایقاع کما یأتی فی الباب الاٰتی، قلت ما الطف تعلیلہ بقولہ لان ذلک کنایۃ تفویض الخ،

"جب تک عورت نے خاوند کے ساتھ طلاق کو معلق نہ کیا ہو یا دلالتِ حال کے ساتھ، کیونکہ یہ سپرد کرنیکا کنایہ ہے واقعہ کرنے کا کنایہ نہیں، جیسا آگے آتا ہے، میں کہتا ہوں کہ کس قدر طلاق کی وجہ بیان کرنے میں لطافت پیدا کر دی ہے"،

غائبانہ طلاق بھی واقع ہوجاتی ہے

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک عورت سامنے نہ ہو طلاق واقع نہیں ہوتی، سو یہ بھی غلط ہے، غائبانہ طلاق بھی واقع ہو جاتی ہے،

لفظ "طلاق" صحیح مخرج سے ادا نہ ہو تب بھی طلاق واقع ہوجاتی ہے

بعضے لکھے پڑھے لوگوں نے ایک جہالت کی کہ طلاق دینے والے کو یہ فتویٰ دیا کہ تو نے طلاق میں حرف طاء کو مخرج سے ادا نہیں کیا بلکہ بجائے اس کے حرف تاء فوقانیہ سے کہا، اس لئے طلاق واقع نہیں ہوئی، سو فقہاء نے تصریحاً غلط حرف سے طلاق واقع ہوجانے کو لکھا ہے،

رنجش کی بناء پر بیوی کے ناجائز جگہ پر بیٹھنے سے طلاق واقع نہیں ہوتی

ایک غلطی اس باب میں یہ ہے کہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ اگر میاں بی بی میں بہت مدت تک رنجش کے سبب بے تعلقی رہی خصوص جب کہ وہ دوسری جگہ ناجائز طور پر بیٹھ رہی تو خود بخود طلاق ہوجاتی ہے، سو یہ بھی غلط ہے، گو اس فعل سے معصیت (گناہ) ہے، مگر طلاق واقع نہیں ہوتی، مرد کو اختیار ہے جب چاہے اس عورت کو زوجیت کے طور پر قبضہ کرلے،

شوہر کے مرض الوفات میں طلاق پانے والی عورت کو میراث سے حصہ ملے گا،

ایک غلطی بابِ طلاق میں بہت دقیق ہے، جو ایک مسئلہ کے نہ جاننے سے واقع ہوتی ہے جو کہ بہت کم معلوم ہے، خصوص اس کے بعض جزئیات سے، تو بعض طالب علم بھی بے خبر ہیں، اول وہ مسئلہ سمجھ لیا جائے پھر اس غلطی پر متنبہ کیا جائے گا، مسئلہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مرض وفات میں اپنی مدخولہ بی بی (جس سے ہمبستری ہوچکی ہو) کو بدون اُس کی رضامندی کے طلاق بائن دیدے، اور وہ شخص عدت گذرنے کے قبل مرجائے تو ظاہراً تو شبہ ہوتا ہے کہ جب طلاق بائن[a] سے نکاح کا علاقہ قطع ہوگیا تو اس کو

---

[a] طلاق بائن:۔ ایسی ایک طلاق جس میں نکاح بالکل ٹوٹ جاتا ہے اور اب بغیر نکاح کئے اس مرد کے پاس رہنا جائز نہیں، اگر پھر اسی کے پاس رہنا چاہے اور مرد بھی اس کو رکھنے پر راضی ہو تو پھر سے نکاح کرنا پڑیگا، ایسی طلاق کو طلاقِ بائن کہتے ہیں، (بندہ احقر قریشی غفرلہ)

شوہر سے میراث نہ ملے گی، مگر حکم شرعی یہ ہے کہ اس صورت میں وہ عورت میراث پائے گی، گویا شریعت نے اس کا انتظام کیا ہے کہ کوئی شخص ایسی حالت میں اپنی بی بی کو اس کے حصۂ میراث سے محروم نہ کر سکے پس ایسی حالت میں اگر طلاق دی تو احتمال ہو سکتا تھا کہ شاید دوسرے وارثوں کے مقابلہ میں بی بی کو محروم کرنے کے واسطے طلاق بائن دی، ہوتی، تاکہ وہ زوجہ نہ رہے، اور اس لئے زوجیت کی میراث نہ پائے، اس لئے شریعت نے عدّت کو قائم مقام نکاح کے قرار دے کر اس عورت کو میراث دلوائی ہے، اور ایسے طلاق دینے والے کو فارٌّ بالطلاق (طلاق دے کر میراث سے بھاگنے والا) کہتے ہیں، اور وہ غلطی یہی ہے کہ لوگ اس عورت کے استحقاقِ میراث (میراث کے مستحق ہونے) کو نہیں جانتے، اور اس مسئلہ کی جس جزئی سے بعض طلبہ بھی بے خبر ہیں وہ جزئی بدون مرض کے غلبۂ احتمالِ ہلاک (ہلاکت کا غالب گمان) ہونے کی ہے، مثلاً شیوع (پھیلاؤ) طاعون کا ہو رہا ہے، مگر مطلقاً نہیں، بلکہ خود اس شخص کے محلہ میں اس قدر زور شور ہو کہ ہر وقت خود اس کے مبتلائے طاعون ہونے کا خطرہ لگا رہتا ہو اسی طرح جس کے لئے سزائے موت کا حکم ہو چکا ہو، یا وہ لام پر گیا ہوا ہو اور غالب قرائن سے اندیشہ موت کا ہو، سو چونکہ یہ حالتیں مرض کی نہیں، اس لئے ان حالتوں کا حکم بعض کو معلوم نہیں، مگر چونکہ غلبۂ ہلاک ان میں اور حالتِ مرضِ موت میں مشترک ہے اس لئے اُن کا حکم بھی مثل مرضِ موت ہی کے ہے، حتی کہ ایسے شخص کے وصایا بھی صرف ثلث (ایک تہائی) میں جاری ہوں گے،

طلاقِ بائن اور طلاق رجعی میں شوہر سے پردہ کے احکام، ایک غلطی بعض آثار طلاق کے متعلق یہ ہوتی ہے کہ بعضے تو طلاقِ بائن میں بھی شوہر سے پردہ نہیں کراتے، حالانکہ اس وقت ضروری ہے، اور بعضے رجعی میں بھی پردہ کو ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ یہ ضروری نہیں، بلکہ اگر قرائن سے امید رجعت کی ہو تو زینت بھی کرنا جائز ہے بلکہ مستحسن ہے،

طلاق کے بعد عدّت میں نفقہ دینا واجب ہے، اور انہی آثار کے متعلق غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ طلاق کے بعد عدّت میں نفقہ نہیں دیتے، حالانکہ واجب ہے، اس کی کچھ تفصیل آگے بھی آتی ہے،

بقیہ احکام بعد الطلاق

عدت سے متعلق چند کوتاہیاں

منجملہ احکام بعد الطلاق کے ایک عدّت ہے، لوگ اس میں طرح طرح کی غلطیاں کرتے ہیں

چنانچہ ایک غلطی یہ ہے کہ اکثر عوام عدت مطلقاً تین مہینے سے اور بعضے چار مہینے دس دن سمجھتے ہیں حالانکہ عدت کی کئی قسمیں ہیں

عدت کی قسمیں حاملہ کی عدت وضع حمل ہے، خواہ مطلقہ ہو یا اس کا شوہر وفات پاگیا ہو، اور غیر حاملہ میں تفصیل ہے کہ اگر اس کا شوہر وفات پاگیا ہے تو اس کی عدت چار مہینے دس دن ہیں، اور اگر وہ مطلقہ ہے تو اگر اس کو حیض آتا ہے تو اس کی عدت تین حیض ہے اور اگر کم سنی کے سبب ہنوز (ابھی) حیض نہیں آتا یا بڑھاپے کے سبب حیض موقوف ہو گیا، تو ان دونوں کی عدت تین مہینے ہیں، پس علی الاطلاق سب صورتوں میں ایک ہی قسم کی عدت کا حکم کرنا یہ غلط ہے،

عدت کے اندر نکاح جائز نہیں ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ بیوہ سے نکاح کرتے ہیں، اور انقضاءِ عدت (عدت پوری ہونے کا) بھی انتظار نہیں کرتے، اور عدت کے اندر نکاح کر لیتے ہیں، بعضے اپنے نزدیک بڑی احتیاط کرتے ہیں، کہ نکاح کو تو جائز سمجھتے ہیں مگر اس سے قربت نہیں کرتے، سو خوب سمجھ لینا چاہئے کہ عدت کے اندر بالکل نکاح جائز نہیں ہوتا،

زنا سے حمل رہ جانے کی صورت میں نکاح فوراً جائز ہے، بعضے لوگ اس کے مقابلہ میں دوسرا غلو کرتے ہیں کہ اگر کسی غیر منکوحہ (غیر معتدہ (ایسی عورت جس کا نکاح نہ ہوا ہو اور نہ وہ عدت میں ہو) کو زنا سے حمل رہ جائے تو اس کے لئے بھی وضع حمل کو عدت تجویز کرتے ہیں، سو یہ بھی غلط ہے، اس پر عدت نہیں، اس سے نکاح فوراً جائز ہے، البتہ صحبت اور اس کے مقدمات بوس و کنار وغیرہ جائز نہیں، جب تک کہ وضع حمل نہ ہو جائے،

عدت میں پورے تیس دن کا مہینہ شمار کیا جاتا ہے ، ایک غلطی عام یہ ہے کہ جن صورتوں میں مہینوں سے عدت ہے خواہ تین مہینے یا چار مہینے دس دن، اس میں اگر ایک یا دو مہینے انتیس کے ہوں تو اس کمی کے عوض دس دن عدت میں بڑھاتے ہیں، مثلاً ایک عورت کے شوہر کی وفات دسویں شوال کو ہوئی تو بیسویں صفر کو علی الاطلاق اس کی عدت کو ختم سمجھتے ہیں، اگرچہ ذیقعدہ و ذی الحجہ و محرم و صفر میں سے دو یا تین مہینوں کا چاند انتیس کا ہوا ہو، حالانکہ ہمارے ائمہ میں سے یہ کسی کا مذہب نہیں، صاحبین کے نزدیک درمیان کے مہینے چاند سے لیں گے، اور اول کا مہینہ انتیس کا ہوا ہو تو اس کی تکمیل اخیر میں دنوں سے کرلیں گے، تو اس صورت میں بھی بیسویں صفر کو اس کی عدت ختم نہ ہوگی، اور امام صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سب مہینے دنوں سے شمار کریں گے، یعنی اس صورت میں ایک سو تیس دن گزرنے سے مدت ختم ہوگی، پس اگر درمیان میں تین مہینے انتیس

کے ہوئے تو بئیسویں صفر کے بعد تین دن بڑھائے جائیں گے، اور تئیسویں صفر کو عدت ختم ہونے کا حکم کریں گے، خوب یاد رکھنا چاہیئے،

عدت کا شمار طلاق یا وفات کے وقت سے شروع ہوتا ہے

بعضے لوگ یہ غلطی کرتے ہیں کہ اگر کسی عورت کو طلاق ہوگئی یا اس کے شوہر کی وفات ہوگئی، اور اس کو ایک مہینہ بعد خبر ہوئی تو بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ابتداء عدت کی خبر پہنچنے تک کے وقت سے ہوگی، حالانکہ ایسا نہیں، بلکہ طلاق یا وفات ہی کے وقت سے عدت کا شمار ہوگا،

نابالغہ کا شوہر فوت ہونے کی صورت میں عدت کا حکم

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ سمجھتے ہیں کہ نابالغہ کا شوہر اگر مر جائے تو اس پر عدت نہیں، سو یہ بھی غلط ہے، ان لوگوں کو غلط ہوگیا ہے، یہ حکم طلاق میں ہے، کہ اگر منکوحہ سے ہمبستری یا خلوتِ صحیحہ نہ ہوئی ہو اور طلاق ہوجائے تو اس میں عدت لازم نہیں، تو طلاق کو موت پر قیاس کرکے جو حکم طلاق قبل الدخول (ہمبستری سے پہلے حکمِ طلاق) کا تھا، وہ موت قبل الدخول کا سمجھ لیا، یہ قیاس غلط ہے، اور دونوں کا حکم جُدا جُدا ہے اور راز اس میں یہ ہے کہ عدتِ طلاق میں اصالۃً تصرف براۃ رحم (رحم کے خالی ہونے کو ثابت کرنے) کے لئے ہے، اور قبل الدخول میں احتمال شغلِ رحم (ہمبستری سے پہلے رحم کے بھرنے ہونے) کا نہیں ہے اس لئے وہاں عدت نہیں اور عدتِ موت میں اصالتاً قضائے حقِ نکاح (حقِ نکاح پورا کرنے) کے لئے ہے، اور اسی وجہ سے عدتِ اشہر (مہینوں) سے ہے، اس لئے یہاں عدت ہے،

مدتِ عدت کے اندر نفقہ واجب ہے،

ایک غلطی نفقہ کے متعلق ہے، کہ اکثر لوگ طلاق بائن کے بعد مہر کو تو واجب الادا سمجھتے ہیں، مگر مدتِ عدت کے اندر نفقہ (کھانے پینے وغیرہ کے اخراجات) کو واجب نہیں سمجھتے، حالانکہ عدت کے اندر نفقہ بھی واجب ہے، البتہ عدتِ وفات کا نفقہ کسی کے ذمہ واجب نہیں ہے، اور اسی طرح خلع میں عورت اگر نفقہ، عدت کو تصریحاً ساقط (ختم) کردے تو اس میں بھی ساقط ہوجاتا ہے، (کذافی الدر المختار)

عدت کے اندر عورت کا بلا عذر گھر سے نکلنا جائز نہیں،

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر عدت کے اندر گھر سے نکل آئے تو اس پر پھر از سر نو عدت واجب ہوگی، اور پہلی عدت ٹوٹ گئی، سو یہ بالکل غلط ہے، یہ تو ضرور ہے کہ بلا عذر گھر سے نکلنا معتدہ (عدت گذارنے والی) کو جائز نہیں، اسی واسطے معتدۃ الطلاق (طلاق کی عدت گذارنے والی) کو کسی وقت نکلنے کی اجازت نہیں دی گئی، کیونکہ اس کا نفقہ زوج پر واجب ہے، اور خلع میں اگر زوج سے ساقط ہوا ہے تو عورت کے ساقط

کرنے سے ہوا ہے، تو اس نے اپنے نفقہ کا بہ اختیارِ خود التزام کیا ہے، اس لئے اس کا بھی وہی حکم ہے، اور معتدالوفات (شوہر کی وفات کی عدت گذارنے والی عورت) کا نفقہ کسی پر ابتداء ہی سے واجب نہیں، اس لئے اس کو دن کو بضرورت انتظامِ معاش کے اور تھوڑے سے حصۂ شب میں بھی نکلنا جائز ہے، لیکن زیادہ حصہ رات کا اپنے گھر میں گذارنا واجب ہے، پس فرق دونوں میں اسی ضرورتِ معاش و عدمِ ضرورت سے ہوا، سو اگر کوئی معتدالوفات ہی معاش سے مستغنی ہو (یعنی محتاج نہ ہو) تو اس کا نکلنا جائز نہ ہوگا، (درمختار عن الفتح)

عدّت کی مدّت گذرنے کے بعد کوئی پابندی نہیں

ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے خصوصاً عورتیں یوں سمجھتی ہیں کہ عدت گزرنے کے بعد عدت سے نکلنے کے لئے یہ بھی ضروری ہے کہ اس گھر سے دوسرے گھر جاوے، اور اس کا بڑا اہتمام کیا جاتا ہے، سو یہ بالکل غلط ہے جب وہ مدت گذر گئی پس عورت عدت سے نکل گئی، گو اسی گھر میں رہے،

مطلقہ کو حقیر سمجھنا صحیح نہیں

ایک غلطی جو ایک رسمِ جہالت کہنا بجا ہے یہ ہے کہ مطلقہ کو مطلقاً (بالکل) حقیر اور ذلیل سمجھتے ہیں، اور گو زیادتی شوہر ہی کی ہو مگر بلا وجہ یہ حکم لگا دیتے ہیں کہ اس نے کچھ تو عیب کیا ہوگا، تب تو اس کو طلاق ہوئی، اور پھر اس عیب کو بھی عفت (پاکدامنی) ہی کے متعلق سمجھ لیتے ہیں، اور اس بناء پر حتی الامکان اس سے نکاح نہیں کرتے، سو ظاہر بات ہے کہ جب واقعات دونوں طرح کے ہیں کہیں عورت کی زیادتی ہوتی ہے کہیں مرد کی، پھر یہ کیسے سمجھ لیا کہ عورت ہی خطاوار ہے، اور اگر خطاوار ہے تو یہ کیا ضرور ہے کہ وہ خطا عفت ہی کے متعلق ہے، ایسے قرائن پر کسی پر شبہ کرنا سخت گناہ اور حرام ہے،

بلاتحقیق محض وقوعِ طلاق سے شوہر یا بیوی پر کوئی حکم لگانا گناہ ہے

ایک غلطی اس کے مقابلہ میں کہ وہ بھی رسمِ جہالت ہی ہے یہ ہے کہ بعض لوگ طلاق دینے والے کو بلا دلیل ظالم قرار دے لیتے ہیں، اور اسی بناء پر پھر اس کا نکاح دشوار ہو جاتا ہے، سو یہ بھی پہلے کی طرح رجم بالغیب (اٹکل پچو) ہے، کہیں کہیں عورتیں سرکشی و نافرمانی و ایذا رسانی کرتی ہیں، تو اس صورت میں مرد بجز طلاق کے کیا کرے، حاصل یہ کہ محض وقوعِ طلاق سے بلاتحقیق نہ شوہر پر الزام لگاوے، نہ عورت پر بلکہ جن لوگوں کا اس قصہ سے کوئی تعلق نہیں ہے، ان کو تو اس سے تعرض ہی کی ضرورت نہیں، اور جن کا کچھ ضروری تعلق ہے وہ بھی بدونِ تحقیق کے کوئی حکم نہ لگائیں، کہ بدونِ دلیل شرعی کوئی حکم لگا دینا مخالفت ہے، نص وَلَا تَقْفُ مَا لَيْسَ لَكَ بِهٖ عِلْمٌ (بنی اسرائیل آیت ۳۶)

(اور جس بات کی تحقیق نہ ہو اس پر عمل درآمد مت کیا کر) کی اور فَاحْكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بِالْحَقِّ وَلَا تَتَّبِعِ الْهَوٰى (ص ۲ آیت ۲۶) (سو لوگوں میں انصاف کے ساتھ فیصلہ کرتے رہنا اور آئندہ بھی نفسانی خواہش نہ کرنا) کی،

چھوٹے بچوں کی پرورش میں کوتاہیاں

یہاں تک اس بقیہ میں اکثر احکام متعلق عدت کے تھے، طلاق کے بعد علاوہ عدت کے حضانت یعنی چھوٹے بچوں کی پرورش کا پیش آتا ہے اسی طرح وفات شوہر کے بعد بھی، خلاصہ یہ کہ افتراق بین الزوجین (میاں بیوی میں تفریق) کے بعد کبھی نابالغ اولاد بھی ہوتی ہے، بعض اوقات زوجین اور کبھی زوجہ اور ورثہ زوج میں ان بچوں کے متعلق پیش آتی ہے، اور اکثر تو یہ کشاکش اس صورت سے ہوتی ہے کہ فریقین میں سے ہر شخص ان بچوں پر اپنا دعویٰ استحقاق کا (حقدار ہونے کا دعویٰ) کرتا ہے، اور سب اپنے اپنے پاس رکھنا چاہتے ہیں اور کبھی اس کا عکس بھی ہوتا ہے، یعنی ہر ایک دوسرے پر ڈالتا ہے، اوّل صورت میں اکثر تو یہی ہے کہ جس کا زور ہوا وہ غالب آگیا، اور بچہ پر قبضہ کرلیا، خواہ حق ہو یا ناحق ہو، یعنی اگر باپ یا باپ والے زوردار ہوئے تو دودھ پینے ہی کی حالت میں یا اس کے ذرا بعد ماں سے چھین لیتے ہیں، اور اگر ماں والے زوردار ہوئے تو وہ عمر بھر بھی باپ کو قبضہ نہیں دیتے، سو یہ دونوں غلطیاں ہیں،

چھوٹے بچوں کی پرورش کا کون زیادہ مستحق ہے؟

اس کا قانون شرعی یہ ہے کہ اگر ماں کافر اور فاجر نہ ہو اور اس نے ہنوز کسی ایسے مرد سے نکاح نہ کیا ہو جو بچّہ کے ساتھ ذی رحم محرم (نسبی رشتہ دار) ہونے کا علاقہ (تعلق) نہ رکھتا ہو تو ماں اس بچّہ کو اپنے پاس رکھنے کے استحقاق میں سب سے مقدّم ہے، اور اس استحقاق کی مدّت یہ ہے کہ لڑکا سات برس کا ہو جائے اور لڑکی ایسی ہو جائے کہ مردوں کو اس کی طرف رغبت ہونے لگے، اس کے بعد اس کو باپ کی طرف واپس کردیا جائے گا، اور دادا بھی بجائے باپ کے ہے، (یعنی باپ کے حکم میں ہے) جبکہ باپ موجود نہ ہو، اگر باپ اور دادا نہ ہوں تو پھر عصبات جو کہ ذی رحم محرم ہوں، وہ زیادہ مستحق ہیں، بشرطیکہ معتمد (قابلِ اعتماد) ہوں، اور جو ایسے عصبات نہ ہوں تو حاکم کسی اہل کے سپرد کردے، اور لڑکی کو کسی امین دیندار عورت کے سپرد کرے اور لڑکا اگر بالغ ہو کر خود اپنی نگرانی کرسکے، پھر اس پر قبضہ کرنے کا کسی کو حق نہیں، اور اگر ماں کافر، فاجر ہو تو اس کو کچھ حق نہیں، اسی طرح اگر کسی ایسے مرد سے نکاح کرلیا ہو جو بچہ کا ذی رحم محرم نہیں، اس کی تین صورتیں ہیں؛

ایک[۱] یہ کہ نہ ذی رحم ہے..... نہ محرم ہے، جیسے بالکل اجنبی شخص، دوسری[۲] یہ کہ ذی رحم تو ہے

مگر محرم نہیں جیسے چچازاد بھائی رشتہ دار تو ہی مگر محرم نہیں، تیسرے یہ کہ محرم تو ہو مگر ذی رحم نہیں جیسے رضاعی تایا چچا کہ ان سے نکاح تو حرام ہے اس لئے محرم تو ہے، مگر ان کی کچھ قرابت نہیں، غرض ان تینوں قسموں میں سے جس کسی سے عورت نے نکاح کرلیا تو ان سب صورتوں میں عورت کا یہ حق جاتا رہے گا،

اس سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ علی الاطلاق باپ کا قبضہ بھی غلطی ہے، اور علی الاطلاق ماں کا قبضہ بھی، بلکہ دونوں کے قبضوں میں یہ تفصیل ہے جو اوپر مذکور ہوئی،

ایک دوسرے پر ٹالنے کی صورت میں بچہ کو کون دودھ پلائے گا؟

اب رہا اس کا عکس کہ ہر ایک دوسرے پر ڈالتا ہے، اس کا قانون یہ ہے کہ اگر کوئی دوسری عورت دودھ پلانے والی اور پرورش کرنے والی مل سکے خواہ بلاعوض یا بعوض (بغیر معاوضہ کے یا معاوضہ کے ساتھ) اور باپ یا بچہ اتنے مال کا مالک ہو کہ اس عوض کو ادا کرسکے تب تو ماں پر جبر نہ کیا جائے گا، ورنہ جبر کیا جاوے گا،

اس قانون سے معلوم ہوگیا ہوگا کہ علی الاطلاق بچہ نہ عورت پر ڈالا جاسکتا ہے اور نہ باپ پر اور یاد رکھنا چاہئے کہ جب تک بچہ ماں کی حضانت (پرورش) میں رہے گا، دونوں کا خرچ باپ کے ذمہ ہوگا، باقی تفاصیل کتب فقہ میں ہیں،

طلاق یا موت کے بعد گھریلو سامان کے احکام

ایک معاملہ بعد الطلاق یا بعد الموت جس میں غلطیاں ہوتی ہیں اثاث البیت (گھریلو سامان) کے متعلق ہے، کہ ہر ایک زوجین میں سے یا ایک کے مرنے کے بعد اس کے ورثہ اور دوسرا زندہ اس میں دعویٰ ملک کا کرتے ہیں، سو اس کا فیصلہ یہ ہے کہ جو چیزیں عورتوں کے لائق ہیں، جیسے زنانہ کپڑے وہ عورت کے ہیں، لیکن مرد اس کے خلاف پر شرعی گواہ قائم کردے تو گواہوں پر حکم ہوگا، اور جو چیزیں مردوں کے لائق ہیں جیسے مردانہ کپڑے، یا ہتھیار وغیرہ وہ مرد کی ہیں، لیکن اگر عورت اس کے خلاف پر گواہ قائم کردے تو گواہوں کے موافق حکم ہوگا، اور جو دونوں کے کام کی چیزیں ہیں وہ بھی مرد کو دی جائیں گی، لیکن اگر عورت گواہوں سے اس کے خلاف ثابت کردے تو پھر گواہوں پر فیصلہ ہوگا، یہ تو جب ہے کہ زوجین میں اختلاف ہو، اور اگر ایک مرگیا اور دوسرے زندہ ہیں، اور اس میت کے ورثہ میں اختلاف ہو، تو اس صورت میں جو چیز صرف مردوں کے یا صرف عورتوں کے کام کی ہوں اس میں تو یہی تفصیل ہے، اور جو چیزیں دونوں کے کام کی ہوں اس میں اختلاف ہے، امام محمد رحمہ اللہ تو وہ چیزیں مردوں کو دلاتے ہیں خواہ وہ مرد ہو یا عورت ہو، اور گواہ ہونے کی حالت میں گواہوں پر فیصلہ ہوگا، یہ سب تفصیل برتنے کی چیزوں میں ہے، اور اگر سوداگری کا مال ہو تو اسباب (سامان) کا زنانہ ہونا دلیل نہ ہوگا عورت کے مالک

ہوتے کی، یہ سب احکام و مسائل، عالمگیریہ کے باب سابع کی فصل سابع عشر میں ہے، اور احقر کے نزدیک جہاں یہ عُرف ہو کہ مرد اپنے مال جمع کرنے کی غرض سے زنانہ زیور بنوا کر عورت کو عاریۃً پہنا دیتے ہوں تو وہاں یہ زیور بھی مثل مالِ تجارت کے سمجھا جائے گا، جس کا حکم ابھی معلوم ہوا، مگر دوسرے علماء سے بھی احتیاطاً مراجعت کر لی جائے،

زوجین میں جُدائی کے نو ماہ بعد بچہ کی ولادت ہونے پر ثبوتِ نسب کے احکام، ایک غلطی جو معصیت کے شدید درجہ تک ہے بعد مفارقت الزوجین (میاں بیوی کی جدائی کی صورت) میں یہ ہوتی ہے کہ اگر زمانہ طلاق یا بیوگی سے نو مہینے کے اندر بچہ پیدا نہ ہو، بلکہ بعد میں ہوا تو عورت کو زنا کی تہمت لگاتے ہیں، حالانکہ شریعت میں جو قانون ثبوتِ نسب کا ہے یہ اس کے بالکل خلاف ہے فقہاء نے اس کو بہت مفصل لکھا ہے، یہاں نمونہ کے طور پر ایک جزئیہ طلاق کا اور ایک وفاتِ زوج کا لکھا جاتا ہے،

پہلا جزئیہ : اگر کسی کو طلاق بائن ہو جائے اور وقتِ طلاق سے دو برس کے اندر اس کے بچہ پیدا ہو تو وہ اسی شوہر کا سمجھا جائے گا،

دوسرا جُزئیہ، اگر کسی کا شوہر مر جائے، اور وقتِ وفات سے دو برس نہ گزرے ہوں کہ بچہ پیدا ہو تو اسی شوہر کا سمجھا جائے گا،

اور یہ اس وقت ہے جب دونوں صورتوں میں معتدہ (عدت گذارنے والی) نے اس کے قبل عدت گذرنے کا اقرار نہ کیا ہو، اور اگر عدت گزرنے کا اقرار کر چکی تھی پھر اس کے بچہ پیدا ہوا تو اس میں تفصیل ہے کہ اگر وقتِ اقرار سے چھ مہینے سے کم میں بچہ پیدا ہوا تو اس اقرار انقضائے عدت (عدت گزرنے) کو غلط سمجھا جائے گا، اور نسب ثابت ہوگا، اور اگر وقتِ اقرار سے چھ مہینے گذر گئے تھے تو نسب ثابت نہ ہوگا، یہ سب مسائل ہدایہ میں ہیں، لیکن نسب ثابت نہ ہونے کے یہ معنی نہیں کہ اس عورت کو یقیناً زانیہ کہا جائے گا، بلکہ مطلب یہ ہے کہ قانون سے وہ بچہ مرد کے ذمہ لازم نہ ہوگا، مثلاً اس کے مال میں وارث نہ ہوگا، اور اس کے ذمہ اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، باقی زانیہ نہ ہونے کی صورت بعض صورتوں میں یہ ہو سکتی ہے کہ اس کا اقرار انقضائے عدت کا خود غلط ہو، اور بعض صورتوں میں یہ ہو سکتا ہے کہ کسی ظالم نے اُس پر ظلم کیا ہو، خواہ شوہر نے عدتِ طلاق میں یا کسی غیر نے وفاتِ شوہر میں، باقی اس کا یہ مطلب نہیں کہ اگر واقع میں بھی عورت کی کوئی شرارت ہو تب بھی اس قانون کے سبب وہ عند اللہ بری ہوگی، ظاہر ہے کہ خدا تعالیٰ پر قانون حاکم نہیں، مطلب یہ ہے کہ ہم لوگوں کو

اس پر تہمت رکھنے کا کوئی حق نہیں، باقی وہ جانے اور اس کا فعل جانے، جیسا کرے گی عند اللہ اس کے ساتھ ویسا ہی معاملہ کیا جائے گا، اب اس میں یہ شبہ بھی نہیں ہوسکتا کہ اس قانون سے تو عورتوں کی جرأت بڑھ جائے گی، ایسی جرأت سے کہاں تک بچا جائے گا، آخر یہ بھی تو قانون ہے کہ جس کا شوہر پاس ہو اس کا بچہ ثابت النسب ہوگا، تو اس سے شوہر کے پاس رہنے والیوں کی جرأت بڑھے گی کہ اگر ہم بدکاری کرلیں ہم کو کون کچھ کہے گا، خاوند کے ماتھے جائے گی، اور اگر جرأت کا انسداد ضروری ہے تو کیا ظلم کا انسداد ضروری نہیں؟ اگر واقع میں وہ بری ہو اور اس قانون سے کام نہ لیا جائے تو اس پر جو بہتان کا ظلم ہوگا اس کا کیا علاج ہوگا؟

عدت شوہر کی روح نکلنے کے فوراً بعد شروع ہو جاتی ہے۔

ایک اعتقادی غلطی عدتِ وفات کے متعلق جہلا میں یہ ہے کہ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر مردہ شوہر کا جنازہ لے جانے سے پہلے بیوہ کو اس گھر سے دوسرے گھر میں لے جائیں تب تو جائز ہے، ورنہ پھر جائز نہیں، منشا اس جہل کا یہ ہے کہ عدت کی ابتدا جنازہ کے لے جانے کے بعد سے سمجھتے ہیں، حالانکہ عدت بمجرد دم نکلنے کے (عدت تنہا روح نکلتے ہی) شروع ہو جاتی ہے، اور جنازہ لے جانے کے قبل اور بعد دونوں حال میں ایک ہی حکم ہے، کہ بلا عذر قوی (جس کی تفصیل کتب فقہ میں ہے) عدت کے اندر دوسرے گھر کی طرف منتقل ہونا حرام ہے، یہ مسئلہ استطراداً مسائل بعد الطلاق میں ذکر کر دیا گیا،

عورت کی بدچلنی کے باعث طلاق ہو جانے سے بھی مہر ساقط نہیں ہوتا

ایک علمی غلطی مہر کے باب میں طلاق کے بعد یہ واقع ہوتی ہے کہ بعضے لوگ یوں سمجھتے ہیں کہ اگر عورت کے کسی قصور پر طلاق دی گئی ہو تو مہر ساقط ہو جاتا ہے، مثلاً عورت کی بدچلنی ثابت ہو گئی یا وہ نعوذ باللہ مرتد ہو گئی، سو سمجھ لینا چاہیئے کہ مہر ہمبستری یا خلوتِ صحیحہ سے مؤکد ہو جاتا ہے، اس کے بعد وہ کسی طرح ساقط نہیں ہوتا، خواہ طلاق ہو یا نہ ہو، پھر خواہ طلاق کا سبب مرد کی زیادتی ہو یا عورت کی، البتہ اگر عورت معاف کردے یا مہر پر خلع کرلے، اس صورت میں بیشک مہر ساقط ہو جاتا ہے،

مہر کے متعلق ایک کوتاہی جس سے نکاح ہی منعقد نہیں ہوتا

ایک غلطی مہر کے متعلق (اگرچہ اس کا تعلق ما بعد الطلاق کے ساتھ نہیں ہوتا مگر یہاں استطراداً ذکر کی جاتی ہے) یہ ہے کہ بعضے دیندار تقلیلِ مہر کی ترغیب و فضائل سنکر ہر جگہ اس پر عمل کرتے ہیں، حالانکہ بعضے مواقع اس سے مستثنیٰ ہیں، اور وہ موقع ایک مسئلہ ہے وہ یہ کہ اگر نابالغ لڑکی کا نکاح کرنے والا بجز اس کے باپ یا دادا کے کوئی اور ولی ہو، جیسے بھائی یا چچا تو اس صورت میں اس کا مہر اگر مہر مثل سے بہت کم ہو

توحسبِ تصریح درمختار یہ نکاح ہی صحیح نہ ہوگا، اور صاحب درمختار نے صدرالشریعت کے حکمِ صحت کو وہم کہا ہے، پس ایسے موقع پر یا تو مہر مثل مقرر کرے یا اس صغیرہ کو بالغ ہونے دے، پھر اس کی رضا سے مہر قلیل کیا جاوے،

طلاق یا موت ہوجانے پر مہر مؤجل کا حکم

ایک اور مسئلہ کے متعلق استطراداً ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ مہر مؤجل میں اگر اجلِ مجہول بجہالت فاحشہ ہو توحسبِ تصریح فقہا، وہ تاجیل صحیح نہ ہوگی، مہر معجل واجب ہوگا، لیکن اگر یہ اجل طلاق یا موت ہو گو جہالت فاحشہ ہے مگر اس کی صحت میں اختلاف ہے، بعض نے اس کو جائز کہا ہے، مگر احقر کو اس میں تردد ہے، علماءِ محققین سے مراجعت کی جاوے، اور اگر اس قول کو کوئی شخص لیتا ہے تو اسی کے ساتھ ایک اور قول بھی مفتی بہ کہا گیا ہے، وہ یہ کہ اگر مہر مؤجل ہو تو عورت کو اس اجل کے قبل انکار کرنا تسلیمِ نفس (خود کو مرد کے سپرد کرنے) سے جائز ہے، اور اگر ایک بار صحبت ہوجاوے دوسری بار میں بھی یہ انکار جائز ہے، اور تاجیل کے اس حکم میں گو اختلاف ہے، مگر درمختار میں اس کو مفتیٰ بہ اور استحسان کہا ہے، سو اگر مؤجل بالطلاق و بالموت میں مرد اس فتویٰ کو لے گا، تو عورت اس فتوے کو لے سکتی ہے،

عورت ایک بار مہر معاف کر دے تو پھر وصول نہیں کر سکتی

ایک غلطی مہر کے متعلق کہ وہ بھی استطراداً مذکور ہوتی ہے یہ ہے کہ بعضی عورتیں کسی وقت خوش ہو کر بلا کسی شرط یا قید کے مہر معاف کر دیتی ہیں، پھر دوسرے وقت ناخوش ہو کر کہہ دیتی ہیں کہ میں اپنی معافی کو واپس لیتی ہوں، سو اس صورت میں مہر معاف ہوجاوے گا، اور اس کہنے سے وہ عود نہ کرے گا، البتہ اگر معافی میں کوئی شرط ہو اور مرد نے اس شرط کے خلاف کیا تب البتہ وہ معافی نہ رہے گی،

معافی مہر کو اگر شوہر تسلیم نہ کرے تو مہر معاف نہیں ہوگا

ایک غلطی یہ ہوتی ہے کہ عورت کے معاف کرنے کے وقت مرد اس کو قبول نہیں کرتا، اور جب دوسرے وقت عورت مطالبہ کرتی ہے تو اس پچھلی معافی کو یاد دلا کر اس سے تمسک کرتا (یعنی دلیل پکڑتا) ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ معافی کو اگر مخاطب رد کر دے تو وہ معافی کالعدم ہوجاتی ہے، یہ آخر کی دو غلطیاں اسی وقت ایک پیش شدہ واقعہ سے ذہن میں آئیں،

ایک شبہ کا ازالہ

اب مضمون طلاق کے متعلق ایک مضمون بعنوان "رفع اشتباہ" لکھکر اس باب کو طلاق کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ اوپر جو مبغوضیت طلاق کا مضمون ذکر کیا گیا ہے اس پر ایک شبہ وارد ہوتا ہے، وہ یہ کہ اہلِ تاریخ نے بالاتفاق نقل کیا ہے کہ حضرت امام حسن رضی اللہ عنہ

عورتوں کو کثرت سے طلاق دیتے تھے تو ایسے امام جلیل الشان ہو کر اس فعلِ مبغوض کا کیوں ارتکاب فرماتے تھے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ مبغوضیت اس وقت ہے جب ضرورت نہ ہو، اور ان کو ضرورت تھی، وہ ضرورت یہ تھی کہ ان کو طبعی طور پر جدید عورتوں کی رغبت تھی، اور جدید نہ رہنے کے وقت اُن سے بے رغبتی ہو جاتی تھی، اور چار سے زیادہ جمع نہ کر سکتے تھے، تو اب بجز طلاق قدیمہ و نکاح جدیدہ کے کیا صورت ہو سکتی ہے؟ نیز مبغوضیت طلاق میں وحشتِ زوجہ (بیوی کی پریشانی) کو بھی دخل ہے، اور ان کے اس فعل سے منکوحات کو وحشت نہ ہوتی تھی، چنانچہ احقر نے کسی مقام پر کہ اس کی تعیین یاد نہیں رہی لکھا دیکھا ہے کہ عورتیں یہ خیال کر کے کہ "اُن کے بدن پر بچپن میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جابجا پیار کیا ہے تو بلا حائل ان کے بدن کو مس کرنے سے برکت نصیب ہوگی" باوجود ان کے کثرتِ طلاق کے پھر اُن کے نکاح سے انکار نہ کرتی تھیں، اور ان عورتوں کے ساتھ ان کے اولیاء بھی اس کو ناگوار نہ سمجھتے تھے، یہاں تک کہ ایک بار حضرت علی رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ "اے اہلِ کوفہ حسنؓ سے عورتوں کو مت بیاہو کہ وہ کثرت سے طلاق دیتے ہیں، قبیلۂ ہمدان میں سے ایک شخص بولا واللہ ہم ان سے ضرور نکاح کریں گے وہ جس کو پسند کریں رکھیں اور جس کو ناپسند کریں طلاق دیدیں" (اوردہ فی تاریخ الخلفاء عن ابن سعید)۔

اور میں نے احیاء العلوم میں دیکھا ہے کہ حضرت علیؓ اس جواب سے خوش ہوئے، اور قبیلۂ ہمدان کے لئے اس ارشاد سے شفاعت کا وعدہ فرمایا۔

لَوْ کُنْتُ بَوَّابًا عَلٰی بَابِ الْجَنَّةِ لَقُلْتُ لِهَمْدَانَ اُدْخُلُوْا بِسَلَامٍ	"اگر میں جنت کے دروازہ کا بوّاب بنوں تو میں قبیلۂ ہمدان کو کہوں کہ سلامتی کے ساتھ اس میں داخل ہو جاؤ"

تَمَّ مَا یَتَعَلَّقُ بِاَبْوَابِ الطَّلَاقِ

نفقہ کے احکام

اس میں بھی متعدد مختلف غلطیاں اور کوتاہیاں ہوتی ہیں، غلطی سے مراد علمی اخلال (علمی خرابی) اور کوتاہی سے مراد عملی اخلال (عملی خرابی) ہے، دونوں مختلف طور پر مذکور ہوتی ہیں،

بیوی کا نفقہ شوہر پر واجب ہے — ایک غلطی یہ ہے کہ بعضے لوگ بی بی کا نفقہ اُس وقت واجب سمجھتے ہیں کہ وہ نادار ہو، اور اگر وہ مالدار ہو تو اس صورت میں اس کا نفقہ واجب نہیں سمجھتے، سو یہ بالکل غلط ہے، بیوی کا نفقہ دونوں مذکورہ حالتوں میں واجب ہوتا ہے، صرف اتنی شرط ہے کہ بی بی کی طرف سے تسلیم نفس میں بلاعذر کوتاہی نہ ہو، اور اگر عذر سے ایسا ہو، جیسے مہر معجل کے لینے کے لئے اپنے نفس کو تسلیم نہ کرے اس میں نفقہ واجب رہے گا،

کم سن عورت کو اگر شوہر اپنے گھر رکھے تو اس کا نفقہ بھی واجب ہے — البتہ اگر براہِ سرکشی شوہر کے گھر سے چلی گئی اس صورت میں نفقہ واجب نہ رہے گا، جب تک کہ واپس نہ آجائے، اسی طرح اگر بی بی بہت کمسن ہو کہ قابل ہمبستری کے نہ ہو لیکن اس قابل ہو کہ مرد کے پاس رہنے سے مرد کا جی بہلے، معمولی خدمت کر سکے تو تسلیم نفس کے بعد اس کا نفقہ بھی واجب ہے، البتہ اگر اس قابل بھی نہ ہو جیسے بعض قوموں میں بہت ہی کم عمری میں شادی کر دیتے ہیں اس کا نفقہ واجب نہ ہوگا، (کذا فی الدرالمختار)

لیکن جو قابل تمتع کے نہ ہو محض انس اور خدمت کے لائق ہو خود شوہر اس کو اپنے گھر رکھنے پر مجبور نہیں ہے، اگر رکھے گا نفقہ دے گا، اگر نہ رکھے گا نہ دے گا (کذا فی الدرالمختار)

جوان عورت کا نکاح کم سن لڑکے سے ہو تب بھی اس کے ذمہ بیوی کا نفقہ واجب ہے — اور بعض قوموں میں یہ بھی عادت ہے کہ جوان عورت کا کم عمر لڑکے سے عقد کر دیتے ہیں، اس عورت کا نفقہ زوج کے مال سے اگر وہ صاحبِ جائداد یا مالک نقد ہو واجب ہوگا، کیونکہ مانع تمتع مرد کی طرف سے ہے، عورت کی طرف سے نہیں،

شوہر کی اجازت کے بغیر میکے چلے جانے سے شوہر کے ذمہ نفقہ واجب نہیں — ایک غلطی بعض عورتوں کی جانب سے یہ ہے کہ شوہر سے مخالفت کر کے اپنے میکے جا بیٹھتی ہیں اور نفقہ کا مطالبہ کرتی ہیں، سو ابھی مذکور ہوا ہے کہ اس صورت میں نفقہ واجب نہ ہوگا،

ذی وسعت مرد کے ذمہ ماما کا خرچ بھی واجب ہے

ایک کوتاہی بعض مردوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود فارغ البالی کے بی بی کے خرچ میں تنگی کرتے ہیں اور اتنا کم دیتے ہیں کہ وہ خود اپنے ہاتھ سے پکائے تو کافی ہو سکتا ہے، ورنہ ماما (نوکرانی) رکھنے کی گنجائش نہیں ہوتی۔ حالانکہ مرد اگر ذی وسعت ہو تو اس کے ذمہ ماما کا خرچ بھی واجب ہے۔

تنگدست شوہر ماما رکھنے پر مجبور نہیں

اور ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ باوجود شوہر کے تنگدست ہونے کے اس کو مجبور کرتی ہیں کہ ماما لا دے، حالانکہ شوہر کی تنگدستی کی صورت میں مرد اس پر مجبور نہیں ہے، بلکہ دیکھا جائے گا کہ عورت اپنے کام پر قادر ہے یا نہیں، اگر قادر ہے تو اپنا کھانا بھی پکائے اور شوہر کا بھی پکائے، اور اگر قادر نہیں خواہ کسی مرض کے سبب، خواہ امیر کبیر ہونے کے سبب، تو نہ شوہر ماما لانے پر مجبور ہے اور نہ عورت کھانا پکانے پر، بلکہ شوہر سے کہا جائے گا کہ تیار شدہ کھانا عورت کو لا کر دے، خواہ بازار سے یا کہیں اور پکوا کر (کذا فی الدر المختار)

تنگدستی کی حالت میں عورت کو تفریق کا مطالبہ کرنا جائز نہیں

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہوتی ہے کہ جہاں ذرا نفقہ میں تنگی ہوئی انھوں نے تفریق کی درخواست شروع کی، سو سمجھ لینا چاہئے کہ سخت تنگی کی حالت میں گو بعض ائمہ کے نزدیک قاضی کو تفریق جائز ہے، لیکن اوّل تو یہاں شرعی قاضی نہیں، اور بدون قاضی شرعی کے کسی کے نزدیک بھی تفریق صحیح نہیں، دوسرے ہمارے مذہب حنفی میں خود قاضی کے ہوتے ہوئے بھی اس خاص وجہ سے تفریق جائز نہیں، بلکہ قاضی عورت کو حکم دے گا کہ تو قرض لے لے کر خرچ کرتی رہ اور وہ قرض بذمہ شوہر ہوگا۔

روشن خیال حضرات کو حقیقی ہمدردی کی نشان دہی

بعضے روشن خیال ایسی صورتوں میں بزعمِ خود علماء پر اور درحقیقت شریعت پر اعتراض کیا کرتے ہیں کہ تفریق کا جائز نہ ہونا عورت کے حقوق کا تلف کرنا ہے، کیونکہ ہمارے دیار میں شرعی قاضی تو ہے نہیں تو خود عورت کو ایسی مجبوری میں تفریق کے اختیارات ہونے چاہئیں، ورنہ اگر اس کو قرض بھی نہ ملے تو پھر کہاں سے کھائے؟

میں کہتا ہوں کہ آپ صاحبوں کو تو یہ آسان ہے کہ عورت کی ہمدردی میں شریعت پر اعتراض کر کے اپنا دین برباد کرنے لگے، اس سے زیادہ آسان تو یہ تھا کہ اس کی ہمدردی میں اپنا کچھ مال صرف کرتے اور ایسے ستم دیدہ غم رسیدہ کی مدد کرتے اور یہ تو خیال کرنا چاہئے کہ آپ کی اس رائے میں عورت کی تو ہمدردی ہوگئی، لیکن کیا ایسا مجبور مرد قابلِ ہمدردی کے نہیں، کیا اس کی یہی ہمدردی

ہے کہ اس کی بی بی کو جو اس کے لئے کسی قدر مایۂ انس و تسلی تھی اس سے جُدا کر دیا جائے؛ اور جو طریقہ ہمدردی کا ہم نے بتلایا ہے اس میں دونوں کی امداد ہے، مرد کی بھی عورت کی بھی، اور دونوں اپنے گھر پر آباد رہیں گے، انصاف کیجئے ہمدردی کہنے کے لائق کونسی صورت ہے؟

قہوہ، حقہ، اور موسمی پھل شوہر کے ذمہ واجب نہیں،

ایک کوتاہی بعض عورتوں کی طرف سے یہ ہے کہ شوہر کے مال کو بے دریغ اڑاتی ہیں اور سب فضول اخراجات اور تمامی تنعمات کا خرچ بذمہ شوہر سمجھتی ہیں، خصوص پان چھالیہ یا بعض جائے دکانی میں اس قدر زیادتی کرتی ہیں کہ خود بھی کھاتی پیتی ہیں، اور آنے جانیوالیوں کو تقسیم کرتی ہیں، اور یہ شوہر کے ذمہ جرمانہ سمجھتی ہیں، حالانکہ فقہائے یہاں تک تصریح کردی ہو کہ قہوہ اور حقہ اور موسمی پھل بھی شوہر کے ذمہ نہیں، اگرچہ قہوہ اور حقہ کی عادت بھی ہو کہ اس کے چھوڑنے سے تکلیف ہو، تب بھی شوہر کے مال میں یہ صرف نہ ڈالا جائے،

قد علم مما ذکرانہ لا یلزمہ لہا القھوۃ والدخان وان تضررت بترکھما لان ذلک ان کان من قبیل الدواء او من قبیل التفکہ لا یلزمہ کما علمت (ردالمحتار ج۲ ص۱۰۶۸)	(بے شک جان لے جیسا کہ پہلے ذکر کیا گیا کہ قہوہ اور حقہ اس کے لئے لازم نہیں، خواہ ان کے چھوڑنے سے نقصان پہنچے، کیونکہ یہ دوا، یا پھلوں کی قسم سے ہے، جو اس کے لئے لازم نہیں جیسا کہ تو نے سمجھ لیا ہے)

شوہر ان مصارف میں سے جتنے کا متحمل ہو جائے اس کا احسان ہے، اور شوہر کی شان کے لائق بھی یہی ہے کہ اگر خدا تعالیٰ وسعت دے تو بی بی کو اس کے لئے سرمایۂ راحت ہے راحت پہنچانے میں دریغ نہ کرے، مگر عورت کو بھی مناسب نہیں کہ اس راحت پہنچانے کا یہ صلہ کرے کہ اس کو کلفت پہنچائے،

مردوں کے رشوت لینے کی زیادہ تر ذمہ دار عورتیں ہیں،

واقعی ان عورتوں کی فضول خرچیوں کی بدولت بالخصوص پان اور لباس و آرائش اور رسوم و تقریبات میں مسلمان پنپنے نہیں پاتے، اور ان کے گھر کو جائداد کو، تجارت کو گھن سا لگ رہا ہے، کہ آہستہ آہستہ بالکل خاتمہ ہو جاتا ہے، بلکہ ان اخراجات کی بدولت دنیا کیسا ان کا دین تک برباد ہوتا ہے، ملازم مردوں کی رشوت کے زیادہ حصہ کی ذمہ دار یہی فضول خرچیاں ہیں، ورنہ اکثر گھروں میں دنیا کی بھی رونق رہے اور مردوں کا تقویٰ بھی محفوظ رہے،

عورتیں چاہیں تو مرد کو متقی بنا سکتی ہیں،

بلکہ اگر ذرا عورت مضبوطی اختیار کرلے تو مرد کو بمجبوری متقی بننا پڑے، بہت نظائر ایسے موجود ہیں کہ عورتوں نے مردوں پر زور دیا کہ اگر تم رشوت نہ چھوڑو گے تو ہم تمھاری کمائی کا کھائیں پئیں گے نہیں، اُدھر مرد عورت کا تعلق، اُدھر اس

خلوص کی برکت، مجموعہ کا اثر یہ ہوا کہ مردوں کو رشوت سے توبہ کرنا پڑی،

بری کے جوڑوں کی موجودگی میں شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں،

ایک کوتاہی عورتوں کی طرف سے یہ ہے کہ بری کے جوڑے انبار کا انبار ان کے صندوقوں میں ذخیرہ رہتا ہے، پھر بھی روزانہ شوہر سے جوڑے بنوانے کی فرمائش کی جاتی ہے، سو سمجھ لینا چاہئے کہ شوہر کے گھر کے جوڑے جب تک موجود رہیں اس وقت تک شوہر کے ذمہ نیا جوڑا بنانا واجب نہیں، اور یوں وہ بنادے اس کا احسان ہے،

خاوند کے مال کو ضائع کرنے کی قیامت کے روز باز پرس ہوگی

اسی طرح اکثر عورتیں کو بیکار چیزوں کی بے حد حرص ہے، اور دھاندہی کہ خواہ ضرورت بھی نہ ہو بس پسند آنے کی دیر ہے، کہ فوراً ہی خرید لیتی ہیں اور ذخیرہ کرتی چلی جاتی ہیں، پھر لطف یہ کہ نہ وہ کام میں آتی ہیں نہ ان کی حفاظت کرتی ہیں، یوں ہی ضائع ہو جاتی ہیں، تو اس طرح سے خاوند کے مال کو اُڑانا قیامت میں موجب باز پرس ہے، حدیث اَلْمَرْأَةُ رَاعِيَةٌ فِي بَيْتِ زَوْجِهَا الخ میں اس کی تصریح ہے،

عید، بقر عید اور شادیوں پر مستقل جوڑا بنانا شوہر کے لئے ضروری نہیں،

علیٰ ہذا عید بقر عید کے لئے یا شادیوں میں شرکت کے لئے مستقل جوڑا بنانا شوہر کے ذمہ نہیں تو اس کے مال میں سے بلا اس کی رضا کے بنانا بھی عورت کے لئے جائز نہ ہوگا، یہ تو دنیوی مصارف ہیں، ان میں تو بلا رضائے شوہر اس کا مال صرف کرنا کہاں جائز ہوتا،

شوہر کی اجازت کے بغیر دینی مصارف میں بھی چندہ دینا جائز نہیں،

دینی مصارف میں بھی مثلاً کسی سائل کو دینا یا کسی مدرسہ وغیرہ کے چندہ میں دینا یا کسی عالم یا واعظ یا یتیم و مسکین و بیوہ و محتاج کی خدمت کرنا بھی بلا رضائے شوہر اس کے مال میں سے جائز نہیں، نہ ایسا دیا ہوا چندہ خدا تعالیٰ کے یہاں قبول ہے، حدیث میں ہے،

اِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ اِلَّا الطَّيِّبَ　　(یعنی اللہ تعالیٰ پاک ہے وہ صرف پاک چیز کو ہی قبول فرماتا ہے)

عورتوں کو اخراجات کے لئے مال دینے کے بارے میں مردوں کو ایک مشورہ

چونکہ ایسے مصارف دینیہ و دنیویہ کی اکثر حاجت واقع ہوتی ہے، اور اکثر عورتوں کے پاس جداگانہ مال نہیں ہوتا، اس لئے مردوں کو مناسب ہی کہ نفقۂ واجبہ کے علاوہ حسب وسعت کچھ خرچ ایسے مواقع کے لئے جداگانہ بھی دے دیا کریں، پھر اس کا حساب نہ لیا کریں، تاکہ وہ اپنی مرضی کے موافق آزادی کے ساتھ

بے تکلف ایسے مصارف میں صرف کر سکیں،

شوہر کے ذمہ عورت کا صدقہ فطر قربانی اور اس کے اپنے زیور کی زکوٰۃ واجب نہیں، نیز شوہر کے ذمہ عورت کے مملوکہ زیور کی زکوٰۃ یا اس کی طرف سے صدقۂ فطر یا قربانی واجب نہیں، سو اگر ایسی رقم ان کو مل جایا کرے گی تو ان واجبات کی ادائیگی میں ان کو سہولت ہوگی، لیکن چونکہ شوہر پر واجب تو ہے نہیں، اگر شوہر نے نہ دیا تو عورت اپنا زیور بیچ کر یہ سب حقوق اس سے ادا کرے، شوہر کے مال سے بلا اس کی رضا کے ان عبادات میں صرف کرنا جائز نہ ہوگا، خوب سمجھ لینا چاہئے، عورتیں اس میں سخت بے احتیاطی کرتی ہیں، اور اس کے ناجائز ہونے کا ان کو وسوسہ تک بھی نہیں آتا، گویا شوہر کے مال کا اپنے کو بالکل مالک سمجھتی ہیں، سو یہ بنا ہی باطل ہے،

شوہر اور بیوی کی ملک جدا جدا ہے ان دونوں کی ملک جدا جدا ہے، یہ شوہر کے لئے بھی ظلم ہوگا کہ اگر عورت کے مال میں بلا اس کی رضا کے تصرف کرے، اور عورت کے لئے بھی خیانت ہوگی اگر مرد کے مال میں بلا اس کی رضا کے تصرف کرے،

رضا کا مفہوم و مطلب اور رضا سے مراد سکوت کرنا یا ناراضی کا اظہار نہ کرنا یا پوچھنے پر رضا ظاہر کرنا نہیں، تجربہ سے ثابت ہے کہ اکثر اوقات باوجود گرانی اور کراہت کے لحاظ و شرم و مروت کے سبب بھی ایسا کیا جاتا ہے، رضا وہ ہے کہ قرائن قویہ غیر مشتبہ سے مالک کا طیبِ خاطر جزم (یقینی طور پر دلی رضامندی) کے ساتھ معلوم ہو جاوے، قرآن و حدیث میں اسی مادہ کا استعمال شرط جواز مال میں کیا گیا ہے،

قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى فَاِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوْهُ هَنِيْٓـئًا مَّرِيْٓـئًا،	(فرمایا اللہ تعالیٰ نے ہاں اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر کا کوئی جزو تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار و خوشگوار سمجھ کر)
وَقَالَ رَسُوْلُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ اَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُّسْلِمٍ اِلَّا بِطِيْبِ نَفْسٍ مِّنْهُ	(اور فرمایا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے، خبردار! کہ مسلمان کا مال بغیر اسکی رضامندی کے حلال نہیں)

چندہ دینے اور وراثت کی معافی میں رضامندی کی شرط اور یہی حکم ہے چندوں اور مواریث کے متعلق کہ لحاظ سے دیدینا یا معاف کر دینا کافی نہیں، طیبِ خاطر شرط ہے، اور مواریث میں طیبِ خاطر سے معاف کرنا بھی کافی نہیں، کیونکہ اعیان میں ابرا صحیح نہیں،

بھائیوں کو میراث ہبہ کرنے کا سہل طریق

جیسا ہندوستان میں رسم ہے کہ بہنیں بھائیوں کو اپنا حصہ معاف کر دیتی ہیں بلکہ دو صورتوں میں سے ایک صورت کی ضرورت ہے، یا تو ترکہ میں جو چیزیں قابل تقسیم ہیں ان کو حسّاً تقسیم کر کے پھر جس وارث کا دل چاہے دوسرے وارث کو ہبہ مع القبض کر دے، اور اگر اس میں جھگڑا معلوم ہو تو اس دوسرے وارث کے ہاتھ اپنا حصہ بیع کر دے، پھر زرِ ثمن (مقررہ قیمت) خواہ معاف کر دے اور یہ بہت سہل ہے، شرعاً تو اس طرح سے معاملہ صحیح ہو جائے گا، پھر قانونی استحکام جس طریق سے چاہے کر دے، یہ مسئلہ کتاب المیراث کا تھا یہاں استطراداً ذکر کر دیا گیا،

مہر لے لینے سے نفقہ ساقط نہیں ہوتا

ایک غلطی نفقہ کے باب میں یہ ہے کہ بہت عورتوں کا گمان یہ ہے (اور مرد بھی اس غلطی میں عورتوں کے مبتلا رہنے کو غنیمت سمجھتے ہیں) کہ اگر ہم مہر لے لیں گے تو پھر نفقہ میں ہمارا کچھ حق نہ رہے گا، اس وجہ سے خود مانگنا تو درکنار بعضی خدا کی بندیاں تو مرد کے دینے پر بھی اُس ڈر کے مارے نہیں لیتیں، یہ امر بالکل غلط اور باطل ہے، وہ جدا حق ہے یہ جدا حق ہے، ایک کے لینے سے دوسرا ساقط نہ ہوگا،

شوہر پر اپنی بی بی کو رہنے کے لئے جداگانہ گھر یا کمرہ دینا واجب ہے

اور نفقہ ہی کا ایک جزو بی بی کو رہنے کے لئے گھر دینا ہے، اس کے متعلق ایک عام غلطی میں اکثر مرد مبتلا ہیں کہ جداگانہ گھر دینا اپنے ذمہ واجب نہیں سمجھتے بس اپنے عزیزوں میں عورت کو لاڈ لتے ہیں، سو اس میں حکم یہ ہے کہ اگر شامل رہنے پر عورت بخوشی راضی ہو تب تو خیر ورنہ اگر وہ سب سے جدا رہنا چاہے تو مرد پر اس کا انتظام واجب ہے، اور یہاں بھی راضی ہونے کے معنی وہی ہیں جو اوپر مذکور ہوئے، یعنی طیبِ خاطر سے راضی ہو، حتیٰ کہ اگر مرد کو قرائن قویہ سے معلوم ہو جائے کہ وہ جدا رہنا چاہتی ہے، مگر زبان سے اس کی درخواست نہ کر سکے تب بھی مرد کو شامل رکھنا جائز نہیں، البتہ اتنی گنجائش ہے کہ اگر پورا گھر جدا نہ دے سکے تو بڑے گھر میں سے ایک کوٹھڑی یا کمرہ ایسا دینا کہ اس کی ضروریات کو کافی ہو سکے، اور اس میں اپنا مال و اسباب مقفل کر کے (تالا وغیرہ لگا کر) رکھ سکے، اور آزادی کے ساتھ اپنے میاں کے ساتھ تنہائی میں بیٹھ اُٹھ سکے، بات چیت کر سکے، یہ واجب کے ادا کرنے کے لئے کافی ہوگا،

عورت کو اپنے عزیزوں سے جدا رکھنے ہی میں سلامتی ہے،

اور آجکل کے طبائع و واقعات کا مقتضا، تو یہ ہے کہ اگر عورت شامل رہنے پر راضی بھی ہو اور جدا رہنے سے سب اعزّہ (رشتہ دار) ناخوش بھی ہوں تب بھی مصلحت یہی ہے کہ جدا ہی رکھے، اس میں ہزاروں مفاسد کا انسداد (ہزاروں خرابیوں کی روک تھام) ہے، اور گو اس میں چند روز کے لئے عزیزوں کا ناک مُنہ چڑھے گا، مگر اس کی مصلحتیں

جب مشاہدہ ہوں گی سب خوش ہوجائیں گے، خصوص چولھا تو ضرور ہی علیحدہ ہونا چاہئے، زیادہ تر آگ اس چولھے ہی سے بھڑکتی ہے، فقہاء نے یہاں تک فرمایا ہے کہ مرد کی اگر پہلی بی بی سے کچھ اولاد ہو دوسری بی بی کو اس کے ساتھ بھی شامل رہنے پر مجبور نہیں کرسکتا، اور آجکل واقعات سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ بالخصوص دوسری اولاد کے ساتھ شامل رہنا بڑے بڑے فسادوں کی جڑ ہے، کہ دوسرے عزیزوں کے ساتھ اتنا فساد نہیں ہوتا،

بیوی پر اپنی ساس کی خدمت کرنا فرض نہیں ہے، بعضے آدمی اس کو بڑی سعادتمندی سمجھتے ہیں کہ بی بی کو اپنی ماں کا محکوم و مغلوب بنا کر رکھیں، اور اس کی بدولت بیبیوں پر بڑے بڑے ظلم ہوتے ہیں، سو سمجھ لینا چاہئے کہ بی بی پر فرض نہیں کہ ساس کی خدمت کیا کرے، تم سعادتمند ہو خود خدمت کرو، خدمت کے لئے نوکر لاؤ،

حرمتِ مصاہرت میں طلاق سے اور ارتداد میں بلا طلاق نفقہ ساقط ہے، ایک غلطی نفقہ کے متعلق وہ ہے جو اس کے قبل سرخی "بقیہ احکام بعد الطلاق" کے تحت میں مذکور ہو چکی ہے، کہ بعض لوگ طلاقِ بائن کے بعد نفقہ عدت کا واجب نہیں سمجھتے، سو اس کی تفصیل اسی مقام میں مذکور ہو چکی ہے، اعادہ کی حاجت نہیں، صرف ایک جزئیہ جو اس جگہ مذکور نہ تھا ذکر کیا جاتا ہے، وہ یہ کہ اگر افتراق بین الزوجین (میاں بیوی میں جدائی) کا سبب عورت کا کوئی فعلِ معصیت کا ہے تب اس کا نفقہ واجب نہیں، مثلاً عورت کی رضامندی سے حرمتِ مصاہرت ہوگئی، یا نعوذ باللہ عورت مرتد ہوگئی، اور اس لئے تفریق واقع ہوئی، حرمتِ مصاہرت میں طلاق سے اور ارتداد میں بلا طلاق، ان صورتوں میں نفقہ ساقط ہے البتہ مہر ساقط نہ ہوگا، جب خلوتِ صحیحہ سے مؤکد ہو چکا ہو۔

یہ سب کلام تھا بی بی کے نفقہ کے متعلق

نابالغ اولاد کا نفقہ بھی باپ پر واجب ہے اب سمجھئے کہ بی بی کی طرح نابالغ اولاد کا بھی نفقہ باپ پر واجب ہے، صرف اتنا فرق ہے کہ بی بی تو اگر مالدار بھی ہو تب بھی شوہر پر اس کا نفقہ واجب ہے، اور اولاد کا اس وقت واجب ہے جب وہ مالدار نہ ہوں، ورنہ خود اُن کے مال میں سے صرف کیا جائے گا، باپ کے مال میں واجب نہ ہوگا،

میراث کے مالک بچہ کا نفقہ باپ پر واجب نہیں مثلاً ایک بچہ کی ماں مرگئی، اور اس نے زیور جائیداد وغیرہ چھوڑا جس میں اس بچہ کو بھی میراث پہنچی، سو جب تک یہ میراث کا حصہ باقی ہے اُس وقت تک اس بچہ کا خرچ باپ کے ذمہ نہیں، اگر نقد نہ ہو باپ کو اجازت ہے کہ اس کو بیچ بیچ کر

اس کی ضروریات میں خرچ کرتا رہے، البتہ اگر فضولیات میں صرف کرے گا اپنے پاس سے بھرنا پڑے گا، اور یہ مسئلہ بہت مشکلوں کا حل کرنے والا اور بہت سی بے احتیاطیوں کا بند کرنے والا ہے، مثلاً بہت لوگ ایسے موقع پر بچوں کا حصہ تقسیم کرکے جدا نہیں کرتے، اور یوں سمجھتے ہیں کہ اس تقسیم سے ہمارا نقصان ہے، کہ خرچ ان بچوں کا ہمارے ذمہ ہے اور پھر اتنا مال اور الگ کردو تو ہر طرح ہم ہی خسارہ میں رہے، اور اس لئے اس کو بار سمجھتے ہیں، سو اب اس مسئلہ سے یہ اشکال رفع ہوگیا کہ تمھارا اس میں کوئی نقصان نہیں، جب تک اُن کا حصہ خرچ نہ ہوجائے تمھارے ذمہ ان کا نان نفقہ ہی واجب نہیں، البتہ اُن کا حساب رکھنے میں بہت احتیاط رکھنا چاہئے، سو یہ کوئی مشکل بات نہیں،

یہ تفصیل تو نابالغ ہونے تک ہے، اور بالغ ہونے کے بعد پھر نفقہ واجب نہیں رہتا، البتہ اگر یہ خود غنی ہے اور لڑکی کی شادی نہیں ہوئی، گو بالغ ہے، یا لڑکا کسی مرض وغیرہ کے سبب کسب سے عاجز ہے گو بالغ ہے یا تب اس کا نفقہ بھی واجب ہوگا،

محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے،

ایک غلطی یا کرتا ہی کہئے یہ ہے کہ بجز بی بی اور اولاد کے اور کسی کا نفقہ اپنے ذمہ نہیں سمجھتے، حالانکہ ایک تو محتاج والدین کا نفقہ مالدار اولاد پر واجب ہے، اور دوسرے جتنے اقارب (قریبی رشتہ دار) اس کے ذی رحم محرم ہوں، اور وہ حاجت مند ہوں، اور کسب سے بھی عاجز ہوں ان سب کا بھی نفقہ واجب ہے، مگر صرف تنہا پر نہیں بلکہ والدین کا تو تمام اولاد پر اور ان اقارب کا ایسے رشتہ داروں پر کہ اگر وہ ذی رحم محرم مرجائے تو ان رشتہ داروں کو ان کی میراث میں سے حصہ پہنچے، بقدر اس حصہ کے ہر شخص پر واجب ہوگا،

ذی رحم محرم کا نفقہ بھی حصۂ میراث کی طرح تقسیم ہوگا،

مثلاً ایک آدمی کے تین بھائی ہیں ایک عینی ایک علاتی (باپ شریک) ایک اخیافی (ماں شریک) تو اب دیکھنا چاہئے کہ اگر یہ شخص مرجائے تو ان تینوں میں میراث کس طرح بٹے؟ سو حکم یہ ہے کہ اخیافی کو تو ذی فرض ہونے کے سبب چھٹا حصہ ملے، اور عینی کو عصبہ ہونے کے سبب پانچ باقی مل جائیں اور علاتی کو کچھ بھی نہ ملے، پس اس شخص کا نفقہ بھی انہی دونوں پر واجب ہوگا، اس طرح سے اگر چھ روپے مہینہ تجویز کیا جائے، تو ایک روپیہ اخیافی بھائی پر اور پانچ روپیہ عینی بھائی پر، اور یہ نسبت میراث کی اُس وقت دیکھیں گے جب سب ذی رحم محرم ہوں، ورنہ ایک اگر ذی رحم محرم ہو دوسرا نہ ہو تو نفقہ صرف ذی رحم محرم پر ہوگا، اگرچہ اس شخص کے مرنے پر وارث وہ دوسرا غیر ذی رحم محرم ہوجائے، مثلاً ایک شخص کا ایک چچازاد بھائی ہے اور ایک ماموں، تو نفقہ صرف ماموں پر ہوگا، اور میراث چچازاد بھائی کو ملے گی، یہ سب نفقات تھے علاقہ

قرابت (رشتہ داری کے تعلق) کے سبب،

کام سے عاجز حاجتمند (انسان یا جانور) کا نفقہ سب پر واجب ہے

ایک فرد نفقہ واجبہ کی مطلقِ احتیاج کے سبب ہے، اس میں کسی کی تخصیص نہیں، جو شخص بھی حاجتمند اور کسب سے عاجز ہو خواہ وہ قریب ہو یا اجنبی، اور خواہ مسلم ہو یا کافر، بلکہ خواہ آدمی ہو یا جانور سب کی خبرگیری سب پر واجب ہے، البتہ اگر جانور کسی کا مملوک ہو تو صرف اس کے مالک پر نفقہ کے لئے جبر کیا جائے گا، اور اگر پھر بھی کوتاہی کرے تو حاکم اس کو بیع پر مجبور کرے گا، (کذا فی الدر المختار) اور اگر وہ جانور کسی کا مملوک نہ ہو تو اگر وہ خود چل پھر کر اپنا پیٹ بھر لیتا ہے تو خیر، اور اگر وہ اس سے معذور رہے تو سب پر اس کا نفقہ واجب ہوگا، اور موذی جانور درندے، خزندے اس سے مستثنیٰ ہیں "حقوق بہائم" (جانوروں کے حقوق) میں میرا رسالہ "ارشاد البہائم" قابل ملاحظہ ہے۔

بے جان چیزوں پر نفقہ کے لئے مجبور نہیں کیا جا سکتا،

البتہ بے جان چیزوں پر نفقہ کرنا اگر وہ بدون نفقہ کے ضائع ہوتی ہوں، جیسے گھر یا کھیتی وغیرہ، پھر بھی اس نفقہ پر مجبور نہ کریں گے، گو مال کے ضائع کرنے کی کراہت اس شخص پر ہوگی، مگر نفقہ پر مجبور نہ کریں گے، لیکن یہ چیز اگر مشترک ہو اور ایک شریک بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرنے کو تیار ہے تو دوسرے شریک کو بھی حاکم جبر کرے گا، کہ بقدر اپنے حصہ کے خرچ کرے، کیونکہ اس کو اپنے مال کے ضائع ہونے پر راضی ہونے کا حق ہے، مگر یہاں تو خرچ نہ کرنے سے دوسرے کا مال بھی ضائع ہوتا ہے، جس کا اس کو حق نہیں، اس لئے جبر کیا جائے گا،

علماء، مشائخ اور مبلغین کا نفقہ تمام مسلمانوں پر واجب ہے،

ایک فرد نفقہ واجبہ کی ایسی غامض (پوشیدہ) ہے کہ کسی کا ذہن بھی اس کی طرف منتقل نہ ہوا ہوگا، اور عوام کا تو کیا ہوتا خواص کا بھی نہ ہوا ہوگا، اور اس فرد کے بتلانے سے پہلے ایک مقدمہ معروض ہے، پھر اس فرد کو بتلایا جائے گا،

اور وہ مقدمہ یہ ہے کہ فقہاء نے تصریح کی ہے کہ نفقہ احتباس کی جزاء بھی ہوتا ہے، یعنی جو شخص کسی کی مصلحت یا خدمت کے لئے محبوس و مقید ہو، اور اس احتباس کے سبب وہ اپنی معیشت کا انتظام نہ کر سکتا ہو تو اس شخص کا نفقہ اس پر واجب ہوگا جس کی مصلحت و منفعت کیلئے محبوس ہوا،

چنانچہ اس کی مشہور مثال جو فقہا نے ذکر کی ہے رزقِ قاضی ہے، یعنی قاضی مسلمین، چونکہ عامۂ مسلمین کی شفقت کے لئے خدمتِ قضا میں محبوس و مشغول ہے، اس لئے اس کا گذارہ جس کو رزق و قوت کہتے ہیں عامۂ مسلمین پر واجب ہے جس کی شکل یہ ہے کہ بیت المال میں سے دیا جاتا ہے، کہ حقیقت اس کی مجمع اموالِ مسلمین ہے، اور اس لئے اس میں دیئے جانے کی حقیقت یہی ہے کہ عامۂ مسلمین سے دلوایا جاتا ہے،

اسی کی مثال ہے گواہوں کی خوراک، اس کا حاصل بھی یہی ہے، کیونکہ وہ ایک خاص وقت تک وہ مَنْ لَہُ الشَّهَادَة (جس شخص کے لئے گواہی دی جا رہی اس) کے کام میں مشغول ہے، اس لئے اس کو اس سے خوراک دلوائی جاتی ہے، حکامِ وقت نے بھی شریعت کے اس مسئلہ کو برقرار رکھا ہے، اور یہ مثال خصوصیت کے ساتھ اس لئے بھی وارد کی گئی ہے کہ اس فردِ مقصود کے متعلق بعض اعتراض کرنیوالوں پر حجت (دلیل) ہو، اور فقہا نے زوجہ کے نفقہ کو بھی جزاءِ احتباس ہی کہا ہے،

جب یہ مقدمہ ممہد (بیان) ہو چکا تو اب اس فردِ غامض کو بتلایا جاتا ہے، وہ علماء و طلباء و مشائخ کی خدمت ہے، جس کی حقیقت یہی ہے کہ یہ حضرات قوم کی دینی مصلحت میں محبوس ہیں، چنانچہ علمِ دین کی تحصیل و تعلیم کا دینی خدمت ہونا تو ظاہر ہے، باقی اس مصلحت کا قوم کی طرف راجع ہونا وہ اس طرح ہے کہ علومِ دینیہ میں تبحر مجموعہ مسلمین پر فرض کفایہ ہے، یعنی قوم میں اتنے جامع علومِ ادیان کے موجود رہنے کا انتظام رکھنا ضروری ہے، جس سے عام مسلمین کی دینی حاجتیں تبلیغِ احکام و جوابِ اسئلہ وغیرہ پوری ہو سکیں، اگر ایسا انتظام نہ کیا جائے گا تو تمام قوم عاصی و آثم (گنہگار) ہو گی،

علماء و طلباء کا نفقہ سب مسلمانوں پر واجب ہونیکی وجہ

اس مسئلہ کی علماء نے تصریح بھی کی ہے، اور عقل سے بھی سمجھ میں آتا ہے، اور اس کی عقلی نظیر طبیبِ کامل کی سی ہے، کہ ہر شخص کو طبیب کی حاجت پیش آتی ہے، لیکن اگر ہر شخص طبیب کامل بنے تو امرِ معاش بالکل مختل (درہم برہم) ہو جائے، اور اگر کوئی بھی نہ بنے تو حاجتِ طبیہ کسی کی بھی پوری نہ ہو، اس لئے صورت مجوزۂ عقل (عقل کی تجویز کردہ صورت) یہ ہے کہ قوم میں سے چند احاد (افراد) ایسے کامل ہوں جو تمام قوم کی حوائج (ضروریات) کو کافی ہو سکیں، اور یہ صورت ایسی ضروری ہے کہ اگر از خود کوئی تکمیل کی طرف توجہ نہ کرے تو قوم کو متفق ہو کر اور مصارف برداشت کر کے اس کا اہتمام ضروری ہے کہ چند آدمیوں کو اس طرف متوجہ کریں، اور اُن کے خورد و نوش (کھانے پینے) کے ذمہ دار ہوں، اور جب وہ طبیب ہو جائیں تو اُن کے گذارہ کے ذمہ دار ہو کر ان کو شہر میں رکھیں، اور وقتاً فوقتاً اپنے علاج کی حاجتیں اُن کے سامنے پیش کریں، پس اسی طرح مطبِ روحانی کے اہتمام کو کہ عبارت ہے دینی حاجتوں کے انتظام سے اس مطبِ جسمانی پر قیاس کر لیا جائے، اور یوں اگر کوئی اس مطبِ رُوحانی ہی کو فضول سمجھے وہ ہمارے نزدیک قوم سے خارج ہے، وہ ہمارا مخاطب ہی نہیں، خطاب مسلمانوں کو ہے، جس طرح کوئی وحشی جنگلی مطبِ جسمانی ہی کو فضول بتلائے تو وہ مطبِ جسمانی کی مثال اس پر حجت نہیں،

غرض اس تقریر سے اس مصلحت کا قوم کی طرف راجع ہونا ظاہر ہو گیا، جب یہ مصلحت عام قوم

کی ہے تو مثال طبیب کی طرح ان صاحبوں کے نفقات جو کہ اس مصلحت کی تکمیل میں مشغول ہیں، یعنی دین کے علماء و طلباء، مجموعہ قوم کے ذمہ واجب ہوں گے،

مذکورہ صاحبان کے نفقہ کے لئے مہتمم مدرسہ کو چندہ دینا	پھر جس وقت تک بیت المال منتظم تھا، بیت المال سے وصول ہو جانا عامہ مسلین سے وصول ہو جانے کی صورت تھی چنانچہ فقہاء نے قضاۃ

وعلماء ومفتیین وامثالہم کی کفایت کا بیت المال میں سے ہونا تصریحاً لکھا ہے، اور جب سے بیت المال منتظم نہیں رہا اب اس کی صورت صرف یہی ہے کہ سب مسلمان متفق و مجتمع ہو کر تھوڑا تھوڑا سب ان حضرات کی خدمت بقدر کفایت کریں، خواہ مدرسہ کی شکل میں ہو جس میں ضوابط و قواعد مقرر ہوتے ہیں، اور ان صاحبوں کی تنخواہیں اور وظیفے مقرر ہوتے ہیں، اور یہ سہل اور اقرب الی الضبط (آسان اور انتظامی لحاظ سے بہتر) اور خواہ توکل کی صورت میں ہو جس میں کوئی مقدار معین نہیں، جو کسی کو توفیق ہوئی بلا واسطہ کسی مہتمم وغیرہ کے خود ان کی نذر کر دے، اور یہ اقرب الی الخلوص (خلوص کے قریب) ہے،

اور یہ مسئلہ قرآنی منصوص بھی ہے، قال اللہ تعالیٰ :۔

لِلْفُقَرَآءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ ، (البقرہ، آیت ۲۷۳)	اُس میں حق اُن حاجتمندوں کا بھی ہے جو مقید ہو گئے ہوں اللہ کی راہ میں، اس لئے کہ وہ زمین میں محنت مشقت نہیں کر سکتے ۔

اس آیت میں اگر ان امور پر نظر کی جائے کہ لام استحقاق کا ہے، لفظ فقراء احتیاج کو بتلا رہا ہے، "اُحْصِرُوْا" احتباس پر دلالت کر رہا ہے، اور فِي سَبِيلِ اللهِ کی تفسیر طالب علم کے ساتھ منقول ہے، اور لَا يَسْتَطِيعُوْنَ ضَرْبًا عدم تفرغ الاسباب المعاش (اسبابِ معاش کی فرصت نہ ہونے) کی طرف اشارہ کر رہا ہے، تو تقریر مذکور کی صریح دلیل ہے،

پس علماء وطلباء سے جو سوال کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ جو علم دین میں مشغول ہیں آخر انھوں نے معاش کا کیا انتظام کیا ہے، تو عجیب بات ہے کہ سوال کا حق تو ان کو تھا بالعکس (اُلٹا) وہ اُن سے پوچھنے لگے،

اب معلوم ہو گیا ہوگا کہ جب اس کا انتظام قوم پر واجب ہے تو اگر ان کی خدمت میں کوتاہی کریں گے تو قیامت میں اُن سے باز پرس ہو گی، اور اس تقریر سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ تعلیم دین پر جو تنخواہ لی جاتی ہے اس میں امام شافعی رحمہ اللہ کے قولِ جواز اخذ الاجرت علی الطاعات

(نیکیوں پر معاوضہ حاصل کرنے کے جائز ہونے) پر فتویٰ دینے کی حاجت نہیں، اس کو اجرت ہی کیوں کہا جائے؟ کفایت جزاء للحبس (پابندی کے بدلہ کے لئے کفالت) کہا جائے، تو خود امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے مذہب پر اس کا جواز ثابت رہے گا،

اگر یہ شبہ کیا جائے کہ یہ سب موقوف اس پر ہے کہ یہ لوگ اپنی معاش کے لئے فارغ نہیں ہیں سو ہم یہ نہیں مانتے، اس کا جواب یہ ہے کہ یہ بات تجربہ سے معلوم ہوتی ہے اگر یہ لوگ معاش میں مشغول ہوں.... تو ان خدماتِ دینیہ کا ایسا حق ادا نہیں کر سکتے، جیسا کہ بالکل اس کے لئے فارغ ہوں اس وقت ادا کر سکتے ہیں، اور تجارب میں منازعت (تجربہ شدہ معاملہ میں بحث) نہیں ہو سکتی، حق تعالیٰ نے جن کی نسبت لَا یَسْتَطِیْعُوْنَ فرمایا ہے وہ اپاہج نہ تھے، بلکہ غایت درجہ مشغول فی سبیل اللہ تھے،

علماء کی دینی خدمات معلوم کرنیکا معیار

البتہ اس تقریر سے وہ علماء منتفع ہو سکتے ہیں جن کی نیت محض دینی خدمت ہے، طلبِ اموال نہیں ہے، اور اس کا معیار یہ ہے کہ اگر ایک جگہ تنخواہ میں توسط کے ساتھ گذر ہو رہا ہے اور دوسری جگہ سے زیادہ تنخواہ کا پیام آئے اور دوسری جگہ جانے میں کوئی دینی مصلحت زیادہ نہ ہو تو یہ شخص وہاں جانے سے انکار کر دے، بس یہ معیار ہے ورنہ بے شک وہ اجیر (مزدور) ہے، اور ایسے شخص کی تنخواہ کا تعین اس کو رزق وکفایت ہونے سے نہ نکالے گا، بلکہ تعین کو بمصلحت قطع نزاع (جھگڑے کو ختم کرنا) کہا جائے گا جس سے وہ اُجرت نہ ہوگی،

مادی نفقہ کے احکام ختم ہوئے

بابُ النفقاتُ الرُّوحانیۃ

نفقاتِ روحانیہ کا مفہوم، نفقاتِ روحانیہ سے مراد دینی تعلیم و تربیت ہے، اوپر اہل و عیال کے حقوق متعلقہ انفاقِ رزقِ حسّی (یعنی مادی رزق) کے بیان کئے گئے تھے، ایک قسم انفاق اور رزق کی معنوی بھی ہے، یعنی دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جو اہل و عیال کے حقوق ہیں،

چنانچہ سورۂ بقرہ میں ہے:-

وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ ٥ (البقرۃ، آیت ۳)	("اور جو کچھ رزق ہم نے اُن کو دیا ہے اس میں سے خرچ کرتے ہیں")،
كُلَّمَا رُزِقُوْا مِنْهَا مِنْ ثَمَرَةٍ، (البقرۃ: آیت ۲۵)	("جب کبھی دیئے جائیں گے وہ لوگ اُن بہشتوں میں سے کسی پھل کی غذا")،

کی تفسیر البذل من النعم الظاهرة والباطنة کے ساتھ مع اس کی مؤیدِ علم لایقال به ولا ینفق منه کے اور مرزوق کی تفسیر الطاعات والمعارف التی یستلذ بها اصحاب الفطرة والعقولِ السلیمة کے ساتھ کرنا (کما فی الروح) دلیل ہے اس کی کہ رزق عام ہے معنوی کو بھی اور انفاق عام ہے رزقِ معنوی کو بھی، تو ایک نوع کے نفقات و ارزاق کے بعد دوسری نوع کے نفقات و ارزاق کے احکام کا بیان کیا جانا اولیٰ و احریٰ ہے، (بہتر اور موزوں ترین) ہے، اس لئے اب دینی تعلیم و تربیت کے متعلق جو اہل و عیال کے حقوق ہیں وہ مذکور ہوتے ہیں:-

بیوی اور اولاد کی روحانی تربیت جسمانی پرورش سے زیادہ ضروری ہے جاننا چاہئے کہ جس طرح نفقاتِ حسّیہ (مادی اخراجات) سے بی بی اور اولاد اور متعلّقین کی جسمی تربیت ضروری ہے، جس کا اوپر بیان کیا گیا ہے، اسی طرح علوم و طرقِ اصلاح (علوم اور اصلاح کے طریقوں) سے ان کی روحی تربیت اس سے زیادہ ضروری ہے، اس میں بھی انواع انواع (قسم قسم) کی کوتاہیاں اختیار کی جاتی ہیں،

دین کی بات بتلانا اور امر منکر پر روکنا اولاد اور بیوی کے حقوق میں داخل ہے،

چنانچہ سب سے اوّل اور اعظم کوتاہی تو یہ ہے کہ بہت لوگ اس کو ضروری ہی نہیں سمجھتے یعنی اپنے گھر والوں کو نہ کبھی دین کی بات بتلاتے ہیں، نہ کسی امر منکر (برُے کام) پر اُن پر روک ٹوک کرتے ہیں، پس ان کا حق اتنا ہی سمجھتے ہیں کہ ان کو ضروریات کے لائق خرچ دیدیا اور سبکدوش (فارغ) ہوگئے، حالانکہ قرآن مجید میں نصِ صریح:

قُوٓا اَنْفُسَكُمْ وَاَهْلِيْكُمْ نَارًا	(اُپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو دوزخ کی آگ سے بچاؤ)،

اور سنّت میں حدیث صحیح:

كُلُّكُمْ رَاعٍ وَّكُلُّكُمْ مَسْئُوْلٌ عَنْ رَّعِيَّتِهٖ،	(تم میں سے ہر ایک حاکم ہے اور قیامت کے روز تم میں سے ہر ایک سے اس کے محکوموں کے بارے میں سوال ہوگا)،

اس کے وجوب کو صاف بتلا رہے ہیں، نیز اس میں متعدد مرفوع حدیثیں ہیں:-

اخفهم فی الله ولا ترفع عنهم عصاك ورجل كانت عنده أمة يطأها فأدبها فأحسن تأديبها وعلمها فأحسن تعليمها (متفق عليه عن ابی موسیٰ، کتاب الایمان)	(یعنی ان کو اللہ سے ڈراؤ، اور ان سے بے توجہی نہ کرو، یعنی ایک شخص کے پاس باندی ہے وہ اس سے وطی بھی کرتا ہے، اور اُسے اچھی طرح ادب سکھائے اور اچھی طرح تعلیم دے)
وَمَنْ عَالَ ثَلٰثَ بَنَاتٍ اَوْ مِثْلَهُنَّ مِنَ الْاَخَوَاتِ فَاَدَّبَهُنَّ (رواه فی شرح السنة عن ابن عباسؓ)	(جس نے تین بیٹیوں یا اسی طرح تین بہنوں کی پرورش کی اور انھیں ادب سکھایا)،
لان يؤدب الرجل ولده خير من ان يتصدق بصاع، ترمذی عن جابر بن سمرة،	(یعنی آدمی اپنے لڑکے کو ادب سکھائے اس سے بہتر ہے کہ ایک صاع صدقہ کرے)
مانحل والد ولده من نحل أفضل من ادب حسن (ترمذی عن ایوب بن موسیٰ)	(کسی والد نے اپنی اولاد کو اچھے ادب سے بڑھکر کوئی چیز نہیں دی)

مُرُوْا صِبْيَانَكُمْ بِالصَّلٰوةِ وَهُمْ اَبْنَاءُ سَبْعٍ وَاِذَا بَلَغُوْا عَشْرًا فَاضْرِبُوْهُمْ

اپنے لڑکوں کو نماز کا حکم دو جب وہ سات برس کے ہو جائیں اور جب وہ دس برس کی عمر کو پہنچ جائیں تو انکو مارو (نماز نہ پڑھنے پر)"

یہ سب نصوص دلالت کر رہے ہیں تعلیم و تربیت دونوں کی مطلوبیت پر،

لڑکیوں کو دینی تعلیم دلانا ضروری ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ لڑکوں کی تعلیم کو تو ضروری سمجھتے ہیں، مگر بیبیوں کی اور لڑکیوں کی تعلیم کو ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ تعلیم نسواں کو مضر سمجھتے ہیں، جیسا کہ اس کے مقابلہ میں بعض لوگ نسواں (عورتوں) کے لئے تعلیم جدید[۱] کو یا تعلیم قدیم کو بطرز جدید بھی ضروری سمجھتے ہیں، سو اس کی کافی بحث تعلیم نسواں کی تحقیق میں اسی رسالہ میں گزر چکی[۲] ہے، ضرور ملاحظہ فرمائی جاوے، ان سے ان کوتاہیوں کا اور ان کے تدارک کا اچھی طرح علم ہو جاوے گا،

تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تعلیم کو تو سب کے لئے ضروری سمجھتے ہیں مگر تربیت کو ضروری نہیں سمجھتے، حالانکہ تربیت کی ضرورت تعلیم سے بھی اہم ہے، تعلیم درسی سے تو من کل الوجوہ (ہر اعتبار سے) اور مطلق تعلیم سے من وجہ (بعض وجوہ سے)۔ تعلیم درسی سے تو اس لئے کہ وہ فرض عین نہیں، بہت صحابہ علوم درسیہ سے خالی تھے مگر ان پر کبھی اس کو لازم نہیں کیا گیا، اور تربیت یعنی تہذیب نفس ہر شخص پر فرض عین ہے، اور مطلق تعلیم سے اس لئے کہ مقصود تعلیم سے تربیت ہی ہوتی ہے، کیونکہ تعلیم علم دینا ہے، اور تربیت عمل کرانا اور علم سے مقصود عمل ہی ہے، اور مقصود کا اہم ہونا ظاہر ہے، اور ان سے اعمال جوارح (انسانی اعضا سے متعلق اعمال صالحہ) کا عقائد سے اہم ہونے کا اشکال لازم نہیں آتا، کیونکہ عقائد تو خود علوم مقصودہ بالذات ہیں، اور گفتگو ان علوم میں ہے جو عمل کے لئے مقصود ہیں، اور من وجہ (ایک طرح) اس لئے کہا گیا کہ بعض حیثیتوں سے یہ علوم افضل ہیں اعمال سے کہ علم اصل اور بناء ہے، اور عمل اس کی

---

[۱] جس کا مہلک ہونا ظاہر ہے بقول علامہ اقبال مرحوم ؎

جس علم کی تاثیر سے زن ہوتی ہے نازن ؏ اس علم کو کہتے ہیں ارباب نظر موت

[۲] ملاحظہ ہو اصلاح معاملہ متعلقہ بہ تعلیم نسواں اس عبارت تک "یہی فیصلہ ہے عقلاء کے اختلاف کا" اصلاح انقلاب امت جلد اول ص ۱۴۲ ، مطبوعہ ادارۃ المعارف کراچی ۱۴،

فرع اور اس پر مبنی، بہرحال تربیت یا تعلیم سے اہم ہے یا اس کے برابر مہم ہی سہی، مگر اس سے قطع نظر کرنے کی اور ضروری نہ سمجھنے کی تو کسی حال میں گنجائش نہیں،

تربیت آجکل کی تہذیب کا نام نہیں، ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعض لوگ تربیت کو بھی ضروری سمجھتے ہیں مگر اس کی حقیقت تہذیب عرفی سمجھتے ہیں، چنانچہ اسی کا اہتمام بھی کرتے ہیں، گو وہ شریعتِ مقدسہ کے خلاف ہی کیوں نہ ہو حتیٰ کہ میں نے ایک معزز تعلیم یافتہ کا جو کہ طبیب بھی تھے بچشمِ خود یہ واقعہ دیکھا کہ اُن کی گود میں ان کا ایک بچہ تھا، ایک صاحب اُن سے ملنے آئے، تو انھوں نے اس بچے کو حکم دیا کہ ان کو سلام کرو، یہاں تک تو نہایت خوبی کی بات تھی، اس بچہ نے کہا السلام علیکم، تو حکیم صاحب کیا فرماتے ہیں "یوں نہیں کہتے اس طرح کہو آداب عرض"، وہ ملاقاتی صاحب دیندار آدمی تھے بہت بگڑے، اور کہا افسوس! بچہ تو سنت کے موافق عمل کرے اور آپ اس کو بدعت کی تعلیم دیں، تو وجہ اس کی یہی ہے کہ تہذیبِ شرعی ان کی نظر میں کوئی چیز نہیں، حالانکہ مسلمان کو جس تہذیب کا امر ہے وہ تہذیبِ شرعی ہے،

آجکل کی تہذیب کو تعذیب کہنا بجا ہے بلکہ دونوں تہذیبوں کی حقیقت اور ان کے آثار میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہے کہ تہذیبِ عرفی جو کہ تہذیبِ شرعی کے منافی ہو، اس قابل بھی نہیں کہ اس کو تہذیب کہا جا سکے، بلکہ احقر تو اس کو تعذیب (عذاب) کہا کرتا ہے، کیونکہ حقیقت اس کی تکلف ہے، اور تکلف سے جو کلفتیں ہوتی ہیں وہ ظاہر ہیں، بلکہ تکلف کو تکلف کہتے ہی اس لئے ہیں کہ اس میں کلفتوں کو برداشت کرنا ہوتا ہے، امراء کی مجالس میں اس کا مشاہدہ ہو سکتا ہے،

حقیقی تہذیب، تہذیب شرعی کا نام ہے، حقیقی تہذیب تہذیبِ شرعی ہی ہے، چنانچہ متبعینِ سنت جو اس تہذیب کے عامل ہیں وہ جس راحت میں ہیں اس کا مشاہدہ محققین علماء مشائخ کی مجلس میں کر لیا جائے، اور آخری بات یہ ہے کہ اگر تہذیب غیر شرعی میں کلفت بھی نہ ہو اور تہذیب شرعی میں راحت بھی نہ ہو تب بھی جب مسلمان کے لئے ایک منہی عنہ (ممنوع) ہے اور دوسری مامور بہ (جس کا حکم دیا گیا ہے) تو مسلمان پر مسلمان ہونے کی حیثیت سے ایک کا ترک دوسرے کا فعل لازم ہوگا، جیسے اگر نماز کے لئے اٹھنے میں مشقت ہو اور گرم بستر میں لیٹے رہنے سے راحت ہو، مگر اس مشقت کو اس راحت پر ترجیح ہوگی، پھر اس کا بھی مشاہدہ کھلی آنکھوں ہر عامل کر لے گا کہ یہ مشقت اور یہ راحت چند روزہ ہی، پھر تو ایسا ذوق صحیح عطا ہوگا کہ موافقت شرع کے برابر کسی چیز میں راحت اور مخالفتِ شرع کے برابر کسی چیز میں کلفت نہ ہوگی مولانا اسی کو فرماتے ہیں ؎ "چند روزے جہد کن باقی بخند" (یعنی چند روز کوشش کر بقیہ ایام ہنستا رہ یعنی عیش کر)۔

غرض تربیتِ صحیحہ تہذیبِ شرعی کا نام ہے اس کا اہتمام کرنا چاہیئے،

تہذیبِ شرعی کے اپنانے میں عملی فروگذاشتیں

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے لوگ ضرورت بھی اسی تہذیب شرعی کی سمجھتے ہیں اور اس کا قصد بھی کرتے ہیں، مگر اس کی حقیقت نہیں سمجھتے، اس لئے اس میں عملاً و ارشاداً فروگذاشتیں کرتے ہیں، اور اس اخیر کوتاہی میں دیندار بکثرت بتلا ہیں، ان میں بعضے اہلِ علم بھی بلکہ بعض اہلِ طریقت بھی ہیں کہ بہت سے شعبے ان کے ذہن میں بھی نہیں آتے، اور اس وجہ سے خود ان سے ایسی حرکات صادر ہوتی ہیں جو سراسر عقل اور دین کے خلاف ہوتی ہیں اور ان بزرگوں کو ان کا احساس تک نہیں ہوتا، جب خود یہ حالت ہو تو دوسروں کی تو یہ کیا اصلاح کریں گے؟ اور وجہ اس کی یہی ہے کہ ان کو تہذیبِ حقیقی کی حقیقت نہیں معلوم ہوئی، اور باوجود اس کے کہ ان میں سے بعض نے درسیات بھی پوری کرلی ہیں، اور بعضے خدمتِ تدریس پر بھی معمور ہیں، اور شب و روز قرآن وحدیث زبان پر جاری ہیں، پھر بھی یہ بے خبری ہے، اس کی وجہ یہ نہیں کہ قرآن وحدیث میں اس کی تعلیم نہیں، بلکہ وجہ اس کی یہ ہے کہ ان صاحبوں کو اس طرف التفات نہیں، قرآن مجید میں

اَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ ،	(نماز کی پابندی کرتے رہو اور زکوٰۃ دیتے رہو)

کو دیکھتے ہیں مگر

لَا تَمْنُنْ تَسْتَكْثِرُ ، (المدثر، آیت ۶)	(اور کسی کو اس غرض سے مت دو کہ دوسرے وقت زیادہ معاوضہ چاہو)

کو نہیں دیکھتے،

لَا تَدْخُلُوْا بُيُوْتًا غَيْرَ بُيُوْتِكُمْ حَتّٰى تَسْتَاْنِسُوْا وَتُسَلِّمُوْا عَلٰٓى اَهْلِهَا ط (النور، آیت ۲۷)	(تم اپنے (خاص رہنے کے) گھروں کے سوا دوسرے گھروں میں داخل مت ہو جبتک کہ (ان سے) اجازت حاصل نہ کرلو اور (اجازت لینے کے قبل) ان کے رہنے والوں کو سلام نہ کرلو)

کے عموم پر نظر نہیں کرتے، مجھ کو خود ایک ذی علم کے ساتھ اس باب میں مکالمت (گفتگو) کا اتفاق ہوا، جو شب کے وقت میرے مردانہ مکان کے پھاٹک پر پہنچے، وقت ایسا تھا کہ سب سو گئے تھے اور ان کا کوئی شناسا بھی نہ تھا، آواز دی، ملازم جاگا، اور بولا، پھاٹک کھولنے کا حکم دیا کہ ہم ٹھیریں گے، اس کو بوجہ بے وقت ہو جانے کے اور اُن کو نہ پہچاننے کے بے اطمینانی ہوئی، اس لئے

اس نے ادب کے ساتھ کچھ عذر بھی کیا، مگر جب تاکیدی حکم ملا تو اس نے مروّت کے سبب پھاٹک کھول دیا، اور وہ دیوان خانہ میں آکر مقیم ہو گئے، صبح کو مجھ کو واقعہ معلوم ہوا، میں نے اُن سے یہ آیت پڑھکر بلااذن (بغیر اجازت) ٹھیرنے کی وجہ پوچھی، انھوں نے فرمایا یہ آیت خاص زنانخانہ کے متعلق ہے، میں نے اس تخصیص کی دلیل پوچھی، جواب ندارد،

اسی طرح ان آیتوں پر اُن کی نظر نہیں پڑتی :

فَإِنْ طِبْنَ لَكُمْ عَنْ شَيْءٍ مِّنْهُ نَفْسًا فَكُلُوهُ هَنِيئًا مَّرِيئًا (النساء، آیت ۴)	"یعنی ہاں اگر وہ بیبیاں خوشدلی سے چھوڑ دیں تم کو اس مہر میں کا کوئی جزو تو تم اس کو کھاؤ مزہ دار خوشگوار سمجھ کر"،
وَأَنْ تَعْفُوا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ ، (البقرۃ، آیت، ۲۳۸)	"اور تمھارا معاف کرنا تقویٰ سے زیادہ قریب ہے"،

کہ حق تعالیٰ نے مہر کی معافی کی صحت کے لئے طیبِ نفس کی شرط لگائی، اور پھر اقرب الی التقویٰ، عالی ہمتی کو فرمایا کہ بجائے ان سے معاف کرانے کے اُن کے حق سے زائد ان کو دیدو،

لوگوں کو مجبور کر کے چندہ وصول کرنا جائز نہیں،

چنانچہ اس نظر نہ پڑنے کا ثمرہ یہ ہو کہ ایسے لوگوں سے جن کے ساتھ بیوی جیسی بے تکلفی بھی نہیں یہ لوگ مساجد یا مدارس کے لئے خطابِ خاص کے ساتھ چندہ کا سوال کرتے ہیں، اور بوجہ بے تکلفی نہ ہونے کے وہ لوگ اُن کی وجاہت دنیویہ یا دینیہ سے مرعوب اور مغلوب ہو کر آزادی کے ساتھ اپنی رائے ظاہر نہیں کر سکتے، اور کراہت کے ساتھ اس سوال کو پورا کرتے ہیں، موٹی بات یہ ہے کہ بی بی جس سے غایت درجہ بے تکلفی ہے اور جہاں غالب طیب خاطر ہے جب اس سے معافی قبول کرنے میں طیبِ خاطر کو شرط قرار دیا گیا ہے جو تکلف کے موقع پر جہاں ایسا تعلق بھی نہیں اس طیبِ خاطر کا اہتمام بلیغ کیوں نہ شرط ہو گا، چنانچہ ایک حدیث میں اس کی غایت درجہ کی تصریح فرمائی ہے

أَلَا لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ مُسْلِمٍ إِلَّا بِطِيبِ نَفْسٍ مِّنْهُ ،	"خبردار! کسی مسلمان کا مال بدون اس کی طیب خاطر کے حلال نہیں"،

بلکہ عالی ہمتی و عالی حوصلگی و نیز ابقاء عزت دین کا مقتضاء تو یہ تھا کہ اس باب میں بالکل ہی یکسوئی اختیار کرتے اور حضرات انبیاء علیہم السلام کی سنت پر رہتے، حیث قالوا، لَا أَسْأَلُكُمْ عَلَيْهِ مَالًا، (میں تم سے اس پر مال کا سوال نہیں کرتا)، نظر نہ ہونے نے اس غائلہ (آفت) میں مبتلا کیا،

اباحتِ تصرفِ مالی میں کوتاہ نظری

اباحتِ تصرّفِ مالی کی شرائط کے متعلق کوتاہ نظری کے شعبوں میں سے ایک اور واقعہ ہے کہ میرے یہاں ایک مولانا مہمان آئے، گھر سے اُن کے لئے کھانا آیا تو آپ نے ایک دوسرے ہم وطن کو اصرار کر کے کھانے میں شریک کرلیا، میرے ملازم نے کہا کہ بلا اجازت مالک کے یہ تصرف جائز نہیں معلوم ہوتا، فرمانے لگے ہم تحقیق کرلیں گے، مگر ان کے نزدیک یہ امر اتنا مہتم بالشان ہی نہ تھا جو تحقیق کو ضروری سمجھتے، چنانچہ تحقیق نہیں فرمایا، اسی طرح کئی روز گذر گئے، آخر میں نے ہی ایک روز ان سے تذکرہ کیا، تو فرماتے ہیں میں یہ سمجھا کہ یہ سب میرے ہی لئے ہے، اور تھا زیادہ اس لئے دوسرے کو شریک کرلیا، میں نے کہا حیرت ہے، آپ کے پاس اس کی کیا دلیل تھی کہ یہ تملیکاً آیا ہے؟ بلکہ ظاہر تو یہی تھا کہ اباحۃً آیا ہے، اور وہ اباحت مقید ہے تصرّفِ خاص کے ساتھ کہ وہ آپ کا نوش فرمانا ہی، اور زیادہ اس لئے بھیجا جاتا ہے کہ مہمان کو کمی نہ رہے، اور شاید وہ دوبارہ مانگتا ہوا شرمائے تو آپ نے یہ دوسرا تصرف کس بناء پر کیا؟

تربیتِ اخلاق کی نظر سے قرآن وحدیث نہ دیکھنے والے علماء کی چند کوتاہیاں

غرض ان باتوں کی پرواہ ہی نہیں، سب کی وجہ یہی ہے کہ تربیت اخلاق کی نظر سے قرآن وحدیث کو نہیں دیکھا، اسی طرح بعض اہلِ علم و اہلِ مشیخت میں ایک بلائے عام شائع ہے، اِلّا نادراً کہ اپنے ساتھ دعوت میں دو چار کو (اگر بڑے محتاط ہوئے) یا بڑے مجمع کو (اگر غیر محتاط ہوئے) لے جاتے ہیں، اور اپنے جی کو سمجھاتے ہیں کہ صاحبِ دعوت کی اجازت ہو ہی گی، حالانکہ بکثرت مشاہدہ ہوتا ہے کہ صاحبِ دعوت کو گراں گزرتا ہے، مگر ان کو کچھ بحث نہیں، ان میں بعضے اجازت کی ضرورت بھی سمجھتے ہیں مگر خود اجازت کی حقیقت نہیں سمجھتے، اجازت لینا وہ ہے جہاں اجازت دینے والا آزادی سے انکار بھی کرسکے، جس طرح حضور سرورِ عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک مقام پر دعوت میں ایک زائد شخص کی اجازت لی، مگر اس کے ساتھ ہی یہ حالت تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے جان نثار خادموں کو اس قدر بے تکلف کر رکھا تھا کہ جب اُن کی رائے نہ ہوتی تو صاف انکار بھی کردیتے، چنانچہ ایک فارسی کا شوربا پکانا اور آپؐ کی دعوت کرنا اور آپؐ کا حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے لئے پوچھنا اور اس کا انکار کردینا، اور آپؐ کا بُرا نہ ماننا اور اسی طرح حضرت بریرہ رضی اللہ عنہا سے مغیثؓ کی سفارش فرمانا اور اس کا انکار کردینا حدیثوں میں مصرّح ہے، کیا آج کسی مرید کی ہمت ہے کہ وہ اس طرح پیر کی اجازت لینے پر انکار کرسکے، یا کسی پیر کی ہمت ہے کہ مرید کے ایسے انکار کو بشاشت کے ساتھ قبول کرلے، حضرت قیامت قائم ہوجائے، تو ایسی اجازت کا نہ لینا معتبر نہ دینا معتبر، سو ان صاحبوں کو اجازت کی حقیقت سے ہی

آگاہی نہیں، غرض یہ وہ جماعت ہے کہ ضرورت تو تہذیبِ شرعی کی سمجھتے ہیں، مگر اس کی حقیقت سے بے خبر ہیں، یہ مختصر نمونہ ہے تعلیم و تربیت کے متعلق کوتاہیوں کا، اور ضرورت دونوں امر کی عام ہوئی،

تعلیم و تربیت کا اثر ابتدا ہی میں مستحکم ہو سکتا ہے،

اور تجربہ سے ثابت ہوا ہے کہ ابتدا ہی سے جو تعلیم و تربیت ہو اس کا جو اثر ہوتا ہے کہ علوم و اعمال مثل امور فطریہ و طبعیہ کے ہو جاتے ہیں، وہ بات بعد میں نہیں ہوتی، اور یہ کام ماں باپ اور سرپرستوں کا ہے، اور وہ عموماً اس میں کوتاہی کرتے ہیں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہالتیں اور بد اخلاقیاں طبیعتِ ثانیہ بن جاتی ہیں، پھر بعد میں جو شخص اس کا اہتمام کرنا چاہے، مثلاً عورت کے لئے شوہر اور مردوں کے لئے استاد و پیر، ان کو سخت دقت کا سامنا ہوتا ہے، اور بعض ناگواری درجۂ منافرت تک پہنچ جاتی ہے، دوسرے مصلحین سے تو یہ منافرت صرف مباعدت (دوری) کی صورت پیدا کر لیتی ہے،

عورتوں کی اصلاح کی طرف پوری توجہ دینی چاہئے!!

مگر زوجین کا تعلق ایسا ہے کہ ہر وقت کا سابقہ رہتا ہے، اور مرد اپنی مصلحتوں سے قطع تعلق کو پسند نہیں کرتا، اور نہ عورت کی جہالتوں کی برداشت کرتا ہے تو یہاں ہمیشہ کے لئے منازعت و مناقشت (لڑائی جھگڑے) کی بنیاد قائم ہو جاتی ہے، جس کے نتائج جانبین کے حق میں بُرے سے بُرے پیدا ہوتے رہتے ہیں، اور دونوں کی زندگی موت سے بھی تلخ تر ہو جاتی ہے، اور ان سب کا سبب اکثر وہی ابتدا میں اصلاح کی طرف توجہ نہ کرنا ہے، لیکن اگر ایسا اتفاق ہو گیا تو یہی نہیں کہ ان لوگوں کو مہمل چھوڑ دیا جائے بلکہ جب قدرت ہو تب ہی اس کی سعی کرنا ضروری ہے،

تہذیبِ شرعی پر عمل درآمد کا طریقہ

اور قدرت دو قسم کی ہے، ارادی اور قہری، سو ارادی تو پیر اور استاد کی ہے، اور قہری حاکم کی ہے، خواہ بحکومتِ عامہ ہو جیسے سلطان و نائبِ سلطان، خواہ بحکومتِ خاصہ جیسے عورت کے لئے شوہر، یا غلام کے لئے آقا، سو مردوں کے لئے تو تہذیبِ شرعی کے لئے حکومتِ قہریہ کے اسباب بہت کم مجتمع ہوتے ہیں، کیونکہ سلاطین کو تو اس طرف توجہ ہی نہیں، اور غلام کسی کے ہیں نہیں، اب رہگئی حکومتِ ارادیہ سو اس کے اثر سے نکل جانا ہر وقت ان کے اختیار میں ہے، اس لئے مردوں کی اصلاح کے اسباب بے شک ضعیف ہیں، البتہ عورتوں کے لئے عادتاً شوہر کا ہونا لازم ہے، اور گو کبھی اس کی مدت قصیر (کم) بھی ہوتی ہے مگر اکثر طویل ہی ہوتی ہے، سو عورتوں کی اصلاح کا طریق بہت سہل ہے،

خلاصۂ کلام یہ ہوا کہ ماں باپ یا پرورش کنندہ کے ذمہ بچوں کی تعلیم و تربیت ضروری ہوئی

اور شوہر کے ذمہ بیبیوں کی، اصالۃً اسی مضمون کو بیان کرنا مقصود ہے، باقی جس کو جس پر قدرت ہو اور جس قسم کی ہو وہ اسی پر قیاس کرلی جاوے، ممکن ہے کہ استطراداً اس کے بھی کچھ مضامین مذکور ہوجائیں پس سنئے:

عورتوں کی تعلیم و تربیت کے مختصر اور ضروری قواعد، تعلیم و تربیت کے مختصر اور ضروری قواعد مخلوط طور پر لکھے جاتے ہیں:۔

(۱) جب گھر میں بی بی کو نکاح کرکے لاوے اوّل اس کو اپنے سے بے تکلف کرلے، اس کے بعد عقائدِ ضروریہ میں سے اس کا امتحان لے، یعنی بہشتی زیور کے اوّل حصہ میں جو عقائد ضروریہ لکھے ہیں ان کو سُناکر اور سمجھاکر اس سے پوچھے کہ کیا تیرا یہی عقیدہ ہے، جس کا وہ اقرار کرلے اس اقرار پر اکتفاء کرے، اس کی ضرورت نہیں کہ وہ اپنی زبان سے پوری تقریر کرسکے، بعض عوام اس پر قادر نہیں ہوتے تو ایسے لوگوں کو اس کی تکلیف نہ دی جاوے، اور جس میں وہ تردّد (شک) ظاہر کرے اس کو خوب سمجھاکر بتلادے کہ یہ عقیدہ ضروری ہے، اسی کے موافق اپنا اعتقاد رکھے،

(۲) اس کی پوری نماز سُن لے، یعنی جو کچھ اس میں پڑھا جاتا ہے وہ بھی اور رکعات کی تعداد مع فرض اور واجب اور سنتوں کے، اور ہر ایک کی جس طرح نیت کی جاتی ہے، اور رکوع و سجود و قعدہ کی ہیئت سب پوچھ لے، اور دیکھ لے، جہاں کوئی غلطی ہو اس کو درست کردے، اور درست کرنے کا یہ مطلب نہیں کہ بس ایک دفعہ زبان سے کہہ دیا، ممکن ہے کہ ذہول (بھول) ہوجاوے، اور ممکن ہے کہ بہت سی غلطیوں پر ایک دم سے متنبہ کیا، اور سب کو ضبط نہ کرسکی، اس لئے ایک ایک غلطی کی اصلاح کرکے اس پر بار بار عمل کراکر دیکھ لے، اس طرح سے تمام نماز کو درست کردے،

(۳) اس کو پردہ کے سب احکام و مسائل بتلادے، کہ کس کس سے پردہ کرنا ضرور ہے، اور کون کون محرم ہیں، اور اس کی بہت تاکید کردے، یہ سب مسائل بہشتی زیور میں ملیں گے، ان کو دیکھ دیکھ کر بتلادے،

(۴) اس کو اہلِ حقوق کے حقوق خصوص جن سے ہر وقت سابقہ (واسطہ) پڑے گا سمجھادے رسالہ حقوق الاسلام میں یہ حقوق مذکور ہیں، خواہ اُن کو پڑھ کر سنادے یا سمجھادے،

(۵) رسومِ جہالت کی قباحت اس کے دل میں بٹھلادے، اور ان سے ایسی نفرت دلادے کہ وہ اُن کے پاس نہ پھٹکے، اصلاح الرسوم اس کے لئے کافی ہے، نیز اس کے دیگر اعمال و اخلاق و عادات کی اصلاح کی بھی کوشش جاری رکھے، جس کے لئے آسان طریقہ یہ ہے کہ کتبِ ذیل اس کو تھوڑا تھوڑا کرکے سنادے:۔

بہشتی زیور تمام، فروع الایمان، جزاء الاعمال، قصد السبیل، تعلیم الدین، اصلاح الرسوم، تبلیغ دین، آداب المعاشرت، احقر کے مواعظ[۱]، جو کہ تخمیناً سو کی تعداد یا کچھ کم و بیش چھپ چکے ہیں، یہ رسالہ اصلاحِ انقلاب ... جتنا چھپ جائے، ترجمہ روض الریاحین اگر چھپ جائے، اور جو کوئی حرکت ان کتابوں کے خلاف ہو نرمی سے مطلع کرے. اور بار بار مطلع کرنے سے اکتائے نہیں، انشاء اللہ ضرور اثر اور نفع ہوگا،

قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی وَذَکِّرْ فَاِنَّ الذِّکْرٰی تَنْفَعُ الْمُؤْمِنِیْنَ (الذّٰرِیٰت، آیت) (اللہ تعالیٰ نے فرمایا اور سمجھاتے رہیے کیونکہ سمجھانا ایمان لانیوالوں کو (بھی) نفع دے گا»

(۶) خرچ کرنے کے آداب اس کو سمجھائے کہ فضولیات میں خرچ نہ کرے،

(۷) زیور اور لباس کے زیادہ .... اہتمام کرنے سے اس کو نفرت دلائے،

(۸) تھوڑا سا ذکر و شغل اس کو قصد السبیل سے بتلا دے، اگر کوئی شیخ متبع سنت محقق میسّر ہو اس کی برکات و کمالات اس کے سامنے بیان کر کے جب اس کو اعتقاد ہو جائے اس کو بیعت کرا دے کہ اس کو اتّباع کی سہولت میں دخلِ عظیم ہے،

(۹) اگر تھوڑا وقت فرصت کا نکال کر کچھ لکھ پڑھ لے اس قدر کہ کتب مذکورہ کو پڑھ کر سمجھ سکے تو زیادہ بہتر ہے، اس سے اس کی نظر دین پر وسیع ہو جاتی ہے، اور جس قدر نظر وسیع ہوگی، اسی قدر اصلاح میں ترقی کی امید ہے،

بچوں کی تربیت کا طریقہ

(۱۰) پھر خدا تعالیٰ جب اولاد دے اور وہ سیانی ہونے لگے تو سب سے اوّل اس کو کلمۂ توحید سکھلا دے، پھر اس کو ضروری آداب کی تعلیم کرے،

(۱۱) جب سامنے آئے سلام کرے،

(۱۲) کسی کے پاس کوئی چیز دیکھے تو حرص نہ کرے، اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی وسعت (حیثیت) کے موافق اس کی مرغوب (پسندیدہ) چیزیں خود منگا کر اس کو کھلاتا پلاتا رہے، اور جب وہ ضد کرے ہرگز اس کی ضد پوری نہ کرے، تاکہ ضد کرنے کی عادت چھوٹ جائے،

(۱۳) اس کو یہ عادت ڈالے کہ کوئی چیز تنہا نہ کھائے، بلکہ دوسرے بچوں کو تقسیم کر کے کھائے، اور اس کے لئے یہ رعایت رکھنا ضروری ہے کہ جو چیز اس کو دے خواہ نقد یا غیر نقد اس کی ملک نہ کرے،

---

[۱] حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہٗ العزیز کے مواعظ کا مطالعہ اصلاحِ نفس کے لئے تریاق کا حکم رکھتا ہے، ان کی تعداد ۴۰۰ کے قریب ہے ۱۲

کیونکہ ملک ہوجانے کے بعد نابالغ کو تبرع کرنا جائز نہیں، بلکہ اباحت کے طور پر دے، تاکہ دوسروں کو دینا اور ان دوسروں کو لینا جائز ہو،

(۱۴) جھوٹ بولنے سے اس کو نفرت دلائے،

(۱۵) پردہ اور حیاء کی اس کو تعلیم کرے،

(۱۶) اس کو یہ عادت ڈالے کہ اگر اس سے کوئی غلطی ہوجائے تو اس کا اقرار کرلیا کرے، اور اگر وہ غلطی متعدّی ہو تو صاحبِ حق سے معاف کرایا کرے، اس کی عادت ڈالنا بہت سخت ضروری ہے کہ اس میں اس کے دین کی سلامتی اور دنیا میں موجبِ عزت و راحت ہے، اور اس میں لپی ڈپیش کرنا تکبر اور ہمیشہ کے لئے موجبِ نفرت و ذلت ہے،

(۱۷) اس کی بھی عادت ڈالے کہ سخن پروری کبھی نہ کرے، حق واضح ہوجانے کے بعد گو اپنے سے کم درجہ کا آدمی اس پر مطلع کرے فوراً اس کا اتباع کرے، اور ہر امر میں اس کو تواضع اور خاکساری کی عادت ڈالے،

(۱۸) لڑکوں اور لڑکیوں کو ایک جگہ نہ کھیلنے دے، اگر وہ نامحرم ہیں تو آئندہ کے مفاسد کا اس میں انسداد ہے، اور اگر وہ محرم ہیں تو لڑکیوں میں قلتِ حیاء پیدا ہونے کا اور لڑکوں میں نقصانِ عقل کا احتمال ہے،

(۱۹) اس کی عادت ڈالے کہ وہ چھپ کر کوئی کام نہ کریں، چھپ کر بچہ وہی کام کرے گا جس کو برا سمجھے گا، تو گویا ابتداء ہی سے وہ برا کام کرنے کا خوگر (عادی) ہوجائے گا،

(۲۰) خود بھی بچوں کے سامنے کوئی نامناسب کام یا بے حیائی کا کام نہ کرے، گو بچہ اتنا چھوٹا ہو کہ بول بھی نہ سکتا ہو، کیونکہ اس فعل کا عکس اس کے دماغ میں مرتسم و منقوش (یعنی نقش) ہوجاتا ہے، پھر اس کا اثر بڑے ہوجانے کے بعد ظاہر ہوگا،

(۲۱) ہنسی، دل لگی کی عادت اس میں نہ پیدا ہونے دے کہ اس سے مادہ بیباکی کا پیدا ہوگا، کیونکہ محل بے محل کی بچہ کو تمیز نہیں ہوگی،

(۲۲) اس کا اہتمام رکھیں کہ سیانے بچوں میں دوستی نہ پیدا ہونے پائے کہ اس کے مفاسد بے شمار ہیں، اور اگر ان کو باہم کھیلنے میں کوئی مصلحت ہو تو اس کھیل کے وقت خود حاضر رہیں، بعد میں اختلاط (میل جول) نہ ہونے دے،

(۲۳) سیانے لڑکوں کو علماءِ محققین اور مشائخ محققین کی مجالس میں اپنے ساتھ لے جایا کرے،

کہ ان حضرات کی صحبت و توجہ موجب برکات و تقویت علی الدین والطاعات ہے،

(۲۴) جب بچہ سیانا ہو جاوے اس کو نماز کی سورتیں اور دُعائیں زبانی یاد کرائے اور نماز پڑھائے اور لڑکی ہو تو اس کو پردہ میں بٹھلاوے،

(۲۵) اور جب پڑھنے کا متحمل ہو تو اس کو کسی ایسے مکتب میں جس کا معلم شفیق اور دیندار ہو بٹھلادے اور لڑکی ہو تو زنانہ مکتب میں بٹھلادے، مگر آجکل جو زنانہ اسکول ایجاد ہوئے ہیں ان کی آب و ہوا اچھی نہیں اُن سے بچائے،

(۲۶) سب سے اوّل قرآن شریف پڑھوائے، اگر دماغ متحمل ہو تو حفظ کرانا افضل ہے، ورنہ ناظرہ ہی سہی مگر صحیح خواں (صحیح پڑھانے والے) سے پڑھوائے،

(۲۷) اگر قرآن حفظ کرادے تو بعد ختم قرآن اور اگر ناظرہ پڑھوائے تو بعد نصف قرآن ایک سبق اُن کتابوں کا شروع کرادے جو نمبر ۵ میں مذکور ہوئیں،

(۲۸) اور خواہ ان سبقوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت نکال کر یا ان کتابوں کے بعد بقدر ضرورت کچھ حساب اور املاء و انشاء کی مشق بھی ضرور کرادی جائے کہ ان چیزوں سے دین میں بھی مدد پہنچتی ہے لڑکیوں کے لئے لکھنے نہ لکھنے کے مناسب یا نامناسب کی تحقیق اسی رسالہ کے مبحث تعلیمِ نسواں میں گذر چکی ہے،

(۲۹) ان کتابوں کے بعد اگر اللہ تعالیٰ فراغ دے تو عربی کی تعلیم بھی کرادے، کہ اس زمانے میں اس کی بڑی سخت ضرورت ہے، ورنہ کوئی حلال اور طیّب حرفہ کسبِ معاش کے لئے سکھلادے کہ پریشانی سے ہمیشہ محفوظ رہے، بلکہ اگر علومِ عربیہ کے ساتھ کوئی پیشہ مناسبِ حال طلبہ سکھلادیا جائے تو علمِ دین کو ذریعۂ معاش بنانے سے وہ بچ سکتے ہیں،

(۳۰) اہل و عیال کی اصلاح و تادیب میں مضامینِ ذیل سے بہت اعانت ملے گی، ضرور ملاحظہ کرکے اس کے موافق عمل کریں،

رسالہ ہٰذا کی سُرخی طریقِ اصلاحِ انقلابِ طالبانِ احکام کے دستور العمل کے ختم تک،

رسالہ ہٰذا کی سُرخی سدِ موانعِ انقلاب امر پنجم کے ختم تک،

حصہ دہم بہشتی زیور اوّل سے ہنر اور پیشے کے بیان تک،

رسالہ الامداد میں مضمون قوت العیال جواب تک حسب بیان مہتمم رسالہ ان پرچوں میں شائع ہوا ہے، جلد اوّل کے سب باستثناء ۱۰، جلد دوم کے نمبر ۱، ۵، ۶، ۹، جلد سوم کے نمبر ۲، ۳، ۴، ۵، ۱۰، جلد چہارم

کا نمبر ۳، یہاں تک مضمون لکھنے کے بعد یاد آیا کہ بہشتی زیور کے چوتھے حصہ میں بذیل سرخی "اولاد کی پرورش کرنے کا طریقہ" اسکے متعلق کچھ ضروری دستور العمل ہے، دیکھنے سے اس مقام پر اس کا بعینہ نقل کر دینا مناسب معلوم ہوا، گو اس میں بعض ماسبق کا تکرار بھی ہے، مگر اس کے مہتم بالشان ہونے کے سبب تکرار کو گوارا کر کے اس میں تصرف گوارا نہیں کیا گیا، و ہو ہذا۔

اولاد کے پرورش کرنے کا طریقہ | جاننا چاہئے کہ یہ امر بہت ہی خیال رکھنے کے قابل ہے، کیونکہ بچپن میں جو عادت بھلی یا بری پختہ ہو جاتی ہے وہ عمر بھر نہیں جاتی، اس لئے بچپن سے جوان ہونے تک ان باتوں کا ترتیب وار ذکر کیا جاتا ہے:۔

(۱) نیک بخت دیندار عورت کا دودھ پلائیں، دودھ کا بڑا اثر ہوتا ہے،

(۲) عورتوں کی عادت ہے کہ بچوں کو کہیں سپاہی سے ڈراتی ہیں کہیں اور ڈراؤنی چیزوں سے، یہ بری بات ہے، اس سے بچے کا دل بیحد کمزور ہو جاتا ہے،

(۳) اس کے دودھ پلانے کے لئے اور کھلانے کے لئے وقت مقرر رکھو کہ وہ تندرست رہے،

(۴) اس کو صاف ستھرا رکھو، کہ اس سے تندرستی رہتی ہے،

(۵) اس کا بہت سا بناؤ سنگار مت کرو،

(۶) اگر لڑکا ہو اس کے سر پر بال مت بڑھاؤ،

(۷) اگر لڑکی ہے اس کو جب تک پردہ میں بیٹھنے کے لائق نہ ہو جائے زیور مت پہناؤ، اس سے ایک تو ان کی جان کا خطرہ ہے، دوسرے بچپن ہی سے زیور کا شوق دل میں پیدا ہونا اچھا نہیں،

(۸) بچوں کے ہاتھ سے غریبوں کو کھانا کپڑا پیسے اور ایسی چیزیں دلوایا کرو، اسی طرح کھانے پینے کی چیزیں ان کے بھائی بہنوں کو یا اور بچوں کو تقسیم کرایا کرو، تاکہ اُن کو سخاوت کی عادت ہو، مگر یہ یاد رکھو کہ تم اپنی چیزیں اُن کے ہاتھ دلوایا کرو، خود جو چیز شرع سے انہی کی ہو اس کا دلوانا کسی کو درست نہیں،

(۹) زیادہ کھانے والوں کی برائی اس کے سامنے کیا کرو، مگر کسی کا نام لے کر نہیں، بلکہ اس طرح کہ جو کوئی بہت کھاتا ہے لوگ اس کو حبشی کہتے ہیں، اس کو بیل جانتے ہیں،

(۱۰) اگر لڑکا ہو سفید کپڑے کی رغبت اس کے دل میں پیدا کرو، اور رنگین اور تکلف کے لباس سے اس کو نفرت دلاؤ کہ ایسے کپڑے لڑکیاں پہنتی ہیں، تم ماشاء اللہ مرد ہو، ہمیشہ اس کے سامنے ایسی باتیں کیا کرو،

(۱۱) اگر لڑکی ہو جب بھی زیادہ مانگ چوٹی بہت تکلف کے کپڑوں کی اس کی عادت مت ڈالو،

(۱۲) اس کی سب ضدیں پوری مت کرو کہ اس سے مزاج بگڑ جاتا ہے،

(۱۳) چلّا کر بولنے سے روکو، خاص کر اگر لڑکی ہو تو چلّانے پر خوب ڈانٹو، ورنہ بڑی ہو کر وہی عادت ہو جاوے گی،

(۱۴) جن بچوں کی عادتیں خراب ہیں، یا پڑھنے لکھنے سے بھاگتے ہیں، یا تکلف کے کپڑے یا کھانے کے عادی ہیں اُن کے پاس بیٹھنے سے، اُن کے پاس کھیلنے سے اُن کو بچاؤ،

(۱۵) ان باتوں سے اُن کو نفرت دلاتی رہو، غصہ، جھوٹ بولنا، کسی کو دیکھ کر جلنا، یا حرص کرنا، چوری، چغلی، اپنی بات کی پچ کرنا، خواہ مخواہ اس کو بنانا، بے فائدہ بہت باتیں کرنا، بے بات ہنسنا، یا زیادہ ہنسنا، دھوکہ دینا، بھلی بُری بات کا نہ سوچنا، اور جب ان باتوں میں سے کوئی بات ہو جاوے فوراً اس کو روکو، اس پر متنبہ کرو،

(۱۶) اگر کوئی چیز توڑ پھوڑ دے یا کسی کو مار بیٹھے، مناسب سزا دو تاکہ پھر ایسا نہ کرے، ایسی باتوں میں پیار دلاڈ ہمیشہ بچوں کو کھو دیتا ہے،

(۱۷) بہت سویرے مت سونے دو،

(۱۸) سویرے جاگنے کی عادت ڈالو،

(۱۹) جب سات برس کی عمر ہو جاوے نماز کی عادت ڈالو،

(۲۰) جب مکتب میں جانے کے قابل ہو جاوے اول قرآن مجید پڑھواؤ،

(۲۱) مکتب میں جانے میں کبھی رعایت مت کرو،

(۲۲) جہاں تک ہو سکے دیندار استاد سے پڑھواؤ،

(۲۳) کسی کسی وقت اُن کو نیک لوگوں کی حکایتیں سُنایا کرو،

(۲۴) ان کو ایسی کتابیں مت دو جن میں عاشقی معشوقی کی باتیں یا شرع کے خلاف مضمون یا اور بیہودہ قصے یا غزلیں وغیرہ ہوں،

(۲۵) ایسی کتابیں پڑھواؤ جس میں دین کی باتیں اور دنیا کی ضروری کارروائی آجاوے،

(۲۶) مکتب سے آنے کے بعد کسی قدر دل بہلانے کے لئے اس کو کھیلنے کی اجازت دو، تاکہ اس کی طبیعت کُند نہ ہو جاوے، لیکن کھیل ایسا ہو جس میں کوئی گناہ نہ ہو، چوٹ لگنے کا اندیشہ نہ ہو،

(۲۷) آتشبازی یا باجے یا فضول چیزیں مول لینے کے لئے پیسے مت دو،

(۲۸) کھیل، تماشے دکھلانے کی عادت مت ڈالو،

(۲۹) اولاد کو ضرور کوئی ایسا ہنر سکھلادو جس سے ضرورت اور مصیبت کے وقت چار پیسے حاصل کرکے اپنا اور اپنے بچوں کا گذارہ کرسکے،

(۳۰) لڑکیوں کو اتنا لکھنا سکھلادو کہ ضروری خط اور گھر کا حساب کتاب لکھ سکیں،

(۳۱) بچوں کو عادت ڈالو کہ اپنا کام اپنے ہاتھ سے کیا کریں، اپاہج اور سست نہ ہوجائیں، ان کو کہو کہ رات کا بچھونا اپنے ہاتھ سے بچھائیں، صبح کو سویرے اُٹھ کر تہہ کرکے احتیاط سے رکھدیں کپڑوں کی گٹھڑی اپنے انتظام میں رکھیں، اُدھڑا پھٹا خود سی لیا کریں، کپڑے خواہ میلے ہوں خواہ اُجلے ہوں ایسی جگہ رکھیں جہاں کیڑے کا چوہے کا اندیشہ نہ ہو، دھوبن کو خود گن کر دیں اور لکھ لیں اور گن کر پڑتال کرکے لیں،

(۳۲) لڑکیوں کو تاکید کرو کہ جو زیور تمھارے بدن پر ہے رات کو سونے سے پہلے اور صبح کو جب اٹھو دیکھ بھال لیا کرو،

(۳۳) لڑکیوں سے کہو کہ جو کام کھانے پکانے، سینے پرونے، کپڑے رنگنے، چیز بُننے کا گھر میں ہوا کرے اس میں غور کرکے دیکھا کرو کہ کیونکر ہو رہا ہے،

(۳۴) جب بچے سے کوئی بات خوبی کی ظاہر ہو اس پر خوب شاباش دو پیار کرو، بلکہ اس کو کچھ انعام دو تاکہ اس کا دل بڑھے، اور جب اس کی بُری بات دیکھو اوّل تنہائی میں اس کو سمجھاؤ اور دیکھو بُری بات ہے، دیکھنے والے دل میں کیا کہتے ہوں گے، اور جس جس کو خبر ہوگی وہ دل میں کیا کہے گا، خبردار پھر مت کرنا، نیک بخت لڑکے ایسا نہیں کیا کرتے، اور اگر پھر وہی کام کرے مناسب سزا دو،

(۳۵) ماں کو چاہیئے کہ بچے کو باپ سے ڈراتی رہے،

(۳۶) بچے کو کوئی کام چھپا کر مت کرنے دو، کھیل ہو یا کھانا اور کوئی شغل ہو، جو کام چھپا کر کرے گا سمجھ جاؤ کہ وہ اس کو بُرا سمجھتا ہے، سو اگر وہ بُرا ہے تو اسے چھڑاؤ، اور اگر اچھا ہے جیسے کھانا پینا تو اس سے کہو سب کے سامنے کھائے پیئے،

(۳۷) کوئی کام محنت کا اس کے ذمّہ مقرر کردو جس سے صحت اور ہمت رہے، سستی نہ آنے پائے، مثلاً لڑکوں کے لئے ڈنڈ مگدر کرنا، ایک آدھ میل چلنا، اور لڑکیوں کے لئے چکّی یا چرخہ چلانا ضرور ہے، اس میں یہ بھی فائدہ ہے کہ ان کاموں کو عیب نہ سمجھیں گی،

(۳۸) چلنے میں تاکید کرو کہ بہت جلدی نہ چلے، نگاہ اوپر اٹھاکر نہ چلے،

(۳۹) اس کو عاجزی اختیار کرنے کی عادت ڈالو، زبان سے، چال سے، برتاؤ سے، شیخی نہ بگھارنے پائے یہاں تک کہ اپنے ہم عمر بچوں میں بیٹھ کر اپنے کپڑے یا مکان یا خاندان یا کتاب و قلم دوات، تختی تک کی تعریف نہ کرنے پائے،

(۴۰) کبھی کبھی اس کو دو چار پیسے دیدیا کرو، کہ اپنی مرضی کے موافق خرچ کیا کرے، مگر اس کو یہ عادت ڈالو کہ کوئی چیز تم سے چھپاکر نہ خریدے،

(۴۱) اس کو کھانے کا طریقہ اور محفل میں اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ سکھلاؤ، تھوڑا تھوڑا ہم لکھے دیتے ہیں،

کھانے کا طریقہ (۱) داہنے ہاتھ سے کھاؤ (۲) شروع میں بسم اللہ کہو (۳) اپنے سامنے سے کھاؤ (۴) اوروں سے پہلے مت کھاؤ (۵) کھانے کو گھور کر مت دیکھو (۶) کھانے والوں کی طرف مت دیکھو، (۷) بہت جلدی جلدی مت کھاؤ (۸) خوب چباکر کھاؤ (۹) جب تک لقمہ نگل نہ لو دوسرا لقمہ مُنہ میں مت رکھو، (۱۰) شوربا وغیرہ کپڑے پر نہ ٹپکنے پائے (۱۱) انگلیاں ضرورت سے زیادہ سننے نہ پائیں،

محفل میں اُٹھنے بیٹھنے کا طریقہ (۱) جس سے ملو ادب سے ملو (۲) نرمی سے بولو (۳) محفل میں تھوکو نہیں، (۴) وہاں ناک صاف مت کرو، اگر ایسی ضرورت ہو وہاں سے الگ چلے جاؤ (۵) وہاں اگر جمائی یا چھینک آئے مُنہ پر ہاتھ رکھو، (۶) آواز پست کرو، (۷) کسی کی طرف پشت مت کرو، (۸) کسی کی طرف پاؤں مت کرو، (۹) ٹھوڑی کے نیچے ہاتھ دے کر مت بیٹھو، (۱۰) انگلیاں مت چٹخاؤ (۱۱) بلاضرورت بار بار کسی کی طرف مت دیکھو، (۱۲) ادب سے بیٹھے رہو، (۱۳) بہت مت بولو (۱۴) بات بات میں قسم مت کھاؤ (۱۵) جہاں تک ممکن ہو خود کلام مت کرو (۱۶) جب دوسرا شخص بات کرے خوب توجہ سے سنو، کہ اس کا دل نہ بجھے، البتہ اگر گناہ کی بات ہو مت سنو، یا تو منع کردو یا وہاں سے اُٹھ جاؤ (۱۷) جب تک کوئی شخص بات پوری نہ کرلے بیچ میں مت بولو (۱۸) جب کوئی آئے اور محفل میں جگہ نہ ہو ذرا اپنی جگہ سے کھسک جاؤ، مل کر بیٹھ جاؤ کہ جگہ ہو جائے (۱۹) جب کسی سے ملو یا رخصت ہونے لگو، السلام علیکم کہو اور جواب میں وعلیکم السلام کہو، اور طرح طرح کے الفاظ مت کہو،

ختم ہوا مضمون بہشتی زیور کا،

امید ہے کہ اہل و عیال کی تعلیم و تربیت کے متعلق مضمون مذکور کافی ہوجائے گا، اسی طرح اور بھی جس جس پر قدرت ہو جیسے شاگرد و مرید، نوکر و رعیت وغیرہم سب کی تعلیم و تربیت میں یہی طریقہ مشترک ہے،

انتہت عبارت رسالہ بہشتی زیور

و بانتہارہا

تمت احکام النفقات الروحانیۃ

اصلاحِ انقلاب متعلق لقطہ

لقطہ کا مفہوم اور اسکی کوتاہیاں

(اوپر کے باب میں اپنے مال کے خرچ کرنے کے احکام تھے، اِس میں دوسرے کے مال کے بعض افراد کے احکام ہیں، کیونکہ لقطہ ایسی پڑی ہوئی چیز کو کہتے ہیں جس کا مالک معلوم نہ ہو) اس میں بھی مختلف ومتعدد کوتاہیاں واقع ہوتی ہیں،

جس چیز کے ضائع ہونے کا گمان غالب ہو اس کا اٹھانا واجب ہے،

چنانچہ ایک کوتاہی اس میں یہ ہے کہ بعضے لوگ ایسی چیز کو بالکل اٹھاتے ہی نہیں، اور سمجھتے ہیں یہ نہ اٹھانا ہی افضل ہے، حالانکہ جہاں گمان غالب ہو کہ نہ اٹھانے سے وہ چیز ضائع ہوجائے گی وہاں اٹھالینا واجب ہے، اگر نہ اٹھائے گا گناہگار ہوگا (درمختار) اور یہی حکم ہے پڑے ہوئے بچے کا (درمختار)

اور اگر اٹھا کر پھر وہاں ہی رکھ دیا تو گناہ تو ہے ہی، مگر بعض کے نزدیک اس کے ذمے ضمان بھی لازم ہے، (ردالمحتار)

اپنے کام کی غرض سے کسی چیز کا اٹھانا گناہ ہے،

ایک کوتاہی اس کے مقابل یہ ہے کہ بعضے لوگ اس نیت سے اٹھاتے ہیں کہ اس کو اپنے کام میں لائیں گے، تو اس نیت سے اٹھانا گناہ بھی ہے اور اس اٹھانے سے وہ ضامن بھی ہوجائے گا، جب تک مالک کے پاس نہ پہنچائے (ردالمحتار عن نورالعین عن الخانیہ)

اٹھائی ہوئی چیز کی تشہیر واجب ہے

ایک کوتاہی یہ ہے کہ بعضے اٹھاتے تو اسی نیت سے ہیں کہ ہم مالک کو پہنچادیں گے، مگر مالک کو نہ پہنچاتے ہیں نہ تلاش کرتے ہیں، گھر میں لے کر بیٹھ جاتے ہیں، کہ کوئی ڈھونڈھتا ہوا آئے گا، ورنہ کون مشقت کرے، سو ایسا کرنا جائز نہیں بلکہ اس کی تشہیر واجب ہے، یعنی جس جگہ وہ ملی ہے وہاں بھی اعلان کرے اور مواقعِ اجتماع پر بھی جیسے بازار میں اور مساجد کے دروازوں پر اور جہاں جہاں احتمال مالک کے ملنے کا ہو، اور مدت اس تشہیر کی یہ ہے کہ گمان غالب یہ ہوجائے کہ اب مالک نے اس کی تلاش چھوڑ دی ہوگی،

یا اس چیز کے بگڑنے کا اندیشہ ہونے لگے، جیسے پھل وغیرہ (درمختار)

چیز اٹھانے کے بعد دو اختیار | پھر اس کے بعد اس کو دو اختیار ہیں، ایک یہ کہ اس کو بعینہٖ محفوظ رکھے، اور دوسرے یہ کہ اس کو خیرات کردے، پھر اگر خود مسکین ہے، تو اپنے نفس پر بھی خیرات کرسکتا ہے، اور مسکین نہیں ہے تو مساکین پر تصدّق کردے، اور یہ بھی اختیار ہے خواہ بعینہٖ تصدّق کردے، خواہ فروخت کرکے دام تصدّق (صدقہ) کردے، اور اگر اس کو یا اس کے داموں کو محفوظ رکھا تو وصیت کرجانا واجب ہے (ردالمحتار)

مسئلہ: اگر کسی وجہ سے خود تشہیر نہ کرسکے تو دوسرے شخص کو بشرطیکہ امانتدار ہو تشہیر کے لئے دے سکتا ہے (ردالمحتار)

نہ معلوم اہلِ حقوق کے حقوق کی ادائیگی کا طریقہ | مسئلہ: جس کے ذمہ کچھ حقوق العباد ہوں اور اہلِ حقوق معلوم نہیں یا معلوم ہیں مگر مرگئے، اور اُن کے وارث بھی نہیں تو ایسے حقوق بمنزلۂ لقطہ کے ہیں، کہ مالک کے نہ ملنے کے وقت خیرات کردینا چاہئے، اور یہ خیرات ایسے حقوق کی اور اسی طرح لقطہ کی مالک کی نیت سے ہونا چاہئے،

صدقہ کرنے کے بعد مالک آنے کا حکم | مسئلہ: اگر بعد تصدّق کے مالک آگیا تو اس کو اختیار ہے، خواہ اس تصدّق کو جائز رکھے اور خواہ اس سے ضمان لے، اور ثواب اس لاقط (اٹھانیوالے) کو ملے گا، (ردالمحتار)

بروز قیامت ظلم کا دعویٰ مورث اور حق کا دعویٰ وارث کرے گا | مسئلہ: اگر کسی کا قرض یا کوئی حق اس کے ذمہ آتا ہے اور اس نے نہ اسکو دیا اور نہ اُس کے ورثاء کو تو قیامت میں اس پر دعویٰ کون کرے گا؟ اس میں قول مختار یہ ہے کہ ظلم کا دعویٰ تو مورث کرے گا کہ اس کا حق نہ دیا تھا، اور حق کا دعویٰ وارث کرے گا، کیونکہ وہ مالِ میت سے اس وارث کی طرف منتقل ہوگیا، اور اگر وارث کو دیدیا تو وارث کا دعویٰ تو جاتا رہا مورث کا رہے گا، اس کے لئے دعاء و استغفار کیا جائے (ردالمحتار)

مسافر کا ترکہ بحکم لقطہ کے ہے، | مسئلہ: تمہارے گھر کوئی مسافر مرگیا اور اس کے ورثاء معلوم نہیں تو اس کا ترکہ بحکم لقطہ ہے (درمختار)

دفینہ کا حکم لقطہ کا ہوگا | مسئلہ: تم نے کوئی گھر خریدا اور اس میں کچھ دفینہ (دفن شدہ مال) نکلا تو وہ بحکم لقطہ ہے، (ردالمحتار)

اصلاحِ انقلاب
متعلّق گم شدہ انسان

(لقطہ مال تھا جس کا اس کے اہل کو پتہ نہیں، یہ انسان ہے جس کا اس کے اہل کو پتہ نہیں) اس میں بھی کچھ غلطیاں کی جاتی ہیں؛

مفقود اپنے نفس کے حق میں زندہ ہے — اور اس کے سمجھنے سے پہلے ایک قاعدہ کلیہ سمجھ لینا چاہیئے، اس سے ان غلطیوں کا سمجھنا آسان ہو جائے گا،

مفقود اپنے نفس کے حق میں زندہ ہے — وہ قاعدہ یہ ہے کہ مفقود چونکہ وقت مفقود ہونے کے زندہ تھا، اور اب تک اس کی موت کی کوئی دلیل نہیں، تو اس کا ظاہر حال یہ ہے کہ وہ زندہ ہے، اور ظاہر حال جس کو استصحاب بھی کہتے ہیں حجتِ دافعہ ہے حجتِ مثبتہ نہیں، پس یہ حیاتِ ظاہری اس کا حق تو دوسرے کے مال میں ثابت نہ کرے گی، لیکن اس کے مال میں دوسرے کا حق ثابت نہ ہونے دے گی، یعنی اگر اس کے زمانۂ فقدان (گمشدگی) میں اس کا کوئی مورث مثلاً اس کا باپ مرا اور اس کے دو بیٹے تھے ایک یہی مفقود، دوسرا موجود، تو اس کے ترکہ میں اس مفقود کا یقینی حق نہیں ہوگا، بلکہ احتمالِ حیات کے سبب اس کا حصہ بطورِ امانت کے رکھیں گے، اگر آ گیا تو لے لے گا، اور اگر نہ آیا یہاں تک کہ انتظار کی مدتِ شرعیہ کے بعد (جس کی مقدار آگے آتی ہے) اس کی موت کا حکم کیا گیا تو وہ امانت رکھا ہوا حصہ اسی موجود کا سمجھا جائے گا، اگر وہ زندہ ہوا تو وہ لے گا ورنہ اس کے شرعی ورثہ لیں گے یوں نہ سمجھا جائے گا کہ وہ اس مفقود کا حق ہے، تاکہ اس کے مال کے ساتھ وہ بھی اس کے ورثہ کو دیا جائے، اور یہی مطلب ہے حجت مثبتہ نہ ہونے کا، اور یہی مطلب ہے حجت دافعہ ہونے کا، اور یہی مطلب ہے فقہاء کے اس قول کا کہ وہ اپنے نفس کے حق میں حیّ (زندہ) ہے۔

مفقود کے بارے میں چند کوتاہیوں کا بیان

اس قاعدہ کلیہ کے بعد اب ان غلطیوں کو سمجھنا چاہیئے :-

مفقود کا حصہ وراثت رکھنا چاہیئے

سو ایک غلطی یہ کی جاتی ہے کہ اس کے مفقود ہونے کا زمانہ میں جو اس کا مورث مرتا ہے اس کے ترکہ میں سے اس مفقود کا حصہ کوئی شخص نہیں رکھتا، ورثاء حاضرین باہم تقسیم کر لیتے ہیں، حالانکہ گو اس کا استحقاق یقینی نہیں مگر محتمل تو ہے، اس کا انجام یہ ہوتا ہے کہ اگر وہ صحیح سالم آ گیا، اگر اس کو اپنے استحقاق کا علم ہوا اور اس کے وصول کی قوت بھی ہوئی تب تو نزاع (جھگڑا) ہوگا اور اگر علم نہ ہوا یا قدرت نہ ہوئی تو دوسرے ورثہ حق العباد کے وبال میں مبتلا ہوں گے،

مفقود کے مال اور اس کے حصہ امانت کا حکم یکساں نہیں،

اور ایک غلطی یہ ہو سکتی ہے (گو سنی نہیں گئی) کہ اگر اس کا حصہ امانت کے طور پر محفوظ رکھا جاوے تو جس وقت اس کی موت کا حکم شرعاً کیا جائے گا اور خود اس کا ترکہ اس کے ورثہ موجودین وقت الحکم بالموت میں تقسیم کیا جاوے گا، تو ممکن ہے کہ اس حصہ امانت کو بھی اس کی ملک سمجھ کر اس کو بھی اس کے ترکہ کے ساتھ تقسیم کر دیا جاوے، حالانکہ اوپر کے قاعدہ سے ثابت ہو چکا ہے کہ اس صورت میں وہ حصہ امانت کا ان ورثہ کا حق ہے، جن کے حصہ میں سے یہ امانت نکال کر رکھی گئی تھی، خلاصہ یہ کہ اس امانت کا حکم اور خود جو اس مفقود کا مال بلا واسطہ ہو ان دونوں کا حکم یکساں نہیں ہے،

مفقود کے مال کو دوسرے کے مال پر قیاس کرنا صحیح نہیں،

ایک غلطی اس دوسرے مسئلہ سے (کہ اگر وہ نہ آیا تو وہ امانت اُن ورثہ کا حق ہے جن کا حق کم کر کے یہ امانت رکھی گئی ہے) یہ ہو سکتی ہے کہ اس کو وقت فقدان (گم ہونے کے وقت) سے میت سمجھ کر جب اس کا ترکہ تقسیم کرنے لگیں تو انہی ورثہ کو دیدیں جو اس کے فقدان کے وقت تھے، حالانکہ وہ اپنے مال کے اعتبار سے زندہ ہے، حاصل یہ کہ بعضی غلطی تو منشاء مفقود کے مال کو دوسرے کے مال پر قیاس کرنا ہے، اور بعض کا منشاء دوسرے کے مال کو مفقود کے مال پر قیاس کرنا ہے، یہ دونوں قیاس باطل ہیں، ان دونوں کا حکم جدا جدا ہے، جیسا کہ مفصل بیان کیا گیا،

مفقود کے متعلق امام مالکؒ کے فتویٰ پر عمل کے لئے قضاء قاضی شرط ہے،

ایک غلطی عام یہ ہو رہی ہے کہ علماء سے یہ سُن لیا کہ امام مالک رحمہ اللہ اور امام شافعی رحمہ اللہ کے نزدیک انتظار مفقود کی مدت چار سال ہے اور یہ بھی سُن لیا کہ ضرورت میں دوسرے مذہب پر عمل درست ہے،

اس کو مطلق سمجھ کر بلا کسی قید کے اس پر عمل شروع کر دیا، چار سال کے بعد اس کی بی بی کا نکاح بھی کرانے لگے، عدت کی بھی ضرورت نہ سمجھی، اگر قدرت ہوئی اس کا ترکہ بھی تقسیم کر لیا، پھر ضرورت کو بھی نہیں دیکھا اور بعد تحقق ضرورت کے اس پر عمل کی شرط بھی نہ دیکھی، حالانکہ امام مالکؒ کے نزدیک چار سال جوازِ نکاح کی مدت نہیں، بلکہ اس کے حکم بالموت کی مدت ہے، پھر اس کے بعد عدتِ وفات ہوگی؛

اور شافعیؒ کا مذہب قدیم اس کو قرار دیا ہے، جس سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا قولِ جدید اس کے خلاف ہے، اور مفتیٰ بہ قولِ جدید ہوتا ہے، پھر یہ قول ان دونوں حضرات کا صرف نکاح کے بارے میں ہے، میراث میں ان کا مذہب ہمارے ہی مذہب کے مثل ہے،

اور امام احمد رحمہ اللہ کے نزدیک تفصیل ہے کہ اگر ایسی حالت میں غائب ہوا ہے کہ غالب حال اس کا ہلاک ہے، جیسے صفِ قتال یا کشتیِ شکستہ میں تھا، تب تو چار سال کی مدت ہے ورنہ ان کا مذہب بھی ہمارے ہی مذہب کے مثل ہے،

یہ سب اقوال شامیؒ نے نقل کئے ہیں (اور اس سے معلوم ہوتا ہے کہ حنفیہ کا مذہب اس میں ایسا قوی ہے کہ دوسرے ائمہ بھی کسی نہ کسی صورت میں اس کو مذہب لیتے ہیں)

اسی طرح جس عورت کے پاس نفقہ موجود ہو وہاں ضرورت بھی متحقق نہیں، یا کسی دیندار معتبر گھرانے میں نوکری کر سکے وہاں بھی ضرورت نہیں، اسی طرح جہاں مالکی یا شافعی حاکم مل سکے وہاں بھی حنفی کو اس قول پر حکم کرنے کی ضرورت نہیں، اور جہاں ضرورت بھی ہو تب بھی اس پر عمل کرنے کی اکثر علماء کے نزدیک ایک شرط یہی ہے، وہ یہ کہ اس عمل کے لئے صرف فتویٰ کافی نہیں، قضاءِ قاضی ہونا چاہئے، چنانچہ درمختار میں واقعاتِ مفتیین سے اس کی نسبت قنیہ کی طرف کی ہے، اور گو اس میں دوسرا قول بھی ہے جو شرف الائمہ کی طرف نسبت کیا گیا ہے مگر نجم الائمہ قاضی عبدالرحیم نے اشتراط کو ترجیح دی ہے، اور واقعات کی عبارت سے امام صاحبؒ کا اس میں نص ہونا ثابت کیا ہے،

مفقود کی مدت انتظارِ طویلہ کا اصل مقصد احتیاط ہے،

اور احقر کہتا ہے کہ قواعد سے بھی ایسے امور مجتہد فیہا میں قضاءِ قاضی کے اشتراط سے اس اشتراط ہی کو ترجیح ہوتی ہے، اور احقر اس کے خلاف پر فتویٰ دینے کو صحیح نہیں سمجھتا، خصوص جبکہ اصل فروج (شرمگاہوں) میں حرمت ہے، اور یہ لزوم قضاءِ قاضی کسی خاص قول کے ساتھ مخصوص نہیں، بلکہ اس باب میں حنفیہ کے نزدیک جو مدتِ انتظار ہے، جس میں سب سے زیادہ احتیاط ہے اس میں بھی قضاءِ قاضی شرط ہے یعنی

قاضی یوں کہے کہ میرے نزدیک اب وہ مرگیا ہے، اس لئے میں اس کی موت کا حکم کرتا ہوں (لاطلاق مافی الدرالمختار انما یحکم لموتہ لقضاء لانہ امر محتمل مما لم ینضم الیہ القضاء لایکون حجۃ) اور وہ مدت احتیاط کی اس لئے ہے کہ بہت طویل ہے، اصل معنون تو اس کا یہ ہے، باقی اُس کے عنوانات میں اقوال مختلف ہیں،

(۱) موت اقران فی بلدہ (۲) موت اقران فی جمیع البلاد (۳) نوّے سال وقتِ ولادت سے نہ کہ وقتِ فقدان سے (۴) سّو سال (۵) ایک سو بیس سال (۶) ساٹھ سال (۷) ستّر سال، (۸) تفویض الیٰ رائ الامام (امام کی رائے کے سپرد کردینا) اور شامی نے اس قول اخیر میں یہ شرط نقل کی ہے،

لابد من مضی مدۃ طویلۃ حتی یغلب علی الظن موتہ لابمجرد فقدہ عند ملاقاۃ العدو او سفر البحر و نحوہ،	(انتی طویل مدت کا گذرنا ضروری ہے کہ اس کی موت واقع ہونے پر گمان غالب ہوجائے دشمن سے ملاقات یا مطلق سفر وغیرہ کی صورت میں صرف گمشدگی کافی نہیں،)

ہندوستان میں سلطنت کی طرف سے کسی ایسے قاضی کے تقرر کا انتظام نہیں ہے اس لئے اس شرط کی تحقق یہاں دشوار ہے، پس اس صورت میں مفقود کے احکام میں بجز صبر کے کوئی علاج نہیں، البتہ اگر کوئی مسلمان حاکم جس کو سلطنت کی طرف سے ایسے اختیارات دیئے گئے ہیں کسی عالم سے فتویٰ لے کر مفقود کی موت کا حکم کردے، وہ حکم صحیح ہوجائے گا، اس لئے کہ قاضی مسلم کا تقرر سلطنتِ غیر مسلم کی طرف سے بھی صحیح ہے، صرح بہ الفقہاء، یا ریاستوں میں جو قضات مسلمان مقرر ہیں ان سے حکم حاصل کرلیا جائے، مگر اس میں یہ شبہ ہے کہ اس قاضی کی حدود شرع سے باہر جو شخص ہو اس پر بھی اس کا حکم نافذ ہوگا یا نہیں اس کی تحقیق علماء سے کرلی جائے،

احکامِ مفقود سے متعلق چند شبہات اور اُنکے جوابات

یہ تھیں ضروری تنبیہات احکام مفقود کے متعلق اب بعضے اور شبہات کے جواب لکھتا ہوں جو اُن احکام کے متعلق بطور معارضہ پیش کئے جاتے ہیں،

زیادہ عمر مانع نکاح نہیں ایک شبہ یہ کیا جاسکتا ہے کہ اتنی مدت انتظار کے بعد کہ نوّے برس ہیں یا اس سے زیادہ، جب موت کا حکم کیا گیا تو اس حکم سے کیا فائدہ ہوا؟ اتنی عمر کی عورت تو نکاح کے

قابل ہی نہیں رہتی،

جواب اس کا یہ ہے کہ معترض مسئلہ ہی نہیں سمجھا، اس مدت کی ابتداء مفقود ہونے کے حکم سے نہیں ہے تاکہ عورت کا اتنا سن رسیدہ ہونا لازم آئے، بلکہ اس کی ابتداء مفقود کے یوم ولادت سے ہے یعنی وہ نوّے برس کا ہو جائے، مثلاً، اور مرد کے سن رسیدہ ہونے سے عورت کا سن رسیدہ ہونا لازم نہیں آتا، مثلاً کسی اسّی برس کے بوڑھے نے دس برس کی لڑکی سے نکاح کیا اور مفقود ہو گیا، تو جب یہ نوّے سال کا ہوگا عورت بیس برس کی ہوگی، وعلیٰ ہذا، دوسرے حکم بالموت کا ثمرہ محض صحت نکاح زوجہ ہی تو نہیں ہے، اسکے مال کی تقسیم بھی تو ہے اور اسمیں یہ استعداد نہیں تیسرے یہی مسلّم نہیں کہ ایسی عمر کی عورت نکاح کے قابل نہیں رہتی اگر تقاضائے نفسانی کی نفی بھی تسلیم کر لی جائے، تب بھی نکاح میں اور مصالح بھی تو ہیں، مثلاً کوئی مسن (عمر رسیدہ) بیوہ عورت حج کو جاتی ہے اور محرم کوئی موجود نہیں، اس نے اس لئے کسی سے نکاح کر لیا کہ اس کے ساتھ سفر جائز ہو، اور مرد نے اعانت فی الدین (دین میں مدد) سمجھ کر قبول کر لیا، تو دیکھئے اتنی عمر مانع نکاح نہ ہوئی،

قانون مفقود کے سخت ہونے کا شبہ صحیح نہیں،

ایک شبہ یہ کیا جاتا ہے کہ یہ قانون بڑا سخت ہے، اگر عورت کو نان نفقہ کی حاجت ہو یا اس پر نفس کا غلبہ ہو تو وہ کیا کرے؟

جواب اس کا یہ ہے کہ یہ اشکال اسی صورت کے ساتھ خاص نہیں، اگر کسی عورت کا شوہر موجود ہو، مگر بے توجہ ہو کر نہ نان نفقہ دیتا ہے نہ اس کا حق تحصین (بیوی ہونے کا حق) ادا کرتا ہے تو اس صورت میں عورت کیا کرے؟ اگر کہا جائے کہ دعوےٰ کر دے، ہم بھی یہی کہیں گے کہ یہاں بھی دعویٰ کر دے، اگر حاکم کی رائے میں ضرورت متحقق ہوگی وہ شافعیؒ و مالکؒ کے مذہب پر حکم بالموت جلدی کر دے گا، اگر کہا جائے کہ ایسا حاکم کہاں ہے، ہم کہیں گے اگر ہماری مفروضہ صورت بھی ایسا حاکم نہ ملے، یا ملے مگر یہ حکم نہ کرے تو عورت کیا کرے گی، اگر کہا جائے کہ صبر کرے، ہم کہیں گے یہاں بھی صبر کرے، یا اگر بے توجہ نہ ہو مگر نادار اپاہج ہو کر نہ بالفعل کسی مال کا مالک ہو نہ کسب پر قادر ہو، اور نہ عورت پر قادر ہو، تو اس کی عورت کیا کرے؟ اگر کہا جائے کہ عنّین اور اس کی زوجہ میں قاضی تفریق کر دے گا، .... تو ہم کہیں گے کہ اگر ایک بار قادر ہو چکا ہو اور اس وجہ سے اب تفریق ممکن نہ ہو (چنانچہ مسئلہ فقہیہ باب عنّین میں یہی ہے)، تو عورت کیا کرے؟ اسی طرح اگر زنِ مفقود کی نوکری کر کے کھانے میں شبہ فتنہ کے سبب کسی کو اعتراض ہو تو صورت مفروضہ میں بھی ایسا احتمال ہو سکتا ہے، غرض کچھ بلا اسی میں منحصر نہیں، دوسری صورتوں میں بھی ایسا ہو سکتا ہے

اور بکثرت ہوتا بھی ہے، پس بجز صبر و تحمل مشاق کے کوئی چارہ نہیں،

مفقود کے بارے میں ایک ضروری مسئلہ

اب ایک ضروری فرع لکھ کر اس بحث کو ختم کرتا ہوں، وہ یہ کہ اگر بعد حکم بالموت کے اس کی بی بی نے نکاح کر لیا اور اس کا مال ورثہ میں تقسیم کر دیا گیا اور وہ پھر صحیح سالم آ گیا تو اس کا کیا حکم ہے؟ سو وہ حکم یہ ہے کہ اس کی بی بی کا نکاح ثانی فاسد ہو جائے گا اور عدت گزرنے کے بعد وہ بی بی اسی کو مل جائے گی، البتہ اگر کچھ اولاد ہو گئی ہو تو وہ دوسرے شوہر کو ملے گی، کذا فی رد المحتار وعبارتہ:-

اَنّ زوجۃ لہ والاولاد للثانی	(”بیشک بیوی اس کی ہو گی اور اولاد دوسرے کی ہو گی“)

اور مال میں یہ تفصیل ہے کہ جو وارثوں کے ہاتھ میں خرچ ہو چکا وہ گیا گذرا، اور جو خرچ نہیں ہوا وہ اس مفقود کو دلایا جائے گا، کذا فی رد المحتار وعبارتہ:

فی الباقی فی ید ورثتہ لہ ولا یطالب بماذھب،	(”یعنی جو اس کے ورثہ کے ہاتھ میں باقی موجود ہے اس کو مل جائے گا اور جو ختم ہو چکا اس کا مطالبہ نہیں ہو سکتا“)

مرنے کے بعد بفرضِ محال زندہ ہونے والے کا حکم

اور یہی حکم ہے مال میں اس شخص کا جو مرنے کے بعد زندہ ہو جائے البتہ اس کی بی بی اب اس کو نہ ملے گی، کیونکہ موت سے خود اسی کا نکاح یقیناً باطل ہو گیا تھا، اور مفقود کا یقیناً باطل نہ ہوا تھا، ظناً باطل ہوا تھا، وہ ظن کاذب (گمان جھوٹا) ثابت ہوا، فقط ؎

اصلاح انقلاب

متعلّق بہ تعزیر و تعییر و تکفیر

تعزیر و تعییر اور تکفیر کا مفہوم تفسیر ان الفاظ کی یہ ہے :۔

تعزیر؛ وہ سزا ہے جو تادیب کے لئے دی جائے ، اور حد کے درجہ سے کم ہو، اور اس کے طرق (طریقے) مختلف ہیں، ملامت کرنا، ڈانٹنا، مارنا، ہاتھ یا لکڑی وغیرہ سے، کان کھینچنا، سخت الفاظ کہنا، محبوس کردینا، (رد المحتار) مالی سزا دینا، جس کا طریقہ بعد میں آتا ہے،

تعییر؛ کسی کا عیب نکالنا، اس میں غیبت و بہتان بھی داخل ہوگیا،

تکفیر؛ کسی کو کافر کہنا۔

اوپر کے قریب ابواب میں غیر کے مال میں تصرف کرنے کی بحث تھی، ان تینوں امور میں غیر کی آبرو میں تصرف کرنے کا بیان ہے، چنانچہ ظاہر ہے کہ ان تینوں امر سے دوسرے کی آبرو ریزی ہوتی ہے، گو بعض میں تصرّف فی النفس و تصرّف فی المال ہے، اور چونکہ آبرو ریزی ان تینوں میں امرِ مشترک ہے، اور اس مابہ الاشتراک کی وحدت سے یہ تینوں امر گویا امرِ واحد ہیں، اس لئے ان تینوں کے متعلق مضامین مخلوط طور پر بیان ہوں گے، جیسے تینوں کے عنوان کو جمع کردیا گیا، (یعنی ترتیب کا قصد نہ ہوگا)

حقوق العباد کی ایک کوتاہی کی علمی غلطی پس ان کے متعلق ایک کوتاہی جو بوجہ علمی غلطی ہونے کے سب سے اشد ہے کہ ان میں حق العباد ہونے کا احتمال ہی کسی کو نہیں ہوتا، اِلّا ماشاء اللہ، اور اس وجہ سے اُن کو بالکل خفیف و سرسری سمجھا جاتا ہے، سو یہ بڑی سخت غلطی ہے اور سخت ہونا اس کا اس لئے ہے کہ یہ اعتقادی غلطی ہے، حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد صریح ہے :۔

اَلَا اِنَّ دِمَاءَکُمْ وَ اَمْوَالَکُمْ وَ اَعْرَاضَکُمْ حَرَامٌ عَلَیْکُمْ کَحُرْمَۃِ یَوْمِکُمْ ھٰذَا فِیْ بَلَدِکُمْ ھٰذَا فِیْ شَھْرِکُمْ ھٰذَا۔

"خبردار! تمھارا خون، مال اور تمھاری عزتیں (ناحق طریقہ سے) تم پر اسی طرح حرام ہیں جس طرح تمھارے آج کے دن کی تمھارے اس خطہ اور اس شہر کی حرمت ہے"۔

حقوق العباد کی تین قسمیں، جس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حقوق العباد کی تین قسمیں ہیں:۔

(۱) کسی کی جان یا بدن کو ضرر پہنچانا، (۲) کسی کے مال کو ضرر پہنچانا، (۳) کسی کی آبرو کو ضرر پہنچانا یعنی بدون کسی استحقاق کے، اس وقت اکثروں نے حق العبد کو صرف قسم دوم ہی میں منحصر سمجھ رکھا ہے اور اگر کسی کی نظر بڑھتی ہے تو قسم اوّل کو بھی اس میں داخل کر لیتے ہیں، باقی قسم ثالث تک تو اکثر خواص کا ذہن بھی نہیں جاتا،

تعزیر سے متعلق اساتذہ کی ایک عظیم کوتاہی ایک کوتاہی تعزیر کے متعلق یہ ہے کہ جفا کاروں کے نزدیک اس کی کوئی حد ہی نہیں، جب تک اپنے غصّہ کو سکون نہ ہو جائے، سزا دیتے ہی چلے جاتے ہیں، اور اس میں اہلِ حکومت عموماً مبتلا ہیں، الّا ما شاء اللہ خواہ دنیاوی حکومت ہو جیسے اہلِ عدالت و اہلِ پولیس، یا شوہر یا باپ یا خواہ دینی حکومت ہو، جیسے استاد کہ یہ ہزار گونہ ان سب سے اس باب میں بڑھے ہوئے ہیں، عدالت اور پولیس کو تو یہ بھی فکر ہے کہ کبھی مظلوم حکامِ بالا سے استغاثہ (فریاد) نہ کر بیٹھے، شوہر کو محبت ہوتی ہے، باپ کو شفقت بھی ہوتی ہے، یہ اسبابِ ظلم کے مقلّل (کم کرنے والے) ہو جاتے ہیں، اور ان حضرات کو نہ کوئی اندیشہ ہے اور نہ محبت و شفقت، اگر کچھ اندیشہ ہو سکتا تھا تو والدین سے ہوتا، مگر والدین خواہ حُسنِ اعتقاد سے خواہ اپنی مطلب برآری کی خوشامد میں کان تک نہیں ہلاتے، اور بعضے اپنے اعتقاد میں شاگرد کے گوشت پوست کا استاد کو مالک سمجھتے ہیں، تو اُن سے کب احتمال ہے کہ ان حضرت کو ظلم سے روکیں گے، اس لئے یہ سب سے بڑھ کر آزاد ہیں، بہر حال باوجود کچھ کچھ تفاوت کے اتنا امر سب میں مشترک ہے کہ ان کے بیان تعزیر (سزا دینے) کی کوئی حد نہیں، حالانکہ ضرب فاحش (سخت مارنے) سے فقہاء نے مصرّحاً منع فرمایا ہے، اور جس ضرب سے جلد پر نشان پڑ جائے اس کو بھی ضرب فاحش میں داخل کیا ہے، اور جس سے ہڈی ٹوٹ جائے یا کھال پھٹ جائے وہ تو بدرجۂ اولیٰ (ردالمحتار عن التاتارخانیہ، ص ۲۹۳ ج ۳) بلکہ ضرب فاحش سے خود استاد کو تعزیر دی جائے گی (درمختار)

تعزیر بدون ثبوت شرعی کے نہیں دی جا سکتی

اسی طرح یہ سخت کوتاہی ہے کہ ایسی سزاؤں کے لئے ثبوت شرعی کی ضرورت نہیں سمجھتے، بے سند خبروں پر بلکہ بعض دفعہ محض قرائن پر سزا دینے کو مباح سمجھتے ہیں، قرآن مجید میں نص ہے:

اِنَّمَا السَّبِیْلُ عَلَی الَّذِیْنَ یَظْلِمُوْنَ النَّاسَ وَیَبْغُوْنَ فِی الْاَرْضِ بِغَیْرِ الْحَقِّ (الشوریٰ، آیت ۴۲)	(الزام صرف اُن لوگوں پر ہے جو لوگوں پر ظلم کرتے ہیں اور ناحق دنیا میں سرکشی اور تکبر کرتے ہیں۔)

اور حق یا بدون دلیل شرعی کے کسی کو ایذاء دینا ناحق کا ظلم ہے، جس پر یہ وعید ہے۔ اہلِ طریق ایسے لوگوں کا جن کو سزائیں دینا پڑتی ہیں یہ ہے کہ جو صورتیں اکثر پیش آتی ہیں اُن کو علماء محققین کے روبرو پیش کر کے اُن کے احکامِ شرعیہ دریافت کر لیں کہ کونسا طریق ثبوت کا معتبر ہے، اور کونسا غیر معتبر، اور کس صورت میں کتنی سزا جائز ہے؟ کتنی سزا ناجائز ہے؟ اور اس مقام پر کسی کتاب بینی کرنے والے کو دھوکا نہ ہو کہ فقہاء نے مشتبہ آدمی کو تعزیر دینا جائز لکھا ہے، اگرچہ ثبوت باقاعدہ نہ ہو، کما فی الدر المختار:-

لِلْقَاضی تعزیر المتهم وان لم یثبت علیه،	(تہمت والے پر تعزیر لگوانے کے لئے قاضی کو اختیار ہے اگرچہ وہ تہمت اس پر ثابت نہ ہو۔)

بات یہ ہے کہ یہ حکم صحیح ہے، مگر خود مشتبہ ہونا بھی محتاج ثبوت ہے، یہ نہیں کہ سزا دینے والا جس کو چاہے مشتبہ سمجھ لیا کرے، چنانچہ قول مذکور وان لم یثبت کے تحت میں رد المحتار کا قول ہے:

ای ما اتهم به انما نفس التهمة اوکون من اهلها فلابد من ثبوتها کما علمت،	(یعنی مطلقاً تہمت لگائی یا وہ اس کا اہل ہوا تو اس کے لئے ثبوت ضروری ہے، جیسا کہ تجھے معلوم ہو چکا۔)

شہادتِ شرعی کے ثبوت کا طریقہ

اور طریقہ اس کے ثبوت کا یہ ہے کہ دو مستور الحال یا ایک عادل کسی جنایت (شرارت) کی شہادت دے، یا اس نے اس قدر جنایتیں کی ہوں کہ اس کا مفسد ہونا مشہور ہو گیا ہو تو ایسے شخص کو حاکم محبوس کر سکتا ہے، پس یہ حقیقت ہے تعزیر متہم کی، اور فاسق کی شہادت سے اسی طرح ایک مستور کی شہادت سے مشتبہ بھی نہیں ہوتا، یہ سب ردالمحتار میں ہے تحت قول مذکور للقاضی تعزیر المتهم، اور پھر یہ بھی مطلقاً نہیں، بلکہ بعض حقوق اللہ میں (درمختار)

مالی جرمانہ ہمارے مذہب میں درست نہیں

ایک کوتاہی اور یہ بعض برادریوں میں بھی شائع ہے یہ ہے کہ خطاؤں پر جرمانہ کرتے ہیں، پھر بعضے تو کسی کسی موقع پر کھانا پکاکر تمام برادری جمع ہو کر کھا پی لیتے ہیں، اور بعضے اپنے زعم میں اس کو ثواب کے کاموں میں صرف کرتے ہیں، جیسے مدرسہ یا مسجد یا انجمن، سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ تعزیر بالمال (مالی جرمانہ) ہے جو کہ ہمارے مذہب میں درست نہیں، اور بعض روایات میں جو وارد ہے وہ منسوخ ہے، اور بعض جو اس کے قائل ہوئے ہیں اس کا مطلب یہ ہے کہ چندروز تک اس مال کو اپنے پاس رکھے، جب وہ شخص توبہ کرلے وہ مال اس کو لوٹا دیا جائے، نہ خود رکھے نہ بیت المال میں داخل کرے، (کذا فی الدر المختار و رد المحتار، ص ۲۷۵ ج ۳)

اور مجوزین (جائز کہنے والوں میں) کے نزدیک بھی جو اس کے شرائط ہیں، ان فاعلین (کرنے والوں) کو نہ ان کی خبر نہ اُن کی رعایت، تو اختلافی جواز بھی متحقق نہیں، اور جب یہ جائز نہیں تو وہ رقم حلال نہ ہوگی، تو اس کا کھانا بھی ناجائز اور نیک کاموں میں صرف کرنا اور بھی زیادہ ناجائز حدیث میں ہے:

إِنَّ اللّٰهَ طَيِّبٌ لَا يَقْبَلُ إِلَّا الطَّيِّبَ

("اللہ تعالیٰ پاک ہیں سوائے پاک چیز کے کسی کو قبول نہیں کرتے")

اور ابھی ردالمحتار سے بیت المال میں داخل کرنے کا عدم جواز مذکور ہو چکا ہے،

اور یہی حکم ہے ان رقوم کا جو دباؤ ڈال کر یا شرما کر چندہ کے نام سے جمع کی جاتی ہیں یا شادیوں میں وہ دُولہا والوں سے اپنے کمینوں کے یا مسجد وغیرہ کے لئے لیتے ہیں، کیونکہ بلا طیب خاطر دینا ان سب میں امر مشترک ہے، اور اس سے اس کا حکم بھی معلوم ہو گیا جو بعض جگہ کمیٹی یا جماعت معاہدہ سے اس پر متفق ہو جاتی ہے کہ جو شخص نماز نہ پڑھے اس پر اس قدر جرمانہ، سو یہ بھی جائز نہیں، اور یہ شبہ نہ کیا جائے کہ یہاں تو طیب خاطر سے معاہدہ ہوتا ہے، بات یہ ہے کہ معاہدہ کے وقت طیب خاطر ہونے سے یہ تو لازم نہیں آتا کہ رقم کے مطالبہ کے وقت بھی طیبِ خاطر ہو اور جہاں معاہدہ بھی نہ ہو بلکہ دو چار ذی اثر شخصیتوں نے متفق ہو کر اس جرمانہ کو اپنے تابعین پر عام کر دیا، یہ تو بدرجۂ اولیٰ ناجائز ہوگا،

صاحب معصیت اپنے نفس پر خود جرمانہ کرے تو گناہ نہیں

اور بعض احادیث میں جو بعض معاصی کا کفارہ تصدق بدینار یا نصف دینار یا مطلق تصدق وارد ہوا ہے، اور بعض مشائخ انہی احادیث سے اس طریقہ پر مریدین کی تربیت بھی فرماتے ہیں تو ان احادیث یا اس طریق تربیت کا محمل یہ ہے

کہ صاحبِ معصیت خود اپنے نفس کا علاج کرے نہ کہ کوئی دوسرا اس سے جبراً وصول کرے، یہ امرِ اوّل کے متعلق ضروری بیان تھا،

ہر سنی سنائی بات پر اعتماد صحیح نہیں،

اور امرِ ثانی کے متعلق ایک کوتاہی جو بہت ہی عام ہے، حتیٰ کہ علماء و مشائخ و ثقات تک بھی باستثناء من شاء اللہ اس سے محفوظ نہیں، یہ ہے کہ جس کی نسبت جو کچھ بھی سنا یا اکثر اوقات سُنے ہوئے بھی نہیں ہوتے محض قرائن پر دیکھو قرائن بھی کیسے جو ضعیف الدلالت بھی نہیں محض غیر دال، اعتماد کرکے زبان سے ہانک دیا، خود ہی تفسیر و حدیث میں اس کے متعلق احکام پڑھائیں، وعظ میں دوسروں کو سُنائیں، مگر جب عمل کا موقع ہو ایسے بھول جائیں گویا اس کے متعلق کبھی حکمِ شرعی کان میں پڑا ہی نہیں، پس بلفظ دیگر گویا قرآن و حدیث صرف درس و وعظ کے لئے ہے عمل کے لئے ہی نہیں، یا اگر عمل کے لئے بھی ہے تو صرف عوام کے لئے اور خواص اس سے بَری ہیں، یہ تو بعینہٖ علماءِ یہود کا طرز ہے اللّٰھم احفظنا،

بہرحال کوئی خاص ہو یا عامی، احکام تو سب ہی کے لئے عام ہیں، اور حدیث:-

كَفٰى بِالْمَرْءِ كَذِبًا اَنْ يُّحَدِّثَ بِكُلِّ مَا سَمِعَ،	(آدمی کے جھوٹ کے لئے کافی ہے کہ وہی بات (بلا تحقیق) کرے جو اُسنے (کسی سے) سُنی ہو)

اور حدیث،

اِيَّاكُمْ وَالظَّنَّ فَاِنَّ الظَّنَّ اَكْذَبُ الْحَدِيْثِ	(بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی زیادہ جھوٹی بات ہے)

ان ابواب میں نصوصِ صریحہ صحیحہ ہیں، نیز ان احادیث کا مدلول شب و روز مشاہدہ میں بھی آتا ہے، کہ سُنی ہوئی حکایات اور اس سے بڑھ کر قرائن پر بنا کی ہوئی روایات اس کثرت سے غلط نکلتی ہیں کہ گویا قریب قریب سب ہی غلط ہوتی ہیں، اور اگر اتفاقاً شاذ و نادر کوئی صحیح بھی ہوتی ہے تو اس میں جھوٹ کی آمیزش (ملاوٹ) اس نسبت سے ہوتی ہے جو پَر اور کوّے میں نسبت ہے، یعنی پَر کے برابر سچ ہوتا ہے اور کوّے کے برابر جھوٹ،

پھر اس بے بنیاد اور لغو اور مہمل حکایت پر کسی سے عداوت، کسی پر بدگمانی، کسی کی نسبت بدزبانی بے تکلف جائز رکھی جاتی ہے، اور عجب بات ہے کہ کوئی شخص ایسا نہیں جس کی نسبت کوئی نہ کوئی شخص ایسی ہی بیہودہ بلنیاد پر کچھ نہ کچھ کہتا نہ ہو اور خود اس شخص کو اس مقولہ کا باطل ہونا معلوم ہوتا ہے، اور اس مقولہ سے ناگواری بھی محسوس کرتا ہے، اور اس وقت خود بھی اسی قاعدۂ شرعیّہ سے تمسک کرتا ہے، اور اس قائل کو اس قاعدہ کی مخالفت پر جاہل سمجھتا ہے، مگر خود کسی کی

نسبت کچھ کہہ بیٹھتا ہے اُس وقت یہ سب اصولِ صحیحہ کالعدم ہوجاتے ہیں، تو گویا معنی اس کے یہ ہوئے کہ اور لوگ تو ہمارے معاملہ میں ان اصول کے مقید رہیں، مگر ہم دوسروں کے معاملہ میں ان اصول سے آزاد رہیں۔ سبحان اللہ! کیا انصاف ہے، موٹی سی بات ہے کہ یہ اصول قابلِ تمسک ہیں یا نہیں؟ اگر ہیں تو تم بھی اس پر عمل کرو اور اگر نہیں تو دوسروں سے بھی عمل کے منتظر و متوقع نہ رہو، یہ زبردستی کا فرق کیسا کہ تم دوسروں کے لئے تو عمل نہ کرو اور دوسرے تمہارے لئے عمل کریں، اس فرق کا منشا۔ اگر جہل و تعسف و کبر نہیں تو اور کیا ہیں؟ اگر یہ ہے تو کیا ان اخلاق کی اصلاح واجب نہیں، اور بالخصوص کسی مرد و عورت کی عفت و پاک دامنی کے متعلق معاملات میں تو بے احتیاطی حد سے گذری ہوئی ہے، جس کی نسبت نصوص سے سب سے زیادہ احتیاط کی ضرورت معلوم ہوتی ہے،

کسی بچہ کو ولد الزنا کہنے کا حکمِ احتیاط

حتیٰ کہ فقہاء نے انہی نصوص کی بناء پر تصریح فرمائی ہے کہ اگر ایک مشرقی کا نکاح ایک مغربیہ سے توکیلاً (وکیل کے ذریعہ) نکاح ہوا اور کسی نے دونوں کو مجتمع نہیں دیکھا، اور پھر اولاد ہوئی تو باوجود اس کے بھی اس عورت کو زانیہ کہنا یا اس بچہ کو ولد الزنا کہنا جائز نہیں، بلکہ اس بچے کو اسی مشرقی مرد کا کہیں گے،

(بہشتی زیور میں یہی مسئلہ تو لکھ دیا تھا جس پر مہربانوں نے بیحد شور و غل مچایا، اور اس کے قبل تمام کتبِ فقہ میں (جن میں بہت کا اردو میں بھی ترجمہ ہوچکا ہے) موجود ہے، مگر کسی کو اس طرف التفات نہیں ہوا، پس بہشتی زیور میں اس کا آجانا غضب ہوگیا، رسالہ رفع الارتیاب[۱] اور رسالہ حکایات الشکایات، شکایت اوّل کے ذیل میں ان سب شبہات کا جواب نقلی و عقلی موجود ہے)۔

واقعی بات یہ ہے کہ اگر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے باب میں وحیِ قطعی نازل نہ ہوئی ہوتی تو لوگوں کی اس بے احتیاطی پر نظر کرتے ہوئے قوی شبہ ہوتا ہے کہ اُس زمانے کے بہت سے مسلمان بھی ان پر بدگمانی کئے ہوئے نہ رہتے، مگر ہم لوگوں کی قسمت اچھی تھی جو اس باب میں وحی نازل فرمائی گئی مگر عجیب بات ہے کہ باوجود اس حکم کے عام ہونے کے دوسرے موقع پر جہاں جزئیاً وحی..... نہ ہو اس حکم پر عمل نہیں ہوتا، حالانکہ اس حکم کے ضمن میں جو اصول بیان فرمائے گئے ہیں وہ کسی کے ساتھ مخصوص نہیں، گو یہ فرق ضرور ہے کہ محلِ نص کی برأت و نزاہت قطعی ہے، کیونکہ

---

[۱] یہ دونوں رسائل حضرت حکیم الامت مولانا تھانوی قدس سرہٗ کے تالیف فرمودہ ہیں، جو آجکل نایاب ہیں، کاش کسی ناشر کو ان کی اشاعت کی توفیق ہوجائے، آمین، (احقر قریشی غفرلہٗ)

وہ صرف ان اصول ہی پر مبنی نہیں، اگر وہ اصول نہ بھی ہوتے تب بھی برأت کا اعتقاد قطعاً فرض تھا اور خلاف کا احتمال بھی واقع نہیں تھا،

کسی پر زنا کا حکم لگانے کے لئے کشف، الہام، خواب کا اعتبار حجت نہیں،

اور غیر محل نص کی برأت ظنی ہے، کیونکہ وہ ان اصول پر مبنی ہے جن کا حاصل دلیلِ شرعی نہ ہو، اس کے ساتھ تکلم اور اس میں سوءِ ظن جائز نہیں، گو واقع میں اس کے خلاف کا احتمال ہو، کما قال تعالیٰ :-

إِذْ تَلَقَّوْنَهُ بِأَلْسِنَتِكُمْ وَتَقُولُونَ بِأَفْوَاهِكُم مَّا لَيْسَ لَكُم بِهِ عِلْمٌ وَتَحْسَبُونَهُ هَيِّنًا وَهُوَ عِندَ اللَّهِ عَظِيمٌ ۝

(النور، آیت ۱۵)

(یعنی جب کہ تم اس کو اپنی زبانوں سے نقل در نقل کر رہے تھے، اور اپنے منہ سے ایسی بات کہہ رہے تھے جس کی تم کو مطلق خبر نہیں اور تم اس کو ہلکی بات سمجھ رہے تھے، حالانکہ وہ اللہ کے نزدیک بہت بھاری بات تھی)

مگر اس فرق میں اس بے احتیاطی کی اجازت کہاں ہوئی، کفِ لسان و حسنِ ظن تو دونوں میں امرِ مشترک ہے،

اور میں نے جو ان اصولِ واردہ فی تبرءۃ الصّدّیقہ کا حاصل بیان کیا ہے اس میں ایک طالب العلمانہ شبہ کا بھی جواب ہو گیا،

لَوْلَا جَاءُوا عَلَيْهِ بِأَرْبَعَةِ شُهَدَاءَ فَإِذْ لَمْ يَأْتُوا بِالشُّهَدَاءِ فَأُولَٰئِكَ عِندَ اللَّهِ هُمُ الْكَاذِبُونَ ۝

(النور، آیت ۱۳)

(یعنی یہ لوگ اس پر چار گواہ کیوں نہ لائے جس حالت میں یہ لوگ گواہ نہیں لائے، تو بس اللہ کے نزدیک یہ جھوٹے ہیں)

یعنی اس دعوے پر جب چار گواہ نہ لاسکے تو وہ اللہ کے نزدیک جھوٹے ہیں، اور یہ ظاہر ہے کہ حق تعالیٰ کا علم خلاف واقع ہونا محال (نا ممکن) ہے، تو اللہ تعالیٰ کے نزدیک جھوٹا وہی ہوگا جو واقع میں جھوٹا ہو، تو اس مقدمہ کے بعد معنی آیت کے یہ ہوئے کہ اگر کوئی کسی کو زانی کہے اور اس پر چار گواہ قائم نہ کرسکے تو وہ شخص واقع میں جھوٹا ہے، اور جب کسی کو زانی کہنے والا واقع میں جھوٹا ہوا تو یہ شخص جس کو زانی کہا گیا ہے واقع میں زانی نہیں تو لازم یہ آیا کہ جہاں چار گواہ نہ ہوں وہاں واقع میں کوئی زانی نہیں ہوتا، اور یہ مشاہدہ سے باطل ہے، کیونکہ ہزاروں آدمی واقع میں زانی ہوئے ہیں، اور ان کے زنا پر ایک بھی گواہ نہیں ہوا چہ جائیکہ چار، تو پھر آیت کا مضمون کیسے صحیح ہوا؟ یہ ہے اشکال

مگر میں نے جو حاصل بیان کیا ہے اس سے یہ اشکال جاتا رہا،

تقریر اس کی یہ ہے کہ عند اللہ کے معنی فی علم اللہ و فی الواقع نہیں بلکہ فی حکم اللہ و قانونہٗ ہیں یعنی گو گواہ نہ لانے کی صورت میں واقع میں اس مدعیٰ علیہ کے زانی ہونے کا احتمال ہو، مگر قانونِ الٰہی میں اس مدعی کو کاذب کہا جائے گا، یعنی اس کے ساتھ وہ معاملہ کیا جائے گا جو کاذب کے ساتھ کیا جاتا ہے، یعنی اس کو اس تہمت لگانے کی سزا دی جائے گی، اور اس کے دعوے کی بناء پر کسی کو اس مدعیٰ علیہ پر بدگمانی یا اس کے ساتھ بدزبانی جائز نہ ہوگی،

اسی طرح ایسی ہی ضعیف یا باطل بناؤں پر کسی کو چور سمجھنا اور کسی طرح کا شبہ کرنا جائز نہیں، اور سب کا قاعدۂ مشترکہ یہی ہے کہ جس امر کے اثبات کا شرع میں جو طریق ہے جب تک اس طریق سے وہ امر ثابت نہ ہو اس کا کسی کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، اور اپنے محل میں ثابت ہو چکا ہے کہ ان طرقِ اثبات میں شریعت نے الہام یا خواب یا کشف کو معتبر و حجت قرار نہیں دیا، تو ان کی بناء پر کسی کو چور یا مجرم سمجھنا حرام اور سخت معصیت ہے،

مسمریزم، حاضرات، لوٹا گھمانا، وغیرہ سب جہل اور خرافات ہیں،

اور جب ان ذرائع کا شرع میں کوئی اعتبار نہیں جو کہ بعض امور غیر ملزمہ میں کسی درجہ میں معتبر بھی ہیں بشرطِ عدم تخالفِ شرع تو جو ذرائع شریعت کے نزدیک کوئی درجہ بھی نہیں رکھتے اُن پر حکم لگانا تو کس درجہ سخت گناہ ہوگا، جیسے حاضرات کرنا، چور کا نام نکالنے کے لئے لوٹا گھمانا یا آجکل جو عمل مسمریزم کا شائع ہوا ہے یہ تو بالکل جہل اور خرافات ہی ہیں، جن میں اکثر جگہ تو عامل کا دھوکہ ہی ہے، اور بعض جگہ عامل دھوکہ باز تو نہیں ہوتا، مگر وہ خود دھوکہ میں ہوتا ہے، اس کو ان اعمال کی حقیقت معلوم نہیں،

سو سمجھ لینا چاہئے کہ یہ سب تصرّفات قوّتِ خیالیہ کے ہیں، تو جیسے کوئی شخص کسی واقعہ میں فکر و خیال کو صرف کر کے کوئی رائے قائم کرلے بس اس سے زیادہ ان اعمال کی حقیقت نہیں، اور اس سے دھوکہ نہ ہو کہ بعض اعمال میں آیاتِ قرآنیہ پڑھی جاتی ہیں، بات یہ ہے کہ ان آیات کی تلاوت محض حیلہ ہے، قوّتِ خیالیہ کے یکسو کرنے کا، ورنہ اصل فعل قوّتِ خیالیہ کا ہے، گو آیات بھی نہ پڑھی جائیں، جب بھی وہ تصرّفات ظاہر ہوتے ہیں، اور اگر صرف آیات پڑھی جائیں اور خیال کو دوسری طرف متصرّف کر دیا جائے تو ہرگز یہ تصرّفات ظاہر نہ ہوں،

قرآن مجید، دیوان حافظ، مثنوی سے فال نکالنے کا حکم،

اور یہی حکم ہے قرآن مجید کا، دیوانِ حافظ یا مثنوی سے فال لے کر کسی پر حکم لگا دینے کا، جیسے ایک حکایت مشہور ہے کہ کسی بادشاہ کی

بیگم کا بڑا قیمتی ہار گُم ہو گیا تھا، اس نے کنیزک سے بوقتِ شب چراغ منگا کر اس کی روشنی میں دیوانِ حافظ سے فال لی تو یہ مصرعہ نکلا، ع

چہ دلاور ست دزدے کہ بکف چراغ دارد
(چور کتنا دلیر ہے کہ اپنی ہتھیلی پر چراغ رکھتا ہے!!)

بس اس نے اس کنیز کو پکڑ لیا اور تلاشی لینے سے وہ ہار اس کے پاس نکلا، اگر ایسی حکایات ثابت بھی ہوں تو اتفاقی بات ہے، نہ اس عمل اور اس واقعہ میں کوئی وجہِ تعلق، نہ کسی دلیل سے اس کی دلالت اس پر ثابت، تو حجتِ معتبرہ کیسے ہوگا؟

سحر یا جن یا نجومی یا پنڈت کے واسطہ سے کسی چیز یقین کر لینا قریب کفر ہے

اور اس سے بڑھ کر یہ کہ کسی سحر یا کسی جن کے واسطے یا کسی نجومی یا پنڈت کے واسطے سے کسی خبر کا یقین کر لینا خصوصاً جبکہ اس خبر سے کسی بری کو متہم کر دیا جائے ایسا شدید حرام ہے کہ قریب کفر کے ہے، اور اس سے دھوکا نہ ہو کہ فلاں دفعہ اس کے مطابق نکلا، یوں تو آدمی کچھ بھی نہ کرے، یونہی بکنا شروع کر دے، کوئی نہ کوئی بات ٹھیک ہو ہی جاتی ہے، اسی طرح ان خرافات میں اگر ایک دفعہ کوئی بات سچ نکلتی ہے تو ننو دفعہ جھوٹ نکلتی ہے، تو معتقدین اس ایک کا تو ذکر کرتے ہیں اور ننو بار کا ذکر نہیں کرتے، اور اگر کوئی یاد دلاتا ہے تو اتفاقی ہونے سے جواب دیتے ہیں، میں کہتا ہوں کہ جس طرح جھوٹ ہونے کو اتفاقی کہہ دیتے ہیں سچ ہونے کو اتفاقی کیوں نہیں کہدیتے، یہ سب تسویلات شیطانیہ (شیطانی حیلہ بازیاں) ہیں،

مسلمان کے لئے شریعت ہی علم وعمل کا مدار ہے

اور اگر تجربہ ومشاہدہ میں نزاع قطعی نہیں کرتے ہو تو ان کو جانے دو آخر شریعت مسلمان کے لئے اصل مدار علم وعمل کا ہے یا نہیں؟ جب ہے تو دیکھ لو، جب شریعت نے ان کی دلالت کو حجت نہیں کہا تم کیسے کہتے ہو؟ اس کی ایسی مثال ہے سمجھ لو کہ جنتری سے اگر ۲۹ر کا چاند ثابت ہو خواہ وہ اپنے قاعدہ میں صحیح ہی ہو مگر شریعت نے اسکو حجت قرار نہیں دیا، کوئی بیٹا اپنے باپ کے نافع معاملہ میں گواہی دے گو وہ بیٹا کتنا ہی بڑا متقی اور سچا ہو، مگر اس گواہی میں اس کے قول کو حجت قرار نہیں دیا گیا، گواسی اجلاس پر اگر دوسرے شخص کے معاملہ میں وہ شہادت دے فوراً قبول کر لی جائے گی،

تار کے ذریعہ گواہی قبول نہیں،

یا اہلِ سلطنت نے باوجودیکہ تار کو بعض امور میں حجت ٹھہرایا ہے، لیکن اگر کوئی شخص عدالت میں اپنی شہادت تار کے ذریعہ بھیج دے گو پورا یقین ہو کہ اسی شخص کا تار ہے

مگر قبول نہ کیا جائے گا،

قانونِ شریعت کی حکمتوں کا اظہار ضروری نہیں

آخر شریعت ایک قانون ہے، کیا اس کو حق نہیں کہ جن دفعات کو اپنے محکومین کے لئے قرینِ حکمت سمجھے تجویز کردے، باقی یہ اس کے ذمہ نہیں کہ ان حکمتوں کا سبق بھی سب کے سامنے دُہرایا کرے، گو بعض خاص عباد کو بعض حکمتوں پر اطلاع بھی ہو جاتی ہے، مگر ان کے ذمہ بھی ضروری نہیں کہ ان کا اظہار کیا کریں، کیونکہ اصل مقصود کہ عمل ہے ان حکمتوں کے ظہور پر موقوف نہیں، اور ایسوں ہی پر ان کا انکشاف بھی ہوتا ہے، جو اپنے عمل میں اطلاعِ حکمت کا انتظار نہیں کرتے، اور یہ مشرب رکھتے ہیں ؎

زباں تازہ کردن باقرارِ تو نینگیختن علت از کارِ تو

کفر کا فتویٰ دینے میں سخت احتیاط کی ضرورت ہے،

امر ثانی کے متعلق بھی ضروری بیان ہو چکا، اب امر ثالث کے متعلق عرض ہے کہ اس میں بھی یہ بڑی کوتاہی ہے کہ ذرا تدبر سے کام نہیں لیتے، قائل کے قول کا کوئی محمل صحیح نہیں سوچتے، بس مفتی صاحب کو جو بات ناگوار ہوئی فوراً کفر کا فتویٰ لگا دیا، بلکہ بعض اوقات محمل صحیح سمجھ میں بھی آجاتا ہے پھر بھی اس کو ذہن سے دفع کر کے اپنا غیظ نکالتے ہیں، بلکہ اس سے بڑھکر یہ کہ وہ بیچارہ قائل وجہ کفر کا خود انکار کر رہا ہے، اور محمل صحیح کی تصریح کر رہا ہے، مگر جب بھی اس کو معافی نہیں دی جاتی، تکفیر ہی کی سزا اس کے لئے بحال رہتی ہے، حالانکہ حدیث میں تصریح ہے، لا تکفرہ بذنب ولا تخرجه عن الاسلام اور فقہاء نے فرمایا ہے کما فی ردالمحتار عن الخلاصۃ:

اذا کان فی المسئلۃ وجوہ یوجب التکفیر ووجه واحد یمنعه فعلی المفتی رای یجب علیه) ان یمیل الی الوجه الذی یمنع التکفیر تحسنا للظن بالمسلم	(جب کسی مسئلہ میں بہت سی وجوہ ہو جو کفر ثابت کرتی ہیں اور ایک وجہ کفر کی نفی کی ہو تو مفتی پر واجب ہو جاتا ہے کہ اس وجہ کی طرف میلان اختیار کرے جو کفر کی نفی کرتی ہے مسلمان کے ساتھ حُسنِ ظن اختیار

لہ اس موضوع پر حضرت مفتی اعظم سیدی و مرشدی مولانا مفتی محمد شفیع صاحب دیوبندی قدس سرہ العزیز نے "وصول الافکار الی اصول الاکفار" کے نام سے جامع مکمل اور مدلل رسالہ لکھا ہی جو قابلِ دید ہے، اس کے علاوہ حضرت موصوف قدس سرہٗ کا دوسرا رسالہ "ایمان اور کفر قرآن کی روشنی میں" بھی قابلِ ملاحظہ ہی، جو ادارۃ المعارف کراچی نمبر ۱۴ سے مل سکتا ہے ۱۲ (احقر قریشی)

زاد فی البزازیۃ الا اذا صرح بارادتہ موجب الکفر فلا ینفعہ التاویل والذی تحرز اعنہ لا یفتی بکفر مسلم امکن محمل کلامہ علی محمل حسن او کان فی کفرہ اختلاف ولو روایۃ ضعیفۃ من البحر (ج ۳ ص ۲۴۰)

کرتے ہوئے، بزازیہ میں یہ عبارت زیادہ کی ہو کہ مگر جب اس شخص نے ایسے ارادے کی صراحت کر دی جو کفر ثابت ہی کر دیتا ہے تو اس وقت اسے تاویل نفع نہ دے گی، اور جو شخص اس بات سے بچا کہ کسی مسلمان کے کفر کا فتویٰ نہیں دے گا، اس کے کلام کا اچھے محمل پر خیال کرنا ممکن ہے، یا اس کے کفر میں اختلاف ہے اگرچہ ضعیف روایت کے اعتبار سے ہے جیسا کہ بحر الرائق ج ۳ ص ۲۴۰ پر ہے"

بلا تحقیق کفر کے فتووں کا انجام اور ان مکفرین کی جرأت یہاں تک بڑھ گئی ہے کہ عوام سے گذر کر خواص یعنی علماء تک کو اپنی تکفیر کا نشانہ بناتے ہیں، اور ان سے گذر کر اخص الخواص یعنی عارفین تک بھی پہنچتے ہیں، اور ماشاء اللہ جن اقوال کی بناء پر تکفیر کرتے ہیں وہ ایسے دقیق ہوتے ہیں کہ ان مکفرین کا طائر ذہن بھی وہاں نہیں پہونچتا، یا دقیق نہیں ہوتے مگر ناشی ایسے احوال سے ہوتے ہیں جن کی ہوا تک بھی ان محبوسانِ الفاظ و رسوم کو نہیں لگی تو ان کی تکفیر کرنا بالکل اس آیت کا مصداق ہوتا ہے،

قال تعالیٰ: بَلْ كَذَّبُوا بِمَا لَمْ يُحِيطُوا بِعِلْمِهِ وَلَمَّا يَأْتِهِمْ تَأْوِيلُهُ ۚ

(یونس، آیت ۳۹)

"بلکہ ایسی چیز کی تکذیب کرنے لگے جس کے (صحیح وسقیم ہونے کو) اپنے احاطۂ علمی میں نہیں لائے اور ہنوز انکو (اس قرآن کی تکذیب) کا آخری نتیجہ نہیں ملا)

وقال تعالیٰ:

وَإِذْ لَمْ يَهْتَدُوا بِهِ فَسَيَقُولُونَ هَٰذَا إِفْكٌ قَدِيمٌ ۝

(الاحقاف، آیت ۱۱)

"اور جب اُن لوگوں کو قرآن سے ہدایت نصیب نہ ہوئی تو یہی کہیں گے کہ یہ قدیمی جھوٹ ہے"،

ولنعم ما قیل ؎

وکم من عائب قولاً صحیحاً ❊ وآفتہ من الفہم السقیم

"(اور کتنے لوگ ہیں جو درست بات کا عیب نکالنے والے ہیں، اور اس کی مصیبت ہے سمجھ کی بیماری سے)"،

کیا یہ غضب اور ستم نہیں ہے کہ ہر زمانہ میں ایسوں کی تکفیر ہوئی جن کی برکت سے علوم اسلامیہ کا احیاء ہوا، اور جن کے فیض سے برکاتِ دینیہ کا القاء ہوا،

کفر کا فتویٰ دینے کے لئے بعض شرائط

اور اگر کسی بزرگ کا کلام مأوّل نہ ہوسکے، تو اس کی تکفیر سے یہ اسہل واسلم ہے کہ اس کلام ہی کی نسبت کا انکار کر دیا جائے اور غلبۂ حال کی تاویل کے رَد کرنے کے لئے بعض متقشفینِ عذر کو ان چند عذروں میں سمجھتے ہیں جن کو اصولیین نے بوجہ کثرتِ وقوع ذکر کر دیا ہے، اور اس تخصیصِ ذکری کو تخصیصِ واقعی سمجھ کر دوسرے عذروں کی نفی ہی کر دی، حالانکہ ان میں عذر منحصر نہ ہونا خود فقہاء ہی کے کلام میں مصرّح ہے :۔

فی العالمگیریہ احکام المرتدین من اصابہ برسام او اطعم شیئاً فذھب عقلہ فھذی فارتد لم یکن ذٰلك ارتداداً وکذا لو کان معتوھاً او موسوساً او مغلوباً علی عقلہ بوجہ من الوجوہ فھو علی ھٰذا کذا فی السراج الوھاج،	(”عالمگیری احکام المرتدین میں ہے جسے سرسام کی بیماری پہنچی یا اس نے کسی چیز کو کھا لیا جس کے بعد اس کی عقل چلی گئی پھر اس نے کچھ بکواس کی، پھر وہ مرتد ہوا یہ اس کا ارتداد نہیں ہوگا، اور اسی طرح اگر کوئی شخص کم عقل (پاگل) ہے، یا کسی وجہ سے مغلوب العقل یا وسوسہ والا ہے تو وہ بھی اسی حکم میں ہے جیساکہ سراج وہاج میں ہے“)

اس عبارت میں ”بوجہ من الوجوہ قابلِ نظر ہے :۔

وفی مدارج السالکین لابن القیّم ج ۱ ص ۱۱۴، تحت حدیث قصۃ القائل انا عبدك وانت ربی، وفی الحدیث من قواعد العلم انّ اللفظ الذی یجری علی لسان العبد خطأً من فرح شدید او غیظ شدید ونحوہ لا یؤاخذ بہ ولھذا لم یکن	(”ابن قیّم سے مدارج السالکین ج ۱ ص ۱۱۴ ”انا عبدک وانت ربّی“ کے قائل کے قصّہ میں مرقوم ہے کہ قواعدِ علم سے یہ بات ہے کہ بندہ کی زبان پر جو لفظ سخت غصّہ کی وجہ سے یا غیر معمولی خوشی یا اور کسی وجہ سے خطاءً چل نکلے اس کا مواخذہ نہیں ہوتا اسی واسطے وہ شخص کافر نہیں ہوگا، جس نے ”انت عبدی وانا ربک (بسبقت لسانی)

كافراً بقوله انت عبدی وانا ربك ومعلوم ان تاثير الغضب فی عدم القصد يصل الى هذا الحال او اعظم منها اھ

کہہ دیا، اور معلوم ہے کہ غصہ کی تاثیر سے اس حالت تک یا اس سے بڑھ کر پہنچنے میں عدم قصد ہے")

اس عبارت میں لفظ "نحوہ" قابلِ غور ہے، اور اس دوسری عبارت کے نقل کرنے میں یہ بھی مصلحت ہے کہ بعض جامدین علی الظاہر غیر متبعین للفقہاء پر بھی کہ وہ امر تکفیر میں اور بھی شدید ہیں، حجت ہو، کہ اُن کے متبوعِ مسلّم کا فتویٰ ہے، اور ہم نے جو امرِ تکفیر میں احتیاط کرنے کو کہا ہے اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر کوئی صریح کفر کا کام کرے یا صریح کفر کی بات کرے، جس میں تأویل نہ ہو سکے، یا ہو سکے مگر خود وہ فاعل یا قائل اس کا انکار کرے تب بھی اس کی تکفیر نہ کی جائے،

ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے

چنانچہ ایک کوتاہی اس اوّل کوتاہی کے مقابل اس باب میں یہ بھی ہے کہ علماء پر اعتراض کیا جاتا ہے، کہ ذرا ذرا سی بات میں تکفیر کر دیتے ہیں، ان معترضین کے نزدیک وہ بات ذراسی ہوتی ہے، ان صاحبوں کو یہ آیت پیشِ نظر رکھنا چاہئے:-

وَلَئِنْ سَأَلْتَهُمْ لَيَقُولُنَّ إِنَّمَا كُنَّا نَخُوضُ وَنَلْعَبُ ۚ قُلْ أَبِاللَّهِ وَآيَاتِهِ وَرَسُولِهِ كُنْتُمْ تَسْتَهْزِئُونَ ○ لَا تَعْتَذِرُوا قَدْ كَفَرْتُمْ بَعْدَ إِيمَانِكُمْ،

(التوبہ، آیت ۶۵، ۶۶)

"اور اگر آپ اُن سے پوچھیں تو کہدیں گے ہم تو محض مشغلہ اور خوش طبعی کر رہے تھے آپ ان سے کہدیجئے گا کہ کیا اللہ کے ساتھ اور اس کے رسول کے ساتھ اور اس کی آیتوں کے ساتھ تم ہنسی کرتے تھے، تم اب یہ بیہودہ عذر مت کرو، تم اپنے کو مؤمن کہہ کر کفر کرنے لگے"

اور اوپر یہ عبارت گذر چکی ہے الا اذا صرح بارادة الكفر فلا ينفعه التاويل،

ہر امر میں حدودِ شرعیہ کی رعایت ضروری ہے

خلاصہ یہ کہ ہر امر میں حدودِ شرعیہ کا پاس واجب ہے، نہ اُن کا تنابز ہو اور نہ ان سے تجاوز ہو،

ثبوتِ کفر کے بعد تجدیدِ ایمان کے ساتھ تجدیدِ نکاح اور اعادۂ حج بھی واجب ہے

ایک بے احتیاطی اس باب میں یہ ہوتی ہے کہ ثبوتِ کفر کے بعد اسلام کی تو تجدید کرلی جاتی ہے، نہ نکاح کی تجدید ہوتی ہے حالانکہ یہ بھی ضروری ہے اور نہ حج کا اعادہ ہوتا ہے حالانکہ کفر سے حجِ سابق بھی باطل ہوجاتا ہے، تو بعد تجدیدِ ایمان اگر شرائط وجوبِ حج کے پائے جائیں تو حج پھر کرنا چاہئے،

وھذا آخر ما اردنا ایرادہ فی ھذہ الفصول

حصۂ دوم تمام شد

یکم شعبان ۱۳۳۸ھ

ناشر

ادارۃ المعارف کراچی ۱۴